برصغیر میں مسیحی سکالرز کا پیش کردہ قرآنی لٹریچر

(۱۸۳۷ء .... ۱۹۴۷ء)

ایک تاریخی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی [علوم اسلامیہ]

(۲۰۰۳ء .... ۲۰۰۹ء)

مقالہ نگار

ساجد اسد اللہ

لیکچرار علوم اسلامیہ

گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، سمندری

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر

ڈائریکٹر سیرت چیئر

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ﴿﴾ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ

وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ...... ﴿﴾ [آل عمران ۳: ۳۔۴]

DECLARATION CERTIFICATE

This thesis which is being submitted for the degree of Ph. D in The Islamia University of Bahawalpur, does not contain any material which has been submitted for the award of Ph. D degree in any university and ,to the best of my knowledge and belief , neither does this thesis contain any material published nor written previously by another person, except when due reference is made to the source in the text of the thesis.

SAJID ASDULLAH

Ph. D Scholar

Regd. # 1338/Acad Dated: 04/06/2003

Department of Islamic Studies

The Islamia University of Bahawalpur

TO WHOM IT MAY CONCERN

It is certified that Mr. Sajid Asdullah S/O Muhammad Daud is a Ph. D student in the Department of Islamic Studies and he has completed his Thesis titled:

برصغیر میں مسیحی سکالرز کا پیش کردہ قرآنی لٹریچر (۱۸۳۷ء.........۱۹۴۷ء)

(ایک تاریخی، تحقیقی تنقیدی جائزہ)

Under my supervision and guidance for the award of Ph. D Degree. Mr. Sajid Asdullah is eligible for submission of Thesis under the Rules & Regulation of the Department as well as of the University regarding Ph.D. The material used by him is original and he has shown creativeness in his work. I am satisfied with the quality of student's research work.

SUPERVISOR

PROF. DR. ABDUL RAUF ZAFAR

انتساب

للہ ورسولہ

امابعد!

یہ کاوشِ فکر و قلم بچھڑ جانے والے والدین

کہ جن کے لیے دعا، عمر اور رزق میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

رب ارحمھما کما ربینی صغیرا

اور

برادر اکبر طارق عبداللہ (مرحوم)

جن کی محبتیں اور خلوص میرے لیے سرمایہ حیات تھا۔

کے نام معنون کرنا چاہوں گا

رب اغفرھم وارحمھم

اظہار تشکر

رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ (الاحقاف ۴۶: ۱۵)

[اے میرے پروردگار (عزوجل جلالک) مجھے توفیق عطا فرما کہ تو نے جو جو احسانات مجھ پر فرمائے ہیں، ان کا شکر ادا کر سکوں]

حمد و ثنا اللہ تعالی وحدہ لاشریک کی ذات بے ہمتا کے لیے، جس کی نعمتوں کا شمار نہیں اور درود و سلام سید الانبیاء و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی پر۔

تمام کلمات تشکر اللہ علیم وخبیر کے لیے جس نے راقم کو اس تحقیقی کام کی ہمت و توفیق بخشی۔

سب سے پہلے اپنے مشفق استاد مکرم و نگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر صاحب کی خدمت میں ہدیہ تشکر، جنہوں نے اس کام کی تحریک دلائی اور اپنی بے پناہ علمی و انتظامی مصروفیت سے میری فکری و عملی راہنمائی کے لیے وقت نکالا۔ اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر ڈاکٹر شمس البصر صاحب (چیئر مین شعبہ علوم اسلامیہ) اور پروفیسر ڈاکٹر سلیم طارق صاحب (ڈین فیکلٹی آف اسلامک لرننگ) کا بالخصوص جب کہ شعبہ علوم اسلامیہ کے تمام معزز اساتذہ کرام کا بالعموم شکریہ ضروری سمجھتا ہوں۔ جنہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے میری راہنمائی کی۔

احسان شناسی کا اعتراف دستور انسانیت ہے اور اعتراف احسان میرے لیے یقیناً خوشگوار فریضہ ہے۔ میرے علمی سفر میں راہنمائی، معاونت اور حوصلہ افزائی کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں سرفہرست برادر اکبر پروفیسر ڈاکٹر خالد ظفر اللہ صاحب (پرنسپل، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، سمندری) ہیں۔ اپنے علمی و تحقیقی سفر کے پہلے قدم سے ہی ان کی انگلی پکڑ کر چلنے کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتا ہوں۔ ان کی سرپرستی اور مشاورت ہر ہر مرحلے پر جس طرح شامل حال رہی، انہیں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اسلوب تحقیق کو بہتر بنانے کے لیے قیمتی مشورے میرے لئے دلیل راہ بنے اور انہوں نے ترکی زبان میں ماخذوں کا ترجمہ کر کے ان سے استفادہ میں آسانی فراہم کی۔ اسی طرح محترم ظفر اقبال صاحب کے نام کے بغیر یہ فہرست نامکمل رہ جائے گی کہ برسوں کے مطالعہ سے بائبل کو تقریباً ازبر کیے ہوئے ہیں اور ان کا گیرائی اور گہرائی سے کردہ مطالعہ مسیحیت میری اس تحقیق میں بہت معاون ثابت ہوا۔ انہوں نے جس خلوص جذبہ اور محنت سے معاونت کی اس کا، جن الفاظ میں بھی شکریہ ادا کروں، حق ادا نہ ہو گا۔

اس تحقیقی سفر میں جن اساتذہ، ماہرین علم و فن اور کتاب دوست افراد و اداروں سے علمی معاونت ملی ان سب کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ پروفیسر عبدالجبار شاکر (مرحوم)، استاذ مکرم پروفیسر ڈاکٹر سفیر اختر صاحب (اسلام آباد)، پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب، پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب (پشاور)، پروفیسر ڈاکٹر معراج الاسلام ضیاء صاحب (پشاور)، پروفیسر ڈاکٹر ثناء اللہ بھٹو صاحب (جام شورو)، پروفیسر ڈاکٹر غلام محمد جعفر صاحب، (کوئٹہ)، ڈاکٹر عبدالحی مدنی صاحب (کراچی)، ڈاکٹر حافظ محمد سجاد صاحب تترالوی (اسلام آباد)، ڈاکٹر جاوید اختر صاحب، ڈاکٹر حافظ محمد طارق صاحب، پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالرز [عبدالرزاق گوندل صاحب (لیکچرار)، محمد طیب صاحب (لیکچرار)، حافظ امجد حسین صاحب (لیکچرار)، محترم محمد اکرم صاحب (IRI)، محترم حافظ عابد مسعود صاحب (IIUI) محترم قیصر شہزاد صاحب (IRI)] کے تعاون پر انہیں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

نیز (عم مرحوم) حافظ محمد سلیمان رندھاوا، مولانا محمد اسحاق صاحب، محترم ضیاء اللہ کھوکھر صاحب گوجرانوالہ، مولانا عبدالرؤف فاروقی، عبدالحمید صاحب (مرحوم)، محترم سعد صاحب اسلامی مشن لاہور، حافظ شعیب صاحب بلتستانی، محترم شاہ جہان صاحب، محترم اشرف جاوید صاحب مکتبہ دارارقم، محمد سرور صاحب و احباب مکتبہ اسلامیہ، محترم رمضان یوسف سلفی صاحب مکتبہ رحمانیہ، محترم محمد زبیر صاحب مکتبہ ناصریہ، عبدالحمید قلندرانی آف ہمدرد یونیورسٹی، کراچی کے تعاون کا شکریہ من لم یشکر اللناس لم یشکر اللہ کے تحت ضروری خیال کرتا ہوں۔

جماعت احمدیہ کے جناب محمد صادق صاحب لائبریرین، خلافت لائبریری، ربوہ، علم دوست عبدالمالک صاحب آف جھنگ، حافظ ارشد صاحب علوی (لاہوری گروپ)، ارباب صالحہ ظہور لائبریری جماعت احمدیہ لاہور (لاہوری گروپ)، بشارت علی صاحب (اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج ناندلیانوالہ) اور مسیحی احباب جناب انجم جیمس پال (لیکچرار گورنمنٹ کالج سمندری)، مائیکل یوسف صاحب، آفتاب جیمس پال، بشپ ہاؤس فیصل آباد، ارباب کرسچین سٹڈی سنٹر راولپنڈی [ہارون ناصر صاحب، رومانہ بشیر صاحبہ، مادام مسرت صاحبہ] کا شکریہ بھی لازم ہے۔

پی ایچ ڈی اسکالر محترم لیاقت علی صاحب کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ سفر و حضر میں ان کی معیت پریشانیوں و تکلیفوں کو آسان بنانے والی اور ان کی حوصلہ افزائی و تسلی اس تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

ناسپاسی ہوگی اگر کمپیوٹر کمپوزنگ میں معاونت کرنے پر برادر کبیر فائق نصر اللہ صاحب کا ذکر نہ کیا جائے۔ اپنی استطاعت سے بڑھ کر انہوں جس طرح مقالہ کے لیے محنت کی اور ناممکن کو ممکن بنایا، اس پر صمیم قلب سے ان کا ممنون ہوں۔ نیز انعام اللہ غازی اور فتح اللہ اربکان بھی ہاتھ بٹانے پر شکریہ کے مستحق ہیں۔

برادر سعید جاوید صاحب اور طارق محمود صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ ان کی وجہ سے میں قیام ہاسٹل کے دوران اہل خانہ کے بارے کبھی پریشانی کا شکار نہ ہوا۔

یہ علمی سفر اہل خانہ (سرمد ساجد، اخواتہ و ام سرمد) کے تعاون کے بغیر پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا کہ اس دوران راقم گھریلو ذمہ داریوں سے مستثنیٰ رہا اور انہوں نے اس مقالہ کی تیاری کے لیے بہتر ماحول اور سہولت پہنچانے کی مقدور بھر کوشش کی۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب احباب کا حامی و ناصر ہو۔

دعاگو

ساجد اسد اللہ

تقدیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء وخاتم المرسلین، وبعدہ

حاملین قرآن اور پیروکاران انجیل کے باہمی تعلقات کا آغاز نزول قرآن کے ابتدائی دور میں ہو گیا تھا۔ یہ تعلقات اتار چڑھاؤ کے ساتھ تاریخ کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہندوستان میں مسلم اقتدار کے تنزل اور مغربی استعمار کے غلبہ کے بعد یہاں مسلم مسیحی علمی مجادلہ کا آغاز ہوا۔ علمی جمود کے شکار مسلم معاشرہ میں مغربی مسیحی مشنریز کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں زبردست تموّج پیدا ہوا۔ مسلم علماء اور مسیحی منادین کی باہمی علمی رزم گاہی سے وسیع حجم پر مبنی لٹریچر معرض وجود میں آیا۔ یہ ہندوستان کی مذہبی علمی تاریخ کا ایک اہم جزو ہے جس کی طرف بعد میں کم توجہ دی گئی ہے۔ مختلف علمی تحریروں میں اس کا ضمنی اور جزوی طور پر تو تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن یک جائی سے اردو میں اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ اس لٹریچر کا غالب حصہ زیب او طاق اور الماریوں کی زینت ہی بنا رہا ہے۔

اٹھارویں سے بیسویں صدی عیسوی کے عہد کی علمی میراث اور فکری تاریخ پر مبنی یہ لٹریچر دو مذہبی گروہوں کے جذبات، رویوں اور طرز عمل کو جانچنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ دور متذکرہ میں سیاسی مخالفت کی بنا پر لکھا جانے والا یہ لٹریچر فریقین میں معاشرتی و مذہبی بُعد کا سبب بنا۔ وطن عزیز کے دونوں مذہبی پڑوسی اس علمی ذخیرہ کے تجزیہ سے ایک دوسرے کے بارے پائی جانے والی غلط فہمیوں اور عدم برداشت کے رویہ کی وجوہات کا سراغ لگا سکتے ہیں، جو کہ آج کے مکالماتی دَور کے لیے نہایت اہم ہے۔ یہ متنوع لٹریچر مختلف جہات کا حامل ہے اس میں سے ہمارے پیش نظر مسیحی فریق کی طرف سے لکھا جانے والا قرآنی لٹریچر ہے۔ جس میں اس کا تاریخی جائزہ اور علمی تجزیہ نیز اس کے ردعمل میں مسلم علماء کی علمی کاوشوں کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ پانچ ابوب پر مشتمل ہے۔

باب اول "برصغیر میں تاریخ مسیحیت۔ مختصر جائزہ" کے عنوان سے ہے۔

فصل اول میں مسیحیت کی برصغیر میں آمد کے بارے مختلف فیہ دعاوی کا جائزہ اور آرتھوڈکس کلیسیا کی مختصر تاریخ پر مبنی ہے۔ دوسری فصل کیتھولک کلیسیا اور تیسری فصل پروٹسٹنٹ کلیسیا کی مختصر تاریخ پر محتوی ہے۔

دوسرا باب "برصغیر کا مسیحی قرآنی لٹریچر۔ تعارفی جائزہ" دو فصول پر مشتمل ہے۔ فصل اول میں معروف مسیحی مصنفین کے حالات و آثار کا تذکرہ ہے۔ جب کہ دوسری فصل میں برصغیر میں لکھے گئے مسیحی قرآنی لٹریچر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب " مسیحی انتقادی ادب کا منہجی و تجزیاتی جائزہ " کے لیے مختص ہے۔ فصل اول میں مسیحی لٹریچر میں قرآن کریم پر وارده بعض اعتراضات کا تحلیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری فصل میں مسیحی ناقدین کے ماخذ و مصادر کے حوالے سے مغرب میں قرآن کے تنقیدی مطالعہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم "مسلم علماء کی تصنیفی و مناظرانہ کاوشیں" کے عنوان سے ہے۔ فصل اول میں مسیحی لٹریچر کے جواب میں مسلم علماء کی طرف سے لکھی جانے والی بعض توضیحی، تردیدی، تنقیدی اور الزامی کتب کا تعارف کروایا گیا ہے۔ جب کہ دوسری فصل میں مسیحی تبشیری کاوشوں کے رد میں مسلم علماء کے مناظروں کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔

باب پنجم " برصغیر کے تفسیری ادب پر مسلم مسیحی کشمکش کے اثرات " بھی دو فصل پر محتوی ہے۔ فصل اول میں برصغیر کے تفسیری ادب پر مسیحی لٹریچر کے ایجابی اثرات اور تردیدی رجحان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسری فصل میں اسی حوالے سے سرسید احمد خاں، مولانا عبدالحق حقانی، اور مولانا ثناءاللہ امرتسری کی تفاسیر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ میں شامل لٹریچر کا معروضی اسلوب میں تحلیلی تجزیہ و تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بائبلی پس منظر کے ناطے، مسیحی انتقادی ادب کا کو خصوصاً عہد جدید کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسا الزامی طریق کے طور پر نہیں بلکہ اصول تحقیق کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے مذہبی ادب کو مذہبی نظریات کی کسوٹی پر پرکھنا مقصود تھا۔ مقالہ ہذا میں بائبل کے حوالہ جات کے لیے سوسائٹی آف سینٹ پال روم ۱۹۵۸ء کی اردو اشاعت کو مد نظر رکھا گیا ہے

قبل ازیں براہ راست اس عنوان پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا گیا۔ البتہ مقالہ نگار کو ضمنی حوالے سے درج ذیل مصادر سے نسبتاً زیادہ معلومات دستیاب ہوئیں۔

1- Birisik , Abdulhamit , Oryantalist Misyonerler ve Kuran , Istanbul 2004

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالحمد بیر ایشق ایک ترک سکالر ہیں، جو اردو زبان میں بھی کافی استعداد رکھتے ہیں۔ ترکی زبان میں لکھی گئی ان کی اس کتاب کا موضوع برصغیر میں پروٹسٹنٹ مشنریز اور ان کا قرآن پر کام کا تعارف ہے۔ مصنف کے مد نظر ترکی زبان میں برصغیر میں مسیحیت اور اس کے لٹریچر کا عمومی تعارف مقصود تھا۔ برصغیر کے مسیحی اہل قلم کی تحریروں کے بارے معلومات اور مواد کی عدم دستیابی کی بنا پر مختصر معلومات ہیں۔ بہر حال برصغیر کی علمی میراث کا ترکی میں تعارف کروانے کی یہ کاوش قابل صد تحسین ہے۔ فاضل مصنف نے علمی راہنمائی کے علاوہ مجھے ترکی سے بعض کتب ارسال کیں۔ اس علمی تعاون پر راقم فاضل مصنف کا تہہ دل سے شکر گذار ہے۔

2- Averill Powel, Muslims and Missionaries in Pre-Mutiny India, Curzon Press Ltd., Uk 1993

یہ ایف سی کالج، لاہور میں خدمات سرانجام دینے والی اور سکول آف ایشین اینڈ افریقین اسٹڈیز SOAS (لندن) سے منسلک اسکالر ایورل پاؤل کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس میں مسیحی مشنریز کی تبشیری کاوشوں اور مسلم مسیحی مناظرانہ سرگرمیوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے، جو کہ میرے مقالہ کے چوتھے باب سے ضمنی طور پر متعلقہ ہے۔ اس

میں مسلم علماء کی مناظرانہ خدمات کا عمومی تذکرہ مفقود ہے۔ راقم نے ای میل کے ذریعے رابطہ کیا لیکن مصنفہ کی طرف سے حوصلہ افزائی کا رویہ سامنے نہیں آیا۔

(۳) امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۷۹ء۔ صحافیانہ اسلوب میں مختصر انداز میں برصغیر میں مسیحی مشنریز کی تبشیری تاریخ، مسیحی اہل قلم اور ان کی کتب کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم علماء کی خدمات کو جذباتی لگاؤ سے پیش کیا گیا ہے۔

(۴) محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی دینی و علمی خدمات۔ (مقالہ، غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ اس مقالہ میں فاضل محقق نے برصغیر میں مسیحی منادین کے ساتھ مناظرہ کرنے والے اور مطالعہ مسیحیت پر کتب کثیرہ کے مصنف مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی خدمات پیش کی ہیں۔ اس کا میرے مقالہ کے چوتھے باب سے جزوی تعلق ہے۔ راقم علمی راہنمائی اور معلومات کی فراہمی پر محترم ڈاکٹر عبداللہ صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہے۔

(۵) سہ ماہی " عالم اسلام اور عیسائیت " اسلام آباد میں شائع شدہ بعض مقالات بھی مفید مطلب رہے۔

دوران تحقیق بہت زیادہ مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس میں سر فہرست مواد کی عدم دستیابی اور معلومات کی کمی تھی۔ مسیحی لٹریچر مقدور بھر کیست میں محفوظ کیا گیا ہے لیکن مسلم تحریریں اپنے حجم کے اعتبار سے جامع طور پر محفوظ نہیں ہیں۔ اس موضوع پر عمومی عدم دلچسپی کو اس کی بنیادی وجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مسلم اور مسیحی اہل علم سے راہنمائی و معاونت کے لیے رابطہ کیا گیا تو بہت ہی محدود عمومی نوعیت کی معلومات میسر ہوئیں۔

مسلم علماء کی طرف سے موضوع کی بجائے عمومی مسیحیت پر رائے زنی کا اظہار ہی سامنے آتا رہا۔ اکثریت نے ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائیک کی تقاریر و تحریروں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ حالانکہ موضوع تحقیق ڈاکٹر صاحب کی تبلیغی کاوشوں سے یکسر مختلف ہے۔

دوسری طرف مسیحی اصحاب کی اکثریت نے حالات و احوال کی بناء پر، باستثنائے معدودے چند (جن کا شکریہ لازم ہے)، ذہنی تحفظات کا شکار ہو کر بہت محتاط رویہ کا مظاہرہ کیا۔ Controversial مواد ہونے کی بنا پر جذباتی ردعمل کا خوف ان کی طرف سے علمی تعاون میں سب سے بڑی رکاوٹ رہا۔ مسیحی مذہبی راہنماؤں کا عمومی رویہ یہ سامنے آیا کہ وہ نسبتاً علمی کی بجائے تنظیمی تگ و دو میں زیادہ سرگرمی دکھلاتے ہیں۔

ذرائع تحقیق کے لیے اساتذہ، اہل علم دانش، انٹرنیٹ اور لائبریریز کی طرف رجوع کیا گیا۔ مسیحی حلقہ کی طرف سے www.Muhammadnism.org پر نئی کمپوزنگ کے ساتھ کچھ کتب دستیاب ہیں، لیکن اس پر کم اعتماد کیا گیا۔ سرکاری و غیر سرکاری لائبریریوں، مذہبی و علمی مراکز اور انفرادی مکتبہ جات سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں علی ارشد صاحب (م ۷ا فروری ۲۰۰۹) آف فیصل آباد کے ذخیرہ " بیت الکتب " سے سب سے زیادہ

اور سہولت سے مواد میسر آیا۔ انہوں نے نہایت نایاب اور قیمتی کتب تک رسائی کے لیے ہمہ وقت اپنے دروازے کھلے رکھے۔ مرحوم کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل علمی مراکز سے مواد کا حصول ممکن ہوا۔

سنٹرل لائبریری دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، پبلک لائبریری، بہاولپور، مرکزی لائبریری پنجاب یونیورسٹی لاہور، پنجاب پبلک لائبریری لاہور، لویولا ہال لائبریری، ذخیرہ کتب محترم ضیاء اللہ کھوکھر صاحب گوجرانوالہ، سیرت اسٹڈی سنٹر سیالکوٹ؛ ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری، اسلام آباد، نیشنل لائبریری، اسلام آباد؛ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد؛ کرسچین اسٹڈی سنٹر، راولپنڈی، خلافت لائبریری ربوہ، جامعہ سلفیہ لائبریری فیصل آباد، مکتبہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن، عصیم لائبریری رجانہ، عبدالرحمن شاد لائبریری ملتان، سنٹرل لائبریری بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، مسعود جھنڈیر لائبریری میلسی، ذخیرہ کتب پروفیسر گل محمد شاہ بخاری صاحب شہداد کوٹ (سندھ)، ذخیرہ کتب ڈاکٹر ادریس سومرو کنڈیارو (سندھ)، ذخیرہ کتب پروفیسر سید اسرار بخاری صاحب شکار پور، ڈاکٹر یوسف میمن لائبریری خیر پور، مکتبہ الراشدیہ نیو سعید آباد (سندھ)، شاہ ولی اللہ اورئینٹل کالج لائبریری منصورہ (سندھ)، سنٹرل لائبریری سندھ یونیورسٹی جامشورو، داؤد پوتہ لائبریری حیدرآباد، سنٹرل لائبریری جامعہ کراچی، ہمدرد یورسٹی لائبریری کراچی، انجمن ترقی اردو کراچی، لائبریری اسٹیٹ بنک آف پاکستان کراچی، ایوب میموریل لائبریری کراچی، مکتبہ جامعہ ابی بکر، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، مکتبہ مفتی جان محمد نعیمی کراچی، اسلامیہ کالج لائبریری پشاور، سنٹرل لائبریری پشاور یونیورسٹی پشاور، مکتبہ مولانا شمس الحق پشاور، سنٹرل لائبریری کوئٹہ یونیورسٹی، مکتبہ دارالسلفیہ، کوئٹہ ان علمی مراکز سے وابستہ افراد کا شکریہ بہت ضروری ہے جن کے تعاون کے بغیر یہ علمی سفر ممکن نہ تھا۔

اس سلسلہ میں HEC کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔ Indeginious Scholarship کے حصول سے لائبریریوں کے ساتھ رابطہ آسان ہو گیا، جس پر راقم ارباب HEC کا تہہ دل سے شکر گذار ہے۔

تحقیق کی کٹھن گھاٹی اور مشکل موضوع پر یہ کام حرف آخر نہیں بلکہ آغاز کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ براہ راست اس عنوان پر کوئی تحقیقی کام سامنے نہیں آیا ہے۔ کسی نئی جہت سے تحقیقی کام یقیناً اس موضوع میں مزید جامعیت کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو علمی معاونت اور مذہبی راہنمائی کے لیے مفید بنائے اور میرے اور مرحوم والدین کے لیے توشہ آخرت بنائے۔ آمین

ساجد اسد اللہ

توضیحات

مقالہ ہذا "برصغیر میں مسیحی سکالرز کا پیش کردہ قرآنی لٹریچر (۱۸۳۷ء۔۱۹۴۷ء) ایک تاریخی، تحقیقی، تنقیدی جائزہ" میں

- آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر (م ۱۸۶۱ء) کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء) سے لے کر تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) تک کے عہد کا لٹریچر شامل تحقیق کیا گیا ہے۔
- جغرافیائی طور پر تقسیم سے قبل کے برطانوی ہند (موجودہ پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش) میں لکھے گئے مسیحی لٹریچر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں علاقائی زبانوں میں ترجمہ و طبع شدہ لٹریچر شامل نہیں کیا گیا۔
- مغربی منادین کی انگریزی یا فارسی کتب کے اردو تراجم یہاں مسیحی حلقہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تراجم کے بغیر برصغیر کا مسیحی لٹریچر نامکمل رہتا ہے چنانچہ انہیں شامل تحقیق کر لیا گیا۔
- عہد متذکرہ میں مسلم حلقہ کی عام زبان فارسی تھی۔ اس لیے مسلم لٹریچر کے جائزہ میں اردو کے علاوہ بعض فارسی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جن کے بغیر مسلم لٹریچر ادھورا متصور ہوتا۔
- اس دور کے بعض الفاظ کا رسم الخط عہد حاضر میں متروک ہو چکا ہے۔ اقتباس لکھتے وقت اسی پرانے رسم الخط کو بعینہ نقل کیا گیا ہے، اس لیے اسے کتابت کی غلطی تصور نہ کیا جائے۔ مثلاً

  ہیں کو ہین، کہو کو کھو، میں کو مین، پھر کو پہر، کچھ کو کچہہ، کہیں کو کہین، پہلے کو پھلے وغیرہ
- بائبل کا حوالہ نقل کرتے وقت مروجہ طریق کے مطابق پہلے کتاب کا نام پھر باب اور پھر آیت درج کیا گیا ہے۔

  مثلاً متی ۳: ۱۱ سے مراد انجیل متی کے تیسرے باب کی ۱۱ویں آیت
- بائبل کے بتکرار مندرج حوالہ جات سے مختلف پہلو سے استدلال کیا گیا ہے۔

(بائبل کا حوالہ نقل کرتے وقت مسلم علماء کے ہاں، قرآنی اصطلاح سے مطابقت کی بنا پر، لفظ آیت کی بجائے درس مستعمل ہے۔ چونکہ مقالہ میں مسیحیوں کے ہاں رائج اصطلاحات نقل کی گئی ہیں اس لیے درس کی بجائے آیت کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے)

- انگریز حکومت کی طرف سے ہندوستان میں مقامی مسیحیوں کے لیے سرکاری کاغذات میں دیسی عیسائی کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی، جو کہ مسلم تحریروں میں مستعمل ہے۔ مقالہ ہذا میں بعض مقامات پر اس پس منظر میں دیسی پادری یا دیسی منادو غیرہ کے الفاظ دیکھنے کو ملیں گے۔

مسیحی اصطلاحات

۱ عقائد

ازلی / موروثی گناہ مسیحی عقیدہ کے مطابق انسان کی سرشت میں گناہ ازل سے موجود ہے اور یہ آدم و حوا کے باغ عدن میں گناہ کرنے کے باعث بنی نوع انسان میں داخل ہوا اور پشت در پشت ورثہ میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔

تثلیث / ثالوث مسیحی الٰہیات میں سب سے اہم عقیدہ تثلیث ہے۔ یعنی ایک خدا میں تین اقانیم باپ، بیٹا اور روح القدس ماننا اور یہ تین اقانیم صرف ایک ہی خدا ہیں۔ کیونکہ ان کا ایک ہی الٰہی علم، ایک ہی الٰہی ارادہ اور ایک ہی الٰہی زندگی ہے۔

لفظ تثلیث کتاب مقدس میں موجود نہیں۔ دوسری صدی کے آخر میں مسیحی بزرگ طرطلیان نے پہلی مرتبہ اس اصطلاح کا استعمال کیا[1]۔

تجسیم / تجسید جسم / جسد اختیار کرنا۔ کیتھولک علماء تجسیم کی بجائے تجسید کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسیحی علم الٰہی میں اس سے مراد ہے تثلیث کے دوسرے اقنوم (مسیح) کا انسان بننا / جسم اختیار کرنا۔ بائبل میں بنیادی طور پر لفظ جسم (عبرانی = بار سا barsa یونانی = Sarx) سے گوشت پوست کا جسم مراد ہے۔ مسیحی علم الٰہی کی رو سے جسم وہ نہیں جو انسان کے پاس ہے بلکہ جو کچھ وہ ہے تجسیم سے جو فارمولا ابھرتا ہے، یہ ہے کہ کسی طور خدا اپنی خدائی سے دستبردار ہوئے بغیر انسان بنا[2]۔

تصلیب مسیحی عقیدہ کے مطابق انسان کے ازلی گناہ کے کفارہ اور حصولِ نجات کی خاطر یسوع مسیح کا سولی چڑھنا

رسولی عقیدہ / کریڈ مسیحی ایمان کہ "میں ایمان رکھتا ہوں خدا قادر مطلق باپ پر، جو آسمان اور زمین کا خالق ہے، اور یسوع مسیح پر جو اس کا اکلوتا بیٹا اور ہمارا خداوند ہے۔ وہ روح القدس کی قدرت سے پیٹ میں پڑا، کنواری مریم سے پیدا ہوا، اس نے پنطس پیلاطوس کے عہد میں دکھ اٹھایا، مصلوب ہوا، مر گیا اور دفن کیا گیا۔ برزخ میں اترا، تیسرے دن مُردوں میں سے جی اٹھا، پھر آسمان پر چڑھ گیا اور خدا قادر مطلق کے داہنے ہاتھ جا بیٹھا۔ وہاں سے وہ زندوں اور مُردوں کی عدالت کے لیے دوبارہ آئے گا۔ میں ایمان رکھتا ہوں روح القدس پر، پاک کلیسیا، مقدسوں کی شراکت، گناہوں کی معافی، جسم کے جی اٹھنے اور ہمیشہ کی زندگی پر۔ آمین"

ساکرامنٹ حلف و عہد باندھنے کا طریق، اصطلاحاً وہ مذہبی رسوم جن کے بجالانے کا یسوع نے شاگردوں کو حکم دیا یا خود مقرر کیا یا خدا کے فضل کے ظاہری نشان ہوں۔ ساکرامنٹ تعداد میں سات ہیں۔

ا۔ **بپتسمہ / اصطباغ** یونانی پانی میں ڈبونا یا غوطہ لگانا، گناہوں سے چھڑانے کے لیے اور مسیح کے ساتھ دفن ہونے اور جی اٹھنے کی بصری علامت

---

1 خیر اللہ، ایف ایس، قاموس الکتاب، (مسیحی اشاعت خانہ، لاہور ۲۰۰۵ء، بار ہشتم) ص ۲۳۳

2 ایضاً، ص ۲۳۴-۲۳۵

۲۔ استحکام روح القدس سے مضبوطی حاصل کرنا

۳۔ عشائے ربانی / پاک شراکت / اقدس یوخرست شکرگذاری کی دعا، اتوار کو جمع ہو کر یسوع کی یاد میں روٹی اور مئے نوش کرنے کی رسم

۴۔ اعتراف / توبہ پادری صاحب کے روبرو اعتراف کرتے ہوئے گناہ معاف کروانے کی رسم

۵۔ بیماروں کو پاک مالش روح اور بدن کو تقویت دینے کے لیے مقدس تیل کی مالش

۶۔ پاک خدمت کہانت کا اختیار دے کر کاہن کو لائق زندگی گذارنے اور خدمت کرنے کا فضل دلوانا

۷۔ نکاح دلہا دلہن کو پاک عہد کی وساطت سے جوڑنا

کفارہ ازلی گناہ سے نجات کے لیے خدا نے اپنے بیٹے کو اس دنیا میں بھیجا جس نے سولی پر جان دے کر بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

کلمہ / کلام / لوگوس نئے عہد نامہ میں یونانی لفظ لوگوس بہت اہم ہے۔ اس کے معنی کلام ہیں۔ یہ بطور خاص کلام خداوندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نئے عہد نامہ میں اس سے مراد یسوع مسیحؑ کی ذات ہے [1]۔

۲ مسیحی رسومات / تہوار

عید خمسین / پینٹی کاسٹ عید فطیر کے بعد کا پچاسواں دن۔ اُسی دن روح القدس رسولوں پر نازل ہوا اور اسی سبب سے آج کل اسے عید نزول روح القدس کہا جاتا ہے۔ اسے ہفتوں کی عید بھی کہا جاتا ہے۔

عید صعود عید قیامت المسیح کے چالیس دن بعد یسوعؑ کے آسمان پر جانے کی یاد میں منایا جانے والا دن

عید فصح / عید فطیر عبرانی فصح یعنی گزر جانا۔ ان واقعات کی رسم یادگار جو یہودیوں کو مصر سے نکلتے وقت پیش آئے تھے چونکہ اس دن فطیری روٹی (خمیر کے بغیر تازہ روٹی) کھائی جاتی تھی اس لیے اُسے عید فطیر بھی کہتے ہیں۔

عید قیامت المسیح / ایسٹر / پاشکا مسیح کا قبر سے جی اٹھنے کا دن۔ ایک خاص کلیہ کے ذریعے کلیسیا ہر سال اس کا تعین کرتی ہے۔ عموماً مارچ کے آخر یا اپریل کے آغاز میں یہ منایا جاتا ہے۔

عید ولادت مسیح / کرسمس ۲۵ دسمبر کو یوم ولادت مسیح کا تہوار

گڈ فرائیڈے / پاک جمعہ مسیحی عقیدہ کے مطابق اس دن مسیح کو مصلوب کیا گیا تھا۔ اس روز گرجوں میں تعزیتی اجتماعات ہوتے ہیں۔

---

1 خیر اللہ، قاموس الکتاب، ص ۷۶

مسیحی ادب

کلام مقدس کلام مقدس روح القدس کی راہنمائی سے لکھا گیا اور اسی وجہ سے الہامی ہے۔[1]

اس کے دو حصے ہیں۔

الف عہد عتیق / عہد نامہ قدیم بنی اسرائیل کا پرانا عہد نامہ ان مختلف کتابوں کا مجموعہ ہے جو یسوع مسیح سے قبل لکھی گئیں اور انہیں بنی اسرائیل نے الہامی تسلیم کرلیا۔ اس کے الہام کا دورانیہ بارہ سو سال پر محیط ہے۔ پہلی پانچ کتب توریت کے نام سے مشہور ہیں۔ جن میں موسوی شریعت درج ہے۔ ان کتابوں کے مصنف، یہود و نصاریٰ کے نزدیک حضرت موسیٰ ہیں۔ عہد عتیق میں شامل کل کتابوں کی تعداد، کیتھولک کے ہاں پینتالیس (۴۵) جب کہ پروٹسٹنٹ کے ہاں انتالیس (۳۹) ہے۔

۱ اسفار تواریخی

توریت (تکوین، خروج، احبار، عدد، تثنیہ شرع / استثناء) ، یوشع، قضاۃ، راعوت، سیموئیل، ملوک، اخبار، عزرا، نحمیاہ، طوبیاہ یہودیت، استیر، مکابین

۲ اسفار حکمت

ایوب، مزامیر (زبور)، امثال، جامع، نشید الاناشید، حکمت، یشوع بن سیراخ

۳ اسفار نبوت

- **انبیائے کبریٰ** اشعیا، ارمیا، مرثیے، باروک، حزقیال، دانیال
- **انبیائے صغریٰ** ہوشیع، یوئیل، عاموس، عوبدیاہ، یونس، میکا، نحوم، حبقوق، صفنیاہ، حجائی، ذکریا، ملاکی

ب عہد جدید کلام مقدس کا وہ حصہ جو یسوع مسیح کی آمد کے بعد لکھا گیا، عہد جدید کہلاتا ہے۔ (کلام مقدس، صفحہ د) عہد جدید میں ستائیس (۲۷) کتب شامل ہیں۔ اس کے چار حصے ہیں۔

ا۔ اسفار تواریخی

اناجیل انجیل ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی "خوش خبری" کے ہیں۔ اور عہد جدید میں اس سے مراد ان واقعات کا بیان ہے جنہیں یسوع مسیح نے سرانجام دیا۔ بعد ازاں یہ نام ان کتب کو دے دیا گیا جن میں خاص طور پر ان کی زندگی، تعلیم، معجزات و کرشمات درج ہیں۔ یہ کتب تعداد میں چار ہیں اور اپنے مصنفین کے نام سے مشہور ہیں۔

انجیل متی — یہ باختلاف رائے ۸۰ء تا ۹۰ء کے درمیان لکھی گئی۔
انجیل مرقس — یہ باختلاف رائے ۶۵ء تا ۷۰ء لکھی گئی۔

---

[1] (کلام مقدس، صفحہ د)

انجیل لوقا — یہ باختلاف رائے ۸۵ء تا ۹۵ء لکھی گئی۔

انجیل یوحنا — یہ باختلاف رائے ۹۰ء تا ۱۰۰ء لکھی گئی۔

رسولوں کے اعمال — اس میں رسولی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ یہ باختلاف رائے ۶۵ء تا ۷۰ء لکھی گئی۔

۲۔ اسفار ہدایت (رسولوں کے خطوط)

الف۔ خطوط پولوس — رومیوں کے نام، قرنتیوں کے نام، غلاطیوں کے نام، افسیوں کے نام، فلپیوں کے نام، کلسیوں کے نام، تسالونیکیوں کے نام، تیموتاؤس کے نام، طیطس کے نام، فلیمون کے نام، عبرانیوں کے نام

ب۔ خطوط عام — یعقوب کا خط، پطرس کے خطوط، یوحنا کے خطوط، یہوداہ کا خط

۳۔ سفر نبوت — یوحنا عارف کا مکاشفہ

اپوکریفا / اسفار متروکہ یونانی پوشیدہ یا مستور۔ عہد نامہ قدیم (عبرانی بائبل) کی مسلمہ فہرست میں شامل نہ کی گئی کتب، نیز کلیسیا کے ہاں موجودہ اناجیل کے علاوہ متداول رہنے والی بعض کتب، جو عہد جدید کے انتخاب کے بعد آہستہ آہستہ متروک ہو گئیں، یعنی قرطاجنہ کونسل ۳۹۷ء میں مستند قرار دی جانے والی کتب کے علاوہ ہیں۔

مسیحی فرقے

آرتھوڈکس گیارھویں صدی عیسوی میں مشرقی اور مغربی کلیسائیں علیحدہ ہو گئیں۔ مغربی کلیسیا نے اپنا نام رومن کیتھولک رکھا، اور مشرقی کلیسیا نے اپنا آرتھوڈکس رکھا۔ مغربی کلیسیا کا سربراہ پاپائے اعظم، جب کہ مشرقی کلیسیا کا صدر پیٹریارک کے نام سے مشہور تھا۔

اوگیسٹین کیتھولک گھرانہ، راہب اوگیسٹن (م ۳۸۶ء) کے پیروکاروں کی مشنری جماعت

پروٹسٹنٹ لفظی معنی احتجاج کرنے والا جرمن نژاد مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۶ء) کے پیروکار گروہ، جو ۱۵۱۷ء میں پاپائیت کے خلاف احتجاجاً رومن کیتھولک کلیسیا سے علیحدہ ہو گئے۔ پروٹسٹنٹ کلیسیا تاج برطانیہ کا ماتحت ہوتا ہے اور اس کا سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ہوتا ہے۔

پریسبٹیرین پروٹسٹنٹ سے تعلق رکھنے والا مسیحی فرقہ جس کی بنیاد جان ناکس John Knox نے سکاٹ لینڈ میں بنیاد ڈالی۔ برصغیر میں تعلیمی اور طبی میدان میں اس گروہ نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

ڈومنیکن کیتھولک گھرانہ، اسپین سے تعلق رکھنے والے راہب ڈومنیک (۱۱۷۰ء۔ ۱۲۲۱ء) کے پیروکاروں کی جماعت

رومن کیتھولک لفظی معنی عالمگیر۔ مسیحی دنیا کا قدیم اور بڑا فرقہ، ویٹیکن (روم۔ اٹلی) سے تعلق رکھنے والی اس کلیسیا کے سربراہ پاپائے روم کہلاتے ہیں۔

نسطوری یہ پانچویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ کے بطریق نسطوریس (م ۳۸۱ء) کی طرف منسوب مسیحی فرقہ، جسے کلیسیا نے بدعتی قرار دے دیا۔ ان کا حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی ذات کے تعین پر اختلاف تھا۔

یسوعی / جیوسٹ ایک کیتھولک فرقہ جسے ۱۵۳۴ء میں Loyalali Inrgo Lopez (۱۴۹۱ء-۱۵۵۶ء) نے چھ دوستوں کے ساتھ مل کر بنایا۔ ۱۵۴۰ء میں پاپائے روم نے اسے تسلیم کر لیا۔ یہ کیتھولک ازم کے اندر سب سے زیادہ متشدد و متعصب گروپ تھا اس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ تفرقہ انداز گریک کلیسیا کو اور بدعتی قومی کلیسیاؤں (جو رومن کلیسیا پر اعتقاد نہ رکھے) کو روم کے پوپ کے ماتحت لایا جائے۔ ہندوستانی علاقہ گوا میں انہوں نے مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بہت اہم خدمات سر انجام دیں۔

بائبل میں مستعمل اصطلاحات

رسول / حواری / شاگرد حضرت عیسیٰ کے شاگرد جن کی تعداد بارہ ہے، رسول کہلاتے ہیں۔ مقدس پولوس براہ راست شاگرد نہ ہونے کے باوجود رسول کہلاتا ہے۔

صدوقی یہودی کاہنوں کا فرقہ جو مردوں کی قیامت اور فرشتوں کے علاوہ بہت سی دیگر روایات کا انکار کرتا تھا۔

فریسی لفظی معنی، علیحدہ کیا گیا، حضرت عیسیٰ کے دور کا یہودی گروہ جو شریعت اور روایتوں اور طہارت کے ضابطوں کے نہایت پابند تھا۔ اس سب سے بااثر فرقہ کے لوگ دوسروں سے پاکیزگی کے لحاظ سے الگ ہوتے تھے۔

ایسینی ایک یہودی فرقہ جو خود کو دوسروں سے زیادہ پاکباز تصور کرتا تھا اور مسیح کے انتظار میں صحرا نشین تھا۔ موجودہ دور میں اس کے آثار وادی قمران سے ۱۹۴۷ء میں دریافت ہوئے ہیں۔ (نوٹ: بائبل میں مذکورہ بالا فرقوں کے علاوہ یہ گروہ بھی فلسطین میں موجود تھا)

کاہن / قسیس عہد عتیق میں لاوی قبیلے کا وہ شخص جو قوم کی طرف سے خدا کے حضور رہ کر قربانیاں گزرانتا تھا۔ عہد جدید میں خدا کا وہ برگزیدہ شخص جو خاص رسم سے مخصوص اور مقرر ہو کر مذہبی خدمات میں مشغول رہتا اور عہد جدید کی قربانی گزرانتا ہے۔ ایک علاقہ / پیرش کا انچارج، جس کی نامزدگی اسقف کی طرف سے کی جاتی ہے۔

کاہن اعظم وہ کاہن جو خدمت اور عبادت کے تمام معاملات پر سردار اعلیٰ کے طور پر مقرر ہو۔ بنی اسرائیل کے رومن دور غلامی کے بعد ان کا تقرر ایک سال کی مدت تک ہوتا۔ اس وقت سے یہ عہدہ دینی کے ساتھ ساتھ سیاسی اہمیت رکھنے لگا تھا۔

لاوی عہد عتیق میں کاہنوں کا طبقہ یا جماعت۔ اسباط بنی اسرائیل میں سے ایک، لاوی حضرت یعقوب کے بیٹے، عہد عتیق میں اسے کہانت کے لیے چنا گیا۔ اور بنی اسرائیل کی میراث میں سے اسے حصہ نہیں دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

ناصری انصاری یروشلیم سے ۷۰ میل دور زبلون کے علاقہ میں حضرت عیسیٰ کا مسکن شہر، جس کی طرف نسبت سے مسیح کو یسوع ناصری کہا جاتا ہے۔[1] اور آپ کے پیروکاروں کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔ انجیل متی میں ناصرہ اور نصاریٰ کا پس منظر یہی بیان ہوا ہے، " اور ناصرہ نام کے ایک شہر میں جا بسا تا کہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو"[2]۔

ہیکل یہودیوں کی عبادت گاہ

عام اصطلاحات

اسقف / بشپ رسولوں کے جانشین یونانی لفظ جس سے ان کاہنوں کا خاص درجہ مراد ہے جو کلیسیا کی نگرانی اور راہنمائی کے لیے خاص رسم کے ذریعے مخصوص اور مقرر ہوتے ہیں۔ جمع اساقف

اقنوم جمع اقانیم تثلیث کے بیان میں ایک اصطلاح، جسے تثلیث کی شخصیت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے[3]۔

پوپ معنی باپ یا بابا، مقدس پطرس کا جانشین، یسوع مسیح کا زمین پر قائم مقام

ڈیکن / شماس مسیحی کہانت کا زیریں درجہ اور خدمت۔ کاہن کا معاون، جمع شمامسہ

ڈیکن نیس / شماسہ خدمت گذار مخصوص عورت، عموماً وہ عمر رسیدہ بیوہ جو خیرات کے کاموں میں کلیسیا کی مدد کرتی تھی۔

سینہیڈرین / عدالت عالیہ یہودی کاہنوں، فقیہوں اور بزرگوں کی وہ مجلس جس میں دینی اور دنیاوی باتوں کا فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کو سولی چڑھانے کا فیصلہ بھی اسی عدالت نے دیا تھا۔

کارڈینل کلیسیا کی حکومت میں پوپ صاحب کے معاون، پوپ کی وفات کے بعد نئے پوپ کے انتخاب کا حق بھی انہیں حاصل ہوتا ہے۔ یہ کلیسیا میں کسی خاص شعبہ کے باختیار انچارج ہوتے ہیں۔

کلیسیا مسیحی مؤمنین کی جماعت

کلیسا عبادت گاہ، گرجا گھر

کیتھڈرل اسقف / بشپ کی رہائش سے منسلک گرجا گھر

مشنری انجیلی بشارت کے لیے غیر ملک و غیر اقوام میں جانے والا مناد مشنری کہلاتا ہے۔

---

1 خیر اللہ، قاموس الکتاب، ص ۹۹۶

2 متی ۲ : ۲۳

3 خیر اللہ، قاموس الکتاب، ص ۷۲

مناد / مبشر کاہن کے معاون اور انجیل کی بشارت (دعوت) دینے والے۔

معاون اسقف اسقف کے نام سے کہانت اور استحکام کے ساکرامنٹ دینے والے معاون اسقف کہلاتے ہیں۔

آرچ بشپ چند اسقفی علاقے مل کر ایک کلیسیائی صوبہ بنتے ہیں۔اس کلیسیائی صوبہ کا صدر بشپ، آرچ بشپ کہلاتا ہے۔

نقایہ کی کونسل شہنشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں نقایہ (قدیم ایشیائے کوچک کا شہر جو موجودہ ایران کے شہر اسنک کے مقام پر تھا) میں کلیسیا کی مجلس منعقد کروائی۔ جو مسیحی عقائد کی تشریح و توضیح کے حوالہ سے بہت اہم گردانی جاتی ہے۔اس میں مسیحی ایمان کا بیان مرتب ہوا جو عقیدہ نقایہ سے موسوم ہے۔۔اسی مجلس میں ایریس کو بدعتی قرار دیا گیا۔

مقدس ہستیاں

پولوس / ساؤل (۵ ق م۔۶۷ء) موجودہ مسیحی الہیات کی بنیاد رکھنے والے پولوس رسول ہیں، جو ایشیائے کوچک کے جنوب مشرقی علاقہ، کلکیہ کے شہر ترسس میں پیدا ہوئے۔ مسیحؑ کی عین حیات نہ تو ان سے ملاقات کی اور نہ ہی ایمان لائے بلکہ شدید دشمنی کا رویہ اپنائے رکھا۔ انجیل کے مطابق ان کے چھ سال بعد مکاشفہ کے نتیجہ میں مسیحیت قبول کی انہیں رسول کا درجہ دیا گیا[1]۔

پولی کارپ (۷۰ء۔۱۵۶ء) دوسری صدی میں سمرنا کا بشپ جسے مسیحؑ کے رسولوں کا شاگرد کہا جاتا ہے۔

جیروم (۳۴۷ء۔۴۲۰ء) بائبل کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے معروف ہیں۔ انہیں ڈاکٹر آف چرچ بھی کہا جاتا ہے۔

---

[1] اعمال: باب ۹

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے یہودی، مسیحی اور مسلم نقطہ نظر

اس وقت دنیا کے تمام مذاہب کے پیروکاروں میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معتقدین (عیسائی و مسلمان) کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کی مذہبی تاریخ میں غلو اور تعلّی کے اعتبار سے سب سے زیادہ متنازع فیہ شخصیت بھی آپ کی ہی ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ جلیل القدر شخصیت سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) پر الگ الگ طریقے سے اثر انداز ہوئی ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بنیادی اختلاف کے حامل یہودی، مسیحی اور مسلم نقطہ ہائے نظر کچھ اس طرح سے ہیں۔

ا یہودی نقطہ نظر

کتب سماوی کی روشنی میں ایک مسیح کی آمد کے منتظر[1] یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے بعد، طرح طرح کے سوالات کرنے اور ان کی جانب سے تمثیلی اسلوب[2] میں جوابات کے باوجود، انہیں نہ صرف پہچاننے سے قاصر رہے بلکہ ان کے جانی دشمن بن گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپؑ کے متعلق جب ان کی خود ساختہ توقعات نقش بر آب ثابت ہوئیں تو انہوں نے مسیح علیہ السلام کو ایک کاذب نبی قرار دے دیا[3]۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ کاوشوں میں مسلسل سرگرم عمل تھے اور یہود، خصوصاً علماء، کی روش پر کڑی تنقید کر رہے تھے۔ اس لئے یہ رویہ ارباب و زعماء ہیکل کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے اپنی اس پریشانی کا حل تورات میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور آپ علیہ السلام کو جھوٹے نبی کے پیمانے پر ناپنے کا پورا پورا بندوبست کیا۔ شریعت موسوی میں جھوٹے نبی کو عدالت میں پیش کر کے مجرم ٹھہرا کر سزا دینے کا حکم دیا گیا تھا[4]۔ ان کے نزدیک سب سے بری موت صلیب پر متصور ہوتی تھی جسے ملعونی موت خیال کیا جاتا تھا[5]۔ چنانچہ یہود نے پیشگی منصوبہ بندی کے تحت مختلف الزامات عائد کرتے ہوئے عدالت میں پیش کر کے آپؑ کی موت کا حکم جاری کروا لیا۔ اس موت کے پروانے (DeathWarrant) کی تفاصیل اناجیل میں موجود نہیں ہیں۔ ۱۸۱۰ء میں قدیم رومی سلطنت کے علاقے اقیلا (Aquila، جو موجودہ دور میں نیپلز۔ اٹلی کا حصہ ہے) میں کھدائی کرتے ہوئے فرانسیسی ماہرین کو سنگ مرمر کا ایک بڑا برتن ملا۔ اس میں تانبے کی ایک لوح محفوظ تھی جس پر قدیم عبرانی زبان میں کچھ کلمات کندہ تھے۔ ماہرین نے اسے حضرت عیسیٰ کی موت کا پروانہ گردانا ہے۔ اس پروانے کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"پنطس پیلاطوس، حاکم گلیل زیریں، حکم جاری کرتا ہے کہ ناصرت کے یسوع کو صلیب پر اپنی موت تک لٹکے رہنا ہو گا"

شہنشاہ معظم قیصر طبریاس کے سترھویں سن جلوس میں، مارچ کے ستائیسویں دن، یروشلیم کے مقدس شہر میں۔ حنان اور قیافا، جو کہ کاہن ہیں اور خداوند کے حضور لوگوں کی قربانیاں گزراننے والے ہیں۔ اور پنطس پیلاطوس، حاکم گلیل زیریں، جس نے جبعتا میں

---

1 متی ۳: ۱۱ ؛ ۲۶:۶۳

2 متی ۱۳: ۵۵

3 متی ۲۶:۶۳، ۶۸

4 "تو جھوٹے نبی۔۔۔سے درگذر نہ کرنا۔۔۔اسے فوراً عدالت میں پیش کرنا"۔ (استثناء ۱۳: ۱۔۱۰)

5 "جو دار پر لٹکایا گیا وہ خدا کی طرف سے ملعون ہے"۔ (استثناء ۲۱: ۲۲)

مسند عدالت کی صدر نشینی کی ہے۔ ناصرت کے یسوع کو دو چوروں کے درمیان صلیب پر لٹکا کر موت کی سزا کا حکم دیتے ہیں۔

عوام الناس کی ٹھوس اور رسوا کن شہادتوں کے مطابق

۱ وہ لوگوں کو بہکانے اور ورغلانے والا ہے۔

۲ اس کی روش باغیانہ ہے۔

۳ وہ شریعت (اور قانون) کا دشمن ہے

۴ اس نے غلط نبوت کرتے ہوئے خود کو خدا کا بیٹا کہا ہے۔

۵ وہ غلط طور پر خود کو اسرائیل کا بادشاہ قرار دیتا ہے۔

۶ وہ ہیکل میں ایک مجمعے کے ہمراہ داخل ہوا جس کے ہاتھوں میں کھجور کی ڈالیاں تھیں۔

صوبہ دار قیلس قرنیلس (Quilius Cornelius) کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ مجرم کو مقام سزا تک لے جائے ہر خاص و عام، امیر ہو یا غریب، سب کو یسوع کی موت کی مخالفت سے منع کیا جاتا ہے۔

گواہ، جنہوں نے یسوع کی سزا پر دستخط کیے، یہ ہیں۔

۱ دانیال روبانی، ایک فریسی Daniel Robani , a Pharisee ۲ یوآنس روبانی Joannus Robani

۳ رافائیل روبانی Raphael Robani ۴ کاپٹ۔ ایک شہری Capet , A Citizen

یسوع کو سزا کے لیے یروشلیم کے دروازہ سترنس (Struenus) سے باہر لے جایا جائے۔

نوٹ: اس لوح کی دوسری جانب یہ بات تحریر ہے: اسی ہی ایک ایک لوح ہر قبیلے کو ارسال کی جائے[1]

یوں یہودی نقطہ نظر کے مطابق آپ کو بنی اسرائیل کے شرعی قوانین کی پامالی کی پاداش میں عدالت میں پیش کرنے کے بعد بغیر کسی رعایت کے صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہود بنی اسرائیل کے آخری نبی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو کنواری مریم کا بیٹا نہیں بلکہ انہیں بڑھئی (یوسف) کا بیٹا کہتے تھے[2]۔

۲ مسیحی نقطہ نظر

باختلاف رائے، معروف مسیحی عقیدہ کے مطابق آپ فلسطین میں گلیل کے شہر ناصریہ کی کنواری مریم مقدسہ کے بطن سے معجزانہ طور پر پیدا ہوئے۔ اپنے پیروکاروں کے ہاں ابن اللہ ٹھہرائے جانے والے پیغمبر مسیحیت کو تبلیغ اور معاشرتی اصلاح کرنے کے جرم میں یہودی مذہبی عدالت نے توریت کے حکم کے مطابق موت کی سزا تجویز کی[3]۔ جس کے نتیجہ میں آپ رومی حاکم پنطس پلاطوس کے سپاہیوں کے ہاتھوں یروشلیم کے علاقہ گلگتا میں بروز جمعہ سر پر سرکنڈوں اور کانٹوں کا تاج پہنے، طرح طرح کی

---

1 The Crucifixion By An Eye Witness , (Indo American Book Company , Chicago1911) , p.10

2 متی ۱۳ : ۵۵

3 استثناء ۲۱ : ۲۲

اذیتیں اور طعنے سہتے، ایلی ایلی بقتی [1] (او میرے خدا او میرے خدا: تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا) پکارتے ہوئے مصلوب ہو گئے۔ یوں لوگوں کے گناہوں کی سزائیں (معاذاللہ) لعنتی موت قبول کی اور ازلی گناہ کا کفارہ ادا کیا۔

تدفین کے تیسرے دن آپ کی قبر کھلی ہوئی اور خالی نظر آئی۔ بعد ازاں مختلف جگہوں پر حواریوں اور پیروکاروں کے سامنے آپ کا ظہور ہوا (جن کی تعداد مختلف فیہ ہے)۔ انجیلی روایت کے مطابق آپ چالیس روز کے بعد اپنے شاگردوں کو برکت دیتے ہوئے آسمانوں پر اٹھا لیے گئے اور خدائے قادر مطلق کی دائیں جانب عرش پر تشریف فرما ہیں [2]۔

۳ اسلامی نقطہ نظر

جمہور اسلامی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معجزانہ طور پر بغیر باپ [3] کے ہوئی۔ اور آپ تیس برس کی عمر میں یہودی اور عیسائی نظریہ کے برعکس، زندہ آسمانوں پر اٹھا لیے گئے۔ (یہودی عقیدہ قتل اور مسیحی عقیدہ تصلیب کے برعکس) " وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ "(النساء۴: ۱۵۷) نہ تو آپ کو قتل کیا گیا اور نہ ہی آپ مصلوب ہوئے۔ بلکہ (احمدی نقطہ نظر [4] کے بھی برعکس) "بَل رَّفَعَهُ ٱللَّهُ إِلَيۡهِ "(النساء۴:۱۵۸) کے مطابق آپ کو جسمانی طور پر زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا اور "وَإِنَّهُۥ لَعِلۡمٌ لِّلسَّاعَةِ " (الزخرف۴۳ : ۶۱) کے مطابق قیامت سے قبل آپ کی آمد ثانی ہوگی [5]۔

بعض یورپین ملاحدہ اور فلاسفرز کے مطابق یسوع نامی ہستی کا کوئی وجود ہی نہیں تھا یہ صرف ایک فرضی اور اصنامی کردار تھا۔ [6]

---

1 متی ۲۷ : ۴۶

2 لوقا (۲۲:۲۲) ؛ متی (۳۲ : ۲۷ـ۴۶) ؛ مرقس (۱۵ : ۱۶ـ۴۶) ؛ لوقا (۲۶ : ۴۳ـ۳۸) ؛ یوحنا (۱۹ : ۱ـ۲۴) ؛
متی (۴۶ : ۲۷) ؛ مرقس (۱۵ : ۳۴) ، مرقس (۱:۱۶ـ۲) ؛ لوقا (۲۳: ۴۳ـ۵۱، ۱:۲۴ـ۲) ؛ اعمال (۱ـ۴) ؛
ایک نظم میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے " تڑکے وہ باندھے گئے، علی الصباح ان کو گالیاں دی گئیں صبح ۹ بجے ان پر موت کا فتویٰ ہوا۔ ۱۲ بجے ان کو کیلوں سے صلیب پر جکڑا، ۳ بجے ان کی مبارک پسلی چھیدی گئی۔ شام کے وقت ان کو صلیب سے اتارا اور رات کو وہ قبر میں مدفون ہوئے۔ [جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن (مرکنٹائل پریس، لاہور ۱۹۳۵ء)، ص ۲۱]

3 آل عمران ۳: ۴۵ـ۴۷؛ ۱۶ مریم: ۱۹ـ۲۲ بعض لوگ اس بات کے انکاری ہیں کہ آپ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی جیسے سرسید احمد خاں (تفسیر القرآن الکریم، (دوست ایسوسی ایٹس، لاہور ۱۹۹۸ء) ج ۲، ص ۲۴) ؛ غلام احمد پرویز، (شعلہ مستور، (طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۴ء، طبع پنجم) ، ص ۱۰۵ـ۱۳۳)

4 مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۵ء ـ ۱۹۰۸ء) بانی جماعت احمدیہ کے مطابق آپ کشمیر تشریف لائے اور یہیں فوت ہوئے۔

5 ملاحظہ ہو البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، (دار السلام للنشر والتوزیع، الریاض ۱۹۹۹ء) باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام، ص ۵۸۱، رقم الحدیث ۳۴۴۸ ؛ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، (دار السلام، الریاض ۱۹۹۹ء) باب فی فتح قسطنطینیہ و خروج دجال و نزول عیسیٰ ابن مریم، رقم الحدیث ۷۲۷۸، ۱۲۵۴

6 نیاز، فتح پوری، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ (آواز اشاعت گھر، لاہور، س ن)، ص ۴۶، ۴۷ ؛
www.boaringchristianity.org نامی ویب سائٹ پر اس رائے کے مؤید کافی مواد دیا گیا ہے۔

فہرست

عنوانات | صفحہ نمبر

باب اول

برصغیر (پاک وہند) میں تاریخ مسیحیت۔ مختصر جائزہ

باب دوم

برصغیر کا مسیحی قرآنی لٹریچر۔ تعارفی جائزہ

باب سوم

قرآنیات پر مسیحی انتقادی ادب کا منہجی و تجزیاتی جائزہ

باب چہارم
مسلم علماء کی تصنیفی و مناظرانہ کاوشیں

باب پنجم

برصغیر کے تفسیری ادب پر مسلم مسیحی کشمکش کے اثرات

باب اول

برصغیر (پاک و ہند) میں تاریخ مسیحیت

مختصر جائزہ

فصل اول

برصغیر میں ابتدائی مسیحیت کے نقوش
اور آرتھوڈکس کلیسیا

فصل اول

برصغیر میں ابتدائی مسیحیت کے نقوش اور آرتھوڈکس کلیسیا

"لِکُلِّ قَوۡمٍ ھَادٍ" (الرعد ۱۳: ۷) کے قرآنی ارشاد نے ہر علاقہ کے بارے مطالعہ مذہب کی راہ دکھلائی ہے اور اس ضمن میں برصغیر پاک وہند خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خطہ ہندومت، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت کی جنم بھومی ہے اور اجنبی حیثیت سے وارد ہونے والے چار مذاہب یہودیت، زرتشت، مسیحیت اور اسلام کا یہاں کی مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ میں کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے عیسائیت اور اسلام (کے پیروکاروں) نے ایک طرف تو سیاسی رسوخ حاصل کرتے ہوئے مسند حکمرانی تک رسائی حاصل کی اور دوسری طرف معاشرتی و سماجی حوالے سے (بلحاظ تعلیمات) یہاں تمام شعبہ حیات میں نمایاں تاریخی و مذہبی تبدیلیوں (جیسے ہندومت میں اصلاحی تحریکات) کا سبب بنے[1]۔

"اکال الامم" سے موسوم ہندومت کی سرزمین برصغیر پاک وہند میں مسیحیت کی تاریخ کافی قدیم ہے، تاہم اس کی یہاں پر ابتداء کا تعین مشکل امر ہے[2]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی بھی باوثوق اور مستند تاریخی مصادر و ماخذ دستیاب نہیں جن سے ہندوستان میں عیسائیت کی ابتدائی آمد کا قطعی تعین ہو سکے[3]۔ ابتدائی مسیحی مورخین اور ہندوستان کے مقامی تاریخ نگار اس کے تحریری شواہد پیش نہیں کر سکے۔ تاہم مختلف فیہ آراء، جنہیں محض دعویٰ ہی گردانا جا سکتا ہے، میں ذیل کی مقدس ہستیوں کی آمد کو برصغیر میں مسیحیت کے ابتدائی نقوش گردانا گیا ہے۔

الف۔ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

ب۔ سیدہ مریم علیہا السلام

ج۔ برتلمائی حواری سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

د۔ توما حواری سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

---

1 سہ ماہی "تحقیقات اسلامی" علی گڑھ، (اکتوبر۔دسمبر، ۲۰۰۷)، ج ۲۶ ش ۴، (ظفر، عبدالرؤف، پروفیسر ڈاکٹر؛ ساجد اسد اللہ، حدیث نبوی پر برصغیر کا مسیحی لٹریچر) ص ۵۵-۵۶

2 " گو ہندوستان میں مسیحی تاریخ کی ابتداء کا سراغ لگانا کچھ آسان نہیں تاہم یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں مسیحی تاریخ بہت پرانی ہے"۔ ولیم بارکلے، یسوع کے حواری، (مترجم: فادر رفیق مائیکل)، (کیٹیکیٹیکل سنٹر، ۱۰۴، موہن ٹیرس، بار اسٹریٹ، صدر کراچی ۱۹۸۴ء)، ص ۶۳

3 Encyclopedia Britannica,(London 1970) , Vol.22, p.228

الف (ا) سیدنا عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی ہندوستان آمد کا دعویٰ

ایک رائے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ بچ نکلے تھے[1]۔ ان روایات کے مطابق آپؑ واقعہ تصلیب کے بعد یروشلیم سے ہجرت کر گئے اور ترکی، مشرقی یورپ، ممکنہ حد تک انگلینڈ، ایران، افغانستان اور نیپال کا سولہ برس پر محیط سفر طے کرتے ہوئے ہندوستان آن وارد ہوئے[2] اور یوزآسف[3] کے نام سے کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ یہیں شادی[4] کرنے کے بعد ۱۲۰[5] سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپؑ کی قبر سرینگر کے علاقہ روضہ بل[6] میں ہے[7]۔ یہاں لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچانے کے حوالے سے آپؑ سے بعض تعلیمات منسوب کی جاتی ہیں جو کہ متداول انجیل کے سوا ہیں۔ ایک روسی سیاح اور مسیحی عالم نکولس نوٹووچ (Nicola Notovich) ۱۸۸۷ء میں سفر کشمیر کے بعد اپنی تصنیف The Unknown Life of Christ میں پہلی بار آپؑ کی ہندوستانی انجیل کی تعلیمات کو منظر عام پر لایا[8]۔ اسی نے پہلی بار یہ دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سفر ہند کے آثار

---

1 ان مذکورہ روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جمعہ کے دن صلیب پر لٹکایا گیا۔ اگلے دن ہفتہ تھا اور یہودی عقائد کے مطابق سبت (ہفتہ) کو پھانسی نہیں دی جا سکتی، چنانچہ آپ کو رات سے قبل اتار لیا گیا۔ اس وقت آپ حقیقت میں زندہ تھے۔ آپ کے شاگردوں نے آپ کے زخموں پر ایک مرہم، جو آج بھی "مرہم عیسیٰ" کے نام سے مشہور اور متداول ہے، لگائی تو آپ بالکل ٹھیک ہو گئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۵ء۔۱۹۰۸ء) نے اس کے اجزاء و ترکیب تک درج کرتے ہوئے اس مجوزہ مرہم کو الہامی قرار دیا [قادیانی، غلام احمد، مرزا، مسیح ہندوستان میں، (مطبع انوار احمدیہ مشن پریس، قادیان ۱۹۰۸ء) ص ۵۷]

2 Holger Kersten , Jesus Lived in India (Element Book Ltd. Shaftsbury,England1983) p.150

3 محی الدین، ابو محمد، تاریخ کشمیر، مطبوعہ امرتسر ۱۹۰۳ء میں یوزآسف کے بارے بحث کرتے ہوئے اس کی سات ممکنہ حیثیتیں بیان کی گئی ہیں۔ ۱۔ یوزآسف ایک پیغمبر تھے۔ ۲۔ ایک شہزادے تھے۔ ۳۔ اخلاف موسیٰ میں سے تھے۔ ۴۔ امام باقر کی نسل میں سے تھے۔ ۵۔ مصر سے آمدہ ایک سفیر کا نام تھا۔ ۶۔ حضرت عیسیٰ کے خلیفہ تھے۔ ۷۔ بعینہ حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے۔
[بحوالہ: مسیح کی ہندی انجیل، از پیام شاہجہان پوری، (ادارہ تاریخ و تحقیق، لاہور ۱۹۹۴ء)، ص ۲۵]

4 قادیانی، مسیح ہندوستان میں، ص ۱۴

5 ایضاً

6 کشمیری زبان میں روضہ بل کا مطلب ہے "پیغمبر کا روضہ"

7 کشمیر میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی نہیں بلکہ مختلف دعووں میں بانڈی پورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، اربان میں حضرت ہارون اور تخت سلیمان کے علاقہ میں حضرت سلیمان علیہم السلام کی مزعومہ قبور کا بھی دعویٰ کیا جاتا ہے۔

8 Holger Kersten , Jesus Lived in India, p.14

بدھ لاماؤں کی کتب میں موجود ہیں۔ آپؑ کی ان تعلیمات کو ہندی انجیل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس ہندی انجیل کو پیام شاہجہان پوری نے اپنی تحقیق کے ساتھ "مسیح کی ہندی انجیل" کے نام سے اردو میں شائع کیا ہے[1]۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مزعومہ کشمیر آمد کے اس نظریہ کو ہندوستان میں سب سے زیادہ شد و مد کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۵ء۔ ۱۹۰۸ء) نے پیش کیا۔ اوراس موضوع پر۱۸۹۹ء میں ایک مستقل تصنیف "مسیح ہندوستان میں" لکھی،جوکہ قادیان سے ۱۹۰۸ء میں چھپی[2]۔اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کشمیر آمد کے حوالے سے قلم اٹھایا[3]۔ تاہم اس مفروضہ کو تحقیقی کسوٹی پر پرکھنے سے اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

(۲) سیدنا عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی جاپان آمد کا دعویٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان مختلف فیہ دعوؤں کے ضمن میں ایک دلچسپ روایت یہ بھی ہے کہ آپؑ ہندوستان ٹھہرنے کی بجائے یہاں سے جاپان تشریف لے گئے تھے۔

Jheaoouba Prophecy[4] نامی کتاب کے مطابق ۱۹۳۵ء میں Kiyomara Takeuchi نامی شخص کو جاپانی علاقہ Ibarah سے ۱۹۰۰سال قدیم ایک دستاویز ملی[5]۔ جس کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جاپانی علاقہ Amori کے گاؤں Herai میں وفات پائی اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ آپ کے بھائی Ouriki کی بھی قبر ہے۔

---

1 Holger Kersten , Jesus Lived in India , p15

2 اس کتاب کے مقدمہ میں مرزا صاحب نے اپنی مجوزہ تحقیق کی تفصیلات سمیت محتویات کو دس ابواب میں شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ (مسیح ہندوستان میں، ص۱۸، مقدمہ) جبکہ مطبوعہ کتاب صرف چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس پر سن تالیف ۱۸۹۹ء درج ہے۔ مرزا صاحب کی وفات سے آٹھ سال قبل کی محررہ یہ تحقیق کسی اشاعت میں بھی اپنے دعویٰ کے مطابق دس ابواب میں شائع نہیں ہوئی۔

3 اس میں سب سے اہم Khawaja, Nazir Ahmad, Jesus in Heaven on Earth, Ahmadiyya Anjuman Ishaat-Islam, Lahore1950 شمار کی جاتی ہے۔

4 Michel Desmaquet , Jheaoouba Prophecy , Tohuma Shorten , Japan

5 جاپانی زبان میں محررہ یہ دستاویز اس وقت کی حکومت نے ممنوع قرار دے کر ٹوکیو میوزیم میں منتقل کر دی تھی، جو کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی بمباری کی نذر ہو گئی۔ تاہم Takeuchi خاندان نے حکومتی تحویل سے قبل اس کی نقل تیار کر لی تھی جو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب قبر کے ساتھ چھوٹے سے میوزیم میں موجود ہے۔

اس دستاویز کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے چودہ سال کی عمر میں اپنے والدین کو چھوڑا اور اپنے ۱۲ سالہ بھائی Ouriki کو لے کر برما، ہند اور چین کی طرف عازم سفر ہوئے۔ پھرتے پھراتے ۵۰ سال کی عمر میں اتفاقاً جاپان آنکلے جہاں مزید ۴۵ سال قیام کیا اور یہاں شادی کے بعد تین بچیوں کے باپ بنے۔ یوں ان کی عمر ۹۵ برس ٹھہرتی ہے۔

اس دعویٰ کی بنیاد یہاں کے باشندوں میں ۱۲۰۰ سال سے رائج گایا جانے والا ایک گیت[1] ہے جس کی زبان آرامی زبان سے مشابہہ ہے اور یہ صرف Herai گاؤں سے ہی خاص ہے۔ مقامی روایت کے مطابق ۱۲۰۰ سال سے یہ گیت اور اس کے ساتھ مخصوص رقص مقامی لوگوں میں رائج ہے[2]۔

ب حضرت مریم علیہا السلام

حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق کوئی مستند روایت نہیں ملتی کہ وہ واقعہ تصلیب کے بعد کہاں تشریف لے گئیں۔ معروف یہی ہے کہ وہ یروشلیم میں فوت ہوئیں اور وہیں دفن کی گئیں۔ ہندوستان میں حضرت عیسی علیہ السلام کی آمد کی متذکرہ روایت میں ایک تائیدی استشہاد کے طور پر حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شامل کیا گیا ہے کہ آپ حضرت عیسی علیہ السلام کے اس مزعومہ سفر ہند میں ساتھ تھیں اور کشمیر جاتے ہوئے راستے میں مری کے مقام پر وفات پا گئیں۔ اس دعویٰ کے مطابق انگریزوں کی طرف سے ۱۸۵۰ء میں بسائے جانے والی اس جگہ کا نام مری آپ کی نسبت سے پڑا ہے۔ یہ مریم سے مَیری اور پھر مری بن گیا۔ یہاں پنڈی پوائنٹ کے مقام پر ایک قبر آپ سے منسوب ہے، جسے مقامی طور پر "مائی مری دا آستانہ" کہا جاتا ہے[3]۔

Uzanne Merie Olsson نامی خاتون نے اپنی کتاب Jesus the King of Kashmir میں اس قبر کو حضرت مریم علیہا السلام کی قبر قرار دیتے ہوئے اس کی تفصیل اور تصاویر بھی شائع کی ہیں[4]۔

یہ بات مد نظر رہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی قبر کا دعویٰ بیت المقدس کی بجائے صرف یہاں مری میں ہی نہیں کیا جاتا بلکہ مختلف دعوؤں میں ترکی، فرانس اور بعض کے نزدیک انگلینڈ تک میں فرضی قبریں حضرت مریم کی

---

1 اس گیت کے الفاظ یہ ہیں "Nany Do Yara Nay Nasareno Nany Do Yara"

دسمبر ۱۹۹۷ء میں Dr. Tom J. Chalko اس گیت کی عبارت لے کر ملبورن (آسٹریلیا) گیا وہاں اس کی ڈی کوڈنگ (Decoding) کی گئی جس کے مطابق اس کے پہلے لفظ کے معنی ہیں "یہ میں ہوں یسوع، یسوا کا بیٹا

2 یہ ساری معلومات www.Jheaoouba.com/tomb.html سے لی گئی ہیں۔

3 اس جگہ اب پی ٹی وی کا ٹاور لگایا گیا ہے اس سے متعلقہ چاردیواری کے اندر ایک قبر کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

4 www.jesus-kashmir-tomb.com

طرف منسوب کی گئی ہیں[1]۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسیحی ذرائع مقدسہ مریم کے آخری ایام اور ان جائے تدفین کے بارے متفق باوثوق خبر دینے سے قاصر ہیں۔

مسلم و مسیحی روایات کے برعکس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی ہندوستان آمد کی یہ روایت ابھی تک صرف ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کی جا سکی۔

ان زبانی یا سینہ بسینہ چلنے والی روایات کا ثابت کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ علم تاریخ کے جدید رجحانات میں سے آج کل "اورل ہسٹری (Oral History) یعنی" معاشرے میں رواج پانے والی زبانی تاریخ "کو قبول کرنے کے بارے بحثیں جاری ہیں[2]۔ مذکورہ بالا شاذ روایات بھی اس تناظر میں بیان کی گئی ہیں۔ ان روایات کو خود مسیحی نقطہ نظر سے بھی کوئی خاص پذیرائی نہیں ملی ہے کیونکہ مسیحی مورخین کی اکثریت نے ان میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور وہ انہیں قبول کرنے میں بھی سنجیدہ دکھائی نہیں دیتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے کلیسائی روایات ایسے بیانات کی نفی کرتی ہیں۔ مسیحی مؤرخین کی طرف سے ہندوستان کی تاریخ مسیحیت کے بارے تحریروں میں ان روایات کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

ج برتلمائی حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہند آمد کی روایت

برصغیر کی تاریخ مسیحیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری برتلمائی کا بھی شاذ ذکر کیا جاتا ہے۔ اس روایت کے مطابق وہ ہندوستان میں مالابار یا بمبئی کے پاس کلیان میں سے کسی جگہ آئے[3]۔ انہوں نے یہاں عیسائیت کی تبلیغ کی اور جاتے ہوئے انجیل متی کا ایک آرامی نسخہ چھوڑ گئے[4]۔

---

1 www.jesus-kashmir-tomb.com

2 اورل ہسٹری یعنی معاشرے میں زبان زدِ عام قصص اور باتوں سے تاریخی حقائق اخذ کرنا۔

3 والٹ، ایس این، مقدس توما، (عباسی لیتھو آرٹ پریس، کراچی ۱۹۷۷ء)، ص ۱۶۷

4 اس روایت کا دارومدار یونانی نژاد مسیحی مبشر پنٹینیس (۱۲۰ء) کی ہندوستان یاترا پر موقوف ہے۔ جس کے مطابق وہ جن لوگوں کے پاس آیا تھا وہ برتلمائی رسول کے پیروکار تھے۔ اس نے ان لوگوں سے مذکورہ نسخہ حاصل کیا اور اپنے ساتھ واپس (اسکندریہ) لے گیا۔[برکت اللہ، پادری، صلیب کے ہراول، (دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۴۹ء)، ص ۱۸]

لیکن اس کے برعکس مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م ۱۸۹۱ء) رقم طراز ہیں، "یوسی بیس کہتا ہے کہ پین ٹی نس جب انڈیا (حبش) مین آیا اوسنے وہاں ایک نسخہ عبری متی کے انجیل کا پایا جو وہان کے لوگون کو برتلما حواری سے پہنچا تھا اور اوسوقت سے ان کے پاس محفوظ تھا اور جیروم پین ٹی نس اس نسخہ کو وہاں سے اسکندریہ مین لایا" (کیرانوی، رحمت اللہ، مولانا، ازالۃ الشکوک، انگپا نایک اسٹریٹ نمبر ۱۵۶ مدراس، ۱۲۸۸ھ، ج ۲، ص ۱۲۹)

معروف مستشرق پادری الفانسو منگانااور دیگر مسیحی مورخین اس روایت کی تردید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق برتلمائی موجودہ ہندوستان نہیں بلکہ یمن کے علاقہ میں آیا تھا۔ کیونکہ اس دور میں جغرافیائی طور پر ہندوستان سے مراد موجودہ ہند نہیں بلکہ بقول پادری برکت اللہ" لفظ ہندوستان کا کوئی خاص مفہوم متعین نہیں تھا۔ افریقہ کے مشرقی ساحل سے جاپان تک کے خطہ زمین کو بعض اوقات "ہندوستان" کہاجاتا تھا[1]۔

اس کے برعکس معروف مسلم تاریخ دان ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) کے مطابق اسے عرب اور حجاز کے علاقہ کی طرف بھیجا گیا تھا۔

"ان برتلمائی بعث الی الارض العرب والحجاز"[2]

(برتلمائی رسول کو عرب اور حجاز کی سرزمین کی طرف بھیجا گیا)

د توما حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہند آمد کی روایت

مذکورہ بالا تمام بیانات کے برعکس مسیحی مؤرخین کی طرف سے ہندوستان میں مسیحیت کے اولین نقوش کے طور پر سب سے زیادہ شدومد کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری توما کا نام لیا جاتا ہے۔ توما نامی اس حواری کا اصل نام یہودا تھا، جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توما بمعنی توام[3] رکھا۔ اس کی طرف پانچ جعلی (اپوکریفا) کتب بھی منسوب ہیں[4]۔ چونکہ اکثر مسیحی تاریخی ماخذوں میں ہندوستانی کلیسیا کی خشت اول توما حواری کی یہاں آمد کی روایت پر رکھی گئی ہے اس لئے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

توما حواری کی ہندوستان آمد کی بنیاد" توما کے اعمال" نامی کتاب میں مذکور اسطورہ پر رکھی گئی ہے۔ خود مسیحی حلقوں میں اس کتاب پر نقد کرتے ہوئے اسے جعلی، بدعتی، تخیلاتی، وضعی، غیر معتبر و غیر ثقہ، افسانوی حیثیت کی حامل اور غلطیوں سے بھرمار گردانا گیا ہے[5]۔

---

1 برکت اللہ، صلیب کے ہراول، ص ۴۲

2 ابن خلدون، تاریخ خلدون، (القاہرہ ۱۳۲۹ھ)، ج ۲، ص ۵۰ ؛ پال، سلطان محمد، پادری، عربستان میں مسیحیت، (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور، بار اول ۱۹۴۵ء)ص ۱۴

3 توام یعنی جڑواں کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی ایک جڑواں بہن تھی جس کا نام لوسیاہ تھا۔ [یوسف مسیح یاد، توما ہند و پاک میں، (پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈز، پشاور)۱۹۹۶ء، ص ۲۰]کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے بھائی یہودا تھے جن کا ذکر انجیل میں ہے۔ (مرقس ۶ : ۳ ؛ متی ۱۲ : ۵۵)

4 انجیل توما، اعمال توما، انجیل طفولیت مسیح، مشاہدات توما، کتاب خانہ بدوشی توما (کیرانوی، ازالۃ الشکوک، ج ۲، ص ۲۳۰)

5 بشپ ولیم جی ینگ اپنی کتاب " رسولوں کے نقش قدم پر " میں رقم طراز ہیں،" یہ ایک بدعتی اور جعلی قصہ ہے جو کہ ایڈیسہ

توما کے اعمال نامی اس کتاب میں مذکور قصہ کے مطابق " حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے حواریوں کو تمام دنیا میں تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی تو ہندوستان میں تبلیغ توما حواری کے حصہ آئی، جس سے انہوں نے پہلو تہی کی کوشش کی اور اپنے خدشات کا اظہار کیا کہ میں ایک نحیف وضعیف جسم کا مالک کمزور شخص اور صرف عبرانی جاننے والا ہوں، میں ہندوستانیوں میں کیسے سچائی کی تبلیغ کروں گا۔ لیکن رات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے سامنے ظاہر ہوئے اور اسے ہند جانے کا حکم دیا۔ اس وقت اتفاقاً یروشلیم میں ہندوستان کے راجہ گونڈوفاس کی طرف سے "حبین" نامی تاجر کسی ماہر معمار کو ہندوستان لے جانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ اس کے سامنے ظاہر ہوئے اور توما کو اپنا غلام ظاہر کرتے ہوئے اسے ڈیڑھ سیر چاندی کے عوض بیچ دیا۔ اس فروخت کی رسید ان الفاظ میں درج کی گئی ہے۔

میں ۱۸۰ء اور ۲۳۰ء کے درمیان تحریر ہوا۔ اس کا مصنف ایک ناستک معلوم ہوتا ہے۔ اور اس غرض سے لکھتا ہے کہ مسیحیوں کو شادی کرنے سے اور ہر قسم کے مال و دولت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس میں بہت سی لغو اور بے بنیاد کہانیاں ہیں جو موجودہ شکل میں قابل اعتبار نہیں" [ولیم جی ینگ، رسولوں کے نقش قدم پر، (مسیحی اشاعت خانہ، لاہور ۱۹۹۸ء بار ششم)، ص ۳۹]
پادری برکت اللہ، نے اس کے بارے تفصیلی بحث کی ہے اور بہت سے لوگوں کی آراء و نقد و تبصرہ نقل کیا ہے۔ ان کے بقول:
" (توما کے اعمال کے) مصنف نے چند تواریخی ناموں اور معتبر روایتوں کو لے کر ایک افسانہ گھڑا ہے۔ جس کے ذریعے وہ ایسے ناستک اور بدعتی خیالات کا پرچار کرنا چاہتا ہے جن کو مقدس پولوس رسول مردود قرار دیتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف کو نہ تاریخ سے دلچسپی ہے اور نہ جغرافیہ سے دل بستگی، بس اس کو ایک ہی دھن ہے کہ وہ ناستک خیالات کی مقدس توما کی زبان سے تبلیغ کروائے۔۔۔ وہ بسا اوقات ایسی فاش غلطیاں کرتا ہے جو مبتدیوں سے بھی نہیں چھپی رہ سکتیں۔۔۔ یہ کتاب ایک ناول ہے جس میں صرف چند نام تواریخی اور دو ایک واقعات قابل اعتبار ہیں اور بس اس لحاظ سے وہ الف لیلۃ کے قصوں کی مانند ہے جس میں خلیفہ ہارون الرشید، جعفر برمکی وغیرہ چند نام اور بغداد موصل وغیرہ چند مقام تاریخی ہیں باقی کتاب محض افسانہ ہے۔ اس کے مصنف نے عجیب خوش اعتقادیاں پیدا کر دی ہیں جس کی وجہ سے مقدس توما کی افسانوی شہرت اس کی تاریخی اہمیت پر غالب آگئی ہے اور تاریخ کا مقدس توما کہانیوں کے توما میں گم ہو گیا ہے" توما کے اعمال" کی کتاب میں اور انجیلی مجموعہ کے "رسولوں کے اعمال" کی کتاب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تاریخی واقعات اور حقیقت کی چٹان پر مبنی ہے۔ (لوقا ۱: ۱۔۳) لیکن " توما کے اعمال" اس مصنف کے باطل خیالات اور اس کی قوت متخیلہ کی مرہون منت ہے۔۔۔ پس لازم ہے کہ ہم اس کو ان معیاروں کی کسوٹی پر پرکھیں جو علم التاریخ نے سچ اور جھوٹ کی پہچان کے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔ بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب " مقدس توما کے اعمال غلط ناستک تعلیم اور خارق عادت فضول قصوں سے بھری پڑی ہے تو گمان اور بھی غالب ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب از سر تا پا ایک افسانہ ہے جس میں صداقت کی جھلک بھی نہیں پائی جاتی۔ پچاس سال ہوئے مغرب کے علماء اور مؤرخین اس نتیجہ پر متفق تھے کہ تاریخی لحاظ سے اس کتاب کی قیمت صفر سے بھی کم ہے" [برکت اللہ، پادری، مقدس توما رسول ہند، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور)، ص ۲۶۔۳۶

باعث تحریر آنکہ

میں اپنا ایک خادم مسمی توما جو فلسطین کا باشندہ ہے بھارت کے راجہ گنڈوفاس کے لیے بوساطت مسمی ھبین سوداگر فروخت کرتا ہوں۔

فروخت کنندہ: یسوع پسر یوسف نجار سکنہ ناصرت ملک فلسطین[1]

توما کو خرید کر ھبین اسکندریہ کے بحری راستے سے ہندوستان روانہ ہوا اور غالباً بھادوں (مکرمی جیت تقویمی ماہ) اٹک پہنچ کر وہاں سے چالیس میل جنوب مشرق میں ٹیکسلا راجہ گونڈوفاس کے پاس پہنچ گیا۔ راجہ مذکور نے توما کو ایک عالی شان محل تعمیر کرنے کی ذمہ داری سونپی اور اس کے لیے رقم بھی توما کے حوالے کر دی۔ اس نے وہ رقم غرباء میں تقسیم کر دی راجہ نے اس پر غضب ناک ہو کر اسے قید کر دیا تاکہ اسے آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اتفاقاً اسی رات راجہ کا بھائی فوت ہو گیا اور مرنے کے بعد اس نے ایک عالی شان محل دیکھا جو توما نے اس کے بھائی کے لیے تعمیر کیا تھا (غرباء میں دولت تقسیم کرنے کے بدلے میں یہ محل بنایا گیا تھا) اس میت نے دوبارہ زندہ ہو کر راجہ کو تمام قصہ سنایا تو راجہ اور اس کی تمام رعایا نے عیسائیت قبول کر لی۔ یہ واقعہ ۴۸ء میں پیش آنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں توما کے پاس سفور نامی ایک قاصد کی آمد کا تذکرہ ہے جسے مزدے راجہ نے بھیجا تھا۔ توما اس کے ساتھ ہو لیا اور جا کر راجہ کی بیوی اور اس کی بیٹی سے بدروحوں کو نکالا۔ اس پر مزدے کے شاہی خاندان نے مسیحیت قبول کر لی۔ راجہ اس کی شہرت اور مقبولیت سے خائف ہو گیا اور اس نے سازش کے ذریعے شہر سے دور ایک پہاڑی پر لے جا کر اسے قتل کرنے کا کہا۔ راجہ کے سپاہیوں نے اسے پہاڑی پر لے جا کر بھالوں سے قتل کر دیا۔ اس مقام پر دوسری یا تیسری صدی کے آغاز میں "ویر توما" یعنی توما کی خانقاہ بنا دی گئی[2]۔

دوسری اور تیسری صدی میں مختلف مقامات کی کلیسیاؤں میں شہداء کے مزاروں پر جانا ایک عام بات تھی۔ جن میں کچھ مقدسین کے مزار زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ جیسے انطاکیہ شہر میں بشپ مقدس اگنیشنس (۱۲۰ء) کی شہادت کے بعد اس کی ہڈیاں لا کر دفنا دی گئیں تھیں اور وہاں اس کا "روز ولادت" منایا جاتا اسی طرح سمرنا کی کلیسیا کے بشپ شہید پولی کارپ کی ہڈیاں دفنا کر سمرنا میں اس کا عرس منایا جاتا تھا ایڈیسہ کی کلیسیا کے ارد گرد ان مزاروں کی موجودگی میں اس کے نمائندے مالاپور میں توما کے عرس میں شریک ہوتے۔ ایڈیسہ کی کلیسیا کی یہ بڑی خواہش تھی کہ مقدس توما رسول کی ہڈیاں یہاں لا کر اس کا عرس منایا جائے چنانچہ کلیسیا کے چند شرکاء ۱۴۵ء میں مالاپور پہنچے

---

1 ایس این والڈ، مقدس توما، ص ۵۶ ؛ یاد، یوسف مسیح، توما ہندوپاک میں (پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈ، پشاور ۱۹۹۶ء)، ص ۷۰ اس رسید کی محتویات اور طرز تحریر دوسری صدی کی تحریروں سے میل نہیں کھاتے۔

2 تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:۔ برکت اللہ، مقدس توما رسول ہند ؛ ایس این والڈ، مقدس توما

اور رات کی خاموشی میں مزار کھود کر یہاں سے باقیات اپنے ساتھ ایڈیسہ لے گئے۔ یہ ہڈیاں ۲۲ اگست ۱۴۵ء کو ایڈیسہ پہنچیں اور وہاں دفنا دی گئیں۔ ۱۱۴۲ء میں اسلامی حکومت کی فتح ایڈیسہ کے بعد یہ ہڈیاں چیوش منتقل کر دی گئیں اور وہاں سے ۱۲۹۸ء میں اٹلی کے شہر اورٹونا کے کیتھیڈرل میں دفن کر دیا گیا۔

یہاں لاش اور ہڈیوں کی کہانی سے قطع نظر تاریخ کا ایک اہم پیغام پنہاں ہے کہ جو قوم تنزلی کا شکار ہو کر شکست کا سامنا کرتی ہے تو اس مایوسی کے عالم میں وہ اسلاف کی ہڈیوں کی پرستش و تعظیم میں لگ جاتی ہے یا پھر استخوان فروشی میں۔ یہ روایت خام خیال فرضی قصہ پر مبنی ہے یا اس میں کوئی حقیقت بھی ہے، اس سے قطع نظر اگر واقعتاً تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ حواری توما پہلی صدی میں ہندوستان آئے تھے تو یہ ہندوستان کی خوش بختی ہو گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نازل شدہ پیغام الٰہی اصلی اور غیر محرف شکل میں "عالی سند" کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔ لیکن اس کا انحصار مذکورہ روایت کے صحیح ثابت ہونے پر ہے، نہ کہ عقیدت اور احساس تفاخر کے جوش میں خالی زورِ قلم سے ہی اس قصہ کو حقیقت قرار دیتے ہوئے اسے بنیاد بنا کر اس پر خوش خیالی اور شاندار منظر کشی سے کلیسائے ہند کی عالی شان عمارت تعمیر کرنے پر۔

مذکورہ بالا روایت کا تحلیلی جائزہ لینے سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

- گونڈوفاس بادشاہ انیسویں صدی تک گمنام رہا۔ ۱۸۷۵ء میں پشاور سے ۲۸ کلو میٹر دور تخت بائی کی پہاڑی پر چھ سطروں پر مشتمل ۱۴۱ء کا کتبہ ملا۔ جس میں بادشاہ گونڈوفاس لکھا پایا گیا۔ سوال یہ ہے کہ تاریخ جو کہ ایک عہد کی جزئیات تک محفوظ کر لیتی ہے اس کتبہ سے قبل مذکور بادشاہ، اس کے خاندان اور اس کے عہد میں ٹیکسلا کے تذکرہ سے یکسر بے نیازی دکھلا رہی ہے۔ اور ہم صرف توما کے اعمال نامی ایک فرضی اور تخیلاتی کردار کی حامل داستان سے اس بادشاہ کے کردار کو لے کر اس پر تاریخ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔
- قدیم ٹیکسلا میں مسیحیت کے کوئی تاریخی، ثقافتی آثار نہیں ملتے۔ مذہبی حوالے سے بھی ۱۹۳۵ء تک یہاں کی وادیاں کوئی شواہد پیش نہیں کرتیں تا آنکہ ٹیکسلا کے قریب سرکاپ کے کھنڈرات میں ایک کسان کو ہل چلاتے ہوئے ایک صلیب نظر آئی جسے مارشل نامی انگریز نے لے لیا۔ اس صلیب سے فرض کر لیا گیا کہ یہ پہلی صدی کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس علاقے میں مسیحی کلیسیا پہلی صدی سے رائج ہے۔ یہ صلیب اس وقت ٹیکسلا کے عجائب گھر میں موجود ہے اس صلیب کا جدید سائنسی آلات کی روشنی میں میٹرولوجی تجزیہ کیا جا سکتا ہے جس سے اس کی قدامت کا تعین ہو سکتا ہے کہ کیا واقعی یہ پہلی صدی کی صلیب ہے۔ نیز یہ بات بھی امر مسلمہ ہے کہ صلیب کی علامت قبل مسیح کئی مذاہب کا شعار تھی۔ نجانے یہ کس مذہب کی باقیات سے تعلق رکھتی ہے۔

○ حبین عام بحری راستے سے ہٹ کر ایک معمار کی تلاش میں یروشلیم کیسے پہنچا۔ کیا اس دور میں ہندوستان اور یروشلیم کے درمیان کوئی تجارتی رابطے تھے بھی یا نہیں۔ پھر اس سے بھی اہم بات کہ اتنی دور جا کر حبین ایک ایسے شخص کو کیونکر خرید لیتا ہے جو اپنے آپ کو بڑھئی ظاہر کرتا ہے اور کاشتکاری کے لیے مل، جوئے نیز کشتیاں اور اس کے پتوار بنانے کا ماہر بتاتا ہے حالانکہ مستند مسیحی تاریخی ماخذ اسے ایک بڑھئی کی بجائے مچھیرا اظاہر کرتے ہیں جو جال بنانے اور مچھلیاں پکڑنے کا ماہر ہے۔

○ گونڈوفاس کی مجہول شخصیت کے حوالے سے بھی بعض سوالات سامنے آتے ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ مسیحی مذہب کا علم بردار ہو گیا تھا اور اس نے اپنی مملکت میں مسیحی مذہب عام کر دیا تھا اور جبکہ دوسری رائے کے مطابق وہ مسیحی نہیں بنا لیکن مسیحیت کو رواداری عزت اور ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتا تھا نیز اس کے مسیحی ہونے کی بھی متضاد سنین بتائے جاتے ہیں ایک میں اگر ۴۸ء ہے تو دوسری میں ۲۱ء۔

○ ٹیکسلا سے مسیحی روایت کا رخ جنوبی ہند میں مالا بار اور کورومنڈل کے ساحلی علاقوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ توما کے ذکر پر مشتمل مقامی دیہاتی گیتوں کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ توما رسول نے انہیں مسیحی بنایا۔ توما کے ذکر پر مبنی مالم زبان میں ساڑھے چار سو اشعار پر مشتمل ٹامس رمبان نامی مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پادری برکت اللہ لکھتے ہیں۔

> " جب ہم ٹامس رمبان کے مجموعہ کو پڑھتے ہیں تو اس میں ہم چند ایک باتیں دیکھتے ہیں جن کی وجہ سے تمام مجموعہ تواریخی نکتہ نگاہ سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ مثلاً " توما کے اعمال " کی اندراپولس کی حکایت کو لے کر کہا گیا ہے کہ یہ کرنگانور میں واقع ہوئیں۔ ٹیکسلا میں محل بنانے کی حکایت لے کر کہا گیا کہ یہ باتیں ملاپور میں واقع ہوئیں حالانکہ دونوں مقامات میں قریباً ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جنوبی ہند کے تمام گیت اور مجموعے " توما کے اعمال " کی تمام حکایت کو شمال مغربی ہندوستان سے الف لیلیٰ کے چراغ کی مدد سے جنوبی ہندوستان لا منتقل کر دیتے ہیں "[1]۔

○ جنوبی ہند میں توما کی آمد کے تعین میں خاصا اختلاف ہے۔ اس کی آمد دسمبر ۵۰ء، ۵۲ء، ۶۵ء، ۶۷ء یا ۷۲ء بتائی جاتی ہے۔

○ اس روایت میں جنوبی ہند میں لوگوں کے معروف مستعمل ناموں میں سے ایک بھی نام نہیں ملتا۔ ملکہ کا نام لاطینی (طرشی پطیہ)، ملکہ کی خادمہ (سن ٹیکس)، بادشاہ کے رشتہ دار (کارٹیس، سفورس، مگدونیہ) یونانی اور باقی تمام ایرانی اور سامی ہیں۔ ممکن ہے مصنف کا خیال ہو کہ چونکہ شاہ گونڈافاس کی ریاست میں ایرانی، سامی یونانی لوگ بستے تھے لہٰذا تمام ہندوستان میں انہیں ناموں کے لوگ رہتے ہوں گے لیکن یہ اسماء ضعف روایت پر دلالت کرتے

---

1 برکت اللہ، توما رسول ہند، ص ۸۱۔ ۸۲

ہیں۔ نیز تادم تحریر تاریخ اور آثار قدیمہ ہر دو میں بادشاہ "مزدئے" مجہول الاسم ہے[1]۔

o یہ روایت ایک اور پہلو سے بھی مشکوک ہے کہ بادشاہ مزدئے اپنے بیٹے کی شفاء کی خاطر مبارک ہڈیاں لینے گیا تو انہیں قبر میں نہ پایا۔ یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ آیا عہدِ مذکور میں ہندوستان میں قبور سے ہڈیاں لینے کا رواج بھی تھا کیونکہ ہندو مذہب میں تو مردوں کو جلانے کا رواج تھا۔ ایک ہندو راجہ کیسے ہڈیوں کو لینے آن پہنچا جب ان کے ہاں ہڈیوں سے شفا کا تصور ہی نہ تھا۔ اور دوسری طرف کیا مسیحی عموماً مردوں کی ہڈیوں سے برکت یا شفا حاصل کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقام سے سال ہا سال بعد مقدس ہڈیاں ایڈیسہ منتقل کی گئیں تھیں[2]۔

o توما کی شہادت کے متعلق متضاد آراء ہیں۔ ایک رائے کہ وہ راجہ کے سپاہیوں کے ہاتھوں شہید ہوا اور دوسری یہ کہ مالابار کے کالی دیوی کے مندر کے پاس پروہتوں کے اصرار کے باوجود توما نے کالی دیوی کو دیوتا ماننے اور چڑھاوا چڑھانے سے انکار دیا جس کے نتیجہ میں مندر کے پجاریوں نے توما کو مار ڈالا۔ تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ توما جنگل میں مور کا شکار کرتے شکاریوں کے تیر سے مرا[3]۔

o خود مسیحی مؤرخین ہی توما کے شہید ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

"ہیر کلون ایک قدیم مصنف کا قول کلیمنٹ (۲۰۰ء) نے نقل کیا ہے لکھتا ہے کہ تھامس (توما رسول) شہید ہوا ہی نہیں۔ (میڈی کاٹ صفحہ ۱۲۰) یہ ظاہر ہے کہ رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیر کلون کے اس قول پر شبہ و شکوک قائم کرتے ہیں اگر کوئی شخص اس پر اعتبار کرنا چاہے تو اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی"[4]۔

o اس سب سے قطع نظر توما رسول کے برازیل (لاطینی امریکہ) جانے کا دعویٰ بھی پایا جاتا ہے[5]۔

o ولیم جی ینگ کے بقول؛" یوسی بس (Eusebius) مؤرخ نے قریباً ۳۲۵ء میں لکھا کہ توما رسول کو مسیحؑ نے پارتھیہ بھیجا۔ ہو سکتا ہے کہ یوسی بس نے اوریجن سے اقتباس لیا ہو، اور یہ شہادت قریباً ۲۲۵ء کی ہو"[6]۔

o جنوبی ہندوستان کے لوگ اپنے آپ کو توما حواری کا معتقد گردانتے ہیں اور تاریخی طور پر اس کے وارث ہونے کے دعویدار ہیں۔ اگر مالابار میں توما حواری آئے تھے تو وہ زمانہ یقیناً مروجہ اناجیل اور پولوس کے خطوط کی تصنیف سے

---

1 برکت اللہ، توما رسول ہند، ص ۸۷

2 ایضاً

3 Thomas P. Christians and Christianity in India and Pakistan, (London 1954), p. 17

4 سمتھ، ونسٹ اے، قدیم تاریخ ہند (مترجم: محمد جمیل الرحمن)، (دار الطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۲۲ء)، ص ۳۶۸

5 American Ethnologist, (From Tupa to the Land without evil: The Christianization of Tupi Guarani Cormology, (Vol. 14, No.1, p.127-128 1987)

6 ولیم جی ینگ، رسولوں کے نقش قدم پر، ص ۳۸

پہلے کا ہے اور انہوں نے سچی اور کھری تعلیمات پر مبنی مسیحیت کی اشاعت کی ہو گی مگر توما رسول کی قائم کردہ کلیسیا ہند کی تعلیمات کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ یقیناً موجودہ کلیسیائی تعلیمات سے مختلف تھیں جس کی دلیل یہ ہے کہ کیتھولک یسوعیوں نے ہندوستان کے ان قدیم مسیحیوں پر سیاسی غلبہ کے بعد ان کے عقائد کو جبراً بدلنے کی ضرورت اس بناء پر محسوس کی کہ یہ عقائد میں ان سے مختلف فیہ تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی سوتے سے پھوٹنے والے سلسلہ مسیحیت میں سے راہ راست پر کون سی جماعت رہی ہے۔ پطرس کی قائم کردہ رومی کلیسیا[1] یا توما کی یہ ہندی کلیسیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ یا تو

۱ توما کی آمد ہند کی روایت غلط ہے۔

۲ دونوں رسولوں میں سے کسی ایک کی پیش کردہ تعلیمات غلط ہیں۔

۳ اگر دونوں رسولوں کی تعلیمات یکساں تھیں تو پھر رومی کلیسیا نے دیدہ دانستہ ان رسولوں کی تعلیمات کو اپنی ضروریات کے لیے بدل لیا ہے۔ کیونکہ رومی کلیسیا مختلف اوقات میں مختلف کونسلوں کے عقائد کے بارے فیصلوں کے زیر اثر رہی ہے۔ جب کہ یہاں کے توما مسیحیوں کے ہاں ایسی کسی کونسل کے کردہ فیصلوں کی کوئی

---

۱ رومن کیتھولک کلیسا کا دعویٰ ہے کہ اس کی بنیاد حواری پطرس نے یسوع مسیح کے فرمان (متی ۱۶ : ۱۸) کے مطابق ۶۲ء میں اپنی روم آمد پر رکھی۔ لیکن خود مسیحی حلقے اس روایت کو قبول کرنے میں متامل ہیں۔ جیسے جی ٹی مینلی رقم طراز ہے:
"رومی کلیسیا جو یہ دعویٰ کرتی ہے (جس میں کوئی صداقت نہیں۔ مینلی) کہ پطرس روم کا پہلا بشپ تھا۔۔۔ یہ نظریہ روایات پر مبنی ہے لیکن ہم کئی زبردست اور محکم وجوہات کے باعث اس سے انکار کرتے ہیں" (یہاں انکار کی پانچ مدلل وجوہات گنوائی گئی ہیں)۔ تفصیلات کے لیے: جی ٹی مینلی، ہماری کتب مقدسہ، (مسیحی اشاعت خانہ، لاہور ۱۹۹۸ء)، ص ۵۲۳

بقول کیرن آرم سٹرانگ "Peter, one of the Twelve, had made converts in the Roman garrison town of Caesarea; Barnabas, a Greek speaking Jew from Cyprus, had made many gentiles in his Ecclesia (Church) in Antioch, the city where those who believed that Jesus was the Christos, were first given the name of Christians. Somebody – we have no idea who – had founded a Church in Rome. Some of the Jerusalem congregation of Christians, especially Jesus' brother, James, found this disconcerting. (The Bible, the Biography by Karen Armstrong, London 2007, p.59)

" یسوع مسیح کے عہد رسالت سے متصل جو دہائیاں گذریں، جہاں تک ان کا تعلق ہے، تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ واقعات قطعاً اس نہج پر رونما نہیں ہوئے جس نہج پر بتایا جاتا ہے۔ اور یہ کہ پطرس کی روم میں آمد سے کلیسا کی بنیاد نہیں رکھی گئی"۔
[موریس بوکائیے، بائبل، قرآن اور سائنس (مترجم: ثناء الحق صدیقی) (ادارۃ القرآن، کراچی، س ن)، ص ۷۱]

تاریخ نہیں ہے۔ (چونکہ وہ رومی کونسلوں کی زیر اثر عقائد میں تبدیلیوں سے لاعلم تھے۔ اس لیے کیتھولک رومی گروہ کو ان کے عقائد بدلنے کی ضرورت پیش آئی) بعد میں پروٹسٹنٹ بھی عقائد بدلنے کی ان کوششوں میں شامل ہو گئے گو کہ ان کا طریقہ کار یسوعیوں سے مختلف تھا۔

چونکہ ہندوستانی کلیسیا کی بنیاد توما رسول پر رکھی جاتی ہے اس لیے ان کی آمدِ ہند کی روایت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناکافی تاریخی معلومات اور شواہد کی بنا پر توما کو ہندوستانی کلیسیا کا بانی ثابت کرنا مشکل امر ہے۔ چنانچہ اسٹیفن نیل اس "بھاری پتھر" کو یہ کہہ کر رکھ دیا ہے کہ؛

"There is really no evidence in favour of the foundation of Indian Christianity by Thomas expect the persistent strength of the tradition .unless further archaeological evidence confirms the tradition , the critical historian must leave the matter with the simple " **We Do Not Know**" [1]

اس کے بعد ہندوستانی کلیسیا کی تاریخ کچھ یوں بیان کی جاتی ہے۔

ایک روایت کے مطابق تاریخی اعتبار سے سب سے پہلا مشنری جو ہندوستان وارد ہوا وہ یونانی النسل اسکندریہ کے مسیحی الہیات کے مدرسہ کا پرنسپل پینٹی نس (Pantaenus) (م ۲۱۱ء) تھا[2]۔ اگرچہ اس کے متعلق اس کی اپنی یا اس دور کی کوئی تحریری شہادت دستیاب نہیں لیکن قدیم مسیحی مؤرخین[3] اس کی ہندوستان آمد کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ کچھ موجودہ مورخین کے مطابق پینٹی نس جس ہندوستان گیا تھا وہ عرب کا جنوبی ساحل اور ملک یمن تھا[4]۔ نیز اس وقت جس علاقہ پر ہند کا اطلاق ہوتا تھا اس میں اس دور کی دریافت آدھی دنیا شامل تھی جو کہ افریقہ سے جاپان تک تھی[5]۔

اس کے بعد ایک صدی تک کلیسیائے ہند کے متعلق تاریخ کے لب ہلتے نہیں دکھائی دیتے۔

"Of the apostle or earliest Christians in the Indian region , we hear nothing for a century"[6]

---

1 Niell , Stephen, The Story of the Christian Church in India and Pakistan,(Michigan 1970), p.17

2 Pantaennus , Greek stoic and principal of Christian College of Alexandra was the first historical missionary of Christ to the people of India" (George Smith, The Conversion of India, (London 1893), p11

3 ان میں یوسی بس (۲۶۵۔۳۴۰)، جیروم (۳۴۰ء۔۴۲۰ء) شامل ہیں، بحوالہ صلیب کے ہراول از برکت اللہ، ص ۱۸

4 برکت اللہ، صلیب کے ہراول، ص ۲۲

5 "The India which captivated the imagination and exited the desire of classical and medieval times was that half of the world which stretches from the East Coast of Africa to East ward of Japan". (Smith , The Conversion of India , p15)

6 Ibid

بشپ کی شرکت کی روایت من گھڑت ہے یا پھر وہ کردار فرضی ہے۔ اسی لیے بعض اصحاب نے یوحنا ایرانی اسقف ایران کی تواریخی شخصیت سے انکار کیا ہے[1]۔

بہر حال اس کے بعد مسیحی تاریخ کا رُخ روم سے ایران کی طرف مڑ گیا۔ مسیحی روایات کے مطابق ایران میں حوادث زمانہ کے اتار چڑھاؤ سے مسیحی کلیسیا بہت بُری طرح متاثر ہوتا رہا ہے۔ شاہ پور اعظم والی ایران کے عہد میں ۳۴۵ء میں ظلم و تعدی اور اذیت رسانی کی تاب نہ لا کرے قبیلوں اور ۷۰ خاندانوں کے ۴۰۰ مسیحیوں نے ایران سے تاجر توما کی سر کردگی میں جنوبی ہند کی طرف ہجرت کر لی۔ لیکن ان کی ہند آمد کی تاریخ میں اختلاف ہے[2]۔ ان کے بارے کو چین کے ڈچ گورنر ایڈرین موتینن (۱۷۸۱ء) کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔

"چوتھی صدی میں ایک تاجر توما کرنگانور آیا۔ اس کے ساتھ بغداد، موصل اور یروشلیم کے مسیحی اور پریسٹ آئے۔ اس نے اپنی دولت کے ذریعے مقامی حکمرانوں میں بڑا رسوخ حاصل کر لیا اور مسیحیوں کو بہت حقوق ملے جن کی وجہ سے وہ نہ صرف اونچی ذاتوں میں شمار ہونے لگے بلکہ ان کا درجہ نائروں (مقامی عمائد و اشراف) سے بھی بڑا ہو گیا"[3]۔

بعض مغربی مصنفین اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسیحی کلیسیا کی بنیاد ڈالنے والا توما حواری نہیں بلکہ یہی توما تاجر تھا۔ جسے نام کی اتفاقی مشابہت کی بناء پر دانستہ توما حواری بنا دیا گیا۔ بنی اسرائیل کا ایک رویہ یہ بھی تھا کہ کسی غیر معروف شخصیت کو محض شراکتِ اسمی کی بنا پر کسی معروف شخصیت سے بدل دیا جاتا تھا۔ یا کسی کے کام کی نسبت کسی معروف شخص سے کر دی جاتی تھی[4]۔ اس سے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ توما نامی اس شخص کی آمد ہند کو توما حواری کی آمد خیال کر لیا گیا جس سے بعد میں لکھنے والے اکثر مورخین ٹھوکر کھا گئے اور توما تاجر کی بجائے توما حواری کی ہندوستان میں تبلیغ کی غرض سے آمد کا ذکر کرنے لگے۔ جیسے مسعودی نے مروج الذهب میں کیا ہے[5]۔

چوتھی صدی عیسوی میں ہندوستان میں بقول پادری برکت اللہ۔

"ہم کو ایک مقام میں مسیحیت کا دیا مدہم طور پر جلتا نظر آتا ہے اس روشنی میں بشپ تھیوفلس جو "ہندی" کہلاتا ہے ۳۵۴ء میں مسیح کی خدمت کرتا نظر آتا ہے"[6]۔

---

1 برکت اللہ، صلیب کے ہمراہ اول، ص ۳۸

2 Smith , The Cyclopedia of India, p.74

3 برکت اللہ، صلیب کے ہمراہ اول، ص ۶۳

4 "Attributing a contemporary or recently composed book to an ancient prophet or wise man was common practice."
بحوالہ: پروفیسر ساجد میر، عیسائیت۔ تجزیہ و مطالعہ دارالسلام، لاہور س ن)، ص ۲۵۴

5 المسعودی، ابو الحسن علی بن حسین بن علی، مروج الذهب و معادن الجواہر، (مصر ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء)، الجزء الاول، ص ۳۱۱

6 برکت اللہ، صلیب کے ہمراہ اول، ص ۷۰

روایت ہے کہ یہ بشپ ہندی النسل تھا جو یرغمال ہو کر روم گیا، جہاں اس نے عیسائیت قبول کرلی[1]۔ پھر قسطنطینہ کے شاہ کانسٹن شیئس نے اسے ایک تبشیری وفد کے ساتھ عرب کی طرف بھیجا جہاں سے یہ ہندوستان آیا اور ہندوستانی کلیسیا کے کئی امور کی اصلاح کی۔

۳۴۵ء میں ایک شامی عالم ایشوداد اپنی رومیوں کے خط کی تفسیر کے اختتام پر لکھتا ہے کہ مارکومائے نے ایک ہندوستانی پریسٹ کی مدد سے رومیوں کے خط کا یونانی سے سریانی زبان میں ترجمہ کیا[2]۔

یہاں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ تاریخ میں یونانی الاسم اس ہندی کا اصل نام کیا تھا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو تبدیلی اسم نے اصل شخصیت کو گم کر دیا ہے۔ کسی ہندوستانی کا دوران سفر مسیحیت قبول کرنا بعید از قیاس نہیں، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے ہندوستان میں کوئی عالی شان مسیحی کلیسیا قائم ہو گئی تھی۔ تحقیق طلب امر یہ بھی ہے کہ کیا اس دور میں پوپ کا ہندوستان میں کوئی حلقہ اثر موجود بھی تھا؟

اسی طرح چوتھی صدی کے نصف میں میروپئس نامی مسیحی مبلغ کے بھی ہندوستان آنے کی روایت بیان کی جاتی ہے۔ جس کے مطابق وہ کانسٹن ٹائین کے دور میں اپنے دو ساتھیوں فرومنٹس اور اوڈیس کے ساتھ ہندوستان آیا۔ واپسی سے قبل وہ قتل ہو گیا جب کہ اس کے دونوں ساتھی حادثاتی طور پر بادشاہ تک پہنچ گئے۔ جہاں ان کی کافی عزت و تکریم کی گئی۔ بادشاہ کی وفات کے بعد فرومنٹیس واپس اسکندریہ آیا اور اس نے کلیسیائے ہند کے جو حالات بیان کئے ہیں، جو کسی بھی طرح لائق تحسین نہیں تھے۔ اسے ۳۶۵ء میں بشپ بنا کر واپس ہندوستان بھیج دیا گیا[3]۔

ایک دوسری روایت میں فرونیٹس کے ایتھوپیا بشپ بنا کر بھیجنے کی روایت بھی موجود ہے۔ اس لیے یہی واضح نہیں کہ ایتھوپیا کون گیا اور ہندوستان کون سا فرونیٹس آیا۔ یہاں تاریخی ابہام پیدا ہو گیا ہے[4]۔

پانچویں صدی میں ہونے والی "ماں"، "روح القدس" اور "ذات الٰہی" کی کلامی بحثیں اور فکری و نظریاتی اختلافات نے تاریخ مسیحیت پر بہت گہرے اثرات چھوڑے اور بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنے۔ جس کا واضح ثبوت نسطوری فرقے کا آغاز ہے۔ قسطنطینہ کے بشپ نسطوریس نے کلیسا میں رائج حضرت مریم علیہا السلام کے لقب " مادر خدا" پر اعتراض کیا کہ اس واجب الاحترام ہستی کو "خدا کی ماں" کہنا جائز ہے یا نہیں۔ وہ مسیحؑ کی صرف انسانی ذات کی وجہ سے ماں تھیں اس لیے انہیں "مسیح کی ماں" کہنا چاہیے، "خدا کی ماں" کہنا کفر ہے۔

---

1 J.N.Ogilive , The Apostles of India , p.50 بحوالہ: صلیب کے ہراول از برکت اللہ، ص ۷۱

2 برکت اللہ، صلیب کے ہراول ، ص ۷۱

3 Keay , A History of Syrian Church in India , p.17-18

4 Ibid

پادری برکت اللہ کے الفاظ میں؛

"نسطورین نے عین وقت پر اور انجیلی روسے بجاطور پر اپنی صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ چوتھی صدی عیسوی میں مشرکانہ مذاہب کے زیر اثر کلیسیا نے مریم بی بی کو "مادر خدا" کہنا شروع کر دیا تھا دور حاضر کے روشن ضمیر انسان اس معاملہ میں بشپ نسطورین کا ساتھ دیں گے"[1]۔

بشپ نسطورین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے حوالے سے یہ فکر پیش کی تھی کہ ان کی انسانیت اور الوہیت دو جدا اور الگ الگ عناصر تھے۔ ایسا کہ آپ میں نہ صرف دو ذاتیں بلکہ دو علیحدہ شخصیتیں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ کلام یا لوگوس (Logos) میں آپ کے انسانی کالبد میں اس طرح بستا تھا کہ گویا آپ کا بدن اطہر ایک ہیکل تھا۔ پس آپ میں دو جداگانہ ذاتیں اور دو الگ شخصیتیں تھیں[2]۔

اس پر ۴۳۱ء میں ایک کونسل بمقام افسس منعقد ہوئی اور اس پر بدعت کا فتویٰ لگا کر اسے ملک بدر کر دیا گیا۔ جبکہ اس کی عالمانہ تصانیف کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ قیصر روم نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ نسطوری مذہب زیادہ نہ پھیلنے پائے، چنانچہ اس نے رومی سلطنت سے اس کا نام ونشان ختم کر دیا اور کیلسڈن کی کونسل نے ۴۵۱ء میں نسطوری خیالات کو بدعت قرار دے کر نسطوریوں کو روم، قسطنطنیہ، انطاکیہ اور اسکندریہ کی کلیسیا سے نکال باہر کیا۔ ان بے چارے نسطوری مسیحیوں نے پھر ایران میں اپنے آپ کو منظم کیا اور ۴۹۸ء میں ایرانی دارالسلطنت سلوکیہ میں ایک کونسل منعقد کر کے تمام مغربی کلیسیاؤں سے قطع تعلق کر لیا۔ اور اپنا نام "کلدی مسیحی کلیسیا" رکھ لیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں آپس کی انتظامی کشمکش ونزاع کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا[3]۔

شمالی ہند کی کلیسیائیں اس کلدی کلیسیا کے ماتحت ہو گئیں اور یوں یہاں نسطوری کلیسیا اور اس کے عقائد کو رواج ملا۔ اس وقت رود شرے (موجودہ رے) ایرانی میٹروپولی ٹن کا صدر مقام تھا اور ہندوستانی کلیسیا بھی اسی کے ماتحت تھی اس کلیسیا نے اپنے ابتدائی ارتقائی مراحل کیسے طے کیے تاریخ اس بارے مکمل طور پر خاموش ہے۔

اس کے نصف صدی بعد تاریخ کلیسیائے ہند کے متعلق ایک اہم دستاویز کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک یونانی سیاح کو سمس نے ۵۲۲ء میں اس علاقہ کی سیر کی اور اپنے دوست کی فہمائش پر پہلے چھ حصوں میں پھر بارہ حصوں میں مسیحی جغرافیہ عالم (Universal Christian Topography) نامی کتاب لکھی[4]۔ ہند (مشرقی ایشیا کو ہی

---

1 برکت اللہ، صلیب کے ہراول، ص ۸۱

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۷۳

4 Smith, Conversion of India, p.27 ان صاحب کے ذہن میں۔ بقول پادری برکت اللہ۔ یہ خبط سمایا تھا کہ کرہ ارض

ہند تصور کیا گیا) کے متعلق اس کا تبصرہ اسٹیفن نیل یوں نقل کرتا ہے؛

"In the Island of Taprobane (Cyclone) .. there is a church with clergy and a congregation of Christians .. and such is also the land called MALEE where the pepper grows .. the Island hath also a church of Persia .Christians who have settled there and a presbyter who is appointed from Persia and all the apparatus of public worship. But the natives and all their king are heathen."

اس طویل اقتباس کو درج کرنے کے بعد سٹیفن نیل اس سے نتائج اخذ کرتا ہے کہ

Some important deductions can be made from these few words of Cosmos. He tells us not of an indigenous from Indian Church but of a community of strangers from Persia. The reference to pepper makes it plain who these strangers were; they were spice merchants, engaged in the flourishing commerce between India and the Roman Empire.[1]

روم اور ہند کے مابین مرچوں کی تجارت کرنے والے اجنبی تاجروں پر مشتمل چھوٹا سا گروہ ہندوستان میں عیسائیت کی موجودگی کی تو دلیل ہو سکتا ہے نہ کہ یہاں باقاعدہ وسیع پیمانے پر بسنے والی فرضی مسیحی آبادی کا ثبوت اور نہ ہی ہندوستان کے مذہبی ادارتی نمائندگی کرنے والے عظیم الشان کلیسیا کی ان پر بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔

۵۳۵ء میں فارس کیتھولکس کے ماتحت باقاعدہ کلیسیائی نظم قائم کیا گیا یہ نظم اس وقت نسطوری فرقہ کے ماتحت تھا[2]۔ اس کے بعد ۵۹۰ء میں مالاپور میں خانقاہ "دیر توما" پر میلے اور اس پر نذریں و چڑھاوے لانے کا ذکر ملتا ہے۔

ہندوستان میں تاریخ مسیحیت کی ابتدائی پانچ سے چھ صدیوں کا تجزیہ کریں تو یہاں مسیحیت کی موجودگی کے مدہم آثار کے علاوہ کوئی واضح اور نمایاں رنگین تصویر نظر نہیں آتی۔ مگر جوشِ تفاخر میں سے یہاں تاریخ کلیسیائے ہند کے نام پر عقیدت اور مذہبی حمیت میں ظن و تخمین پر مبنی ایسی خوش نما تصویر کشی کی گئی ہے جو "تاریخ نویسی" کی بجائے "تاریخ گری" کے رویے کو ظاہر کرتی ہے۔

ان صدیوں میں تاریخ اور تاریخ نویسی کو بجا طور پر اس جملے میں سمو دیا گیا ہے۔

" We know all too little of this remarkable Christian community (in India) during the first five or six hundred years of its existence , though legend is ready and willing to fill out the thin out

---

یہودیوں کے ہاں معتبر ایک علامتی خیمہ کی شکل پر بنی ہے۔ چنانچہ اپنے نسطوری عقائد کی روشنی میں وہ کتاب مقدس کے بیانات کو توڑ مروڑ کر تاویلیں کر کے اس نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ کسی نے اس کتاب کا نام "کیچڑ کا برا عظم" رکھ دیا۔ (صلیب کے ہراول، ص ۱۳۳۔۱۳۴)

1 Neil, Stephen , The Story of Christian Church, p.18

2 Cyclopedia of India , Vol.2 , p.74

line of evidence with a thick covering of fantasy. For the next seven hundred years our information is even more fragmentary.

بلکہ

In 650 AD the country is described as being in a State of Darkness for Lack of Religious Instruction.[1]

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نتیجہ میں جزیرہ عرب سے آفتابِ اسلام کی کرنیں دیگر علاقوں پر ضوفشاں ہو رہی تھیں، اس وقت پیٹریارک یشوع دوم (۶۲۸ء۔۶۵۱ء) نے خاص ہندوستان کے لیے الگ میٹروپولیٹن مقرر کیا[2]۔

بعد ازاں ۸۸۳ء میں انگلستان کے شاہ ایلفرڈ اعظم کا تذکرہ ملتا ہے جس نے دو پادریوں سگہلم اور ایتھلسٹن کے ہاتھ "توماویر" کے لیے نذرانے بھیجے، لیکن وہ خود اس کے بارے کچھ نہیں بتاتے۔

۱۱۲۲ء میں ایک مسیحی روم گیا اور خود کو پیٹریارک یوحنا ظاہر کر کے پوپ اور کارڈینلوں کو مالا پور کے گرجا کے عجائب، معجزات اور کہانیاں سنا کر دنگ کر دیا۔ اس عیار شخص نے پوپ کو دھوکا دے کر اپنا الو سیدھا کیا تھا[3]۔ یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں کے ہاتھوں یورپ کی دوسری صلیبی جنگ (۱۱۱۴ء) میں شکست کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے اور لوگ معجزات پر مبنی قصے کہانیوں پر اندھا دھند اعتماد کرتے تھے۔

جلال الدین فیروز شاہ کے عہد حکومت (۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء۔۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء) میں یہاں اٹلی کا پادری جان آف مانٹی کورونیو اور مارکوپولو آئے۔ ۱۲۹۱ء میں جب مانٹی کورونیو کا پادری جان یہاں آیا اور اس نے ۱۰۰ اشخاص کو بپتسمہ دیا۔ وہ یہاں اپنے تیرہ ماہ کے قیام میں ہندوستانی کلیساء کے بارے کوئی مفصل معلومات نہیں دیتا، فقط چند ضمنی سطور لکھنے پر اکتفاء کرتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے:

"ہندوستان کے ان ساحلی علاقوں میں مسیحی بہت کم تعداد میں پائے جاتے ہیں اور جو ہیں وہ کسی قسم کا رسوخ نہیں رکھتے اور کوئی ان کو پوچھتا نہیں"[4]۔

چین کی سیاحت کرنے والے مارکوپولو ۱۲۹۳ء میں توما کی زیارت کے متعلق لکھا ہے کہ

" مقدس توما رسول کی لاش ایک چھوٹے قصبے میں ہے جہاں بہت کم تاجر جاتے ہیں کیونکہ وہاں کی آمد و رفت آسان نہیں جو مسیحی مالا پور کے گرجا کے منتظم ہیں وہ جنگلات کے درختوں پر قابض ہیں اور ان درختوں کے پھلوں کی گری پر

---

1 Cyclopedia of India, Vol.2, p.74

2 برکت اللہ، پادری، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور ۱۹۶۲ء)، ص ۴۳۔۴۷

3 برکت اللہ، صلیب کے ہراول ص ۱۳۲

4 برکت اللہ، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، ص ۵۱۔۷

گذارہ کرتے ہیں[1]۔

سلطان علاؤالدین کے دور اقتدار (۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء۔۷۱۵ھ / ۱۳۶۱ء) میں ۱۳۱۰ء میں مغربی کلیسیا کا پادری مینن ٹلس (Menin Tillus) جنوبی ہند گیا اور وہ یہاں کے مسیحیوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ؛

"ساحل کے علاقوں میں مسیحی بستے ہیں۔ لیکن وہ تعداد میں کم ہیں اور نہایت معمولی حیثیت کے لوگ ہیں"[2]۔

ان تمام دعاوی کے باوجود منظم کلیسیا کے کوئی مستند شواہد موجود نہیں یہی وجہ ہے کہ پادری برکت اللہ بھی اس حقیقت کا اعتراف یوں کرتے ہیں؛

"حق تو یہ ہے کہ ۹۰۰ء سے لے کر ۱۳۰۰ء تک ہمیں ان (ہندوستانی) کلیسیاؤں کے متعلق کوئی خاص علم نہیں"۔

نیز یہ کہ History is practically silent about Christianity in India till the thirteen century.[3]

اس کے بعد یہ نہیں کہ یہاں کی تاریخ نویسی میں کوئی واضح تحریریں سامنے آگئیں ہیں بلکہ صورت حال اس سے بھی بدتر ہو گئی جس کا اظہار یوں کیا گیا ہے۔

"دسویں صدی سے لے کر پرتگیزیوں کی آمد یعنی پندرھویں صدی کے آخر تک تاریخ جنوبی ہند کی کلیسا کے حالات پر روشنی نہیں ڈالتی۔ ان پانچ صدیوں کی دراز مدت تک کلیسا کی زندگی کے تمام شعبے گم نامی کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں یہ زمانہ ہر معنی میں کلیسائے ہند کا اور بالخصوص جنوبی ہند کا "تاریک زمانہ" ہے"[4]۔

یہ وہ دور تھا جب عالم اسلام منگولی حملے کی زد میں تھا۔ ہلاکو خاں نے جارجیا اور آرمینیا کے مسیحی اتحادیوں کے ساتھ ۱۳ فروری ۱۲۵۸ء میں فتح بغداد کے ساتھ عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود ہلاکو خاں مسیحیت سے متاثر تھا اسی وجہ سے سقوط بغداد کی قتل وغارت میں مسیحی بالعموم بچے رہے۔ وہ اپنی بیوی توزک خانم، جو کہ مسیحی تھی، کی خوشنودی کے لیے عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے درپے تھا۔ جب ہلاکو خاں اور اس کی بیوی فوت ہوئی تو کلیسا میں صف ماتم بچھ گئی اور ان پر ماتم اور نوحہ کیا گیا[5]۔

پادری برکت اللہ سقوط بغداد پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلام کے سخت جان ہونے کا ذکر یوں کرتا ہے؛

"چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں نے اسلامی سلطنتوں اور بادشاہتوں کا خاتمہ کر دیا حتیٰ کہ خلافت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن یہ

---

1 برکت اللہ، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، ص ۵۱۷

2 ایضاً، ص ۵۱۰

3 Cyclopedia of India, Vol.2, p.74

4 برکت اللہ، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، ص ۱۸۱

5 ایضاً، ص ۳۶۴

بات غور کے قابل ہے کہ ان منگولی زلزلوں کے جھٹکوں سے اسلام کو بہت ضعف نہ پہنچا۔ اسلام نے مختلف ممالک واقوام کو زیر کرکے لاکھوں (افراد) کو حلقہ بگوش کر لیا۔ لیکن اسلامی سلطنتوں کے اور خلافت کے ختم ہو جانے کے باوجود یہ مسلمان اپنے سابق مذہبوں کی طرف نہ لوٹے۔ وہ اسلام سے روگردان ہو کر نہ یہودی بنے اور نہ عیسائی ہوئے، وہ نہ تو زرتشتی مذہب میں واپس گئے اور نہ انہوں نے بت پرستی کی طرف رجوع کیا۔ وہ مختلف اقسام کے کلچروں کے وارث تھے لیکن خلط ملط ہو کر ایک ہی قوم بن گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ اسلام میں ان کو کوئی ایسا تجربہ حاصل ہو گیا تھا جو زمانہ کے ساتھ ان کے رگ وخون میں بس گیا تھا اور گو زمانہ کے حوادث نے سیاسی حالات کو پلٹ دیا تھا تاہم ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا بلکہ غیر مساعد حالات میں بھی قائم اور استوار رہا"[1]۔

۱۳۲۵ء میں رومی کلیسا کا پادری اوڈورک اور ۱۳۴۹ء میں پادری جان ڈی مارگ نولی کے ہندوستان آنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ عہد محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء۔۱۳۵۱ء) میں ایک اہم واقعہ پادری جوڈینس کا اپنے چار ساتھیوں Thomas, James, Demetrrius اور Peter کے ساتھ بمبئی کے قریب "تھانہ" کے علاقہ میں تبلیغ کے لیے وارد ہونا ہے[2]۔ مقامی آبادی کی شکایت پر یہ لوگ مقامی قاضی کے پاس حاضر کیے گئے۔ سوالات و جوابات کے دوران رسول اللہ ؐ کے بارے نازیبا کلمات ادا کرنے پر انہیں سزائے موت دے دی گئی[3]۔ اگلے سال ایک آئرش مسیحی راہب Friar James یہاں آیا اور ان لوگوں کی ہڈیاں اکٹھی کر کے لے گیا۔ وہ کولون کے ساحل پر پندرہ مسیحی گھرانوں کا ذکر کرتا ہے جو نسطوری عقائد کے حامل تھے[4]۔

۱۳۴۰ء عامر نامی نسطوری راہب توما کے مقبرہ کی خبر دیتا ہے۔ ۱۴۲۵ء میں نکوڈی کونٹ مالابار آتا ہے اور اسے یہاں توما کے معتقد مسیحی آبادی سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن وہ عقائد کی کوئی تفصیل نہیں دیتا جس سے توما کی تعلیمات پر روشنی پڑتی ہو۔ اس وقت مغربی کنارے کے مسیحی زیادہ آسودہ تھے اور ان کو مقامی راجہ تک رسائی حاصل تھی۔ دریں اثناء مشرقی کنارے پر آباد مسیحی آبادی حالات کے جبر سے یہاں سے کوچ کر گئی اور ان کے پیچھے توما کی زیارت گاہ عدم نگہداشت کے سبب برباد ہو گئی۔

۱۴۴۰ء میں کونٹی ہندوستان آیا اور یہاں کے نسطوری مسیحیوں کے بارے خبر دیتا ہے[5]۔

---

1 برکت اللہ، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، ص ۳۶۴۔۳۶۵

2 Smith , The Conversion of India , p.41

3 برکت اللہ، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، ص ۵۰۹۔۵۵۱

4 Smith , The Conversion of India, p.41 حوالہ مذکورہ کے مطابق اس کے چودہ سالہ تبشیری روئیداد سفر، جس میں وہ ہند آیا تھا، کا ترجمہ سر ہنری یوئل نے کیا ہے۔

5 برکت اللہ، قرون وسطیٰ کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، ص ۵۵۱

۱۴۹۰ء میں جنوبی ہندوستان کے عیسائیوں نے نسطوری کیتھولی کوس سے درخواست کی کہ ان کو ایک بشپ بھیجا جائے کیونکہ وہ مدت سے بغیر کسی بشپ کے تھے۔ اس پر ایک بشپ ان کی طرف بھیجا گیا اور اس نے ۱۵۰۴ء میں یہاں کی کلیسا کے بارے اپنے پٹریارک کو مطلع کرتے ہوئے ان لوگوں کے حالات سے آگاہ کیا[1]۔

نسطوری کلیسا کی تاریخ میں یہ دور انتہائی پریشان کن تھا۔ انہیں ایام میں جب نسطوری کلیسا موت کی وادی میں سے گذر رہی تھی رومی کلیسا کے پوپ نے ۱۴۰۰ء سے اس کو امداد پہونچانے کی بجائے اپنے تابع فرمان کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن اس کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی۔ سولہویں صدی میں جب کلیسیا دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہی تھی تو اس میں باہمی تنازعہ شروع ہو گیا۔ ۱۵۵۲ء میں پٹریارک کے دو دعوے دار پیدا ہو گئے اصل بات یہ تھی کہ ۱۲۶۵ء سے ایک ہی خاندان سے پشت در پشت پیٹریارک بنتے چلے آئے ہیں۔ اور ہر پیٹریارک کی موت پر اس کا بھتیجا گدی نشین ہو جاتا۔ اب یہ دونوں دعوے دار پٹریارک شمعون کے بھتیجے تھے[2]۔

بعد از اں جب پرتگیزی گوا پر قابض ہوئے تو انہوں نے ٹرانکوبار کے ان نسطوری مسیحیوں کی اصلاح کے لیے ۱۵۳۰ء میں تبشیری مناد بھیجے تا کہ ان کے "بدعتی عقائد" درست کیے جا سکیں۔ ۱۵۹۹ء میں گوا کے مبشرین کی کاوشوں سے اجتماعی مذہبی تبدیلی عمل میں آئی اور تمام لوگوں نے کیتھولک عقائد اختیار کرتے ہوئے رومی کلیسیا میں شمولیت اختیار کر لی اور جیوسٹ بشپ ان کی نگہبانی کرنے لگا۔ لیکن صرف نصف صدی بعد ہی ان پرتگیزی مبلغین کی سختی اور زبردستی کے رد عمل میں بڑے پیمانے پر بغاوت ابھری اور ۱۶۵۳ء میں اکثر لوگ رومن کلیسیا سے باغی ہو کر واپس شامی نظم میں چلے گئے۔ ۱۶۵۷ء میں روم سے کچھ پادری آئے جنہوں نے حکمت سے کام لیتے ہوئے حالات ٹھیک کرنے کی کوشش کی اور ان کی کاوشوں سے اکثریت دوبارہ کیتھولک کلیسیا میں لوٹ آئی جبکہ کچھ لوگ اپنے انہیں عقائد پر قائم رہے۔

پادری سی ڈبلیو۔ رینسن ایم اے اس کے بعد کے حالات لکھتا ہے۔

" پس سترھویں صدی کے درمیانی زمانہ سے شامی کلیسیا کی تاریخ دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک حصہ شامی کلیسیا کا وہ حصہ ہے جو رومی کلیسیا کے ماتحت رہا۔ یہ حصہ تعداد میں زیادہ ہے۔ پوپ نے ان کو اجازت دے دی کہ عبادت کو لاطینی رسوم کی بجائے شامی رسوم کے مطابق ادا کریں۔ آزاد شامی مسیحیوں کا دوسرا حصہ انطاکیہ کے یعقوبی فرقہ کے بطریق کے ماتحت ہو گیا۔ اس وقت سے اس فرقہ کے بشپ ان کی پاسبانی کرنے لگے اور یوں ڈیڑھ سو سال تک آزاد طبقہ اپنے عقائد اور رسوم کا پابند رہا۔ اور اس بات کا قائل رہا کہ اس کی ابتدا رسولی زمانہ سے ہے۔ اس کلیسیا کی بائبل اور نماز کی کتاب شامی زبان میں تھی جس کو عام لوگ نہیں سمجھتے تھے لہذا مذہبی تعلیم کم ہوتی گئی۔ چرچ مشنری سوسائٹی نے اپنی مشنری

---

1 Cyclopedia of India ,p.75

2 Ibid

بھیجے تاکہ اس کلیسیا کو بیدار کریں ان مشنریوں کو بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ شامی کلیسیا اپنی قدیم طرز عبادت کی پیرو رہیں اور انگریزی کلیسیا کی رسوم وغیرہ اختیار نہ کریں لہذا مشنریوں کو تاکید کی گئی کہ وہ ایک کلیسیا کی بجائے دوسری کلیسیا قائم نہ کریں۔ بیس سال تک مشنری شامی کلیسیا کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے لیکن بعدہ آپس کی غلط فہمیوں کے باعث وہ ۱۸۳۷ء میں اس کام سے دستبردار ہوگئے اور انہوں نے ٹرانکوو اور کوچین میں انگریزی کلیسیا قائم کر دی۔ آج رومی شامی کلیسیا کی شاخ کے علاوہ شامی کلیسیا کے دو حصے ہیں ایک آرتھوڈکس (تقلید پسند) شامی کلیسیا اور دوسرا حصہ مارتوما شامی کلیسیا کا ہے۔ شامی کلیسا، میں دو جماعتیں ہیں ایک بطریق کی پارٹی جو انطاکیہ کے بطریق کے ماتحت ہے اور دوسری صدر اسقف کی پارٹی جو کوٹیم کے صدر اسقف کو انتظامیہ افسر مانتی ہے"[1]۔

حاصل بحث کہ ہندوستانی کلیسیا کی تاریخ آغاز متنازع فیہ ہے۔ مستند ثبوت اور شواہد کی عدم دستیابی کے ساتھ آغاز مسیحیت سے ہندوستان میں عیسائیت کی موجودگی کا دعویٰ محل نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تیرھویں صدی تک یہاں کی تاریخ کلیسیا ناکافی ثبوت، خاموش تاریخ اور "تاریک دور" کے نتیجہ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہاں کی کلیسیا داخلی خود مختاری کی حامل نہ تھی۔ طبقاتی تقسیم پر مبنی معاشرہ، فرسودہ رسومات، اور توہمات کے پس منظر میں کوئی اصلاحی اور بہتری کا ماڈل رول ادا کرنے میں ناکام رہی۔ اور معاشرتی جبر کے کچلے لوگوں کے لیے امید کا پیغام دینے میں ناکام رہی۔ نتیجتاً یہ شامی کلیسیا مسیحی پیغام مخصوص علاقہ سے باہر اپنے اثرات پہنچانے میں ناکام رہا۔

---

1 ریلنسن، سی ڈبلیو، پادری کلیسائے ہند اور مسیحی خادم الدین (مترجم: پادری برکت اللہ) (پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی، لاہور، س۔ن) ص ۱۶

فصل دوم

برصغیر میں کیتھولک کلیسیا

تاریخی جائزہ

فصل دوم

برصغیر میں کیتھولک کلیسیا۔ تاریخی جائزہ

پندرھویں صدی کا آخری نصف، سیاسی اور مذہبی تناظر میں اسلام اور عیسائیت دونوں کے لیے انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ میں صلیب وہلال کے درمیان معرکہ میں مسیحیت کی شکست اور اسلام کی فتح کے جو نتائج سامنے آئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ یورپ اس علاقہ میں تجارت سے باہر ہوگیا۔ چنانچہ یورپ میں دساوری تجارت کے لئے نئے علاقے کھوجنے کی سوچ بڑی شدت سے ابھر کر سامنے آئی۔ جس کے نتیجہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس صدی کی آخری دہائی میں ایک طرف ۱۴۹۲ء میں امریکہ اور دوسری طرف ۱۴۹۸ء میں ہندوستان کے ساحلوں پر یورپی جہاز لنگر انداز ہوئے۔ اور یہاں سے دوررس نتائج کا حامل نیا تاریخی باب کھلا جس سے اقوام عالم کا ایک معتدبہ حصہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

پندرھویں صدی کا اختتام اور سولھویں صدی کا آغاز تاریخ مسیحیت کی مذہبی وسیاسی کامیابیوں اور کامرانیوں کا سورج لیے طلوع ہوا۔ ایک طرف ۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو سقوط اندلس اور وہاں سے مسلمانوں کا اخراج ہوا اور دوسری طرف استعماری جلو میں مسیحیت ایک نئے انداز میں یورپ سے نکل کر ہندوستان کی سرزمین پر وارد ہورہی تھی۔ لیکن اس سے بھی اہم یہ کہ خود یورپ میں پاپائیت پر مبنی کلیسا اندرونی شکست وریخت کا شکار ہورہا تھا۔ آنے والی دہائیوں میں مذہبی اجارہ داری کے خلاف رد عمل ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے والا تھا۔ مسلمانوں سے حاصل کردہ نئے علوم کے نتیجہ میں مذہب کو عقلی بنیاد پر پرکھنے کی دعوت بھی جڑیں پکڑ رہی تھی۔ چنانچہ خلاف عقل عقائد ورسومات اور پاپائیت کے مذہبی استحصال کے رد عمل میں چند ہی سالوں بعد عیسائیت رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں بٹ گئی[1]۔

۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو پرتگال سے واسکوڈے گاما چار جہازوں کے ساتھ عرب جہاز ران احمد بن ماجد نجدی کی

---

1 "جب ممالک یورپ میں سولھویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کا زمانہ آیا اور نئی روشنی اور نئے علوم نے غلبہ حاصل کرلیا تو عقلاء پر ظاہر ہوگیا کہ رومی کلیسیا کے بعض دستورات ورسوم اور عقائد کتاب مقدس کے خلاف ہیں۔ اس بناء پر مغربی کلیسیا کے متعدد حصے ہوگئے اور ممالک مغرب میں احتجاج کنندہ (پروٹسٹنٹ) کلیسیائیں وجود میں آگئیں جنہوں نے رومی کلیسیا اور پوپ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پوپ کی متابعت سے صاف انکار کردیا۔ | برکت اللہ، پادری، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، (پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۷۰ء، بار اول)، ص ۳۴|

راہنمائی میں مالا بار ساحل کی بندرگاہ کالی کٹ پر لنگر انداز ہوا[1] اور برصغیر میں تاریخ مسیحیت کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اقتصادی مقاصد، سیاسی عزائم اور مذہبی جوش و خروش سے مخمور پرتگیزیوں نے یہاں قدم جمانے کے بعد "اپنے طریقے" سے مسیحیت کی تبشیری سرگرمیاں شروع کر دیں۔ پرتگیزیوں کی آمد سے قبل دوسری صدی ہجری میں مسلمان عرب تاجر یہاں (مالابار یا ارض ماپلا) پہنچے اور یہیں بس گئے۔ کالی کٹ کے راجہ زمورن کی بحری فوج انہیں کے زیر کمان تھی۔ یہ مسلمان بلا شرکت غیرے ساری بحری تجارت کے مالک تھے اور ان کے تجارتی تعلقات طرابلس اور مراکش تک پھیلے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ملیبار (مالابار) کے عرب تاجر نہایت متمول تھے اور ان کا ایک ایک ملک التجار تمام کشتیوں اور جہازوں کا مال خرید سکتا تھا[2]۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخری ایام میں جب پرتگالیوں کا قدم ملیبار میں آیا تو اس مرفہ الحالی اور شادمانی پر اوس پڑ گئی۔ اور مسلمانوں کی تجارت و دولت کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ ۱۴۹۸ء میں جب واسکوڈے گاما کا بیڑا ساحل کالی کٹ پر پہنچا تو سب سے پہلے گاما کی اجازت سے ایک پرتگالی (سزا یاب قیدی) نے جہاز سے اتر کر ارض ملیبار پر قدم رکھا۔ پہلا شخص جس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ایک تونسی مسلمان تھا۔ اس نے پرتگالی کو دیکھتے ہی پوچھا! تجھ پر خدا کی مار، تو یہاں کیسے پہنچا؟ پرتگالی ہکا بکا اسے دیکھنے لگا وہ حیران تھا کہ جہاں کہیں ہم جاتے ہیں مور (مسلمان) پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ پرتگال میں مور، سواحل افریقہ پر مور، اور وہی مور پھر ہندوستان میں۔ جب اس کی حیرت ذرا کم ہوئی تو سوال کا جواب اس نے یہ دیا کہ ہم یہاں عیسائیوں اور گرم مصالحوں کی تلاش میں آئے ہیں[3]۔

آئندہ آنے والی ساڑھے چار صدیوں سے زائد عرصہ تک گوا پرتگیزی حکومت کی کالونی بنا رہا یہاں تک کہ ۱۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ہندوستان نے فوج کشی کر کے اس قدیم ترین نو آبادی پر قبضہ کر کے اسے ہندوستان میں ضم کر لیا۔

۱۴۹۲ء تا ۱۵۰۳ء تک رومی کلیسیا کے سربراہ پوپ الیگزنڈر ششم نے ۱۴۹۳ء میں کلیسیائی تنظیم نو کرتے

---

1 قریشی، محمد صدیق، جنگ آزادی کے مسلم مشاہیر (مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۸ء)، ص ۷؛
Samuel Mander, The Treasure of History, (London 1858) p.777

2 بابائے اردو، مولوی عبدالحق، خطبات عبدالحق (انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۶۴ء، بار دوم)، ص ۳۱۹-۳۲۲
بابائے اردو کے مطابق، "شیخ زین الدین نے اپنی تصنیف "تحفۃ المجاہدین" میں لکھا ہے مسلمانوں کی خوش حالی اور ان کی تجارت کی ترقی ان راجاؤں کے الطاف و التفات کی بدولت تھی۔ وہ مسلمانوں کے عقائد و رسوم کا احترام کرتے تھے۔ مسلمان بھی اپنے راجاؤں کے نہایت وفادار اور خیر خواہ تھے۔ ہندو رعایا سے بھی ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ ہمیشہ باہم صلح و آشتی اور رواداری سے رہتے۔ ان کے مذہبی رسوم اور آداب کا پاس کرتے۔ اور کبھی دل آزاری کے مرتکب نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے تمول و اقتدار اور اثر پر کبھی رشک و حسد نہ ہوا اور نہ ان سے کسی قسم کا اندیشہ تھا۔ (ص ۳۲۰)

3 ایضاً، ص ۳۲۱

ہوئے دنیا کو مغربی اور مشرقی دو حصوں میں بانٹ دیا اور مغربی ممالک کو ہسپانیہ کی جاگیر قرار دے دیا[1]۔ رومی کلیسا کا یہ اسقف اعظم انتہائی عیاش طبع شخص تھا اور اس کے بارے عمومی تاثر یہ ہے کہ تمام حدود و قیود کو در خور اعتناء نہ سمجھنے والی یہ ذات اخلاقی عیوب کا گڑھ تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے حرامی بچے کو آرچ بشپ اور کارڈینل کے مقدس عہدوں پر فائز کر رکھا تھا[2]۔ اس نے شاہان ہسپانیہ اور پرتگال کو مفتوحہ نئے مقبوضات کا مالک قرار دے دیا اور ان کے فرائض منصبی میں یہ بات شامل کر دی کہ، " وہاں کے وحشیوں میں انجیل کی خدمت کے ذریعے مسیحیت کی اشاعت کرو"۔ حالانکہ اس تاریک زمانہ میں رومی کلیسا کے بشپ اور قسیس تک انجیل کی تعلیم سے خود محروم تھے۔ کیونکہ نہ ان کو اور نہ یورپ کے ممالک کے باشندوں کو انجیل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کا مذہب صرف رسوم کی ادائیگی تھا اور بس۔ جب اس "تاریکی کے زمانہ" میں یورپ کے نام نہاد مسیحی ممالک اور مسیحی کلیسیا کی خود یہ حالت تھی تو ہندوستان جیسے ملک میں مسیحیت کا پرچار کس طرح کر سکتے تھے[3]۔

اس نے ایک فرمان کے ذریعے شاہ پرتگال کو حبشہ ایران اور ہندوستان کی تجارت، مفتوحہ مقبوضات اور ان ممالک کے جہازوں کی آمد و رفت کا مالک قرار دے دیا۔

Lord of the conquest navigation and commerce of India, Ethopia , Arbia and Persia.[4]

کلیسیا کی تاریخ میں ایک اہم نام پوپ لیو دہم (Leo X) کا ہے۔ اس کے زمانے میں Indulgences یعنی معافی نامے بیچنے کا کام شروع ہوا تھا۔ اس نے ۱۵۱۴ء میں شاہان پرتگال کو تمام مفتوحہ ممالک کی کلیسیاؤں پر تقرری کا اختیار اور اقتدار عطا کر دیا، اور ان کو اختیار دے دیا کہ وہ شمال مغربی افریقہ سے لے کر تمام ممالک (جنہیں انہوں نے فتح کیا یا وہ آئندہ فتح کریں گے) میں بشپ اور روحانی حکام مقرر کر سکتے ہیں[5]۔

---

1 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۲۰

2 ارباب کلیسیا کی تنظیمی و تبشیری باب میں منفی حرکات تو ایک طرف رہیں، اخلاقی دیوالیہ پن کے تذکرہ کے لیے تو پورا ایک دفتر درکار ہے قاری اس وقت ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں رومی کلیسیا پر ایک ایسا دور بھی گذرا ہے جسے " کسبیوں کا دور " (Rule of the whores or The Rule of the Courtesans) کہتے ہیں۔ [ساجد میر، عیسائیت ۔ تجزیہ و مطالعہ ، ص ۴۷۹] یہ اس روحانی مرکز کا حال ہے جو ایسے اخلاقیات کا مدعی تھا جو ان کے نزدیک فلاح انسانیت کے لیے ناگزیر تھے۔

3 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۶۸

4 ایضاً، ص ۵۵

5 Barrett, David B, World Christian Encyclopedia,(Oxford University, Press, UK 1982) ,p173

اگرچہ بعد میں خود پوپ اپنے اس فرمان کی بنا پر مشکلات سے دوچار ہو گیا تھا۔ شاہ پرتگال یوحنا سوم نہایت متعصب عیسائی تھا۔ اس نے مسیحی مبلغین کے گروہ مسیحیت کی جبریہ اشاعت کی خاطر روانہ کیے اور یوں انجیل کے پرچار کو پرتگیزی حکومت کا ایک شعبہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ بقول پادری برکت اللہ، "جہاں کہیں پرتگیزی حکومت کے قدم پہنچے وہاں مسیحیت کی جبریہ اشاعت ہونے لگی اور جہاں کہیں پرجوش مسیحی مبلغین گئے وہاں پرتگیزی افواج ان کے پیچھے پیچھے پہنچ گئیں اور پرتگیزی سلطنت کو وسیع کر دیا"۔ پوپ لیو سیز دہم کو یوں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

"ہر طرف پرتگیزی جھنڈا صلیبِ مسیح کے سایہ تلے ہے، پرتگال کی فتوحات مسیحیت کی فتوحات ہیں"[1]۔

ہندوستان میں پرتگیزیوں کی آمد کے ساتھ ہی مختلف مسیحی فرقے اپنی تبشیری سرگرمیوں کے لیے یہاں آن وارد ہوئے، جن میں فرانسسکن، ڈومنیکن اور آگسٹینین مشنری شامل ہیں۔ کیننور (Cannanore) میں ۱۵۰۰ء، کوچین میں ۱۵۰۶ء، گوا میں ۱۵۱۰ء، کالی کٹ میں ۱۵۱۳ء، دماؤں میں ۱۵۳۱ء، بمبئی اور باسین میں ۱۵۳۴ء میں یہ سلسلے قائم کیے گئے[2]۔ ان علاقوں میں انہوں نے نو معتقدین اور (اپنی فتح یا مذہبی احتسابی ادارے کے حکم کے نتیجہ میں مرنے والوں کے) یتیم بچوں کے لیے تعلیمی ادارے، چرچ اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ تاہم گوا میں سب سے زیادہ مؤثر تبشیری سرگرمیاں ۱۵۴۰ء میں یہاں یسوعی فرقہ[3] (Jueist) کی آمد سے شروع ہوئیں اور بعد میں سرکاری سرپرستی میں تمام منادی کاوشوں پر یہ یسوعی ہی غالب رہے۔

۱۵۳۴ء میں پوپ پال سوم نے گوا کا اسقفی حلقہ قائم کیا جس کا رقبہ غالباً کلیسیائی تاریخ میں سب سے بڑا تھا۔ یعنی راس امید سے لے کر چین تک۔ اس بشپ کے دائرہ اختیار میں افریقہ کا تمام ساحلی علاقہ بھی شامل تھا۔ ۱۵۳۴ء میں فرانسسکیوں نے ماہیم میں چرچ آف سینٹ مائیکل بنایا، یہ پہلا پرتگیزی گرجا تھا۔

پرتگیزی مبشرین میں سب سے نمایاں مقام حاصل کرنے والا سینٹ فرانسس زیویئر ۶ مئی ۱۵۴۲ء کو گوا پہنچا۔ اس کی تبشیری خدمات کو ہندوستانی کیتھولک کلیسیا میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اس نے آنے سے قبل پرتگیزی

---

1 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۷۱

2 Cyclopadia of India , p. 75

3 "یسوعی فرقہ ۱۵۳۴ء میں Loyalali Inrgo Lopez (۱۴۹۱ء۔۱۵۵۶ء) نے اپنے چھ دوستوں کے ساتھ مل کر بنایا جسے ۱۵۴۰ء میں پاپائے روم نے تسلیم کر لیا۔ یہ کیتھولک ازم کے اندر سب سے زیادہ متشدد و متعصب گروپ تھا۔ اس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ تفرقہ انداز گریک کلیسیا کو اور بدعتی قومی کلیسیاؤں (جو رومن کلیسیا پر اعتقاد نہ رکھے) کو روم کے پوپ کے ماتحت لایا جائے" (برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۳۵)

شاہ یوحنا سے وائسرائے کے نام خصوصی فرمان حاصل کر لیا تھا جس میں اس کی مکمل تائید پر بہت زور دیا گیا تھا[1]۔ اس پُرجوش مبلغ کے بارے مؤرخ مسیحیت رقم طراز ہیں،

"ایسے عظیم المرتب شخص نے بھی انجیل کے صریح حکم کے خلاف شاہ پرتگال کو ۱۵۴۸ء میں لکھا کہ حضور والا فرمان صادر کریں کہ ہندوستان کے حکام اور وائسرائے ہمارے مقدس مذہب کو اپنے مقبوضات میں پھیلانا اپنا فرض منصبی خیال کریں"[2]۔

یہ غالباً انہی تبشیری سرگرمیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۵۴۶ء میں شاہ یوحنا نے ہندوستان میں برہما کے پرستاروں کو اعلانیہ مذہب کی رسومات ادا کرنے سے روک دیا اور اس فرمان کی نافرمانی کرنے والوں کے لیے عبرت ناک سزائیں مقرر کیں جب کہ دوسری طرف مسیحی نو مریدوں کے لیے انعام و اکرام کا اعلان کیا گیا اور وہ ہر جبریہ خدمت اور بیگار سے آزاد قرار پائے۔

۱۵۵۴ء کے بعد گوا اور اس کے مضافات کے باشندوں کو مسیحی بنانے کی باقاعدہ منظم کوشش کی گئی۔ مبلغین نے وائسرائے سے حکم جاری کروالیا کہ پرتگیزی حکومت کے ماتحت حکام مقامی دیسی مسیحی ہوں اور ان کی ہر طرح سے رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ جب کوئی ہندوستانی مسیحی ہو جاتا تو حکومت اور کلیسیا کے اعلیٰ افسران کے روبرو اس کو نہایت شان و شوکت کے ساتھ بپتسمہ دیا جاتا تھا اور اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی جاتی۔ اس سے یہ باور کروانا مقصود تھا کہ ہندوستانیوں کی ترقی کا واحد ذریعہ نئے مذہب کو قبول کرنا ہے۔

۱۵۷۹ء میں شاہ پرتگال کے فرمان کے مطابق وائسرائے نے گوا میں خادمان دین کی ایک مجلس فراہم کی جس کا میر مجلس صدر اسقف تھا، اس میں فیصلہ کیا گیا کہ پرتگیزی مقبوضات میں غیر مسیحیوں کو مذہبی آزادی کا حق نہ دیا جائے کیونکہ حکومت اور کلیسیا دونوں کا ہی مطمع نظر ہے کہ ہندوستان میں مسیحیت کی اشاعت ہو[3]۔

For the three centuries Columbus to Carey, foreign missions were identified with the intolerant and sacrament Arian form of Christianity.[4]

---

1 Thomas, Christians and Christianity in India and Pakistan, p.55

2 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۴۲

3 ایضاً، ص ۴۳

4 Smith, Conversion of India, p.44 مصنف یہاں شاہ ہسپانیہ کے تحت بیرونی خطوں میں تبشیری وفود کا ذکر کر رہا ہے جس کا آغاز کولمبس کی مہم سے کرتا ہے جو اگرچہ اقتصادی غرض سے اتفاقاً امریکہ کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو گیا تھا جبکہ کیری سے مراد پہلا پروٹسٹنٹ انگریز مناد ولیم کیری (۱۷۶۱ء۔۱۸۳۴ء) ہے جو ۱۷۹۳ء کو کلکتہ پہنچا تھا۔

ہندوستان کی کیتھولک تاریخ میں ایک اہم نام برطانوی نژاد تھامس اسٹیفن (۱۵۴۹ء۔۱۶۱۹ء) کا ہے، جو پادری اسٹیوا یا اسٹیویم کے نام سے معروف تھا۔ یہ پہلا انگریز تھا جو ہندوستان میں آباد ہوا۔ فادر تھامس ۱۵۴۹ء میں بمقام بوسٹن پیدا ہوا۔ یہ برطانیہ میں پروٹسٹنٹ ازم کے قدم جمانے کا دور تھا اور اس وقت انگلستان میں کیتھولک کے خلاف سخت رد عمل پایا جاتا تھا۔ یسوعی جماعت سے رابطہ رکھنے والے فادر تھامس نے جدید اصلاح شدہ مذہب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ریاستی مجرم قرار پایا۔ اس کے نتیجہ میں اس کی جوانی کے تیس (۳۰) برس پس زنداں سخت تکلیف و اذیت کی نذر ہو گئے۔ بعد ازاں جان بچانے کے لیے وہ کھسک کر روم چلا گیا۔ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۵۷۹ء کو پرتگیز کے زیر تسلط گوا (انڈیا) پہنچا۔ جہاں اس نے اپنی باقی زندگی مسیحیت کی خدمت میں صرف کر دی[1]۔

وہ پہلا انگریز ہے جو کسی کیتھولک سوسائٹی کے زیر انتظام باہر کسی خطے میں تبشیری سرگرمیوں کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے یہاں آکر اپنے والد اور بھائی کو خطوط لکھے جن میں سفر کے حالات اور یہاں کے لوگوں کے احوال اور معاشرتی و مذہبی رسومات کا تذکرہ تھا۔ وہ یہاں کے لوگوں کے متعلق لکھتا ہے؛

"The people be tawny, but not disfigured in their lips and noses, as the Moors and Kaffirs of Ethiopia".[2]

تھامس اسٹیفن کے ان خطوط نے انگریز لوگوں کو ہندوستان تجارت کی راہ سجھانے میں کردار ادا کیا۔

"Even, if Stephens had written no more, the people of that age were skilled enough in reading between the lines to see India as a market for trade".[3]

اس خط و کتابت سے پتا چلتا ہے کہ پرتگیزیوں نے مقامی مندر تباہ کر دیئے جس کے نتیجہ میں یہاں کی مقامی آبادی نے اپنے مذہب میں پرتگیزی استعمار کی مداخلت پر بہت مزاحمت کی اور کچھ مسیحی منادین کو مار بھی ڈالا تھا۔ جن میں وہ پادری روڈلف اکوایوا، پادری پیٹر وبرنواند فرانسس آرنیا کا نام خصوصی ذکر کرتا ہے۔

اس کا خاص کارنامہ رالف فیچ، جان نیوبرے، جیمس سٹورے اور ولیم لیڈز نامی چار انگریز تاجروں کو موت کی سزا سے بچانا تھا، جنہیں پرتگیزیوں نے جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا تھا۔ انگریز فادر تھامس نے وطن پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت بھاگ دوڑ کر کے انہیں سزا سے بچایا۔ نیوبرے کے خط محررہ ۲۰ جنوری ۱۵۸۴ء میں اس کا ذکر کرتا ہے[4]۔ فادر تھامس نے میراٹھی زبان میں مسیحی عقائد و مذہبی تحریروں کا منظوم مجموعہ مرتب کیا۔ اس کا یہ کام ۱۶۱۴ء میں

---

1 Prasad, Ram Chandra, Early English Travelers In India (Motilal Banarsidass, Delhi 1965), p.1-3

2 Ibid p.4

3 Ibid

4 Ibid p.8

پایہ تکمیل کو پہنچا اور ۱۶۱۵ء میں "Discurso sobre a Vinda do Salvador ao Mundo" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۶۴۶ء میں طبع ہوا، جس کا نام تبدیل کر کے "Christian Purana" رکھ دیا گیا[1]۔

فادر فرانسس زیویئز اور اس کے ساتھیوں نے ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو حکومتی سرپرستی میں عیسائی بنانے کا فریضہ سرانجام دیا اور دوسری طرف مالابار کے نسطوری عقائد کے حامل تومار سول کے معتقدین کو کیتھولک کلیسیا کے تحت لانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ جس کے نتیجہ میں ۱۵۹۹ء میں انہوں نے پوپ کی اطاعت کا جُوا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ یہ جُوا برضا و رغبت نہ تھا بلکہ رومی کلیسیا کے کارپردازوں کی طرف سے زبردستی ڈالا گیا تھا[2]۔ ان لوگوں کے بارے ۲۰ جون ۱۵۹۹ء کو دیام پور میں ۱۵۳ مبلغین اور ۲۰۰ خادمین دین کا منعقدہ اجلاس نو دن جاری رہا۔

It was not the intention of Menezes (The Archbishop of Goa) that the Thomos Christians should discus or disagree; they were to assent and to obey.[3]

آرچ بشپ Menezes نے ان کو رومن کلیسیا کے تحت لانے کے بعد ان کے لیے بہت سی اصلاحات کیں۔

"Some at least of reforms of Menezes were necessary and beneficial. For the most part, they were an extreme example of ecclesiastical aggression and intolerance".[4]

مسیحی مذہبی راہنماؤں کی اخلاقی حالت کا ذکر یوں کیا گیا ہے؛

"پرتگیزی قسیس اور درویش گوا میں منصبی فرائض کی طرف سے غافل ہو کر صرف اپنی طاقت بڑھانے کے چکروں میں لگے رہتے تھے اور خود ہوا اور ہوس کے غلام تھے"[5]۔

اور استعماری طاقت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے؛

"پرتگیزیوں کے اخلاق کو اس بے شمار دولت نے بگاڑ دیا وہ دغا بازی اور لاقانونی میں طاق تھے اور دن دیہاڑے ہندوستان کے سمندروں میں بے باکی سے ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ قرون وسطی کے پرتگیزیوں کے اخلاق بھی اچھے نہ تھے۔ ان کے حکام ظالم اور ستم گر تھے اور پرلے درجے کے رشوت خور اور بددیانت تھے ایسا کہ وہ دیانت داری کو کام میں لانے کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے"[6]۔

---

1 Prasad, Early English Travelers In India, p.8

2 "The tone of the Syrians in general and of the Syrian Catholics in particular indicates that the Synod was imposed upon them by the unscrupulous and crafty Menezies."(Thomas, Christians and Christianity in India and Pakistan, p. 97-98.

3 Stephen Neill ,Builders of the Indians Church,(Edinburgh house Press, London 1934) ,p.23

4 Ibid

5 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۴۹

6 ایضاً، ص ۶۱۔۶۳

پادری ای ایم ویری صاحب نے بجا لکھا ہے کہ؛

The Gospel of Spanish Christianity was a gospel of greed.[1]

حصول دولت کے جنون میں وہ اس حد تک مبتلا ہو چکے تھے کہ وہ جائز و ناجائز کی تمیز سے بھی تہی دست نظر آتے ہیں اور رحم کے لفظ سے تو گویا وہ نا آشنا ہو گئے تھے۔ سالسٹ کے جزیرہ نما کے بہت سے اونچی ذاتوں کے ہندو اور برہمن پرتگیزیوں کے اشاعت مسیحیت کے ظالمانہ طریق کار سے متنفر ہو کر بیجاپور کی سلطنت میں جا کر پناہ گزین ہو گئے، صرف بے بس نیچی ذاتوں کے لوگ ہی رومی کلیسیا میں داخل ہوتے گئے۔

مؤرخ مسیحیت بجا طور پر فرماتے ہیں۔

"قسیسی طبقہ کی غیر رواداری پالیسی نے تمام پرتگیزی حکومت کو متعصب بنا دیا تھا۔ ۱۶۲۹ء میں گوا کے آرچ بشپ نے شاہ پرتگال کو لکھا کہ ہندوستان میں آپ کی سلطنت کے دشمن آپ کے اپنے آدمی ہیں اور ان آدمیوں میں انجمن عیسوی کے مبلغ سلطنت کے بدترین دشمن ہیں"[2]۔

انجمن عیسوی کے مبلغین نے جبر و تشدد اور انعام و اکرام کا لالچ دے کر مسیحیت کی اشاعت کی۔ پادری جان اونگٹن ۱۶۸۹ء میں بمبئی آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ جن لوگوں کی املاک اور جائیدادیں انجمن عیسوی کی خانقاہوں کے نزدیک واقع ہیں ان کو کبھی چین نصیب نہیں ہوتا کیونکہ ان کے عمدہ مقامات ان سے چھینے جاتے ہیں۔ اس طرح کی دھول دھونس کا نتیجہ کلیسا کی آمدنی میں اضافہ کی شکل میں ہوا۔ سالسٹ کے بڑے گرجاگھر کی روزانہ آمدنی سترہویں صدی کے آخر میں آدھا کلو سونے کے برابر تھی"[3]۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مشنریوں کی زبردستی اور مقامی آبادی کو غلامانہ حیثیت دینے کے رویہ کے برعکس ایک پادری رابرٹ ڈی نوبلی (Robert de Nobili) نے ۱۶۲۶ء میں نیا طریق کار اپنایا۔ اس نے مقامی آبادی کے طرز معاشرت کو سیکھنے اور ان کی عادات اور رسم و رواج سمجھ کر انہیں ہمدردی سے عیسائی بنانے کی کوشش کی۔ اس پر اسے کلیسائی روایت سے انحراف کے سنگین الزام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا مقدمہ پوپ کے پاس بھیجا گیا۔ جس نے پادری نوبلی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لیکن پھر بھی یہ کشمکش جاری رہی۔ روم اور گوا کے یسوعی منادین کے درمیان اختلافات پر Indo – Portuguese Schism یا The Goan Schism کی اصطلاح معرض وجود میں آئی۔

---

1 Wherry, E. M., Islam and Christianity in India and the Far East, (Flemi. Revell Company, London1907), p.135

2 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۴۷

3 ایضاً

گوا کا محکمہ احتساب عقائد

کیتھولک کلیسیا ہی نہیں بلکہ تاریخ انسانی کا ایک انتہائی تاریک باب " احتساب عقائد "(Inquisition) ہے۔اس کا باقاعدہ استعمال بارہویں صدی اور اس کے بعد کے ان عیسائی مصلحین کے خلاف ہوا جو بعض شہری و مذہبی آزادیوں کے خواہاں تھے۔ تحریک اصلاح و آزادی کے ان اولین علمبرداروں کو دبانے کے لیے رومی کلیسیا نے بے پناہ تشدد کا سہارا لیا۔ مشہور مؤرخ گبن کی تاریخ میں مذکور ایک خوبصورت جملہ کے مطابق؛

"The Church of Rome defended by violence the empire which she had acquired by fraud.

" رومی کلیسیا نے اپنی سلطنت کی حفاظت تشدد سے کی جسے اس نے دھوکہ سے حاصل کیا تھا"[1]۔

ہندوستانی کلیسیا کا ایک کریہہ منظر۔بقول پادری برکت اللہ۔ رومی کلیسیا کے مبلغین کا انجیل کے محبت کے پیغام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے محکمہ احتساب عقائد کا قیام کروانا ہے۔۱۵۶۰ء میں فادر فرانسس زیوئیر کی درخواست پر گوا میں " محکمہ احتساب "(Inquisition) کے قیام کا بھی عوام کو مسیحی بنانے میں اہم کردار ہے[2]۔

اس نے مسیحی لوگوں کے عقائد کی بھی " تصحیح " کا فریضہ سرانجام دیا اور ساتھ ہی " عقیدے کی تطہیر "کے ضمن میں جس پر بدعتی ہونے کا شبہ ہوتا اس کی " روح کی صفائی " کی جاتی۔(خواہ وہ روح جسد عنصری سے علیحدہ ہی کیوں نہ کرنا پڑتی) یہاں بدعت سے مراد (کیتھولک) عیسائیت کے علاوہ کسی عقیدہ پر عمل کرنا تھا۔ اگرچہ کلیسیائے روم کے تحت محکمہ احتساب باقی عیسائی دنیا میں بھی اپنے " مذہبی تطہیری " کارناموں کی بناء پر شہرت پا چکا تھا، مگر ان سب میں گوا اپنے ظالمانہ ایذیت رسائی کے طریقوں کی بناء پر زیادہ بدنام تھا۔

اختیارات کے ضمن میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب گوا میں یہ ادارہ قائم کیا گیا تو ابتداء میں چار آفیسر مقرر کیے گئے، جن کی مجموعی سالانہ تنخواہ 75 پونڈ تھی۔ اس کے پہلے منتظمین پرتگیز سے یہاں پہنچے اور انہوں نے راجہ کے محل میں مقیم وائسرائے کو ایک چھوٹی رہائش گاہ میں منتقل کرکے علاقے کی سب سے کشادہ اور آرام دہ عمارت کو محکمہ احتساب کی عدالت میں بدل دیا۔ ریکارڈ کے مطابق انہوں نے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے قید خانے قائم کر رکھے تھے، جہاں (مسیحیت نہیں بلکہ) کلیسیا کے مجرموں کو رکھا جاتا۔ صرف ابتدائی سالوں میں ۴۰۰ سے زائد افراد پر مقدمہ درج ہوا اور ۱۲۱ کو سزا کے لیے نصب شدہ کھمبوں(Stakes) کے ساتھ باندھ کر انہیں زندہ جلا دیا[3]۔

---

1 ساجد میر، عیسائیت۔ تجزیہ و مطالعہ، ص ۲۱۵

2 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۷۷

3 Hunter, William, The Imperial Gazetter of India, (Trubner & Co., 1886)

امن اور محبت کے دعوید ار مذہب کے نام پر (قائم ہونے والی) عدالتوں نے ظلم کی انتہاء کر دی جس کا ہر لفظ موت کا جملہ ہوتا تھا"[1]۔

محکمہ احتساب کے ایک اعلیٰ افسر کو شاہی مکتوب میں حکم صادر ہوا،

"ہمیشہ چوکنے ہو کر اپنے فرائض ادا کرو اور بدی کی جڑ میں کلہاڑا مارو کسی بدعتی کو توبہ کا موقع نہ دو مبادا وہ معافی حاصل کر کے آزاد ہو جائے اور دوبارہ بدعت کو اختیار کرے۔ ہمارا نمونہ اختیار کرو جو بدعت کا انکار نہ کرے اس کو زندہ آگ میں جلا دو اور جو بدعت سے توبہ کرے اس کا سر قلم کر دو"[2]۔

بدقسمت مجرم سے اعتراف گناہ اور قبول جرم کے لیے بہت سے طریقے اپنائے جاتے جن میں معروف طریقوں میں سے چند ایک یہ ہیں۔

- ملزم کو باندھ دیا جاتا اور اس کے پاؤں گندھک سے آہستہ آہستہ جلائے جاتے۔
- پانی میں ڈبویا جاتا اور مسلسل غوطے دیئے جاتے۔
- گھومنے والے میز پر بٹھا کر اتنے چکر دیئے جاتے کہ ملزم متلی کی وجہ سے ہی اعتراف کر لیتا۔
- ناخن اکھیڑے جاتے یا ٹانگوں کو کچل دیا جاتا جسے Spanish Boots کا نام دیا گیا تھا۔
- ملزم کو بازو پھیلا کر کھڑا کر کے ان کی بغلوں کے نیچے شمع دان رکھ دیئے جاتے اور اکثر کھولتا ہوا تیل انڈیل دیا جاتا یا ان کے جسموں پر گندھک کے چھینٹے مارے جاتے۔
- لوگوں کو ننگا کر کے ان کے جسموں پر شہد مل کر انہیں باندھ دینا یا لٹکا دینا، تا کہ کیڑے مکوڑے ان کے سارے جسم سے چمٹ جائیں اور انہیں کاٹ کاٹ کر موت سے ہم کنار کر دیں۔
- چمنی میں لٹکا کر نیچے آگ جلا دینا تا کہ دھوئیں سے گھٹ کر مر جائے، یا آہستہ آہستہ آگ میں زندہ جلانا تا کہ اذیت میں اضافہ ہو۔
- بڑی بڑی نصب چکر دار چرخیوں پر ملزم کو باندھ کر انہیں گھمایا جاتا جس سے ملزم کی ہڈیوں کے جوڑ کھل جاتے۔ اس سلسلہ میں Strappado نامی طریقہ سب سے زیادہ مقبول تھا[3]۔

---

1 Sabshena, R.N. Into the Main stream, (Aplinew Publications, 2003), p. 24

2 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص۔ ۲۶

3 امداد صابری، فرنگیوں کے جال میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں؛" ان کے مارنے کا طریقہ کس قدر سفاکانہ ہوتا تھا وہ گوا کے سیاح وزیر نامی کے سفر نامہ میں پڑھیے،" ایک دن صبح کو اس مقام پر گیا جہاں پادریوں کا دار القضاء بنا ہوا ہے۔ دار القضاء کیا تھا مقتل تھا بازار کے بیچ میں ایک بڑا بھاری انجن سولی کی طرح کھڑا تھا جس پر ایک چرخ لگا ہوا تھا انجن پر پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئیں تھیں اس کو استروپیڈو کہتے ہیں۔ جس کے ذریعے سزا دینے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بڑا شہتیر لگا ہوا تھا اس پر انسان کو

انہیں ان تمام طریقوں سے عیسائی بننے پر مجبور کیا جاتا یا پھر "اعتراف گناہ" کے مرحلے سے گذرنا پڑتا۔ "اعتراف گناہ" کے بعد بدنصیب مجرموں کو Fe Auto Da نامی مذہبی رسومات کے دوران کھمبوں سے باندھ کر اکثر گندھک سے لتھڑا لباس پہنا کر، زندہ جلا دیا جاتا اور جو اقرار بدعت کر لیتا اسے جلانے کی بجائے کھمبے پر پھانسی کی رعایتی موت کی سزا دی جاتی[1]۔ مقامی آبادی کی اکثریت ان احتسابی سزاؤں کے ڈر سے عیسائی ہو گئی۔ ایک انگریز مؤرخ پرتگیزی عیسائیوں کے مظالم کی دردناک داستان بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے؛

" واسکوڈے گاما، گلبرل، دی الیدا وغیرہ نے ایسی عجیب وغریب قسم کی بے رحمیاں کی ہیں جن کو شائستگی اور انسانیت کی پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکہ کہنا چاہیے سفاکی، بے دردی اور وحشت ان کے خمیر میں اس قدر تھی کہ بے گناہ قیدیوں، مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی ان کی تلوار اور جبر سے پناہ نہیں ملی "[2]۔

پادری برکت اللہ کے بقول؛

" اس محکمہ کو نہ صرف زندوں بلکہ مردوں پر بھی اختیار حاصل تھا۔ پس اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کسی امیر کبیر کی موت کے مہینوں بعد اس پر فرد جرم لگایا جاتا اور اس کی قبر کھدوا کر اس کی ہڈیاں برسرعام جلا دی جاتیں اور اس کا زرومال ضبط اور جائیداد چھین لی جاتی "[3]۔

محکمہ احتساب عقائد نے تقریباً اڑھائی سو سال تک ہندوستان کے پرتگیزی مقبوضات میں قیامت برپا کیے رکھی۔ سیاح پائرینڈ (Pyrand) ہم کو بتلاتا ہے کہ ہندوستان میں اس محکمہ کی عقوبتیں پرتگال اور ہسپانیہ کے ممالک سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ہندوستان میں اس نے ہزاروں بے گناہوں کو ایذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہزارہا کو آگ میں زندہ جلا دیا۔ لاکھوں کو ایسے زندانوں میں مدت مدید تک ڈالے رکھا جہاں قیدی موت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے[4]۔

سفاکی، شقاوت اور ظلم وتشدد کی مذکور بالا مثالوں کے پیش نظر محققین یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ

کھینچ کر چڑھاتے تھے اور وہاں سے اسے گرا دیتے تھے جس کی ضرب سے اس کی ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں" وہیں کچھ فاصلے پر جزیرہ تھا جہاں پادری کے فتویٰ کے مطابق لوگوں کو زندہ جلایا دیا کرتے تھے۔ جس کے لیے سزا تجویز ہوتی تھی اس کو دارالقضاء کے خوفناک بھتنے شیطان کا لباس پہنا کر لاتے تھے اور جلاد کے حوالے کر دیتے تھے۔ بازار میں علاوہ سور کے دوسرے گوشتوں کی ممانعت تھی۔ (امداد صابری، جہاد آزادی کے روشن چراغ المعروف فرنگیوں کا جال، (دہلی ۱۹۷۹ء)، ص ۳۲

1 www.wakipedia.com/goainquisition.html

2 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۳۲

3 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۷۹

4 ایضاً

Christianity has the distinction among the historic religions of having inflicted torture and death upon those who rejected it, in incomparably greater volume than any other.[1]

(عیسائیت کو تاریخی مذاہب میں یہ "امتیاز" حاصل ہے کہ اس سے اپنے مسترد کرنے والوں کو اتنے زیادہ تشدد اور موت کا نشانہ بنایا ہے کہ کوئی اور (مذہب) اس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا)

لارڈ ایکٹن، جو مشہور مؤرخ اور خود رومی کلیساء کے ممتاز اہل قلم میں سے تھا، لکھتا ہے،

" محکمہ احتساب عقائد کا اصول یہ ہے کہ پوپ کو زندگی اور موت پر اختیار ہے۔ جو شخص اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے اس کو ایذ یتیں دی جائیں اور آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اگر اس مقصد کو سرانجام دینے کے لیے کوئی باقاعدہ کاروائی نہ ہو سکے تو سب قانونی کاروائیوں کو پس پشت پھینک کر ملزم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ بالفاظ دیگر اس محکمہ کا اصول یہ ہے کہ ایسے شخص کو جہاں کہیں پاؤ جان سے مار ڈالو"[2]۔

وہ عیسائی جو کیتھولک مسیحی نہ تھے انہیں بھی اس محکمہ کی "عنایات" کا سامنا کرنا پڑتا۔ مالابار کے شامی نسطوری مسیحی بھی اس محکمہ کی نظر میں بدعتی اور ملحد شمار کئے گئے۔ چنانچہ ایک مہم کے طور پر انہیں رومن کیتھولک کلیسیا کے سائے میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا کچھ دیر کے بعد انہیں لوگوں میں اس مسلط شدہ مذہب کے خلاف تحریک اٹھی۔ جس میں انہوں نے طے کیا کہ وہ اور ان کے بچے رومی کلیسیا سے تعلق نہیں رکھیں گے۔ یہ ہندوستان میں مغربی طاقتوں کے خلاف پہلی آزادی کی تحریک گنی جاسکتی ہے[3]۔

یہ حکم جاری کیا کہ ہندوؤں پر مشتمل اکثریتی مقامی آبادی کے لیے عیسائی ملازم رکھنا جرم ہے۔ نیز کھلے بندوں مذہبی رسومات بجالانا بھی ان کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس طرح بہت سی عبادت گاہوں (مندروں) کو چرچ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی طرح یہ حکم جاری ہوا کہ یتیم ہونے والے بچوں کو فوری طور پر انجمن یسوع کے زیر اہتمام سینٹ پال کالج College of St. Paul of the Society of Jesus کے پادریوں کے حوالے کر دیا جائے جہاں پادری انہیں بپتسمہ دے کر عیسائیت کی مذہبی تعلیم سے آراستہ کریں۔ محکمہ احتساب کی طرف یہ حکم وائسرائے اور گورنر کی تصدیق سے جاری ہوا۔ اگرچہ حکم نامہ میں تو صرف یتیم بچوں کا ذکر تھا تاہم ان بچوں کو بھی جن کے والدین حیات ہوتے زبردستی اغوا کر کے یہاں پہنچا دیا جاتا۔ خوش قسمت والدین وہ تھے جو مسیحی مذہبی راہنماؤں کو رقم ادا کر کے اپنے بچوں کو ان کی دسترس سے بچا لیتے[4]۔

---

1 Rationalist Encyclopedia, p.411 بحوالہ مسیحیت۔ تجزیہ و مطالعہ از ساجد میر، ص ۴۴۲

2 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۸۷

3 Rule, William Harries, History of Inquisition, Wesleyan Conference, (London1868), p.

4 Priolkar A.K. The Goa Inquisition, (Bombay University Press, Bombay 1961), p.

۱۵۶۰ء میں قائم ہونے والا یہ ادارہ تقریباً ۲۵۰ سال تک اپنی سرگرمیاں مذہبی جوش و خروش کے ساتھ ذمہ داری سمجھ کر نبھاتا رہا۔ ۱۷۷۴ء سے ۱۷۷۸ء کے درمیانی عرصہ میں اسے جزوی طور پر ختم کیا گیا۔ ۲۵۲ سالوں کے بعد ۱۶ جون ۱۸۱۲ء کے دن ڈون جوسے نے باقاعدہ اس محکمہ کا خاتمہ کر کے گویا لوگوں کو مذہبی آزادی دی[1]۔

بابائے اردو لکھتے ہیں:

" پرتگالی حکومت کا صحیح تصور اس سنگی تصویر سے بخوبی ہوتا ہے جو گوا میں ایوان وائسرائے کی محراب پر بنی ہوئی ہے۔ وہ ایک سینٹ (یعنی ولی) کی تصویر ہے، جس کا مقدس قدم منہ کے بل پڑے ہوئے غریب ہندوستان کی گردن پر ہے اور دست مبارک میں ننگی تلوار ہے جس کی نوک ہندوستان کی جانب ہے۔ اب آپ سمجھ لیجیے کہ جن کے ولی ایسے ہیں ان کے شیطان کیسے ہوں گے"[2]۔

ایک بار آرچ بشپ کو شکایت کی گئی کہ مقامی لوگوں کو مسیحی بنانے کے لیے کچھ مبلغین نرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ اس بات پر زور دیا گیا کہ انہیں زبردستی بپتسمہ لینے پر مجبور کیا جائے۔

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوا اور اس کے مضافات کے باشندوں کو مسیحی بنے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ صرف ایک سال ۱۵۶۰ء میں ۱۳۹۶۷ شخص کلیسیا میں شامل ہوگئے[3]۔ سولہویں صدی کے اواخر میں انجمن عیسوی کے مبلغین کی تعداد تقریباً دو سو جب کہ پرتگیزی مقبوضات میں ہندوستانی مسیحیوں کی تعداد پونے تین لاکھ کے قریب تھی۔

مشرقی ایشیاء کے علاوہ ان کیتھولک مسیحی منادین کی تبلیغی کاوشیں گوا سے باہر ہندوستان میں مغلیہ دربار تک زیادہ رہیں۔ یہ مسیحی مناد مسیحیت کی تبلیغ کے لیے مغل حکمران جلال الدین اکبر (۲۳ نومبر ۱۵۴۲ء۔ ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کے دربار میں بھی گئے۔ اکبر کے دربار میں تین بار پادری لوگ آئے۔ ۱۷ نومبر ۱۵۷۹ء میں گوا سے تین مسیحی مبلغین روڈلف ایکوا ویوا Rudolf Aquaviva (م ۱۵۸۳ء)، فرانسو ہانریک Francois Henriques، اور انتھونی مونسیراتو Anthony Monsesrate[4] پر مشتمل پہلا وفد روانہ ہوا جو ۲ فروری ۱۵۸۰ء کو اس کے دربار میں پہنچے۔ ان لوگوں نے ۳ مارچ ۱۵۷۹ء کو اکبر کو رائل بائبل کی ایک کاپی پیش کی جس کی جلد کا قبضہ سونے کا تھا اور یہ شاہ فلپ

---

1 پادری برکت اللہ اس کے بند کرنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ یہ بات قابل ذکر کہ محکمہ احتساب کو کسی اخلاقی یا مذہبی بنا پر بند نہیں کیا گیا اس کو ختم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا اثر نقل مکانی کی وجہ سے پرتگیزی صنعت و حرفت اور تجارت پر بھی طرح پڑا۔ (برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص۷۷) اگرچہ دور حاضر میں محکمہ احتساب عقائد ختم کر دیا گیا ہے لیکن تا حال رومی کلیسیا اس محکمہ کو اصولاً تسلیم کرتی ہے۔

2 مولوی عبدالحق، خطبات عبدالحق، ص ۳۲۲

3 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۴۷

4 اس نے ۱۵۹۱ء میں عہد اکبری پر ایک کتاب Commentary لکھی۔

کے لیے چھاپی گئی تھی۔ یہ بائبل چار زبانوں عبرانی، کلدانی، لاطینی اور یونانی زبان میں تھی[1]۔ اکبر نے ان دونوں عیسائی پادریوں کو شاہی عبادت خانہ کے پاس "خوشبو خانہ" میں ٹھہرایا۔ ان معلموں نے جلد ہی "خوشبو خانہ" کو گرجاگھر میں تبدیل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شمالی ہند کا پہلا گرجاگھر تھا جو عہد اکبری میں قائم ہوا[2]۔

اکبر کے پاس تثلیث، جنت اور رسول اکرم محمد ﷺ اور حضرت عیسی علیہ السلام کی بابت مناظرانہ باتیں ہوتیں۔ ان مناظروں کے دوران ایک موقع پر شیخ قطب الدین جالیسری نے کہا کہ ایک بڑا ڈھیر آگ کا دہکاؤ جس کو دعویٰ ہو میرے ساتھ آگ میں کود پڑے۔ (دونوں الگ الگ قرآن اور انجیل ساتھ لیں گے) جو صحیح سلامت نکل آئے وہ حق پر ہے۔ آگ دہکا کر انہوں نے ایک پاپا (پادری روڈلف) کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "بسم اللہ" لیکن پاپاؤں نے کہا یہ خلاف عقل ہے"[3]۔

انہوں نے اکبر سے درخواست کی کہ ان کو خاص و عام انجیل کے پرچار کی اجازت دے اور ہر شخص کو بپتسمہ لینے کی اجازت مرحمت کرے، بادشاہ نے دونوں درخواستیں منظور کر لیں۔ انھیں شفاخانہ (بیماروں کو دم کرنے کے لیے) قائم کرنے اور مسیحی جنازہ کو علانیہ رسومات کے مطابق اٹھانے کی اجازت دے دی۔ یہ جماعت ۱۵۸۳ء میں گوا واپس چلی گئی[4]۔

۱۵۹۱ء میں مبلغین کی دوسری جماعت اکبر کے پاس آئی جس میں پادری دوارتے لئی تاؤ Duarte Leitao ، پادری کرسٹوفل دے ویگا Christofle De Vega اور پادری ایستواؤ ابیرو Estevaa Rebeiro شامل تھے یہ لوگ ۱۵۹۲ء میں واپس چلے گئے۔ تیسری جماعت ۳ دسمبر ۱۵۹۴ء کو گوا سے روانہ ہوئی اور ۵ مئی ۱۵۹۵ء کو لاہور پہنچی۔ جس میں

---

1 یہ بائبل بعد میں یسوعی جماعت کو واپس کر دی گئی تھی جو ۱۸۵۷ء تک کیتھولک ہاتھوں میں رہی اور ۱۸۵۷ء کے لکھنؤ ہنگاموں میں یہ کہیں گم ہو گئی۔ Powel. Missions and Missionaries in pre-Mutiny India , p10

2 ماہنامہ "تعمیر افکار" عزیز الرحمن، سید، عالم اسلام اور کرنے کے کام، ج 8، ش 1، جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۳، زوار اکیڈمی، کراچی

3 صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۴۰؛ پادری برکت اللہ کے بقول مبلغ نے کہا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کی آزمائش نہ کر (متی ۷:۴) (برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۱۶۸) یہ بات قابل غور ہے کہ بار بار مسلمانوں سے نبوی معجزات کے طالب مسیحی منادایک انجیلی حکم کا سہارا لے کر لوگوں کے سامنے اپنے سچے ہونے کا موقع گنوا بیٹھے۔ ان کے سامنے مسیح کا یہ انجیلی بیان بھی تھا، " میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی اعتقاد ہو گا تو تم اس پہاڑ سے کہو گے کہ یہاں سے وہاں چلا جا تو وہ چلا جائے گا اور کوئی بات تمہارے لیے ناممکن نہ ہو گی"۔ (متی ۱۷ : ۲۰)؛ "میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ بھی یہ کام کرے گا جو میں کرتا ہوں بلکہ ان سے بھی بڑے کام کرے گا"۔ (یوحنا ۱۴ : ۱۲)

4 P. Thomas, Christians and Christianity in India and Pakistan, p 97-98.

فرانسس زیوئیر کا بھتیجا پادری جیروم زیوییئر (م ۱۶۱۷ء) ، پادری عمانوئیل پن ہیرو اور پادری بنی ڈکٹ گوئیس (م ۱۶۰۷ء) شامل تھے [1]۔ بادشاہ نے ان پادریوں کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا وہ ان کی ہر جائز درخواست پر غور کر کے اس کو شرف قبولیت بخشا، خندہ پیشانی سے ملاقات کرتا اور ان کو ہر طرح کا آرام اور دلاسہ دیتا، ان کی دل جوئی کرتا۔ یہ پادری ہر بات میں تعصب اور تنگ خیالی سے کام لیتے ہوئے (بزعم خویش) صاف گوئی اور اکثر اوقات درشت کلامی بلکہ دریدہ دہنی تک پہنچ جاتے۔ پادری برکت اللہ کے بقول؛

"پادری زیوییئر، اکبر کے دربار میں مسلم علماء سے مناظرہ کے دوران دریدہ دہنی سے کام لیتا تھا۔ اس کے ایک خیر خواہ نے مباحثہ کے بعد اس کو سمجھایا کہ الفاظ تول کر منہ سے نکالا کرو۔ جب میں تمہاری باتوں کو سن رہا تھا تو میرا جی کرتا تھا کہ تم کو چھری سے ہلاک کر دوں حالانکہ میں تمہارا دوست ہوں" [2]۔

ان کے دلائل دقیانوسی اور سطحی قسم کے ہوتے جو مغربی ممالک کے مسیحی صدیوں سے رٹتے چلے آتے تھے اس پر ستم یہ کہ وہ قومی اور ملی تعصبات سے بھی خالی نہ تھے۔ مثلاً وہ کہتے کہ قرآن کو خود خدا نے آسمان سے بذریعہ وحی نہیں اتارا، بلکہ لوگ رسول اللہ ؐ کی امداد کیا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ ایک مسیحی راہب بھی تھا جس کی مدد سے آپ ؐ نے قرآن کے متعدد مقامات لکھے [3]۔ غالباً ان کا یہ رویہ اور زبان یہاں مسیحیت کی تبلیغ میں آڑے آئی۔ تیسری جماعت کے مبلغین شاہ ہسپانیہ اور گوا کی حکومت کے آلہ کار بن گئے۔ ان امور کو دیکھ کر ہمیں تعجب نہیں ہوتا کہ انجمن عیسوی کے یہ مایہ ناز مبلغین اپنے اصلی مقصد یعنی مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں ناکام رہے۔ ان مبلغین کے اکبری دربار میں جانے کے دو مقصد تھے۔ ایک مذہبی دوسرا سیاسی۔ مذہبی مقصد کہ اکبر بادشاہ مسیحیت کو قبول کر لے اور مغلیہ سلطنت میں مسیحیت کی اشاعت ہو۔ جب کہ سیاسی پہلو اکبر کی حکومت کی جاسوسی کرنا تھا۔ وہ ابتداء ہی سے مغلیہ سلطنت کی ایک ایک بات پرتگیزی حکومت تک پہنچا دیتے تھے۔ یوں مبلغین پولیٹیکل ایجنٹ بن گئے اور سیاسی چالوں میں الجھ گئے۔ اس پر مسیحی اہل قلم ان الفاظ میں اظہار افسوس کرتا ہے؛

"ہمیں ان کی حالت پر ترس آتا ہے کیونکہ ان مبلغین کی سیاسی امور میں مداخلت پرتگیزی حکومت اور تجارت کے کام بھی نہ آئی وہ تارک الدنیا تھے لیکن انہوں نے یورپین ممالک کے بین الاقوامی تعصبات کو ترک نہ کیا جس کی وجہ سے نہ وہ دین کے رہے نہ دنیا کے رہے" [4]۔

---

1 Thomas, Christians and Christianity in India and Pakistan, , p110-111

2 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۱۸۱

3 ایضاً

4 ایضاً، ص ۲۹۴۔۲۹۵

کسی پرتگیزی مسیحی نے اکبر کو یہ خبر دے دی کہ مبلغین گوا کی حکومت کے جاسوس ہیں اور درپردہ حکومت کی خبر رسانی کرتے ہیں۔ جب اکبر اور اس کے درباریوں نے مبلغین کی انگریز سفیر ملڈن ہال کے مقابلہ میں مقامی لوگوں سے سازباز اور گانٹھ سانٹھ کو دیکھا اور ان کو بھیڑ کے لباس میں بھیڑیے پایا اور ان کی سیاسی چالبازیاں دیکھیں جو مسیحی اخلاقیات کے منافی تھیں تو ان کے دلوں پر بہت بُرا اثر پڑا۔

شمالی ہند میں رومی کیتھولک کلیسیا اور غیر رومی کلیسیاؤں میں کشمکش شروع ہو گئی تھی اس کا نتیجہ (جو کلیسائے ہند کے لیے زہر قاتل نکلا) یہ ہوا کہ مبلغین کی توجہ غیر مسیحی ادیان کے پیروکاروں سے ہٹ کر اس بات پر مرکوز ہو گئی کہ غیر رومی کلیسیاؤں کے مسیحیوں کو پاپائے روم کا معتقد بنایا جائے۔ آرمنی مسیحیوں نے ایک آرچ بشپ کو اکبر کے دربار میں کتاب مقدس، مشرقی علماء مسیحیت کی متعدد تصانیف اور بیش قیمت تحائف کے ساتھ بھیجا۔ جب پرتگیزی مبلغین کو اس بات کا پتا چلا تو انہوں نے گوا کی انتظامیہ کو اس کی اطلاع دے دی اور وہ آرچ بشپ راستے میں ہی مارا گیا۔ اس کا سامان اور کتابیں لوٹ لی گئیں جو اکبر کی بجائے پادری پن ہیرو کے ہاتھ آگئیں[1]۔

اکبر نے ۱۵۹۵ء میں زبانی اجازت دے تھی کہ مسیحی مبلغ انجیل کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو تبدیلی مذہب کی اجازت ہے۔ پھر ۱۶۰۲ء میں ایک فرمان کے ذریعے یہی اجازت دے دی۔ ۱۶۰۷ء تک آگرہ میں مسیحیت قبول کرنے والوں کی کل تعداد ستر تھی۔ مبلغین نے ہندومت کو "خاردار زمین" اور اسلام کو "پتھریلی زمین" پایا اور لکھا کہ مسلمانوں کو یہ منوانا آسان ہے کہ مسیحیت برحق ہے لیکن انہیں تبدیلی مذہب پر رضامند کرنا دشوار ہے[2]۔

اکبر نے ابوالفضل فیضی کو انجیل کے ترجمہ پر مامور کیا جس میں بسم اللہ کی بجائے یہ شعر لکھا گیا۔

اے نام تو وے جیزز وکرستو　　　سبحانک لا الہ الا ھو[3]

اکبر ان سے مسیحی مذہب کے متعلق استفسار کرتا رہتا تھا جیسے اس نے ایک بار پوچھا تو پادری نے بتایا کہ لوگ پوپ کے پاؤں کو نہیں بلکہ صلیب کو بوسہ دیتے ہیں جو اس کے پاؤں کی جوتی پر ہوتی ہے۔[4]

اکبر کے درباری ارمنی تاجر سکندر نصرانی کی بیوی مر گئی تو اکبر نے چاہا کہ وہ اپنی سالی سے شادی کر لے۔ پادری زیویئر نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا۔ اکبر کی ناراضگی پر اس نے

---

1 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۱۹۹

2 ایضاً، ص ۱۹۹

3 فانی، مرزا محسن، دبستان مذاہب، (بمبئی، س ن)، ص ۲۷۶

4 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۱۸۵

پاپائے روم سے خصوصی اجازت لے کر اس کا نکاح پڑھا دیا۔[1] ۱۶۹۹ء میں آگرہ میں پہلا گرجا گھر سرکاری سرپرستی میں تعمیر ہوا۔ اکبر پرتگیزیوں کو اپنے ہندوستان میں مداخلت کرنے والا سمجھتا تھا کیونکہ اس کے جہازوں کو مکہ جانے کے لیے ان سے پروانہ راہداری لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ اکبر کی ماں "مریم مکانی" نے اکبر سے کہا کہ جس طرح پرتگیزیوں نے قرآن کو کتے کے گلے میں لٹکا کر شہر اور مز میں پھرایا تھا اسی طرح عیسائیوں کی بائبل کو گدھے کے گلے میں لٹکا کر اس کو آگرہ کے شہر میں پھرایا جائے لیکن اکبر نے کہا کہ کسی مذہب کی تحقیر کرنی در حقیقت خدا کی تحقیر کرنی ہے اور برائی کے بدلے برائی کرنا بادشاہوں کے شایان شان نہیں ہے۔ بائبل نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس سے اس قسم کا انتقام لیا جائے[2]۔

پادری جیروم زیویئر نے اکبر کے درباری عبد الستار بن قاسم لاہوری (ترجمان) کی مدد سے فارسی زبان میں ذیل کی کتب لکھیں۔ مراۃ القدس[3]، چشمہ حیات یعنی آئینہ حق نما[4]، انتخاب آئینہ حق نما[5]، زبور کی کتاب کا فارسی ترجمہ، اناجیل کا ترجمہ، بیان ایمان عیسویان، تاریخ شہداء و مقدسین، انتخاب عقائد دین عیسویان،

---

1 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۲۱۷

2 ایضاً، ص ۱۶۹

3 یہ پہلے پہل پرتگیزی زبان میں لکھی گئی پھر عبد الستار ترجمان کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کے پہلے باب میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور طفولیت کا ذکر دوسرے میں آپ کے معجزات، تیسرے میں آپ کی صلیبی موت اور چوتھے میں اس کے بعد کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اکبر نے خود اس کا نام مراۃ القدس تجویز کیا۔ جہانگیر کے لیے نقل کیے گئے نسخہ میں نو عدد تصویریں ہیں۔ اس کا دیباچہ ۱۶۰۲ء میں آگرہ میں لکھا گیا۔ ایک غیر مکمل نسخہ لاہور کے عجائب گھر میں ہے۔ اس میں گیارہ تصاویر ہیں اور اکبر کی مہر بھی ثبت ہے۔ ۱۶۲۷ء کا محررہ مکمل نسخہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے۔

4 ۱۵۹۷ء میں پرتگیزی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا فارسی ترجمہ ۱۶۰۹ء میں کیا گیا۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول:۔ پانچ ابواب (اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ہدایت بھیجنے کے لیے کس مذہب کو چنا)۔ حصہ دوم:۔ آٹھ ابواب (ذات وصفات الٰہیہ جن کا ذکر کتاب مقدس میں ہے۔ توحید فی التثلیث وغیرہ)، حصہ سوم:۔ نو ابواب (الوہیت مسیح کا ذکر، کلمۃ اللہ اور روح اللہ کی انجیلی تشریح)، حصہ چہارم: آٹھ ابواب (اسلام اور مسیحیت کی تعلیمات کا موازنہ)، حصہ پنجم:۔ آٹھ ابواب (مسیحیت کو مذاہب عالم سے برتر" افضل ثابت کیا گیا ہے)۔ مکالماتی انداز میں پادری ایک روشن خیال فلاسفر (اکبر بادشاہ) سے بات کرتے ہوئے مسلم اعتراضات کو رد کرتا ہے جو دوران مکالمہ ایک مسلم عالم پیش کرتا ہے۔" اسلام اور مسیحیت کے مابین بمشکل کوئی ایسا متنازعہ فیہ مسئلہ ہو گا جس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

5 آئینہ حق نما سے عبارت آرائی اور مکالمات کو حذف کر کے چار ابواب پر مشتمل یہ خلاصہ تیار کیا گیا ہے اس کی نقل جب ایران

داستان مسیح

HISTORIA CHRISTI PERSICE

Conſcripta, ſimulque multis modis contaminata,

A

P. HIERONYMO XAVIER, Soc. Jeſu.

LATINE

Reddita & Animadverſionibus notata

A

LUDOVICO DE DIEU.

LVGDVNI BATAVORVM,

Ex Officina Elſeviriana, A° cIↃ IↃ CXXXIX.

1609ء میں شائع شدہ داستان مسیح از جیروم زیویر کا سرورق

داستان مسیح[1]، القرآن[2]، سوال جواب کی کتاب[3]۔ اس کی مزید تحریریں بھی ہیں۔

بعد ازاں نور الدین جہانگیر بادشاہ غازی (۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء۔ ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۸ء) کے دربار میں ان مسیحی مشنری افراد کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔ لیکن اس دور میں انگریز حکومت سے سیاسی تعلقات کی بنا پر برطانوی پروٹسٹنٹ لوگوں کی جہانگیر کے دربار میں رسائی ہوگئی اور ان کے ساتھ مذہبی رقابت پرتگیزی مشنریوں کا مقصد وحید بن گیا۔ انگریز پرتگیزیوں کے، پرتگیز انگریزوں کے اور دونوں ولندیزیوں کے خلاف جہانگیر کے کان بھرتے رہتے تھے۔ شہنشاہ ان کے اس عیب جوئی کے رویہ سے تنگ آگیا۔

۱۶ اپریل ۱۶۰۹ء میں جہانگیر کے دربار میں ولیم ہاکنس برطانوی سفیر بن کر آیا۔ جہانگیر نے شاہ انگلستان کا خط پادری زیوئیر کو دیا کہ پڑھے۔ اس نے کہا کہ اس خط کے الفاظ ناشائستہ ہیں اور جہاں پناہ کے لائق نہیں۔ ہاکنس سے رہا نہ گیا کہنے لگا یہ پرتگیز ہمارے ملک اور بادشاہ کے دشمن ہیں۔ یہ پادری ہذیان بک رہا ہے جب میرا بادشاہ حضور کے الطاف خسروانہ کا امیدوار ہے تو وہ کس طرح ایسے الفاظ اپنے خط میں لکھ سکتا ہے، جو جہاں پناہ کی شان کے خلاف ہوں[4]۔

جہانگیر نے ہاکنس کو شاہی ملازم رکھ لیا اور تیس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا اسے انگلس خان کہا جاتا تھا۔ جہانگیر کے دربار میں موجود انگریز مسیحی، پرتگیزی مبلغین کو طعنے دیا کرتے تھے مثلاً ودانگٹن (Withington) اور ٹیری (Terry) وغیرہ کہتے کہ نو مرید مسیحی "روپیہ کی خاطر" بپتسمہ پاتے ہیں کیونکہ پرتگیزی پادریوں کو اکبر سے پچاس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ جہانگیر نے غرباء کی امداد کے لیے مزید پچاس روپے ماہوار دے دیئے۔ اس نے ہر مبلغ کے لیے روزانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پادری زیوئیر کو دس روپے روزانہ ملتا تھا۔ دیگر مبلغین میں سے کسی کو سات روپے کسی کو پانچ روپے اور کسی کسی کو تین روپے ملتے[5]۔

پہنچی تو اس کا جواب مسلم عالم احمد بن زین العابدین نے " مصقل صفا در تجلیہ و تصفیہ آئینہ حق نما در رد مذہب نصاری کے نام سے دیا جو ۱۶۲۳ء میں شائع ہوا اس کا جواب الجواب عربی میں ۱۶۲۸ء میں روم سے دیا گیا ایک اور جواب فرانسسکی پادری فلپ گوادانیولی نے عربی میں ۱۶۴۹ء میں لکھا جو شاہجہان کے دور میں ہندوستانی بشپ میتھیوس کے پاس تھا۔

1 اکبر کی فرمائش پر حضرت عیسیٰ اور چار حواریوں کے حالات زندگی پر لکھی۔ اکبر کی وفات کے بعد اس پر اضافے کر کے ۱۶۰۷ء کو جہانگیر کو پیش کی گئی اس میں تصاویر بھی شامل تھیں۔ ۱۶۰۹ء میں زیوئیر نے اسے مکمل کیا۔

2 چونکہ زیوئیر عربی سے ناواقف تھا۔ اس نے بار بار اپنے یورپین احباب سے فرمائش کی کہ اسے قرآن کا لاطینی، اطالوی یا ہسپانوی یا پرتگیزی ترجمہ بھیجا جائے اس نے کوشش کر کے ۱۶۱۵ء میں فارسی ترجمہ کروایا پھر فارسی ترجمہ کا پرتگیزی ترجمہ کیا۔

3 ہندوستانی مسیحیوں کے لیے ۱۶۱۱ء میں لکھا۔ مقامی مسیحی سمجھتے تھے کہ اصل انجیل پرتگیزی زبان میں ہے ان کے لیے یہ رسالہ لکھا گیا۔

4 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۲۴۲۔ ۲۴۲

5 ایضاً، ص ۲۴۸

لاہور میں گرجا کی تعمیر کی اجازت اور ۱۲ بیگھے زمین عطا کرنے کے جہانگیر کے دو فرامین کا عکس

جہانگیر کے درباری نواب مقرب خان کے لے پالک بیٹے، سعد اللہ کو پادری پن ہیرو نے تندرست ہونے پر بپتسمہ دیا۔ لیکن بڑا ہو کر یہ بہت پابند شریعت مسلمان بنا اور ہر وقت گردن میں قرآن حمائل کیے رکھتا۔ ۵ ستمبر ۱۶۱۰ء کو جہانگیر کے بھتیجے داماد شہزادہ طہورث اور اس کے دو بھائیوں کو بپتسمہ دیا گیا۔ ۱۶۱۳ء میں پرتگیزیوں نے عہد شکنی کرکے جہانگیر سے جنگ کی تو شہزادوں نے مسیحیت ترک کر کے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ بلکہ جہانگیر نے لاہور کا گرجا بند کرنے کا حکم دیا۔ اٹھارہ ماہ بعد جب حالات ٹھیک ہوئے تو جہانگیر نے ایک فرمان کے ذریعے گرجا اور سامان واپس کر دیا اور ۱۶۲۶ء میں جہانگیر نے اپنی وفات کے ایک سال پہلے دیا کہ ۱۲ بیگھ زمین گرجا کی ملکیت میں دے دی جائے*۔

دارا شکوہ مسیحیت میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ ایک مسیحی مورخ کے مطابق؛

"اگر دارا سریر آرائے سلطنت ہو جاتا اور اس کا زور چلتا تو اسلام کی جگہ کفر اور یہود و ترسا (مسیحیت) کے مذاہب کا دور دورہ ہو جاتا"[1]۔

اورنگ زیب ایک متدین مسلم حکمران تھا۔ اس کے دور میں مسیحیت کو کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی۔ اس کی وفات کے وقت کل تین سو مسیحی آگرہ میں تھے۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں ۱۷۴۷ء میں ایک پادری سٹروبل (Strobl) لکھتا ہے کہ دہلی میں نہ تو کوئی شخص مسیحی ہوتا ہے اور نہ ہم کسی کو مسیحی بنانے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں ۱۷۸۱ء خاص دار الخلافہ دہلی کی اس کیتھولک کلیسا کا یہ حال تھا کہ وہاں نہ تو کوئی مبلغ تھا اور نہ کوئی گرجا اور نہ گرجا بنانے کے لیے زر تھا[2]۔

اورنگ زیب کی موت کے پچاس سال بعد انجمن عیسوی کی حالت مغرب کے ممالک میں بھی بدتر سے بدتر ہوتی گئی اس کا ردعمل مغلیہ سلطنت میں انجمن کی شاخوں پر پڑا۔ ۱۷۵۹ء میں شاہ پرتگال نے اس انجمن کے تمام شرکاء کو پرتگیزی مقبوضات سے خارج کر دیا۔ چنانچہ گوا کا مرکز انجمن ختم ہو گیا اور اس کے خاتمہ سے مغلیہ سلطنت میں انجمن کی شاخیں بند ہو گئیں، یوں ایک مسیحی تبلیغی انجمن جو ایک مسلمان بادشاہ (اکبر) کے اصرار پر آگرہ میں قائم ہوئی اس کو پرتگال کے مسیحی بادشاہ نے بند کر دیا۔ ۱۷۶۴ء میں لوئی پانزدہم شاہ فرانس نے انجمن کا فرانسیسی مقبوضات میں خاتمہ کر دیا۔ ۱۷۷۳ء میں پوپ کلیمنٹ چہاردہم نے انجمن عیسوی کو ممنوع قرار دے کر توڑ دیا[3]۔ گوا کی انجمن

---

* اس کا عکس دیا جا رہا ہے۔

1 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۳۲۳

2 ایضاً، ص ۴۵۵

3 ایضاً، ص ۴۳۱

یسوعی ہند ۱۵۴۳ء سے ۱۸۰۳ء تک مسیحیت کی تبلیغ کرتی رہی۔ ۱۸۰۳ء میں اس کا آخری مبلغ وینڈل Wendel لکھنؤ میں آنجہانی ہوا تو اس کے ساتھ ہی انجمن عیسوی کا جنازہ بھی ہندوستان سے نکل گیا۔

امداد صابری کے مطابق اس سوسائٹی کے علاوہ درج ذیل کیتھولک سوسائٹیاں بھی سرگرم عمل رہیں۔

- میلان ہیمیری فورفورن مشن: ۱۸۵۰ء کو قائم ہوا ہندوستان میں اس کا عملی میدان حیدر آباد اور کشن گڑھ بنا۔
- بل ہل سوسائٹی: ۱۸۶۶ء میں بنی اس کا حلقہ عمل پنجاب، کشمیر لداخ، تیلگو تھا۔
- جے سوسئٹس مشن: اس کی جدوجہد کا دائرہ بمبئی، پونہ، کلکتہ، مارورہ، منگلور، ترچنا پلی تھا۔
- فرانسیسی کن مشن: یہ فرانسیسی سوسائٹی تھی آگرہ، لاہور، الہ آباد میں اس نے کام کیا۔
- کرجے لائٹ مشن: ویراپولی، کلون میں عیسائیت کا پرچار کیا۔

کیتھولک تبلیغی کام کے حلقے ۳۵، گرجے ۴۷۵۶، پادری یونین ۸۲۶، غیر یورپین پادری ۱۵۵۰، سکول ۳۵۶۲، خیراتی سوسائٹیاں ۱۶۲ تھے[1]۔

۱۸۵۷ء میں برٹش انڈیا میں کل کیتھولک آبادی ۸۵۸، ۸۰۱ تھی۔ ۱۸۸۵ء میں پرتگیزی علاقے میں ۴۷۷، ۲۵۲ تھے۔ جبکہ ۱۹۰۴ء میں ہندوستان (سری لنکا سمیت) میں کیتھولک عیسائیوں کی تعداد ۲،۱۹۱،۳۶۲ تھی جبکہ اس وقت کل آبادی کا تخمینہ ۰۰۰، ۰۰۰ ۲۸۶ تھی[2]۔

سر تھیوڈور موریسن مغلیہ بادشاہوں، انگلستان اور فرانس کے بادشاہوں اور درباریوں کے اخلاق کا مقابلہ کر کے لکھتا ہے کہ سترھویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا دربار اخلاقی اعتبار سے شاہان فرانس اور انگلستان کے درباروں سے کہیں بڑھ کر تھا ایک لحاظ سے ہندوستان اور فرانس اور انگلستان کے درباروں میں نمایاں فرق یہ تھا کہ انگلستان کے امراء اپنی بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو کو اپنے بادشاہوں کی نذر کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ گو مغلیہ بادشاہ عیاش تھے لیکن ان کے امراء کبھی اپنی بیٹیوں کو عصمت دری کے لیے ان کی نذر نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان میں اس قسم کی حرکت کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن فرانس اور انگلستان میں درباری اس قسم کی گھنونی حرکت میں پیش پیش تھے'[3]۔

اس دور کے ہندوستان اور مغرب کا ایک اور معاشرتی تقابل یوں کیا گیا ہے

"قرون وسطیٰ میں مغربی ممالک کی عدالتوں میں حیوانات پر باقاعدہ قانونی طور پر مقدمات چلائے جاتے تھے ان کے

---

1 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۸۰

2 برکت اللہ، پادری، کلیسائے ہند اور خادم الدین، ص ۷۸

3 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۲۶۸ بحوالہ جرنل آف انڈین ہسٹری بابت اگست ۱۹۲۶ء

خلاف اور ان کی طرف سے وکیل اور گواہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک صدی میں ایسے دوصد مقدمات کا ذکر پایا جاتا ہے جن میں بیلوں، گھوڑوں، چوہوں، کیڑوں مکوڑوں، ریچھوں، پاگل کتوں، سؤروں، بلیوں اور بکریوں سانپوں وغیرہ پر مقدمات کئے گئے اور ان کو پھانسی دی گئی یا آگ میں جلایا گیا۔[1]

حق تو یہ ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ہندوستان کی علمی حالت ملکہ انگلستان الیزبتھ کی رعایا سے بدرجہا بہتر تھی"[2]

فرنگیوں کی عورتوں کی حالت منوچی بایں الفاظ بیان کرتا ہے؛

" میں نے بارہا دیکھا ہے کہ ان کی عورتیں اپنے بیمار بیٹے بیٹیوں کو مسلمانوں کے مزاروں اور قبروں پر بھیجتی ہیں تاکہ پیروں کی کرامات سے وہ تندرست ہو جائیں بیچارے مبلغین ان کو ہزار سمجھاتے ہیں لیکن وہ نہیں سنتیں اور نہ وہ انجیل کے احکام اور کلیسائی قوانین کی پرواہ کرتی ہیں"[3]۔

مغلیہ عہد میں کیتھولک مسیحیت کی محدود اشاعت کے اسباب

گو اسے باہر ہندوستان میں مبلغین زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

- ایک وجہ یہ تھی کہ مبلغین نے توجہ بادشاہ کے تبدیلی مذہب پر دی عوام کو تبلیغ نہ کی۔ مثلاً زیویئر کو اکبر اور جہانگیر کے مسیحی بنانے کا شوق دامن گیر ہوا اس کو ہندومت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پادری مانسیرٹ بھی درباری حلقوں کے باہر انجیل کی اشاعت و تبلیغ نہیں کرتا تھا۔ پادری ایکوا ویوا عزلت نشین شخص تھا جس کو اکبر کی رعایا میں انجیل کی بشارت دینے کی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔
- ان بدیسی مسیحیوں کی روحانی زندگی ایسی گھنونی تھی کہ ہندو اور مسلمان ان سے نفرت کرتے تھے۔ مسیحی مبلغ Schwartz نے ایک بار اپنے ایک ہندو دوست کو ایک رقاصہ کے ساتھ دیکھا تو اسے گناہ سے بچنے کی تلقین کی اور کہا کہ ایسی بُری عادت والے لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ اس پر رقاصہ، جو کہ یورپین لوگوں کو اچھی طرح جان چکی تھی، کہنے لگی کہ پھر تو کوئی بھی یورپین مشکل سے جنت میں جائے گا۔ مبلغ نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا[4]۔
- مبلغین کے افعال و اعمال غیر مسیحیوں کو مسیحیت کی جانب لاتے وہ ان کو الٹا مسیحیت کی طرف سے برگشتہ کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ آگرہ کے قاضی کے حضور شکایت کی گئی کہ مبلغین قرآن اکٹھے کر کے یورپ بھیجتے ہیں۔ جہاں رسول عربی کی مورتیں بنا کر ان کو اور قرآن کی نقلوں کو ہر سال جلا دیا جاتا ہے[5]۔

---

1 برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ص ۱۰۵

2 ایضاً، ص ۱۵۲

3 ایضاً، ص ۴۶۴

4 Thomas , Christians and Christianity in India and Pakistan , p.158-159

5 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۴۳۶

- سلطنت کا مذہب اسلام تھا اس لیے لوگ مسیحیت پر کم توجہ دیتے تھے۔
- اعلیٰ ذات کے ہندو بھی بہت کم بپتسمہ لیتے تھے کیونکہ بپتسمہ کے بعد وہ اپنی ذات برادری سے خارج اور ملیچھ سمجھے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں انہیں اچھوت ذات کے نو مسیحیوں سے مساوات اور اخوت کا سلوک کرنا پڑتا۔

پرتگیزی سلطنت نے مبلغین کو اپنی سیاسی اغراض کا آلہ کار بنا رکھا تھا ان کے سیاسی مقصد نے ان کی تبلیغی مساعی کو بھی اجاگر نہ ہونے دیا۔

پادری برکت اللہ کے مطابق مغلیہ سلطنت میں کلیسیا کے زوال کے درج ذیل اسباب تھے۔

- اسلام کا نظام حکومت
- اقوام مغرب کی کشمکش
- پردیسی مسیحیوں کی بد اخلاق زندگیاں
- ہندستانی مسیحی رہنماوں کا فقدان اور کلیسیاؤں کا روحانی انحطاط
- تبلیغ انجیل سے غفلت
- مبلغین کے باہمی تنازعے[1]

تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسیحی بنانے کی سب سے کامیاب شرح پرتگیزیوں کے حصہ میں آئی اس کامیابی کا راز " سختی " تھا۔ ۱۷۰۳ء سے پہلے یہاں "پروٹسٹنٹ" کا وجود اور نام "ناآشنا" تھا۔ ان کی اس کامیابی کی وجوہات میں سب سے بڑی وجہ ان کی دھونس دھول، زبردستی اور ریاستی جبر تھا۔ چنانچہ ان کے اس سخت رویہ پر بہت لے دے ہوئی ہے کہ جس طریقہ سے انہوں نے مندروں کو ڈھایا یا مقدس جگہوں کو پامال کیا، یہ اخلاقی اور مذہبی اصولوں کے خلاف تھا۔ انہوں نے اپنی بستی میں غیر مسیحیوں پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ کوئی فقیر، درویش یا سادھو ان کے علاقہ کی حدود میں نہیں رہ سکتا تھا مسلمانوں کو اذان دینے کی ممانعت تھی۔ جب کوئی متمول غیر مسیحی فوت ہو جاتا تو ان کے نابالغ وارثوں کو مسیحی بنالیا جاتا تھا بلکہ ان کو مملوک غلام بنایا جاتا۔ اس سے یہاں کے مقامی باشندوں کو سخت شکایات پیدا ہوئیں۔

نیز نو معتقدین کو سماجی طور پر زیادہ مرتبہ دیا جاتا جس سے مسیحی مذہب قبول کرنے کی طرف زیادہ میلان بڑھا۔ نو معتقدین کو کسی معاملہ میں قصوروار ہونے کے باوجود سزا سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا۔ ان کے لیے بہت سے سماجی فائدہ اور سہولتیں میسر کیں جو کہ دیگر مقامی لوگوں کو دستیاب نہ تھیں۔ حتیٰ کہ ذات پات کی تقسیم پر مبنی معاشرہ میں

---

[1] برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۴۶۱

نچلی ذات کے لوگوں کو بھی مذہب بدلنے پر معاشرتی طور پر خاص مقام مل جاتا۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ نکلتا کہ مقامی لوگ ان نومعتقدین سے معاشرتی لحاظ سے بالکل تعلق توڑ دیتے۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرے گروہوں سے ڈرا اور خوف دلا کر اپنی طرف راغب کرنے کی تکنیک بھی اپنائی گئی جیسے ساحلی علاقے کے بہت سے مچھیروں کو مسلمانوں کا خوف دلا کر انہیں عیسائی بنا لیا گیا۔ برنیئر لکھتا ہے کہ وہ فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم ایک سال میں اتنے لوگوں کو مسیحی بناتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام مبلغین مل کر دس سال میں نہیں بنا سکتے۔

فصل سوم

برصغیر میں پروٹسٹنٹ ازم کی تاریخ

فصل سوم

برصغیر میں پروٹسٹنٹ ازم کی تاریخ

کتاب مقدس کے مترجم اور جرمن ترجمہ قرآن کا مقدمہ[1] تحریر کرنے والے جرمن نژاد پادری مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔۱۵۴۶ء) اور اس کے ساتھیوں نے سولہویں صدی کے آغاز میں کلیسیا اور پاپائیت کی مطلق العنانیت اور ہوس رانیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ جس کے نتیجہ میں تقریباً ۱۵۲۰ء میں پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا۔ جرمنی سے آغاز ہونے والے اس سلسلہ کا انگلستان میں نتیجہ انگلیکن (Anglican) کلیسیا کی شکل میں نکلا اور رومن کیتھولک کلیسیا کے مقابلہ میں سرکاری سرپرستی میں پروٹسٹنٹ کا مذہبی مرکز انگلستان ٹھہرا[2]۔ جس نے بہت تھوڑے عرصہ میں کئی یورپی حکومتوں کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل کر لی۔

رومن کیتھولک کے برعکس پروٹسٹنٹ ابتداء میں تبلیغ وترویج مذہب کی طرف کم توجہ دیتے تھے کیونکہ

Many a Christian minister thought that the work of conversion was God's and not man's.[3]

(یعنی کچھ مذہبی مقتدر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مذہب کی تبدیلی کا کام خود خدا کے کرنے کا ہے نہ کہ بندے کا)

---

1 ۱۵۴۳ء میں Theodor Biblider نامی مترجم نے اس لاطینی ترجمہ سے جرمن زبان میں ترجمہ قرآن کیا۔۔ جرمن کلیسیا کی باسل کونسل نے فوراً اس ترجمہ قرآن پر پابندی لگا دی لیکن مارٹن لوتھر نے دسمبر ۱۵۴۲ء میں زور دے کر یہ پابندی ختم کروا دی۔ تاہم باسل کونسل نے پبلشر سے حلف لے کر باسل سے باہر اس کی اشاعت کی اجازت دی۔ مارٹن لوتھر نے خود اس کا مقدمہ لکھا جس میں وہ مدعی ہے کہ اس (ناقص) ترجمہ قرآن کے مطالعہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام کی تغلیط میں کوئی شک نہیں رہے گا۔

(Word and World , Vol. xvi, No.2 , Spring 1996, p. 263 (Martin Luther–Translations of Two Preface on Islam By Sarah Henrich & James L. Boyes)

2 قانونی طور پر انگلستان کے بادشاہ کو برطانوی چرچ کا سربراہ (Head of the Church of England) تسلیم کیا جاتا ہے اور آئینی طور پر اسے دین کے محافظ (Defender of Faith) کا خطاب دیا گیا۔ برٹینکا انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔

The title (Defender of Faith) was confirmed to Henry by parliament and is still used by his successors on the English Throne.(Encyclopedia Britannica, 1970)Vol.7, p171

لارڈ چیف سر تھیوبل کے ۱۶۷۶ء کے ایک فیصلہ کے مطابق مسیحیت قوانین انگلستان کا ایک حصہ ہے۔ اور جو شخص اس کے خلاف آواز اٹھائے اس کو سخت سزا دی جا سکتی ہے۔ عیسائیت کی اس قانونی حیثیت کا ہی نتیجہ تھا کہ انجیلی تعلیم کے خلاف ایک مطلقہ عورت مسز سمپسن سے شادی کرنے کے لیے انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا

3 Thomas P , Christians and Christianity In India and Pakistan , p. 151

یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں نمایاں تبشیری خدمات انجام دینے والے انگریز ولیم کیری نے ایک مجلس میں "ہندوستان کے کافروں" میں انجیلی پیغام سنانے کے فرض کی بات کی تو میٹنگ کے چیئرمین مسٹر رائلنڈ نے اسے کہا

"Young man, sit down, when God pleases to convert the heathen, He will do it with out your aid or mine"[1].

(نوجوان! بیٹھ جاؤ، جب خدا ان کافروں کی مذہبی تبدیلی پسند کرے گا تو میری یا تمہاری مدد کے بغیر ہی کر لے گا)

خود لوتھر کا خیال تھا کہ دنیا مزید صرف سو سال تک باقی رہے گی اس لیے اس گروہ کا رویہ مذہبی پرچار کی بجائے اپنی اصلاح پر زور دینے کا تھا۔

"Another hundred years and all will be over. The Gospel is despised. God's word will disappear for what of any to preach it.. The voice will be heard, Behold ,the Bridegroom comth"[2].

لیکن بعد میں اس رویہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے غیر مسیحی لوگوں میں تبشیری سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا۔

پرتگیزی اور ولندیزی استعماری طاقتوں کی طرف سے برصغیر کی منڈیوں سے حاصل کردہ مال اور نفع دیکھ کر دیگر یورپی طاقتوں کی توجہ اس طرف منعطف ہوگئی۔ میر برصغیر کی سیاسی اور معاشرتی صورت حال، ثقافت، ادیان و مذاہب زبان اور اقتصادی صورت حال کے بارے بعض مغربی تحریروں نے سارے یورپ میں اس خطے کے بارے ایک بڑی دلچسپی پیدا کر دی۔ (جیسا کہ پچھلی فصل میں مذکور فادر تھامس اسٹیفن کی تحریروں سے ظاہر ہے۔) چنانچہ پہلے اکبر پھر جہانگیر کے دور میں تجارت کی غرض سے انگریزوں کی یہاں آمد شروع ہوئی۔ اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں چرچ آف انگلینڈ کے تحت پروٹسٹنٹ کی تاریخ شروع ہوئی۔ بعد میں یہاں انگریزی تجارت انگریز استعمار میں تبدیل ہو گئی تو اس سلسلہ میں ان کے دور میں زیادہ کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ یہاں یہ بات اہم ہے کہ برصغیر میں باہر سے حملہ آوروں کا آنا کوئی نئی بات نہ تھی، جیسے مسلم حکمران خاندان مثلاً غزنوی، غوری، لودھی، ابدالی اور خود مغلیہ خاندان سب اپنی اصل کے اعتبار سے غیر ہندی ہی تھے۔ مسلمان اور انگریز دونوں ہی ہندوستان میں نئے مذہب کے ساتھ مسند حکومت پر براجمان ہوئے، لیکن نتائج کے اعتبار سے ہندوستانی معاشرے پر دونوں کے اثرات مختلف مرتب ہوئے ہیں۔ اگر انگریز مسلمان ہوتے تو ان کی سات سمندر پار سے آمد کا بابر کی ہمالیہ پار آمد سے تقابل یقیناً تاریخ کا دلچسپ موضوع ہوتا۔

---

1 Thomas , Christians and Christianity In India and Pakistan ,p. 151

2 Ibid

پرتگیزیوں کی ہندوستان آمد کے سو سال بعد ۳۱ دسمبر ۱۵۹۹ء کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی گئی۔ ریورنڈ اسلم برکت رقم طراز ہے؛

"انگلستان میں بااثر انگریز تاجروں کی ایک جماعت تھی جسے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ اول نے تسلیم کیا اور ہند سے تجارت کی غرض سے اسے " برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی " کا نام دیا گیا۔ اس کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کے ساتھ ساتھ دو باتوں کی خاص ہدایت کی۔

- ہند میں ان کی تجارت تاج برطانیہ کی سرپرستی میں ہوگی۔
- ہند میں تجارت کے ساتھ ان کو Anglican مشنریوں کی سرپرستی بھی کرنا ہوگی"[1]۔

۱۶۰۱ء میں ملکہ برطانیہ کی طرف سے جان نیوبری کی قیادت میں تین افراد پر مشتمل ایک وفد جلال الدین اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ ملکہ نے اکبر کو لکھا تھا؛

" میری رعایا کے پُر خلوص جذبات اس امر کے متقاضی ہیں کہ دنیا کے ہر خطہ زمین پر بسنے والوں کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ رہیں اور خیر اندیش جذبات کا مظاہرہ ہوتا رہے۔ جان نیوبری کو پُر خلوص محبت، نیک نیتی اور دوستی کا پیغام دے کر آپ کی سلطنت میں بھیجا ہے، اس امید پر کہ آپ کی فیاضی، مہمان نوازی اور سخاوت ان کو ہر ممکن سہولت دے کر انگلستان کی محبت خرید لے گی"[2]۔

اکبر نے بڑی فیاضی سے ان کی مہمان نوازی کی اور مغل شہنشاہ کی دی ہوئی سہولتوں سے انگریزوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ یہیں سے ہندوستان میں انگریزوں کے تجارتی مفاد کا آغاز ہوا۔ ۱۶۰۸ء میں ولیم ہاکنس جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا اور اس نے سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ لیکن پرتگیزیوں کی سازشوں کے سبب جہانگیر نے ہندوستان میں انگریزوں کی تجارت کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیا اور ہاکنس کو ۱۶۱۱ء میں واپس جانا پڑا۔ ۱۶۱۵ء میں شاہ جیمز نے سر تھامس رو کو سفیر کی حیثیت سے جہانگیر کے دربار میں بھیجا تاکہ دوبارہ تجارتی معاہدہ ہو سکے۔ انگریز سفیر تین سال تک یہاں رہا۔ وہ بادشاہ سے کمپنی کے لیے سورت میں فیکٹری اور اس کے ارد گرد فصیل بنانے کا شاہی فرمان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ایک دوسرے فرمان میں یہاں تجارت کی اجازت بھی حاصل کر لی۔ بعد ازاں آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بھراچ میں بھی کمپنی کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہو گئیں۔[3] ڈیڑھ صدی بعد یہ کمپنی ہندوستان کی مالک بن گئی جسے ۱۸۵۷ء میں ختم کر دیا گیا اور ہند براہ راست انگریز

---

1 اسلم برکت، ریورنڈ، آئینہ چرچ آف پاکستان، (لاہور ڈیوا سیس، لاہور ۲۰۰۲ء، اشاعت اول)، ص ا

2 بحوالہ ڈاکٹر محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کی علمی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ،، ص ۱۲۵

3 باری، کمپنی کی حکومت (تاریخ)، (نیا ادارہ، لاہور ۱۹۶۹ء، طبع چہارم)، ص ۷۰

تاج کے ماتحت ہو گیا[1]۔ اس کمپنی کے جہازوں اور تجارتی کوٹھیوں میں باقی لوگوں کے علاوہ مذہبی رسومات کی بجا آوری کے لیے پادری حضرات کو بھی متعین کیا گیا، یوں ہندوستان میں پروٹسٹنٹ سلسلہ کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

ہندوستان میں پہلے چیپلن کے طور پر Henry Levett کی تعیناتی عمل میں لائی گئی۔ اس کی خدمات کے صلہ میں ۵۰ پونڈ ادا کیے جاتے، جبکہ مزید ۱۵ پونڈ ذاتی اخراجات کے لیے دیئے جاتے۔ اس کی کارکردگی اس لحاظ سے تسلی بخش تھی کہ وہ جیوسٹ (پرتگیزی کیتھولک مبلغین) سے دلائل میں پورا اترتا تھا۔ جس کا اظہار ٹامس رو نے ولیم لاسک کے نام خط میں کیا[2]۔ کمپنی کے پادریوں کی طرف سے ہندوستان میں تبشیری کاوشوں کے ضمن میں ایک اہم واقعہ ۲۲ دسمبر ۱۶۱۶ء کو ایک بنگالی لڑکا لندن لے جا کر عیسائی بنانا ہے۔ اسے لندن کارپوریٹس کے کونسلرز اور کمپنی کورٹ کی موجودگی میں بپتسمہ دیا گیا اور شاہ انگلستان جیمز اول نے خود اس کا نام "پیٹر" (پطرس) تجویز کیا[3]۔

۱۶۸۵ء میں ایک شاہی حکم کے تحت ہند میں پادریوں کی تقرری سے قبل "بشپ آف لندن" کا اجازت نامہ ضروری قرار پایا[4]۔ ۱۶۹۰ء میں شاہ انگلستان چارلس دوم نے قانون پاس کیا کہ جو مسیحی کمپنی کا ملازم اتوار کو چرچ حاضر نہ ہو تو اس پر جرمانہ عائد ہو گا۔ نیز کمپنی کے ملازمین اگر صبح و شام کی عبادت میں شرکت نہ کریں انہیں بھی جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں اسے اس کے گھر میں سات دن کے لیے محصور کر دیا جائے[5]۔

ایک مرتبہ شاہ انگلستان کو شکایت موصول ہوئی کہ ڈچ کمپنی میں ۳۱ پریسٹ بطور چیپلنز ہیں جبکہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی میں چند ایک ہیں، لہٰذا ان کے مقابلہ میں چیپلنز کی تعداد بڑھانے کی استدعا کی گئی[6]۔

۱۶۹۸ء کے تیار کردہ چارٹر میں کمپنی کے پادریوں کے لیے ضروری قرار پایا کہ وہ گوا کے رومن کیتھولک منادوں کے مقابلہ کے لیے پرتگالی اور مقامی زبانیں سیکھیں تاکہ کمپنی کے ملازمین اور غلاموں میں پروٹسٹنٹ مذہب کی اشاعت کی جاسکے[7]۔ اس سے ان کی آپس میں چپقلش اور حسد و رقابت نیز دو غیر ملکی حکومتوں میں مسابقت کا رویہ

---

1 انتہائی عروج کے دور میں بھی انگریز راج برصغیر کے مجموعی رقبے کے دو تہائی سے کم ہی رہا۔ چھ سات صوبوں میں منقسم ہند کا یہ ساڑھے اکسٹھ فیصد علاقہ برٹش انڈیا تھا۔ جبکہ بقایا ساڑھے اڑتیس فیصد علاقہ ۶۰۱ ہندوستانی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ ریاستیں آئینی طور پر برطانوی ہند کا حصہ نہ تھیں گو ان کا حکومت سے الحاق تھا۔

2 Cyclopedia of India, Vol. II, p.85

3 Ibid

4 Ibid

5 اسلم برکت، آئینہ چرچ آف پاکستان، ص ۴

6 ایضاً

7 Cyclopedia of India, Vol. II, p.86

جھلکتا ہے۔ نیز ان کی برصغیر میں اشاعت مسیحیت میں دلچسپی کا بھی نمایاں اظہار ہوتا ہے۔

مقامی آبادی کے ساتھ کمپنی ملازمین کے ناروا رویے نے لوگوں میں فرنگی مذہب کے بارے شدید نفرت پیدا کر دی اور اس ابتدائی دور میں کمپنی کے ملازمین کے کردار کو دیکھ کر مقامی لوگ عیسائیت سے بے حد متنفر تھے۔ Terry کے مطابق مقامی لوگ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"Christian religion, devil religion, Christians much drunk, Christians much do wrong much beat much abuse others"[1].

(عیسائی مذہب، (ایک) شیطانی مذہب، عیسائی بلانوش، عیسائی بہت زیادہ غلط کار، بے حد متشدد، اور دوسروں کو گالیاں دینے والے)

کیتھولک (پرتگیزیوں) کے برعکس پروٹسٹنٹ (انگریز اور ولندیزی) اس وقت ہندوستان میں صرف تجارت اور سیاست پر زیادہ توجہ مرکوز رکھتے تھے، جب کہ مذہب اور تبشیری سرگرمیوں پر ان کی نظر کم تھی۔ چنانچہ برصغیر میں سب سے پہلے پروٹسٹنٹ مشن کا تعلق انگلستان یا ہالینڈ کی بجائے ڈنمارک سے تھا، جسے ڈنمارک کے شاہ فریڈرک چہارم نے مالی وسائل مہیا کیے۔ ڈنمارک سے تعلق رکھنے والے Ziegenbalge اور Heinrich پہلے پروٹسٹنٹ مشنری ہیں جو ۹ جولائی ۱۷۰۶ء کو ہندوستان پہنچے[2]۔ انہوں نے سب سے پہلے مقامی زبان سیکھی جس کے لیے مقامی مدرسوں کے شرارتی بچوں کے ساتھ زمین پر بیٹھتے ہوئے مٹی پر حروف لکھ کر زبان سیکھی۔ ان کی لگن اور سخت محنت کا نتیجہ ۱۷۱۱ء میں پہلے پروٹسٹنٹ گرجا کی تعمیر کی شکل میں نکلا۔ یہ مقامی حکومت کے مفاد میں نہ تھا، اس پر گورنر نے برہم ہو کر اسے جیل بھجوا دیا[3]۔ Ziegenbalge نے تامل زبان میں انجیل کا ترجمہ کیا اور دس کتابیں بھی لکھیں[4]۔

شاہ ولیم III کی سرپرستی میں ۱۶۹۸ء میں دو تبشیری سوسائٹیاں S.P.C.K (Society For Promoting Christian Knowledge) اور S.P.G (Society For Promoting of the Gospel) لندن میں تشکیل دی گئیں۔ دونوں سوسائٹیوں نے آنے والے وقت میں ہندوستان میں تبشیری سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ S.P.C.K نے ستمبر ۱۷۱۴ء میں بنگال کے پادری سیموئیل برائرکلف (Samuel Briarcliff) کو ہندوستان میں اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ بعد ازاں S.P.C.K نے ڈنمارک کے تبشیری مشن کے ساتھ مدراس میں مشترکہ تبلیغی کاوشوں

---

1 Thomas, Christians and Christianity In India and Pakistan, p. 152

2 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۳۴

3 Thomas, Christians and Christianity In India and Pakistan, p. 153-54

4 Birisik, Abdulhamit, Oryantalist Misyonerler ve Kuran(Istanbul 2004), p.40

کا فیصلہ کیا[1]۔ بشپ آف لندن کے ماتحت فورٹ ولیم، کلکتہ میں پہلے انگلش چرچ کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ کمپنی کے زیر اثر تمام جگہوں پر چرچ قائم کر دیئے۔ ہندوستانی پادریوں کا تقرر براہ راست بادشاہ کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ جن کی ماہانہ تنخواہیں ۱۰۰۰ روپے اور کلیسا کی ۲۳ سال خدمت کرنے پر ۳۶۵ پونڈ پنشن مقرر کی گئی[2]۔

اگرچہ انگلیکن اور ڈنمارک مشن کے درمیان مفاہمت اور اتحاد ہو گیا مگر کمپنی کے اکثر انگریز ملازمین نے اسے قبول نہ کیا۔ ۱۷۲۸ء میں S.P.C.K کے تحت ڈنمارک مشن کے سربراہ بنجمن شلٹز کو جنوبی ہند کے علاقہ ٹرانکو بار، جو کہ ۱۶۲۰ء سے ۱۸۴۵ء تک ڈنمارک کے زیر تسلط رہا، سے مدراس لے گئی۔ مگر مدراس میں موجود انگریزوں نے اسے قبول نہ کیا اور انہوں نے انگلستان لکھا کہ وہ کسی انگریز مشنری کو ہی سپورٹ کریں گے[3]۔ پادری شلٹز ایک دفعہ والی میسور سلطان حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان تصفیہ کے لیے منصف بھی مقرر ہوا تھا[4]۔

ہندوستان میں کام کرنے والے تمام بشپ، پریسٹ اور ڈیکن اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہوئے تاج برطانیہ سے وفاداری کی بھی قسم کھاتے۔ یہاں بھی ۱۷۲۶ء میں انگلستان میں مقرر کیے گئے قوانین اور ضوابط مقرر لاگو تھے لیکن حالات وواقعات کے تحت ان میں نرمی بھی رکھی گئی۔ جیسے ایکٹ 6،5 ولیم C, 54 IV کے تحت برطانیہ کے سکونتی کے لیے سالی (آنجہانی بیوی کی بہن) سے شادی جائز نہیں تھی جبکہ ہند میں سکونت پذیر کے لیے اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا[5]۔

۲۰ جون ۱۷۸۸ء کو چار چیپلن (تھامس بلانشرڈ، جان اوڈن، رابرٹس کار اور ڈیوڈ براؤن) نے برطانیہ گورنمنٹ کو خط لکھا جس میں سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا تھا کہ حکومت کو تمام ہندوستان میں پبلک سکول کھولنے چاہیں جہاں انگریزی پڑھانے کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے مبادی عقائد اور اخلاقیات بھی پڑھائی جائیں۔ اس تجویز کا بنیادی مقصد مسٹر براؤن کے الفاظ میں

" Preparatory to main business of giving Christian light in this land sitting in

---

1 ڈنمارک مشن کے Ziegenbalge نے ۱۷۱۵ء میں تبلیغ کے لیے مالی اعانت کے لیے انگلستان کا دورہ کیا اور آرچ بشپ آف کنٹربری اور شاہ جارج اول سے ملاقات کی۔ جس کے نتیجہ میں اس کی انڈیا واپسی پر انگریز مشنریوں کا رویہ رقابت کی بجائے، Active Co – Operation میں بدل گیا۔ Thomas, Christians and Christianity in India and Pak., p.154

2 Ibid

3 Cyclopedia of India , p.93

4 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۳۴

5 Cyclopedia of India ,p.88

جائیگا جسنے اپنا گھر ریتی مین بنایا ۲۷ اور مینھہ برسا اور سیلاب آئے اور اندھیان چلین اور اس گھر پر صدمہ پہنچایا اور وہ گر پڑا اور اسکا گرنا عظیم ہوا ۲۸ اور جب عیسے یہہ کلام کر چکا جماعتین اسکی تعلیم سے دنگ ہوگئین کیونکہ وہ انکو اقتدار رکھنے والے کی مانند نہ کاتبونکی طرح تعلیم کرتا تھا

اٹھوان باب

مسیح کا ایک کوڑھی اور صوبہ دار کے ایک چاکر اور پطرس کی ساس کو اور بہت سے بیمارونکو شفا بخشنا ۱۸ اور اسکا بتانا کہ اسکی پیروی کیونکر کرین ۲۳ اور دریا مین طوفان کو موقوف کر دینا ۲۸ اور بھوتونکو دیوانونپر سے اتارنا۔

اجب وہ اس پہاڑ سے اترا بہت سی جماعتین اسکے پیچھے ہولیان ۲ اور دیکھو کہ ایک کوڑھی نے آکر اسے سجدہ کیا اور کہا کہ ای خداوند اگر تو چاہے تو مجھے صاف پاک کر سکتاہے ۳ اور عیسے نے ہاتھہ لنبا کرکے اسے چھوا اور کہا کہ مین تو چاہتاہون تو پاک ہوجا اور وہین اسکا کوڑھ صاف جاتا رہا ۴ تب عیسے نے اسے کہا کہ دیکھہ کسی سے مت کہیو پر جا اور اپنے تئین کاہن کو دکھا اور ہدیہ جو موسے نے مقرر کیاہے سو دے تاکہ انپر اسکا ثبوت ہو ۵ اور جب عیسے کفرناحوم مین داخل ہوا

پہلا اردو ترجمہ انجیل از مولوی محمد فطرت لکھنوی طبع شدہ 1814ء سیرام پور کا ایک ورق

heathen darkness"[1].

بنگال میں کمپنی سپرینٹنڈنٹ کے فرائض انجام دینے والے چارلس گرانٹ کی کوششوں سے ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ سے ہندوستان میں مشنری سرگرمیوں میں بہتری کے لیے ایکٹ پاس ہوا جس کے تحت ہند میں بشپ اور آرچ ڈیکن کی تعیناتی کے ساتھ سالانہ تعلیمی گرانٹ اور مشنریوں کو آزادانہ تبشیری سرگرمیوں کا حق مل گیا[2]

ہندوستان میں ابتدائی انگریز مشنریز میں سے سب سے نمایاں نام ولیم کیری (۱۷۶۱ء۔۱۸۳۴ء) کا ہے۔اس کا شمار ہندوستان میں تبشیری اور استشراقی کاوشیں کرنے والی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔بپٹسٹ مشنری سوسائٹی کے رکن اور موچی خاندان سے تعلق رکھنے والا ولیم کیری اپنی بہن، بیوی اور پانچ بچوں سمیت ۱۰ نومبر ۱۷۹۱ء کو کلکتہ پہنچا۔اپنے محدود وسائل کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اسے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ نوبت بھیک مانگنے تک پہنچ گئی، لیکن اس کا مشنری جذبہ تمام مشکلات پر غالب رہا[3]۔اس نے ڈنمارک کے زیر تسلط سیرام پور میں مشنری مرکز قائم کیا اس نے یہاں ایک چھاپہ خانہ قائم کیا اور عہد نامہ جدید کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کروا کر شائع کرنے میں لگ گیا۔برطانوی مناد ۱۸۰۰ء تک اپنی تبشیری سرگرمیوں میں زیادہ کامیاب نہ ہو پایا۔بعد میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۱ء کے دوران ۱۴۰۷ افراد کو بپتسمہ دیا گیا۔اس کامیابی کی ایک وجہ برطانوی حکومت کی طرف سے مشنری سرگرمیوں کی اجازت ملنا ہے۔ولیم کیری کی جماعت نے مقامی سکولوں کو خاص ہدف بنایا اور ۱۸۱۸ء تک ان کی ۱۲۶ مقامی سکولوں تک رسائی ہو گئی تھی[4]۔ان منادوں کی طرف سے ۱۸۱۸ء میں سیرام پور میں ایک کالج قائم کیا گیا جس میں مذہب کے ساتھ ساتھ سائنس، فلسفہ، تاریخ اور معاشرتی علوم کے متعلق بہت سے مضامین پڑھائے جاتے[5]۔

ایک اور نامور مناد ہنری مارٹن نے ۱۸۰۵ء۔۱۸۱۶ء کے عرصہ میں یہاں اپنی توانائیاں مسیحیت کی تبلیغ میں صرف کیں۔اس نے مولوی محمد فطرت لکھنوی سے ۱۸۱۴ء میں عہد جدید کا اردو کا پہلا ترجمہ کروایا۔اس کی کاوشوں سے آگرہ کا ایک شخص مسیحی ہو گیا جس کا نام عبدالمسیح رکھا گیا۔

انگلش مشن مقامی لوگوں کو بپتسمہ دینے کے بعد آزمائشی مدت، جو کہ عموماً ایک سال ہوتی، کے بعد کلیسیا کے باقاعدہ نظم میں شامل کرتا اور پھر وہ مقامی پیریش اور اس کے انتظامی امور میں حصہ لینے کا اہل قرار پاتا۔

---

1 Cyclopedia of India ,p.88

2 Ibid ,p.93

3 Birisik , Abdulhamit , Oryantalist misyonerler ve Kuran , p.41 -42

4 Thomas , Christians and Christianity in India and Pakistan , p.162-166

5 Potts , British Baptist Missions in India ,(Cambridge University Press, Cambridge1967) p.129-130

برصغیر میں تبشیری سرگرمیاں سرانجام دینے والی جماعتوں میں کیتھولک کی نسبت پروٹسٹنٹ جماعتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں سے درج ذیل نمایاں ہیں۔ برٹش مشن سوسائٹی(BBMS قیام ۱۷۹۲ء) ، لندن مشن سوسائٹی(LMS قیام ۱۷۹۵ء، یہ ایشیاء اور افریقہ میں انگریزوں کی حاکمیت کے لیے قائم کی گئی۔ اسے متعلقہ خطے میں لوگوں میں انجیل کی خوبیاں اور عیسائی تمدن سے استفادہ کرنے کا رجحان پیدا کرنے کا ہدف دیا گیا تھا[1]) ، چرچ مشنری سوسائٹی CMS (قیام ۱۷۹۹ء)، ویزلن(Wesleyan) مشن سوسائٹی،(قیام ۱۸۱۳ء)، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی(قیام ۱۸۰۴ء انجیل کی ترویج و اشاعت کے لیے)، ایوینجلیکل مشنری سوسائٹی، سوئٹزرلینڈ(قیام ۱۸۱۵ء) ، گریٹ چرچ آف انگلینڈ کے تحت کیمرج مشن، دہلی(قیام ۱۸۷۷ء) ، آکسفورڈ مشن، کلکتہ(قیام ۱۸۸۰ء)

ان سوسائٹیوں کے کام کی بنا پر ۱۸۱۵ء سے ۱۹۱۴ء تک کے دور کو عیسائیت کے پھیلاؤ کی عظیم صدی قرار دیا گیا ہے[2]۔ ان برطانوی مسیحی تبشیری سوسائٹیوں کی ہندوستان میں سرگرمیاں سب سے زیادہ تھیں جس بنا پر کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلہ میں چرچ کے وسائل کا بیشتر حصہ ہندوستان میں استعمال ہوا

" British societies predominated India , more of the resources of the mission into India than any other country[3] "

۱۸۵۱ء میں ہندوستان میں تقریباً ۳۳۹ سے زائد پروٹسٹنٹ پادری تبشیری سرگرمیوں میں مصروف عمل تھے۔ ان میں سے ۲۲۸ برطانوی اور دیگر یورپین ممالک کے تھے۔ جبکہ ۱۸۸۱ء میں برطانوی لوگوں کی تعداد ۳۳۰ تک ہو گئی۔ صدی کے اختتام پر عیسائی مبلغین کی مجموعی تعداد ساڑھے نو ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔

" Indian was served by 966 European and 1142 Indian Priest , 440 lay brothers and 2778 sisters. Protestant missionaries far out – numbered Roman Catholic – 5465 as against no more than 4000 of the later.[4] "

(ہندوستان میں ۹۶۶ یورپی اور ۱۱۴۲ ہندوستانی پادری کام کر رہے تھے جبکہ برادرز کی تعداد ۴۴۰ اور ننوں کی تعداد ۲۷۷۸ تھی جہاں تک عیسائی مبلغین کا تعلق ہے تو رومن کیتھولک فرقہ کے کم و بیش ۴۰۰۰ مبلغین کے مقابلہ میں ۵۴۶۵ پروٹسٹنٹ مبلغ موجود تھے)

---

1 Kooiman Dick, Conversion and Social Equality in India ,(Manohar Publications, Delhi 1989) p.32.34

2 Encyclopedia Britannica, Vol. 15, p.573

3 H. Daniel Rops, The Church in Eighteenth Century (London1964) , p.188 ; Birisik , Abdulhamit , Oryantalist misyonerler ve Kuran , p. 44

4 Latourette, Christianity in a revolutionary age , (London1961) Vol. III , p.403,407

۱۹۰۷ء میں S.P.C.K اور CMS سے تعلق رکھنے والے لوگ

عام انگریز عورتیں	عام انگریز مرد	مقامی مبلغ	انگریز مبلغ	مشن
541	04	126	90	S.P.C.K
327	35	154	160	CMS

۱۹۲۶ء میں S.P.C.K نے اپنے مشن (اکثر جائیداد کے ساتھ) CMS کے حوالے کر دیئے۔

۱۸۹۰ء کے بعد پہلے ادوار کی نسبت تبشیری سرگرمیوں کا رخ سکولوں، ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں کی طرف زیادہ ہو گیا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں مختلف مشنری اداروں اور گروہوں کے اتحاد کا رجحان بڑھتا گیا چنانچہ ۱۸۹۷ء میں پروٹسٹنٹ مشنری تنظیموں نے متحد ہو کر ساؤتھ انڈیا مشنری ایسوسی ایشن کے نام ایک اتحاد قائم کر لیا۔ ۱۹۰۲ء مختلف کلیسوں اور تنظیموں کے باہمی اشتراک سے یونائیٹڈ چرچ آف ساؤتھ انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ اور اسی سال مدراس میں فورتھ آل انڈیا مشنری کانفرنس مسیحی تنظیموں کے اتحاد کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں ۱۸ ریاستوں کی نمائندہ نیشنل کرسچین کونسل آف انڈیا قائم ہوئی[1]۔ ۱۹۱۴ء میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی تعداد دس لاکھ سے زائد ہو گئی۔

"In 1914 the number of baptized protestants was about one million. However a century earlier Indian protestants had numbered only a few hundred."[2]

۱۹۳۸ء میں مدراس میں منعقدہ کانفرنس میں مقامی چرچ کے دائرہ کار کو وسیع کر دیا گیا اس کے لیے Indigenization یعنی مقامیت چرچ پر زور دیا جانے لگا۔ کیا یہ استعمار کے نوشتہ دیوار پڑھ لینے اور شکست و ریخت سے بچنے کا لائحہ عمل تھا یا مقامی کلیسیا کے اندر سے تبدیلی کا اعلان اس پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔

سرکاری سرپرستی میں ہونے والی ان تبشیری کاوشوں نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کر دی تھی جس کا اظہار سرسید کی اس تحریر سے ہوتا ہے:

"سب جانتے ہیں کہ گورنمنٹ نے پادریوں کو مقرر کیا ہے ان کو تنخواہ دی جاتی ہے دیگر اخراجات اور تقسیم کتب کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں اور ہر طرح ان کی مددگار اور معاون ہے۔ حکام شہر اور فوج کے ماتحتوں سے مذہبی گفتگو کرتے تھے۔ اپنی کوٹھیوں پر بلا کر پادریوں کے وعظ سنواتے تھے غرض اس بات نے ترقی پکڑی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا"[3]۔

---

1 Birisik , Abdulhamit , Oryantalist misyonerler ve kuran , p.45 – 46

2 Latourette , Christianity in a revolutionary age ,Vol. III p. 407

3 سرسید احمد خاں، رسالہ اسباب بغاوت ہند، (اردو اکیڈمی سندھ، کراچی) ص ۱۹۲۔۲۰۲

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں پادری صاحبان کا ٹھاٹھ دیدنی تھا۔ پادری کا منصب اب محض ایک خادم دین کا عہدہ نہ رہا تھا بلکہ ایک پُر کشش، متمول، منافع بخش، سیاسی اثر رسوخ، اور سماجی تفوق کی علامت بن چکا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس منصب کو حاصل دنیاوی مفاد کو ریاستی اشرافیہ بھی رشک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ انجیل میں مذکور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بے لوث تبلیغ کرنے کا فرمان عملاً نسیاً منسیاً بن چکا تھا[1]۔ اس کے برعکس صورت حال کی صحیح عکاسی امداد صابری ان الفاظ میں کرتے ہیں:

" ہندوستان میں پادری ایک نواب کی طرح ٹھاٹ سے زندگی گذارتے تھے۔ وہ یسوع مسیح کی خدمت کے قابل اس وقت بنتے تھے جب ان کو ایک کثیر رقم دی جاتی تھی۔ ان کا کام کرنے کا صلہ معمولی نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی تنخواہ ایک چیف کمشنر کے برابر ہوتی تھی۔ ہر قدم، ہر حرکت پر ان کو بے حساب روپیہ ملتا تھا۔ ان کی ماہوار آمدنی کا اوسط یہ تھا۔

ایک آرچ ڈیکن	دو ہزار روپے ماہوار
سینئر چیپلن	ایک ہزار روپے ماہوار
جونیر چیپلن	پانچ سو روپے ماہوار
پادری کے ہاں لڑکے کی پیدائش کے ساتھ ہی	۵۶ روپے ماہوار
اگر لڑکی پیدا ہو تو پیدا ہوتے ہی	۲۵۰ روپے ماہوار

سفری الاؤنس کلرجی مین (پادری) فی میل پیدل آٹھ آنہ اور ریل کے ذریعہ ایک میل تین آنہ الاؤنس کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ ۵۰ روپے ماہوار مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ اگر سمندر کے ذریعے پادری سفر کرتا تھا تو جہاز کا پہلے درجے کا ٹکٹ ملتا تھا اور نوکر ساتھ جاتے۔ جتنے دن جہاز میں سفر کرتے تین روپے روز کھانے کا الاؤنس دیا جاتا۔ پادری کی بیوی کے لیے آٹھ آنہ فی میل پیدل اور تین آنہ ریل فی میل خرچ دیا جاتا تھا۔ گویا اگر کسی پادری کے ایک بیوی ایک لڑکا اور دو لڑکی ہوتے تو سفر کرنے کی صورت میں پونے دو ہزار روپے کی رقم کے حق دار سمجھے جاتے تھے۔ اور ان کو یہ رقم دی جاتی تھی۔

تنخواہ ماہوار سینئر چیپلن	۱۰۰۰ روپے
الاؤنس ماہوار ایک لڑکا	۵۶ روپے
ماہوار سفر چیپلن بیوی اور ۳ بچے	۲۰۰ روپے
الاؤنس ماہوار دو لڑکی	۶۰۰ روپے
میزان	۱۸۵۶ روپے[2]

1 "چلتے چلتے منادی کرنا۔۔۔۔ مفت تم نے پایا مفت ہی تم دینا نہ سونا نہ چاندی نہ تانبا اپنے کمربند میں رکھنا" متی ۱۰: ۷۔۹؛ جب کہ لوقا کے مطابق " اس نے ان سے کہا کہ راہ کے لیے کچھ نہ لو نہ لاٹھی نہ تھیلی نہ روٹی نہ نقدی اور دو دو کرتے بھی تمہارے پاس نہ ہوں"۔ لوقا ۹: ۳

2 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۸۰۔81

برصغیر میں مسیحی مشنریز کی آمد کے ساتھ ہی دعوت و تبلیغ میں جن نئے ذرائع کا اضافہ ہوا، ان میں اخبار و جرائد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ پرتگیزیوں کے استعمار کے ساتھ ہی سولہویں صدی میں برصغیر میں پرنٹنگ کی صنعت وجود میں آئی لیکن پرتگیزی سرکار نے گوا کے باہر بہت کم اثرات مرتب کیے اور پرنٹنگ ہندوستان میں عام نہ ہو سکی۔ اٹھارویں صدی میں پروٹسٹنٹ مشنریز کے یہاں قدم جمانے سے پرنٹنگ سے عام فائدہ اٹھانے کی بنیاد پڑی۔ ڈنمارک کے پادری بنجمن شلز Benjamin Schultze (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۶۰ء) کے نئے عہد نامہ کا تامل زبان میں ترجمہ ٹرانکوبار سے ۱۷۲۶ء میں شائع ہوا[1]۔ سب سے پہلے ڈچ مشنری نے مدراس میں ٹائپ (لوہے کے) حروف کے چھاپہ خانے قائم کیے۔ یہ ٹائپ رومی رسم الخط تھا[2]۔ سیرام پور میں مشنری مقاصد کے لیے پرنٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں سے مقامی زبانوں میں بائبل کے تراجم اور مسیحی کتب شائع ہونا شروع ہوئیں۔ مسیحیت کی اشاعت کے لیے کتب کے ساتھ ساتھ جرائد کی ضرورت محسوس کی جانے لگی اور چنانچہ مسیحی اداروں اور افراد کی طرف سے متعدد رسائل و جرائد شائع ہونے لگے۔ ۱۸۴۶ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک مسیحی اداروں کی طرف سے جو اردو رسائل جاری ہوئے ان میں حسب ذیل نمایاں ہیں۔

۱۸۴۶ء صدر الاخبار (آگرہ)

۱۸۴۷ء خیر خواہ ہند (مرزاپور)

۱۸۵۹ء بامداد (بمبئی)

۱۸۶۲ء خیر خواہ خلق (سکندرہ)

۱۸۶۷ء مواعظ عقبی (دہلی)

۱۸۶۸ء حقائق عرفان (امرتسر)

مخزن مسیحی (الہ آباد)

کوکب عیسوی (لکھنؤ)

۱۸۶۹ء کوکب ہند (لکھنؤ)

شمس الاخبار (لکھنؤ)

۱۸۷۳ء نور افشاں (لدھیانہ)[3]

---

1 قریشی، سلیم الدین، اٹھارویں صدی کی اردو مطبوعات، (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۸۔۱۹

2 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۸۷

3 عالم اسلام اور مسیحیت، اسلام آباد، جولائی ۱۹۹۳ء، (اختر راہی، منشور محمدی مسلم مسیحی مناظراتی ادب کا ایک جریدہ) ص ۱۶۔۱۷

برصغیر میں اشاعت مسیحیت پر ایک نظر

دیگر ادیان کے بالمقابل مسیحیت کو جب ایک مرتبہ چوتھی صدی میں بازنطینی حکمران قسطنطین کی شاہی سرپرستی حاصل ہوگئی تو پھر پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ وہ بعد میں حکومتی چھتری کے سائے تلے ہی پھلی پھولی ہے۔ ہندوستان میں مسیحیت کی اشاعت کا ناطہ توما رسول سے جوڑا جاتا ہے۔ اگر توما رسول کی ہند میں آمد کو مستند تسلیم کر لیا جائے تو یہاں مسیحیت کی ابتداء ہی سرکاری سرپرستی میں ہوئی، جب ریاست ٹیکسلا کے راجہ نے مسیحیت قبول کر لی اور وہ مسیحی ریاست بن گئی۔ اس روایت کی تصدیق ہو بھی جائے تو پھر بھی بے شمار حل طلب سوالات باقی رہ جاتے ہیں کیونکہ سازگار حالات کے باوجود ہمیں ہندوستان میں مسیحیت کو فروغ ملتا نظر نہیں آتا، تاآنکہ سولہویں صدی سے قبل پرتگیزی قدم یہاں پہنچے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ آمد کے وقت بھی مقامی کلیسیا کی پیش کردہ مسیحیت کے فعال اور مؤثر وجود کی کوئی مستند تاریخی شہادت قطعاً دستیاب نہیں۔ ہندو راجاؤں اور عوام سے معرکہ آرائیوں کا تذکرہ خود مسلمان مؤرخین کی تاریخ میں موجود ہے۔ اگر ہندوستان میں مسیحیوں کی معتدبہ آبادی موجود ہوتی تو متدعیہ علاقوں میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت سے اس کا کسی نہ کسی طور متاثر ہونا لازم تھا مگر تاریخ کے اوراق اس سے خالی ہیں۔ اس کے برعکس اگر مسیحیت کے مختصر وجود کی بجائے کوئی قابل ذکر مؤثر ڈھانچہ یہاں موجود تھا بھی تو رومی کلیسیا کی اس سے لاتعلقی چہ معنی دارد؟ جب کہ وہ دیگر خطوں میں نسطوری یا بدعتی گردہ قرار دے کر ان علاقوں سے لاتعلق نہیں رہتی۔ ان سوالات کے مستند و معقول جوابات ملنے تک برصغیر میں پرتگیزیوں کی آمد سے قبل مسیحیت کا فعال وجود ثابت کرنا بہت مشکل امر ہے۔ پرتگیزیوں نے بھی سیاسی غلبے اور تلوار کے سائے میں مفتوحہ علاقوں میں صلیب گاڑنے کا کام بڑے جوش و خروش سے کیا تھا۔

> Like the wars carried on against the Mexicans , Peruvians and other heathen peoples in South Americans, the wars in the Indians Archipelago were waged largely in the interest of religion. The Cross was planted upon every island where the Catholic dominion was established. The sword and political influence were used with zeal and fanaticism ...[1]

سرکاری چھتری تلے مصروف عمل پرتگیزی مسیحی منادین نے ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی شاہی سرپرستی ڈھونڈنا شروع کر دی تھی۔ اس کا ثبوت اکبر کے پاس آنے والی مسیحی تبشیری جماعت کے مقصد سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا اقرار مؤرخ مسیحیت ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

---

1 Wherry , Islam and Christianity in India and the Far East , p. 134-135

"(۲۷ فروری ۱۵۸۰ء میں اکبر کے دربار میں آنے والی) اس تبلیغی جماعت کا مقصد یہ تھا کہ اکبر اور اس کی مملکت کی غیر مسیحی رعایا کو انجیل کا جانفزا پیغام سنا کر ان کو منجی جہان کے قدموں میں لایا جائے۔ چونکہ اکبر نے ان کو دعوت دی تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ مقصد اکبر کے مسیحیت کو اختیار کرنے سے پورا ہو جائے گا۔ پس اس جماعت نے اپنی اولاً تمام تر توجہ اس نکتہ پر مرکوز کی کیونکہ انہوں نے یہ سوچا تھا کہ جس طرح مالدیو، کا بادشاہ اور لنکا کے کئی بادشاہ مسیحی ہو گئے تھے اور بیجاپور کے راجہ کا ایک نزدیکی رشتہ دار حال ہی میں گوا میں مسیحی ہو گیا تھا اور اراکان کے شاہی خاندان کے افراد بعد کے زمانہ میں مسیحی ہو گئے تھے۔ وہ بھی خدا کے توفیق پا کر اکبر کو مسیحیت کا حلقہ بگوش کر سکیں گے اور اس کی دیکھا دیکھی اس کی رعیت اس کا نمونہ اختیار کرلے گی اور اس کے تمام ممالک محروسہ میں مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ ہو جائے گی"[1]۔

بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازان حکومت کے زیر سایہ مسیحی مشنریوں کو جو فروغ حاصل ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ چونکہ پرتگیزی ایک مخصوص علاقے تک محدود رہے اس لیے ان کے کام کی ہمہ گیری ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت جتنی نہیں۔ کیونکہ مؤخر الذکر گروہ بعد میں بیشتر ہندوستانی علاقوں کا حاکم و متصرف ہو گیا تھا۔

"The continued expansion of the company's territories with the bringing of more and more of the country under the passé Britannica, facilitated missions, whether Roman Catholic or Protestant."[2]

(ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں کے مسلسل پھیلاؤ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ملک کے برطانوی اقتدار کے تحت آجانے سے عیسائی مشنوں کو خواہ وہ رومن کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ، بہت سہولت پہنچی)

مغربی طاقتوں کا اپنی سیاسی برتری کو عیسائیت کے نفوذ کے لئے استعمال کرنا ہمیشہ کا معمول رہا ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے نرم ترین الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا نے ریکارڈ کیا ہے کہ

The political and cultural prestige of Europe aided missionaries in penetrating all parts of the world.[3]

(عیسائی منادوں کے دنیا کے تمام حصوں میں نفوذ کر جانے میں یورپ کے سیاسی اور تہذیبی وقار نے ان کی مدد کی)

انگریز کارپردازوں نے ایک طرف تو یہ تاثر دینے کی کوشش جاری رکھی کہ اسے رعایا کے مذاہب میں دلچسپی نہیں۔ دوسری طرف ۱۸۱۳ء کے ایکٹ کے بعد عملاً یہ پالیسی اختیار کیے رکھی کہ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے کسی بھی موقعہ یا حربے سے اغماض نہ برتا جائے۔ شہنشاہ برطانیہ جارج سوم کے دستخط سے ۱۰ اپریل ۱۸۱۴ء کو نافذ ہونے والے اس نئے چارٹر میں عیسائی مشنوں کے مفاد کو بطور خاص درج ذیل دفعہ میں شامل کیا گیا۔

---

1 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۱۶۱

2 Latourette, Christianity in Revolutionary Age, Vol.3, p.407.

3 Encyclopedia Britannica, ,Vol.15 , p.523

The clause stated that "It was the duty of this country to promote the introduction of useful knowledge , and of religious and moral improvement in India , and that facilities be afforded by law to persons desirous of going to and remaining in India , to accomplish these benevolent designs" [1].

(اس ملک (انگلستان) کا فرض ہے کہ وہ مفید علوم و فنون کو رواج دے اور ہندوستان میں مذہبی اور اخلاقی اصلاحات نافذ کرے قانوناً ان لوگوں کو سہولتیں بہم پہنچائے جو ہندوستان جانے اور وہاں رہ کر اس نیک فرض کی تکمیل کرنے کے خواہش مند ہوں)

برطانوی وزیراعظم لارڈ پامرسٹن (Lord Vicount Palmerston) نے ۱۸۶۲ء میں ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کے مشترکہ وفد، جس میں انگلستان کلیسیا کے سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری بھی شامل تھے، کے سامنے کہا؛

I think we are all agreed as to the end . It is not only our duty but it is our interest, to promote diffusion of Christianity to the maximum and its spread to the length and breadth of India." [2]

(میرے خیال میں ہم اپنے مقصد میں متحد ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ خود ہمارا مفاد بھی اس امر سے وابستہ ہے ہم عیسائیت کے نفوذ کو جہاں تک بھی ہو سکے فروغ دیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں اسے پھیلائیں)

خود لارڈ پامرسٹن کی کابینہ کے ایک وزیر ہند سر چارلس وڈ نے ان کی موجودگی میں کہا تھا،

No person could be more anxious to promote the spread of Christianity in India than they. [3]

(ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے فروغ کے لیے کوئی بھی شخص ان (وزیراعظم و وزیر ہند) سے زیادہ خواہش مند نہیں ہو سکتا)

اور تو اور خود ہندوستانی وائسرائے لارڈ ہنری لارنس (Sir Henry Lawrence) نے ایک بار کہا تھا؛

"کوئی چیز بھی ہماری سلطنت کے استحکام کا اس امر سے زیادہ موجب نہیں ہو سکتی کہ ہم عیسائیت کو ہندوستان میں پھیلا دیں" [4]۔

ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کی اہمیت کا اظہار پارلیمانی ممبر مسٹر مینگز نے اپنی تقریر میں یوں کیا؛

---

1 Sherring , M.A., Rev., History of Protestant Missions in India,(London 1875) p.89

2 Clark , Robert , The Missions, (Church Missionary Society , London, 1904), p. 234-35

3 Ibid, p 234

4 Smith, R.B., Lord Lawrence's Life,(London 1883),Vol.2 , p.313

" قدرت نے ہندوستان کی وسیع سلطنت انگلستان کو تفویض کی ہے، تاکہ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک فاتحانہ لہرائے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی قوت صرف کر دے تاکہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کا کام جاری رکھنے میں کسی وجہ سے کوئی تعویق نہ ہوسکے"[1]۔

انگلستان کے وزیر ہند چارلس وڈ (Charles Wood) نے بیان دیا کہ؛

Every additional Christian in India is an additional bond of union with England and additional source of strength to the Empire.[2]

(ہر وہ عیسائی جو ہندوستان میں عیسائیت قبول کرتا ہے انگلستان کے ساتھ ایک نیا رابطہ اتحاد بنتا ہے اور ایمپائر کے استحکام کا ایک نیا ذریعہ ہے)

گورنر جنرل کے ایجنٹ سر ہربرٹ ایڈورڈز (Sir Herbert Edwards) نے ۱۹ دسمبر ۱۸۵۳ء کو پشاور میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

" یہ عجیب تاریخی اتفاق ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجود کی بنیاد انگلش چرچ کی اصلاح کے صرف دو سال بعد رکھی گئی۔ اس لئے میں پورا یقین رکھتا ہوں اور یہ تنگ نظری نہیں کہ ہندوستان کا ملک انگلستان کو فقط اس لئے دیا ہے کہ انگلستان ہی وہ ملک ہے جس نے عیسائیت کو اپنی اصلی شکل میں رکھنے کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے۔ اب ہمارا مشن ہے کہ ہم دوسری قوموں کے لیے بھی وہی کچھ کریں جو ہم نے اپنے لیے کیا۔ ہندؤں کو ہم توحید کی تعلیم دیں اور مسلمانوں کو اپنے وسیلہ (بائبل) کی"[3]۔

حکومت ہند کی ۱۸۷۳ء میں تیار کی جانے والی ایک سرکاری رپورٹ میں، جسے ہاؤس آف کامنز نے شائع کیا تھا، مسیحی مشنریز کو یوں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا،

"The government of India cannot but acknowledge the great obligation under which it is laid by the benevolent exertions made by these 600 missionaries, whose blameless example and self – denying labours are infusing new vigour into the stereotyped life of the great populations placed under English rule, and are preparing them to be in every way better men band better men and better citizens of the great empire in which they dwell."[4]

---

1 محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی علمی و دینی خدمات، ص ۱۳۱

2 Clark, The Missions, p.234

3 Ibid, p.162

4 Sherring , History of Protestant Missionary ,p.48

(حکومت ہند انتہائی شکر گذاری کے جذبات کے ساتھ ان چھ سو مشنریوں کی نیک کوششوں کو سراہتی ہے ان کا بے داغ نمونہ اور بے لوث خدمات انگریز رعایا کی بے شمار آبادی کی دقیانوسی زندگی میں نئی روح پھونک رہے ہیں اور انہیں بہتر آدمی اور اس عظیم الشان ایمپائر کے بہتر شہری بننے کے لئے تیار کر رہے ہیں، جس میں وہ بستے ہیں)

پنجاب میں مسیحیت کے کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دینے والے پادری رابرٹ کلارک حکومتی سرپرستی کا اعتراف یوں کرتے ہیں؛

"We gratefully acknowledge that in no heathen country in the world, as for as we know, are greater opportunities allowed to missionary work by any Government than they are in India"[1].

[بصد شکریہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے علم کے مطابق کسی بھی کافر ملک میں سرکار کی طرف سے مشنری کام کو اتنے مواقع نہیں دیئے گئے جتنے کہ (حکومت کی طرف سے) ہندوستان میں دیئے گئے ہیں]

1 Clark, The Missions, p.234

باب دوم

برصغیر کا مسیحی قرآنی لٹریچر

تعارفی جائزہ

فصل اول

معروف مسیحی مصنفین

احوال و آثار

فصل اول

معروف مسیحی مصنفین۔ احوال و آثار

قبل از تقسیم، برصغیر میں مسیحیت کی پرچار کے لیے زبانی تبلیغ، سماجی خدمت اور تحریری ذرائع کا طریق کار اپنایا گیا۔ تحریری میدان میں وسیع حجم کا حامل، غالب مناظراتی، مسیحی لٹریچر مقامی کی نسبت زیادہ تر بدیسی اہل قلم کی تحریروں پر مشتمل ہے، جس کی اشاعت قریباً قریباً بدیسی مسیحی مشنریز کی مرہون منت ہے۔

یہاں مسیحی ادب کا آغاز ۱۵۸۰ء میں اس وقت سے ہوتا ہے جب پرتگالی کیتھولک پادری اکبر کے دربار میں آئے۔ ان میں پادری جیروم زیوئر کا نام سب سے نمایاں ہے۔ گوا پر قبضہ کے بعد پرتگیزیوں نے یہاں چھاپہ خانہ بھی قائم کیا جس میں مسیحی دین کی اشاعت کے لیے پمفلٹ، کتابچے اور نماز کی کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔ گوا میں ہی سینٹ پال مشنری کالج قائم کیا گیا جو بعد ازاں ایک تصنیفی مرکز بن گیا۔ ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ کیپوچن فادر کاسیانو نے متی کی انجیل کا ترجمہ کیا، جسے ایک رائے کے مطابق، اردو زبان میں انجیل کا پہلا ترجمہ گردانا گیا[1]۔ شائع نہ ہو سکنے کی بنا پر یہ غیر معروف رہا۔ جنوبی ہند میں تبشیری خدمات سرانجام دینے والے، ڈنمارک کے پادری بنجمن شلزے کے ۱۷۴۸ء میں کردہ ترجمہ تورات و انجیل کو اولین سمجھا جاتا ہے۔ شائع ہونے والا سب سے پہلا اردو ترجمہ انجیل، کیمرج کے گریجوایٹ اور یونانی زبان کے ماہر ہنری مارٹن (۱۷۸۱ء۔ ۱۸۱۲ء) نے مرزا محمد فطرت کی مدد سے کیا جو ۱۸۱۴ء میں سیرام پور میں طبع ہوا۔ ولیم کیری (۱۷۶۱ء۔ ۱۸۳۴ء) کے سیرام پور میں قائم کردہ چھاپہ خانہ نے برصغیر میں مسیحی لٹریچر کی ابتدائی اشاعت میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ برصغیر میں شائع ہونے والے مسیحی لٹریچر کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ برصغیر میں لکھا جانے والا لٹریچر

اس میں مقامی اور بدیسی مسیحی مصنفین کا کام شامل ہے جو یہاں معرض وجود میں آیا۔ مقامی زبانوں میں لکھی گئی تحریریں کے علاوہ یہاں کام کرنے والے بدیسی منادین کی تحریروں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

۲۔ برصغیر سے باہر کا لٹریچر

بدیسی مشنریوں نے برصغیر سے باہر کام کرنے والے مشنریوں کی تحریروں کا ترجمہ بھی یہاں سے شائع کیا ان دونوں طرح کے لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست میں سے بعض معروف مصنفین کے احوال و آثار کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

---

1 بسمل، اقبال، اردو ادب میں مسیحی ادیبوں کا کردار، (عباسی لیتھو آرٹ پریس، کراچی، س ن)، ص ۱۴۴

پادری جی ایل ٹھاکر داس (۱۸۵۲ء۔۱۹۱۰ء)

پادری جی ایل ٹھاکر داس نے ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ کے برہمن گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ۱۸۵۷ء میں ابھی پانچ سال کے تھے جب یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ والد دیوی بھجن جو انگریزی فوج میں ملازم تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں قتل ہو گیا۔ یتیم ٹھاکر داس کو والدہ سیالکوٹ لے آئی۔ ٹھاکر داس کا بچپن سیالکوٹ مشن کے یتیم خانہ میں گذرا۔ بعد ازاں ۱۸۶۸ء میں گوجرانوالہ مشن سکول کے آغاز پر گوجرانوالہ منتقل ہو گئے۔ وہاں پادری مارٹن اور اس کی بیوی سے ریاضی، فلسفہ، انگریزی ادب پڑھنے کا موقع ملا۔ پھر گوجرانوالہ میں ہی پادری جے پی میکی سے مسیحی علم الہیات، تاریخ کلیسیا، عبرانی اور یونانی زبانیں سیکھیں۔ اور ان میں رسوخ حاصل کر کے ۱۸۷۷ء میں مناد کی حیثیت سے مسیحی مذہب کی خدمت کا آغاز کیا۔

آغاز میں پسرور میں " سپرنٹنڈنٹ آف مشنز" متعین ہوئے۔ جھنگ اور سیالکوٹ میں کچھ وقت گذارنے کے بعد واپس گوجرانوالہ آ گئے۔ یہاں ایک چھاپہ خانہ کھولا اور مسیحی اخبار " کرسچین ایڈووکیٹ " جاری کیا۔ چند تنازعات کے باعث یو پی مشن سے علیحدگی ہو گئی اور پریسبٹیرین مشن کی ملازمت اختیار کر لی۔ پھر اسے بھی خیر آباد کہہ کر گوجرانوالہ سے فیروز پور چلے گئے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ای ایم ویری کی دعوت پر لدھیانہ میں اخبار " نورافشان" کی ادارت سنبھال لی۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی کی طرف سے ڈی ڈی (Doctor of Divinity) کی ڈگری بھی ملی۔

پادری ٹھاکر داس مناظرانہ مزاج رکھتے تھے جس کا اظہار ان کی چھتیس کے قریب تصنیفات میں ہوتا ہے، جن میں سے معروف یہ ہیں۔

اظہار عیسوی، انجیل یا قرآن، ذنوب محمدیہ، حکمت الہام، عدم ضرورت قرآن، ریویو براہین احمدیہ

اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے جارحانہ اسلوب کی حامل تنقیدی تحریریں سپرد قلم کیں۔ اسلامی علوم سے بہرہ ور نہ تھے۔ اس لیے قرآن کے بارے قلم اٹھاتے وقت، اکثر مقامات پر منقولی دلائل سے غلط استنباط کرتے ہیں اور معقولی دلائل میں قیاس مع الفارق کا مظاہرہ سامنے آتا ہے۔

پادری جی ایل ٹھاکر داس ۲۱ جنوری ۱۹۱۰ء کو زندگی کی اٹھاون بہاریں دیکھ کر آنجہانی ہوئے[1]۔

---

۱ اے ٹھاکر داس، مسیح کے نورتن، (مسیحی اشاعت خانہ، لاہور، ۱۹۹۵ء، بار سوم) ص ۵۸۔۶۸

پادری صفدر علی (۱۸۳۰ء۔۱۸۹۹ء)

صفدر علی نے ۱۸۳۰ء میں دھول پور، آگرہ کے ایک مسلم گھرانے میں آنکھ کھولی[1]۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج، آگرہ میں داخلہ لیا جہاں مسیحی اساتذہ سے واسطہ پڑا۔ ان کا ایک دوست عمادالدین مسیحی مباحث کی زد میں آکر اسلام کے بارے شکوک و شبہات کا شکار ہوا تو صفدر علی اسے آگرہ کے ایک عالم عبدالحلیم کے پاس لے گیا[2]۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں دونوں ہی ارتداد کا شکار ہو گئے اور برصغیر کے مسیحی حلقے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ صفدر علی تحصیل علم کے بعد پہلے آگرہ کالج میں ہی فارسی کے مدرس، بعد ازاں نیچرل فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس تعینات ہوگئے۔ ان کی زندگی کا یہ دور بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں بقول پادری برکت اللہ؛

> " درویشوں اور صوفیوں کی صحبت کی وجہ سے آپ نے سخت ریاضتیں کیں اور مرشد کامل کی تلاش کرتے رہے۔ جب آپ کی تبدیلی ملتان ہوئی جو" مشائخ صوفیہ کا بن" تھا تو آپ نے ان کے حلقوں، مجلسوں اور خانقاہوں کو مرشد کامل حاصل کرنے کے لیے چھان مارا لیکن اس تمام تگاپو سے کچھ حاصل نہ ہوا[3]۔

جبل پور میں تعیناتی کے دوران نو مسیحی (سابقہ ہندو) پادری نحمیاہ گورے سے راہ و رسم بڑھی تو اس نے صفدر علی کو زبور اور عہد نامہ جدید کے مطالعہ پر لگا دیا۔ تین سال کے ذاتی مطالعہ کی روشنی میں مسیحی کتب سے اسلام کے بارے جو تشکیک پیدا ہوئی، اس پر مسلم علماء سے جوابات چاہے۔ تسلی نہ ہونے پر ۱۸۶۴ء میں کرسمس کے روز کرسچین مشن سوسائٹی CMS سے جبل پور میں بپتسمہ لے لیا[4]۔

اپنے ارتداد کا سبب بتلانے کی غرض سے " نیاز نامہ " تحریر کیا۔ پادری عمادالدین کے برعکس، جن کے بپتسمہ لینے میں پادری صفدر علی کا بھی ہاتھ ہے، تحریروں میں مناظرانہ اسلوب نظر نہیں آتا۔ مناظرانہ اسلوب کی حامل تبشیری سرگرمیوں کی بجائے روحانی دعوت دینے پر زور دیتے تھے[5] اور شاعری کا بھی رجحان رکھتے تھے۔

---

1 Khokhar, Emanual, Rev., Who is Who (Missions among Muslims), (Yehyang Presbyterian, Church Seoul, South Korea 2006), p180

2 عمادالدین، واقعات عمادیہ، (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور س ن) ص ۴؛ ٹھاکر داس، مسیح کے نورتن، ص ۱۰۔۱۱

3 برکت اللہ، پادری، صلیب کے علمبردار، (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی لاہور ۱۹۳۲ء) ص ۱۲

4 Khokhar, Who is Who (Missions among Muslims), p180

5 Ibid

پادری عماد الدین (۱۸۳۰ء ۔ ۹ اگست ۱۹۰۰ء)

عماد الدین نے ۱۸۳۰ء کو پانی پت[1] میں ایک مسلم گھرانے میں آنکھ کھولی[2]۔ لیکن چھتیس سال کی عمر میں کئی فکری مراحل سے گذرنے کے بعد دین اسلام سے ارتداد کرتے ہوئے ۱۸۶۶ء میں عیسائیت کا چولا پہن لیا۔ ان مراحل میں دین محمدی میں تشکیک، تصوف کے ذاتی تجربے، رہبانیت اور سب مذاہب کو واہیات گردانا شامل ہے[3]۔ پادری صاحب مسیحی الہیات میں حکیم (Doctor of Divinity) کا عہدہ حاصل کرنے، اور اسلام مخالف کئی کتب لکھنے کے بعد ستر سال کی عمر میں ۹ اگست ۱۹۰۰ء کو آنجہانی ہو گئے[4]۔

---

1 حسن اتفاق سے برصغیر کے مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں نمایاں جگہ پانے والی تحریروں میں سے تین کے مصنفین کا تعلق پانی پت سے ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کا تعلق بھی پانی پت سے تھا جنہوں نے پادری مذکور کی کتب "ہدایت المسلمین" اور " تاریخ محمدی" کے جواب میں بالترتیب " تریاق مسموم" اور" تاریخ محمدی پر ایک منصفانہ نظر" کے نام سے قلم اٹھایا۔ جبکہ نو معتقد مسیحی ماسٹر رام چندر بھی پانی پتی ہی تھے۔ ان کی نقد قرآن پر "تحریف قرآن" اور "اعجاز القرآن" مسیحی حلقہ میں تو معتبر لیکن علمی حوالے سے سطحی تحریریں ہیں۔

2 لاہز، عماد الدین، واقعات عمادیہ، ص ا۔ ویری نے تاریخ پیدائش ۱۸۵۶ء نقل کی ہے (Wherry, The Muslim Controversy (The Christian Literature Society , Madras1905) , p 15 جو کہ غلط ہے۔ کیونکہ وہ ۱۸۵۴ء میں پادری فانڈر (۱۸۶۵ء) اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان ہونے والے معروف مناظرہ میں موجود تھے (برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۱۹

3 پادری صاحب کا عیسائیت قبول کرنے کا فکری سفر دین اسلام کے بارے تشکیک سے شروع ہوا۔ اپنی کتاب "واقعات عمادیہ" میں رقم طراز ہیں؛" (کالج پڑھائی کے) ان ایام میں کئی عیسائیوں کی صحبت کے سبب مجھے دین محمدی پر شک پڑ گیا" (ص ۴) ؛ "اس علم سینہ کو تصوف کہتے ہیں اور بڑے بڑے دفتر کتابوں کے بھر دیئے عالموں نے اس علم میں قرآن وحدیث سے اور اپنی عقل سے اور ہنود کے بیدانت اور رومیوں و عیسائیوں اور یہودیوں و مجوسیوں کی رسموں اور رہبان و محاریب کی عادت سے انتخاب کر کے لکھ رکھی ہیں۔" (ص ۵) ؛ " میری روح نے آرام نہ پایا بلکہ دن بدن (تصوف کے چلّوں اور وظائف کے) خود بخود تجربہ کاری کے سبب شریعت محمدی سے متنفر ہونے لگا" (ص ۱۰) ؛ " اس کا تجربہ یوں دل میں آ گیا کہ سب مذاہب واہیات ہیں جسم کو آرام دینا چاہیے " (ص ۱۱)

4 عماد الدین، واقعات عمادیہ، ص ۲۲ ،فرنگیوں کا جال، ص ۱۶۳۔ پادری ای ایم ویری (حوالہ سابقہ) اور پاؤل نے غلط تاریخ وفات ۱۸۹۹ء بیان کی ہے۔ Powell , Avril A , Muslims and Missionaries in Pre-Munitiy India (Curzon Press Ltd. , UK 1993) , p.133

ان کا خاندانی پس منظر خاصا متنازعہ ہے۔ آپ اپنی سوانح عمری" واقعات عمادیہ "میں اپنا نسب نامہ ہانسی شہر کے ایک صوفی بزرگ جمال الدین سے جوڑتے ہیں[1]، جب کہ خود ان کے بڑے بھائی اس نسب پر سخت نقد کرتے ہوئے اسے جھوٹ گردانتے ہیں[2]۔

اس متنازعہ نسب نامہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ان کی خاندانی حیثیت اور سماجی مرتبہ و مقام پر بھی دورخی تصویر سامنے آتی ہے۔ مسیحی تحریروں میں انہیں پانی پت کے رئیس اور معزز خاندان کا چشم وچراغ گردانا گیا ہے۔ پادری اے ٹھاکر داس کے مطابق؛

"(ان کے) والد ماجد مولوی سراج الدین صاحب ابھی حیات ہیں جو شہر پانی پت کے رئیسوں میں شمار کیے جاتے ہیں"[3]۔

اور ایورل پاؤل رقم طراز ہیں

" His Grandfather , Maulavi Muhammad Sirdar , had been called to nearby Paniput to minister to the Afghan chaif , his father , Maulavi Ghulam Muhammad Kahn and Muhammad Siraj-ud-Din received similar esteem from the local chief"[4].

اسی طرح برصغیر کے مشہور مناد پادری ای ایم ویری لکھتے ہیں

The Rev.Imad-ud-din D.D , of the C.M.S.Amritsar , known generally as Molvi Imad-ud-din ,

---

1 " پس واضح ہو کہ اپنے حسب نسب کی بابت مجھے اس قدر معلوم ہے کہ ہمارے بزرگ ہانسی شہر کے باشندے تھے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ شہر ہانسی میں بارہ قطب ہیں۔ ان میں سے ایک قطب جن کا نام شیخ جمال الدین ہے۔ ان کے بیٹے شیخ جلال الدین تھے۔ ان کے بیٹے شیخ فتح محمد تھے ان کے بیٹے مولوی محمد سردار ہوئے ان کے بیٹے مولوی محمد فاضل تھے ان کے بیٹے مولوی محمد سراج ہوئے ان کا بیٹا میں ہوں" (عمادالدین، واقعات عمادیہ، ص ۱) اے پاؤل نے یہی نسب نامہ لکھ کر پادری صاحب کو" مصدقہ اشرافیہ " سے تعبیر کیا ہے۔

2 اس نسب نامہ کی صحت اور اس میں" دعویٰ قطب" کے بارے پادری عمادالدین کے حقیقی بھائی لکھتے ہیں؛

"پادری عمادالدین نے ایک کتاب واقعات عمادیہ لکھی ہے جس میں اپنا نسبی سلسلہ حضرت جمال الدین قطب ہانسوی رحمۃ اللہ سے ملاتے ہیں۔ اگر کوئی ہندوستانی اس واقعہ کی تحقیق کرے تو ان کی یہ تحریر باطل ٹھہرے گی۔ اگر عمادالدین کو اپنا نسب بدلنا تھا تو شیخ جمال الدین سے نہ جوڑتے۔ ان کو یہ سلسلہ کسی حواری فرضی طمطاؤس یا پلوس (پولس) سے ملانا چاہیے۔ کیونکہ اگر کوئی محقق تحقیق کرے گا تو ان کو ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا (منشور محمدی، بنگلور، یکم شوال۔۔۔ ۱۵ نومبر ۱۸۷۴ء) ۔۔۔(نسب نامہ کے بارے) یہ تحریر ان کی بالکل جھوٹ اور غلط ہے"۔ (صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۶۱۔۱۶۲)

3 اے ٹھاکر داس، مسیح کے نورتن، ص ۱۰

4 Geoffry A Oddie , Religious Conversion movement in South Asia : Continuities and Change 1800 – 1900 (UK 1997) (Averill Powell, Process to Religious Conversion to Christianity in Nineteen century an North Western India), p.37

Lahiz claimed descent from a celebrated Muslim saint, Qutab Jamal , a scion of a royal family of Persia[1].

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ پادری عماد الدین خاندانی رئیس اور حکمرانوں کے مقرب رئیس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، لیکن اس کے برعکس بعض دیگر تحریروں میں ان کے خاندانی پس منظر کی تصویر کشی اس سے میل نہیں کھاتی"[2]

یہ سوال غور طلب ہے کہ اس مترجم قرآن کا اپنا سلسلہ نسب بدلنا اور مسیحی تحریروں میں پشتی رئیس ظاہر کرنا، ان کے اپنے Complex (احساس کمتری) کا شعوری اظہار ہے یا کہیں نئے مذہب میں، نئی برادری کی طرف سے، نئے تشخص کا تقاضا تو نہ تھا؟ آخر طبقہ اشراف سے ناطہ جوڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس دور میں تبشیری سرگرمیوں کے عمیق مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس وقت مسیحی تنظیموں کی طرف سے مخالف پر نفسیاتی وار کر کے اسے مرعوب کرنا خاص ہتھیار تھا۔ ہندوستان کے پس ماندہ علاقوں میں مخصوص سماجی پس منظر کی بناء پر کسی چیز کے صحیح یا غلط ہونے کا ایک معیار اشرافیہ کے ہاں قبولیت بھی تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اشرافیہ طبقہ کو خاص طور پر ہدف بنایا جس میں انہیں کچھ نہ کچھ کامیابی بھی ہوئی۔[3] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس طرف کے نو مسیحی افراد کو بتکلف اشرافیہ ظاہر کیا گیا ہو، تا کہ عام آدمی کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے اسے با آسانی سے شکار بنایا جا سکتا۔

عماد الدین نے ابتدائی تعلیم کے بعد بغرض تحصیل علم اپنے بڑے مولوی کریم الدین کے پاس اکبر آباد رخت سفر باندھا۔ وہاں عماد الدین نے کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ علماء و صلحاء سے علوم دینیہ کا حصول کیا اور اسی دوران چند مسیحیوں کی صحبت سے یہ اثر ہوا کہ اپنے دین کے بارے دل میں شک بیٹھ گیا۔ اس پر ایک قریبی دوست صفدر علی (جو بعد میں خود بھی عیسائی ہو گیا) ایک عالم دین عبد الحلیم کے پاس بغرض دفع شکوک و اعتراضات لے گیا۔ ان کے جوابات سے دل تو مطمئن نہ ہوا، لیکن ان کے اپنے الفاظ میں نتیجہ یہ نکلا کہ

"اس دن سے اس (مسیحیت) کا خیال چھوڑ کر صرف علم حاصل کرنے کی کوشش کرنی شروع کر دی۔ سب خیالات چھوڑ کر رات دن پڑھنا شروع کیا"[4]۔

---

1 Wherry, The Muslim Controversy, p 15

2 " پادری عماد الدین ذات کے تیلی تھے۔ ان کے والد نے یہ پیشہ ترک کر دیا۔ ہزاروں آدمی پانی پت کے رہنے والے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور جب مدرسہ میں آپس میں ہنستے اور مذاق کرتے تھے تو ان کو تیلی کا لونڈا کہا جاتا تھا" صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۶۲) اس کی تصدیق قلمی میدان میں ان پر کسی گئی پھبتیوں سے بھی ہوتی ہے۔

3 اسکی بعض تفصیلات Powell . Avril , Muslims and Missionaries in Pre-Munitiy India میں مختلف مقامات پر دستیاب ہیں۔

4 عماد الدین، واقعات عمادیہ، ص ۴۔۵؛ اے ٹھاکر داس، مسیح کے نور تن، ص ۱۰۔۱۱

بڑی محنت کے ساتھ علوم دینیہ میں درک حاصل کیا جس کی بناء پر عموماً "مولوی" سے ملقب کیا جاتا ہے[1]۔ اس کے بعد، بقول اے ٹھاکر داس؛

" انہیں تصوف کا شوق دامن گیر ہوا اور فقراء و اولیاء کے پاس معرفت کی غرض سے جانے لگے۔ الغرض یہ نوجوان آنکھیں بند کرکے سمندر تصوف میں غوطہ زن ہوا۔ ایک خیال اسی وقت سے دنیا ترک کرنے کا ایسا دل میں آیا کہ سب چھوڑ چھاڑ جنگل کو نکل گیا"[2]۔

پادری عماد الدین کا تصوف اور رہبانیت کا سفر دس سالوں پر محیط ہے۔ اور اس دوران کیے گئے وظائف، اذکار، چلّے اور (خود ساختہ) عملیات[3] کے تجربوں کا نتیجہ اسلام سے دوری اور قلبی سکون کھونے کی شکل میں سامنے آیا۔

" میری روح نے آرام نہ پایا بلکہ دن بدن خود بخود تجربہ کاری کے سبب شریعت محمدی سے متنفر ہونے لگا۔۔۔ اس آٹھ دس برس کے عرصہ میں محمدی مذہب کے بزرگ اور مشائخ اور مولوی اور فقراء صلحاء جو ملے ان کا چال چلن اور ان کے دل کے تصورات اور ان کے تعصب اور ان کی فریب بازیاں اور جہالتیں اور دمبازیاں جو دیکھی تھیں ان سے یقین ہو گیا کہ کوئی بھی مذہب جہاں میں حق نہیں ہے"[4]۔

اس دوران لاہور منتقل ہونے کا موقع ملا۔ مذہب کے بارے تشکیک اور اضطراب و تفکر کی حالت میں مسٹر میکن تاش ہیڈ ماسٹر نارمن سکول لاہور، کی صحبت میسر آئی تو ان سے انجیل پڑھنا شروع کی۔ اس مسیحی مناد کی کوششیں رنگ لائیں اور انجیل متی کے ساتویں باب تک پہنچتے پہنچتے اپنے مذہب کے بارے کامل شک دل میں پیدا ہو گیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں؛

" میکن تاش صاحب سے کہا آپ براہ مہربانی مجھے انجیل کو سمجھ کر پڑھائیں اور میں خوب تحقیق کروں گا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے انجیل پڑھانا شروع کر دیا۔ متی کے ساتویں باب تک پڑھ کر مجھے دین محمدی پر شک پڑ گیا"[5]۔

---

1 Wherry, The Muslim Controversy, p 15

2 اے ٹھاکر داس، مسیح کے نور تن، ص ۱۷

3 پادری صاحب کے مذکورہ ان تجربوں میں قصیدہ غوثیہ، چہل کاف، حزب البحر، کشف قبور، مراقبہ، وجد کی محفلیں، باعتقاد صوفیوں کا تکنا، گیروے کپڑے پہن کر فقیر کا روپ سدھارنا، پیادہ بے سروسامان دو ہزار کوس کا سفر شامل تھا۔ ایک بار بارہ روز بے سلا کپڑا پہن، ایک زانو پر برلب جاری نہر باآواز بلند ورد کرنا، جو کا آٹا، بے نمک حلال کھانا، نہ کسی آدمی کو چھونا نہ بے وقت بات کرنا، سوا لاکھ بار لفظ اللہ لکھ کر آٹے کی گولیوں میں لپیٹ مچھلیوں کو کھلانا بھی شامل تھا۔ (عماد الدین، واقعات عمادیہ، ص ۶۔۹)

4 ایضاً، ص ۱۰

5 ایضاً، ص ۱۲

جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۹ اپریل ۱۸۶۶ء (جس سال برصغیر کے سرخیل پادری فانڈر ہندوستان چھوڑ گئے) امرتسر جا کر چرچ مشن میں پادری رابرٹ کلارک (۱۹۰۰ء) کے ہاتھ بپتسمہ لے لیا[1]۔

بپتسمہ پانے کے بعد دو سال تک سرکاری ملازمت پر مامور رہے۔ پھر باقی زندگی امرتسر کلیسیا میں تبشیری سرگرمیوں میں گزاری لیکن کلیسیائی خدمت کے آخری سالوں میں امرتسر کی فضا ان کے لیے غیر موزوں رہی اور (اپنے ہی مسیحی) حاسدوں کی عیب جوئی اور دوستوں کی بے وفائی کے سبب کلیسیا کی خدمت سے الگ ہو گئے۔

مذہبی زندگی کے نئے دور میں پادری فانڈر کی تحریروں[2] اور پادری رابرٹ کلارک کی صحبتوں اور علمی مذاکرات نے ایک نئے عماد الدین کو جنم دیا۔ اسلامی علوم پر دسترس اور رسوخ کے پس منظر میں اپنے سابقہ مذہب (اسلام) کا مطالعہ صرف تنقیدی اور تنقیصی حوالے سے ہونے لگا جس کا مقصد وحید مسیحی مذہب کو سچا ثابت کرنا تھا۔ چنانچہ بعد میں (اس نئے) عماد الدین کے قلم سے جتنی تحریریں نکلیں ان کا ایک ہی مقصد یعنی مسیحی مذہب کی سچائی و فوقیت اور اسلام کی تکذیب، تنقیص و تحقیر تھا۔ ۔ اردو زبان کے معروف فرانسیسی محقق مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا تھا؛

" مولوی عماد الدین پہلے اسلام کے عماد تھے اب مسیحی مذہب کے عماد ہیں وہ اپنی تحریر و تقریر میں مسیحی مذہب کی ہندوستان میں بڑی خدمت کر رہے ہیں[3] "۔

نئے مذہب کی خدمت میں پادری کے عہدے پر فائز، نئے عماد الدین کی تردید اسلام میں تحریروں نے اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی دل آزاری میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ شاید اس کے قلم سے اتنی دل آزار تحریریں نہ نکلتیں مگر پادری رابرٹ کلارک کی محنت رنگ لائی اور اس کے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں یہ نو مسیحی پادری " شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ثابت ہوا "۔ ان تحریروں کے پیچھے پادری رابرٹ کلارک کے ذہن پر یہ

---

1 عماد الدین، واقعات عمادیہ، ص ۱۲

2 "His religious life was much influenced by the writings of Dr. Pfander". [Wherry , E.M. ,, Islam and Christianity in India and far East, p164]

پادری فانڈر کی ان تحریروں کے متعلق مدراس یونیورسٹی کے فیلو ایل بی جونز کی رائے ہے کہ " ڈاکٹر فانڈر کی ایک کمی ہے کہ اسلام کی تعلیم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال و عادات پر نکتہ چینی کے بغیر مسیحی ایمان پر نہیں لکھ سکتا تھا یا لکھنا نہیں چاہتا تھا" [تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہندوستان، مدیران خصوصی: سید فیاض و ڈاکٹر عبادت بریلوی، (پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۲ء)، ج ۴، ص ۳۹۵]

3 ایضاً، ص ۵۸۸

مسیحی تحریر شاہد ہے؛

" رابرٹ کلارک کے اخلاص و محبت نے ان (عمادالدین) کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالا۔ جستجو اور تحقیق کے سچے مذاق کے باعث دونوں میں ربط و ضبط بڑھ گیا۔ گھنٹوں بیٹھ آپس میں گفتگو کرتے۔ اعتقادی مسائل اور مذہبی تحقیق و تدقیق کے غور و خوض میں لگے رہتے۔ ان کی صحبت مشرقیت اور مغربیت کے صحیح امتزاج کی خوبی اور سودمندی کا ایک ثبوت ہے۔ پادری رابرٹ کلارک صاحب مغربی علماء کے خیالات ان کے سامنے پیش کیا کرتے جن کو عمادالدین مشرقی رنگ میں سپرد قلم کیا کرتے تھے۔ اسی طریقہ پر رفتہ رفتہ تصانیف وجود میں آئیں "[1]۔

پادری عمادالدین نے مختلف موضوعات پر ۵۳ کتب لکھیں ان میں سے اسلام و مسیحیت کے متعلق چند اہم کتب کا ذکر پادری ای ایم ویری نے کیا ہے۔

۱ اردو ترجمہ قرآن (نیشنل پریس، امرتسر ۱۸۹۴ء)
۲ پندرہ لیکچر
۳ تحقیق الایمان (مطبع آفتاب، لاہور ۱۸۶۸ء)
۴ تعلیم محمدی (وکیل ہندوستان پریس، امرتسر ۱۸۸۰ء)
۵ تفتیش الاولیاء
۶ تفسیر اعمال
۷ تفسیر متی
۸ تقلیقات التعلیقات
۹ تنقید الخیالات
۱۰ تنقید القرآن
۱۱ تواریخ محمدی (کرسچین نالج سوسائٹی، پنجاب پریس امرتسر، ۱۸۷۱ء) عموماً اسے تاریخ محمدی سے موسوم کیا جاتا ہے مگر جس طباعت تک راقم الحروف کی رسائی ہوئی اس کے ٹائٹل پر تواریخ محمدی مرقوم ہے۔)
۱۲ توزین الاقوال
۱۳ حقیقی عرفان
۱۴ حیات المسلمین (مطبوعہ لاہور ۱۸۶۶ء)
۱۵ نغمہ طنبوری
۱۶ واقعات عمادیہ (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور، س ن)
۱۷ ہدایت المسلمین (مطبع نور، لاہور ۱۸۶۸ء)

---

1 اے ٹھاکر داس، مسیح کے نورتن، ص ۱۳۔۱۴

پادری صاحب کے اسلوب تحریر کے متعلق" فرنگیوں کے جال" میں مرقوم ہے

" طرز تحریر نہایت بھونڈا تھا اور دل شکن قلم کے مالک تھے۔ مہذب تخیل سے بہت کم پالا پڑا تھا۔ ان کی طرز نگارش نے خاص طور پر مسلمانوں کے دل بہت دکھائے۔ یہ بات ان کے ساتھی مشنری بھی مانتے تھے "[1]۔

ان منافرت بھری تحریروں پر پادری کریون کا یہ تبصرہ نقل کیا گیا۔

" ۱۸۵۷ء کی مانند پھر غدر ہوا تو اسی شخص عمادالدین کی بد عنوانیوں اور بیہودہ گوئیوں سے ہو گا۔ جوان کو پندرہ روپے کو بھی کوئی نہ پوچھے اور مشن سے ۷۰ روپے ماہوار اور کوٹھی ملے جس کے اندر چاہیں تو تیل نکالنے کا کولہو بھی بنالیں۔ ایسے لالچیوں کا کیا کہنا[2]۔

پادری عمادالدین کے حالات زندگی کا تجزیہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے ترک اسلام کی وجہ اس مذہب میں روحانی تشفی نہ ہونا قرار دیتے ہیں۔ لیکن شعوری مسیحی ہونے کے ناطے وہ مسیحیت میں جس روحانیت کے مدعی ہیں اس کی جھلک ان کی تحریروں میں ذرہ برابر نہیں جھلکتی اور روحانیت کالازمہ قرار پانے والی اخلاقی اقدار کا بھی پاس کرتے نظر نہیں آتے۔

پادری سی.جی فانڈر (۱۸۰۳ء۔۱۸۶۵ء)

جرمن نژاد[3]، ملائے فرنگ سے ملقب[4] اور ہندوستان میں جدید مسیحی علم الکلام کے باوا آدم، کارل گرٹلیب فانڈر ویبلینگن (Waiblingen) جرمنی کے ایک نانبائی کے ہاں ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے[5]۔ گراں قدر تبشیری خدمات سرانجام دینے اور کلیسیائے ہند پر انمٹ تبشیری نقوش چھوڑتے ہوئے پینسٹھ (۶۵) سال کی عمر میں کیم دسمبر ۱۸۶۵ء کو Constantinople (انگلستان) میں آنجہانی ہوئے اور Ham ہیم (انگلستان) میں تدفین ہوئی[6]۔

---

1 فرنگیوں کا جال، ص ۱۶۳

2 ایضاً

3 بعض ثانوی مصادر سے ماخوذ تحریروں میں پادری صاحب امریکن نژاد کیتھولک مستشرق گردانا گیا ہے۔ جس نے دنیا کی طمع اور بیوی کی خوشنودی کی خاطر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا اور اس کے ساتھ انگلستان رہائش پذیر ہو گیا، جہاں سے اسے مسیحی مبلغین کا سربراہ بنا کر ہندوستان بھیجا دیا گیا۔ [ظفر، محمود احمد، حکیم، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے معاصرین، (تخلیقات، لاہور ۲۰۰۷ء)، ص ۱۵۷] یہاں فاضل مصنف کو تسامح ہوا ہے کیونکہ پادری صاحب پیدائشی جرمن پروٹسٹنٹ تھے۔ اور ۱۸۳۳ء میں ماسکو کے ایک سینٹر کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ (برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۱۲)

4 ایضاً، ص ۱۰ ؛ امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۵۲

5 Powell, Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India, p.133

6 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۲۷ ؛ امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۵۳

کارل فانڈر کی پیدائش کے وقت جرمن کلیسیا ایک ہیجانی دور سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف انجیلی تحریک احیائے مذہب نئی "روشن خیالی" (Enlightenment) سے متاثر تھی[1] اور جرمن انرمشن[2] (Inner Mission) کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ دوسری طرف روحانیت پر مرتکز مسیحی تحریک تقوی[3] (Pietism)، جس کے مقابل مذکورہ تحاریک شروع ہوئیں تھیں، بعض علاقوں پر ابھی بھی سخت گرفت لیے ہوئے تھی۔ اس پس منظر کے حامل ماحول میں فانڈر نے جس خطہ میں آنکھ کھولی وہاں Pietism کی جڑیں بہت مضبوط تھیں[4]۔

Pietism کے مؤید لاطینی تعلیم کے ایک سکول سے فانڈر نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ ابتدائی جماعتوں کے بعد ۱۹۲۰ء میں باسل مشنری کالج میں داخلہ مل گیا جہاں سے انہوں نے اپنی مشنری زندگی کا آغاز کیا[5]۔ باسل مشنری کالج میں علم الہیات کی تحصیل کے ساتھ ساتھ عربی اور اسلام قرآن پر تنقیدی دروس سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس وقت جامعات میں Biblical Criticism کے نئے تنقیدی رجحان کی صدا بلند ہو رہی تھی، مگر باسل کالج کے کارپرداز اس کوشش میں تھے کہ وہ ادارے کی فضا معقولیت پسندی اور نئے تنقیدی رویے سے "مسموم" نہیں ہونے دیں گے چنانچہ عموماً طلباء کی حوصلہ شکنی کی جاتی کہ وہ جدید رجحانات کے حامل لیکچر سنیں۔ اس وقت ایک نیا مدرس ڈبلیو ایل وٹ (W.Leberechtde Wett) باسل کالج میں ان دروس کا اہتمام کیا کرتا تھا[6]۔

بائبل کے تنقیدی مطالعہ پر قدامت پسندی اور جدیدیت کی اس کشمکش نے کارل فانڈر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اغلباً اس پس منظر میں ان کا ذہن اس طرف منعطف ہو گیا کہ بائبل کی بجائے قرآن کو نئے تنقیدی اصولوں پر پرکھا جائے، جس کی جھلک بعد میں تبشیری سرگرمیوں کے دوران ان کی مناظرانہ زندگی میں نظر آتی ہے مزید بر آں اس سوچ کو مہمیز یوں ملی کہ مشنری کالج کے نئے ڈائریکٹر نے طلباء کے لیے ہفتہ میں چار سے چھ گھنٹے دورانیہ کے قرآن سے متعلق لیکچرز کا سلسلہ شروع کر دیا[7]۔ قرآن و نبوت کے باہمی تعلق اور نقد قرآن پر ذہن سازی میں ان

---

1 Powell , Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India , p133

2 یہ تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں جرمنی میں شروع ہوئی جو جرمن انجیلی کلیسیاؤں کے درمیان غریبوں اور محتاجوں کی ضرورت پوری کرتی تھی۔ (English Urdu Dictionary of Christian Terminology , (Rawalpindi 2001)

3 سترہویں صدی عیسوی کی ایک تحریک، جو جرمنی کے لوتھرن کلیسیاؤں میں شروع ہوئی جس میں کلیسیائی رسومات کے مقابل شخصی پاکیزگی پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ ایک مذہبی تعلیم کی اصلاح کی تحریک تھی۔ (ایضاً)

4 Powell , Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India , p.133,

5 Abid

6 Wherry , The Muslim Controversy , p1

7 تفصیلات کے لیے: Powell , Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India, p133-135

لیکچر کا کافی دخل ہے، جس کا اعتراف فانڈر اپنے خطوط میں بھی کرتے ہیں[1]۔

باسل مشنری سوسائٹی نے مشنری سرگرمیوں کی خاطر جنوبی روس میں ۱۸۲۴ء میں شوشا (Shusha) میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا جو کہ بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپین کے درمیان آرمینیا کا ایک قصبہ ہے۔ یہ مشن، اہل اسلام کے لیے مختص تھا[2]۔ ۱۸۲۵ء میں بائیس سالہ فانڈر کو اس مشن کے لیے چنا گیا اور شوشا بھیج دیا گیا۔ جہاں بقول ای ایم ویری:

"(He) Devoted himself especially to work of missions among Muslims"[3]

مسیحیت ترک کر کے اسلام قبول کرنے والے آرمینیا کے مسلمانوں کو اصطباغی رنگ میں رنگنے کا جذبہ فانڈر کو بے چین کیے رکھتا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ

"ان بھٹکی بھیڑوں کو واپس ان کے گلہ بان کے پاس لے آئے اور کروڑوں مسلمانوں کو راہ نجات دکھانے کا ذریعہ ہو"[4]۔

بقول اے پاول مسلم آبادی کے درمیان تبشیری سرگرمیوں کا ایک ہیجان انگیز نتیجہ فانڈر کی عیسائیت اور اسلام سے متعلق کتب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

"Pfander's emergence as a writer of books on Islam and Christianity had resulted from the frustrations of his first missionary post at Shusha in the Caucasus"[5]

۱۸۲۹ء میں فانڈر نے فارس اور پھر وہاں سے بغداد کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس دوران وہ اپنی تبشیری سرگرمیوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کو زبانی دعوت دینے کی بجائے کوئی کتاب لکھی جائے جس میں بقول پادری برکت اللہ "مسیحی عقائد کی تائید اور اسلامی عقائد کی مفصل تردید ہو"[6]۔

۱۸۲۹ء کے اختتام تک ایران میں قیام کے دوران فانڈر نے اپنے خیالات مناظرانہ رنگ میں "میزان الحق" کی صورت میں فارسی زبان میں مرتب کیے جسے نہ صرف اسی وقت ایشیائی تبشیری ادب میں بلند مقام حاصل ہوا بلکہ اگلی ڈیڑھ صدی تک یہ مقام برقرار رہا، اور دوسری طرف مسلم اہل علم کے ہاں بھی اس صدی میں رد اسلام پر لکھی جانے والی کتب کے حوالے سے سب سے زیادہ موضوع بحث یہی کتاب ٹھہری۔

---

1 Powell, Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India, p135

2 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص۸

3 Wherry, The Muslim Controversy, p2

4 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص۸

5 Powell, Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India, p138

6 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص۹

"Which aroused more discussion among Mohammedans than any book written in the century"

پادری فانڈر ۱۸۳۳ء میں طہران کے راستے واپس آرمینیا پہنچے جہاں سے اپنے گھر جرمنی کی راہ لی۔ اسی سال ایک آرمینی خاتون سے شادی کر لی جس کا والد ماسکو کے سینٹ کا ممبر تھا[1]۔ ایک رائے کے مطابق پادری صاحب نے اس خاتون کی وجہ سے اپنا مسلک تبدیل کر لیا تھا۔

۱۸۳۵ء کو روسی حکومت کے ایک حکم کے ذریعے شوشا میں مشنری سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے کر مسیحی مشن بند کر دیا گیا[2]۔ ۱۸۳۷ء میں فانڈر نے ہندوستان کا رخت سفر باندھا اور تیرہ (۱۳) ماہ کے بعد ایران اور خلیج فارس سے ہوتے ہوئے کلکتہ آن وارد ہوئے، بعد ازاں ۱۸۴۰ء میں آگرہ منتقل ہو گئے[3]۔ جہاں ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۲۳۳ھ۔۱۳۰۸ھ) کے ساتھ تاریخی المناظرۃ الکبری کیا[4]۔ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۴ء تک فانڈر آگرہ میں تبشیری خدمات سرانجام دیں۔ دریں اثناء ۱۸۵۱ء میں اہل خانہ کی خاطر انگلستان کا دورہ بھی کیا[5]۔

آگرہ قیام کے دوران اُن کی سرگرمیاں زیادہ تر ان پہلوؤں پر محیط رہیں۔

ا۔ مذہبی مباحثے

باسل مشنری کالج (جرمنی) میں ان کا مزاج اصلاً ایک مذہبی مناظر میں ڈھل چکا تھا۔ سر ولیم میور نے انہیں اہل اسلام کے ساتھ مباحثہ کرنے والوں میں لائق ترین گردانا ہے۔ جب کہ پادری فرنچ نے میدان مباحثہ میں یکتا

---

1 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۱۲

2 Wherry, The Muslim Controversy, p1

3 فانڈر صاحب کی آگرہ منتقل ہونے کی وجہ باسل کمیٹی سے قطع تعلق تھی۔ (برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۱۲) جس کے بعد وہ چرچ مشنری سوسائٹی سے منسلک ہوگئے۔ آگرہ میں مسلم مسیحی مناظرہ کی روایت کافی قدیم تھی۔ سب سے پہلے سولہویں صدی میں یہاں اکبر کے دربار پرتگیزی پادریوں اور مسلم علماء کے درمیان مناظرے ہوتے تھے۔ نیز ۱۸۱۱ء میں مسیحیت قبول کرنے والے صالح عبدالمسیح (۱۷۶۰ء۔۱۸۲۷ء) کی وجہ سے یہاں مسلم مسیحی مباحثوں کی بازگشت ابھی سنائی دی جاری تھی کہ پادری صاحب نے وہاں جا کر ان میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ جس کا انتہائی عروج ۱۸۵۴ء میں ہونے والے المناظرہ الکبری کی شکل میں نکلا۔

4 ہندوستان میں مسلم مسیحی کشمکش کی تاریخ اس مناظرہ کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ چوتھے باب میں اس مناظرہ کا بیان کیا گیا ہے۔

5 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۱۶

قرار دیا ہے[1]۔ انہوں نے شوشا میں اپنے قیام کے دوران مسلمانوں سے مباحثہ کے تجربہ کو دہراتے ہوئے آگرہ میں بھی مباحثوں کا بازار گرم کیے رکھا۔

۲۔ تحریر و تصانیف

پادری فانڈر صاحب کا مسلم علماء کے ساتھ مباحث کا نتیجہ مناظرانہ مراسلت کی صورت میں نکلا۔ اپنے آگرہ قیام کے دوران کئی ایک کتابیں بھی سپرد قلم کیں۔

۳۔ تبلیغ اور بازاروں میں منادی

تبلیغ اور بازاروں میں منادی کی خاطر پادری فانڈر صاحب نے شہر کی گنجان آبادی میں دو دکانیں کرائے پر لیں اور روزانہ آگرہ اور گرد و نواح میں اپنا لٹریچر تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ان تبشیری سرگرمیوں پر ان کے اپنے بقول "لوگ مجھ پر ہنستے اور میرا مضحکہ اڑاتے تھے، لیکن جس جگہ وہ ایسا کرتے میں وہاں اگلے دن ضرور پہنچتا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ میں ٹلنے والا نہیں ہوں تو انہوں نے ہنسی مذاق کرنا بند کر دیا"[2]۔

۴۔ کلیسیا کی تنظیم و اصلاح

اس ضمن میں انہوں نے ۱۸۴۸ء میں آگرہ کے کلیسیا میں ایک پنچایت قائم کی جو کہ شمالی ہند میں اپنی نوع کی پہلی پنچایت تھی۔ فانڈر صاحب کے اپنے بقول:

"کلیسا کے قیام کے لیے اور اپنی مدد کے لیے میں نے ایک پنچایت قائم کی ہے۔ پنچایت کے شرکاء کو کلیسیا منتخب کرتی ہے پنچایت کے ممبر چرچ وارڈن کا کام بھی کرتے ہیں اور تادیبی امور کو سرانجام دیتے ہیں"[3]

۵۔ مسیحی منادوں کی تبشیری تربیت

انہوں نے مقامی طور پر کام کرنے والے منادین کی تبشیری تربیت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔ یہاں کے کئی نامور منادان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ اس ضمن میں پادری ٹامس ویلپی فرنچ (Thomas Valpy French) خصوصاً قابل ذکر ہے۔ فرنچ کہتا ہے؛

"مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اس کے آگے زانوئے شاگرد تہہ کیا ہوا ہے"[4]

---

1 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۱۶

2 ایضاً، ص ۱۴۔۱۵

3 ایضاً، ص ۱۴۔۱۵

4 ایضاً، ۱۵

کلیسا میں پہلے ان کا تقرر لوتھرن طریقے سے ہوا تھا۔ ہندوستان آکر مشن تبدیل کر لیا تو بشپ آف کلکتہ نے ان کا تقرر چرچ آف انگلستان کے طریقے پر کیا۔ ۱۸۵۴ء میں پادری رابرٹ کلارک کے ساتھ پشاور بھیج دیا گیا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ ان کی یہاں سے تبدیلی مولانا رحمت اللہ کیرانوی صاحب کے ساتھ ۱۸۵۴ء کے مناظرہ کے مابعد حالات کا نتیجہ ہو۔ پشاور میں وہ کلارک کے ساتھ مل کر ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ اس دوران آرچ بشپ آف کنٹربری کی طرف سے ڈی۔ ڈی (Doctor of Divinity) کی ڈگری عطا ہوئی[1]۔ ۱۸۵۷ء میں قسطنطنیہ بھیج دیا گیا۔
امداد صابری رقم طراز ہیں؛

" یہ (فانڈر) ۱۸۵۷ء میں قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ وہاں سلطان عبدالعزیز سے اس نے ڈینگیں ماریں کہ میں نے آگرہ میں ایک (مسلم) عالم کو شکست دی۔ چنانچہ (جب) مولانا (رحمت اللہ کیرانوی) صاحب قسطنطنیہ پہنچے تو پادری نے ان کی شکل دیکھی تو فرار ہو گیا"[2]۔

پادری برکت اللہ اس بات کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے بقول؛

" سلطان (ترکی) نے مولانا رحمت اللہ کو بلوا بھیجا کہ ڈاکٹر فانڈر سے مباحثہ کرے۔ لیکن مولوی رحمت اللہ کے دارالخلافہ میں پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر فانڈر وفات پا چکا تھا "[3]۔

پادری صاحب کے اس دعویٰ کی تردید " صاحب آثار رحمت " نے یوں کی ہے۔

" مولف " صلیب کے علمبردار " کا یہ کہنا کہ مولانا رحمت اللہ قسطنطنیہ پہنچے بھی نہ تھے کہ اس سے قبل پادری فانڈر کا انتقال ہو گیا تھا، صحیح نہیں ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب ۱۸۶۴ء میں قسطنطنیہ پہنچے اور بقول " صلیب کے علمبردار " پادری فانڈر نے ۱۸۶۵ء میں قسطنطنیہ چھوڑا اور انتقال یکم دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوا گویا پورے ایک سال کا فرق ہے"[4]۔

سر ہربرٹ ایڈورڈ، پادری فانڈر کا تعارف یوں کرواتا ہے،

" وہ ایک زندہ دل، جفاکش اور محنتی انسان تھا۔ اس کو ایشیائی ممالک کے لوگوں کا تجربہ حاصل تھا اور ہندوستان بھر میں علمائے اسلام کے ساتھ مباحثے کرنے میں لاثانی تھا۔ وہ مسلم اور مسیحی عقائد کو ایشیائی نکتہ خیال سے لوگوں کے سامنے پیش کرتا تھا "[5]۔

---

1 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۲۳
2 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۵۳
3 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۲۷
4 امداد صابری، آثار رحمت (یونین پرنٹنگ پریس، دہلی س ن)، ص ۲۵۷
5 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۲۵

فصل دوم

مسیحی قرآنی لٹریچر

فصل دوم

مسیحی قرآنی لٹریچر

قرآنیات پر بعض کاوشیں اور ان کی انفرادیت

برصغیر پاک و ہند میں اشاعت اسلام عرب، ماوراء النہر اور کسی حد تک افریقہ کے بعض علاقوں کے ساتھ ہی ہوئی[1]۔ لیکن مقابلتاً یہاں قرآنیات کا باب بہت وسیع، وقیع، متنوع اور کمیت و کیفیت کے اعتبار سے کسی بھی خطہ کے مقابلہ میں کم تر نہیں۔ بلکہ بعض پہلوؤں کے لحاظ سے ممتاز و منفرد بھی ہے۔ ذیل میں ان میں سے بعض کاوشوں کے مختصر تذکرہ سے ہندوستان میں قرآنیات کے باب میں ان ممیزات کا اندازہ ہو سکے گا۔

اوراق تاریخ میں محفوظ برصغیر میں اولین ترجمہ قرآن کی کاوش ایک عراقی النسل عالم کا ۲۷۰ھ میں سورۃ یٰسین تک کا ترجمہ ہے جو الور کے راجہ مہروک بن رایق کے لئے کیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی کا ایرانی سیاح بزرگ بن شہریار اپنی تصنیف " عجائب الہند " میں رقم طراز ہے۔

فما فی الھند ما حدثنا به ابو محمد الحسن بن عمرو بن حمویه بن حرام بن حمویه النجیرمی بالبصره قال کنت بالمنصوره فی سنة ثمان و ثمانین و مائتین و حدثنی بعض مشائخها ممن یوثق به ان ملك الراو وهو اکبر ملوك بلاد الهند والناحية التی هو و قشمیر الاسفل و کان یسمی مهروك بن رایق کتب فی سنة سبعین ومائتین الی صاحب المنصورة وهو عبدالله بن عمر بن عبدالعزیز یسئاله ان یفسر له شریعة الاسلام بالهندية فاحضر عبدالله هذا رجلا کان بالمنصورة اصله من العراق حد القريحة حسن الفهم شاعر قد نشاء ببلاد الهند و عرف لغاتهم علی اختلا س م الرا فعمل قصیدة وذکر فیها ما یحتاج الیه و انفذها الیه فلما قرءت علی ملك الرا استحسنها و کتب الی عبدالله یسئاله

---

[1] ۶۱۱ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ میں اعلان نبوت کے ساتھ ہی عرب میں دعوت اسلام کا آغاز ہو گیا۔ ۲۳ سالہ عہد نبوی میں ہی اس کا دائرہ عرب سے باہر تک پھیل چکا تھا۔ خلافت راشدہ میں ۶۴۱ء/ ۲۰ھ میں افریقہ اور ۶۵۰ء/ ۳۰ھ میں ماوراء النہر کی سرزمین نور اسلام سے منور ہوئی۔ عہد رسالت میں ہندوستان میں اسلام کی آمد، غیر معتبر روایات سے قطع نظر، معروف روایات کے مطابق عہد فاروقی میں اس وقت ہوئی جب عثمان بن ابی العاص الثقفیؓ والی عمان و بحرین نے ۱۵ھ میں تھانہ (ممبئی) بھڑوچ (گجرات) اور دیبل (کراچی) پر حملہ کیا۔ اس حملے میں اسلامی لشکر کو فتح ہوئی۔ [مبارک پوری، قاضی اطہر، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، (مکتبہ عارفین، کراچی) ص ۲۴۷]

حمل صاحب القصیدۃ فحملہ الیہ و اقام عندہ ثلث سنین ثم انصرف عنہ فسالہ عبداللہ عن امر ملك الرا فشرح لہ اخبارہ وانہ ترکہ وقد اسلم قلبہ ولسانہ وانہ لم یمکنہ اظہار الاسلام خوف من بطلان امرہ وذھاب ملکہ۔

وکان فیما حکاہ عنہ انہ سالہ ان یفسر لہ القران بالھندیۃ ففسرہ لہ قال فانتحیت من التفسیر الی سورۃ یسین قال ففسرت لہ قول اللہ عزوجل" قال من یحیی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشاءھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم" قال فلما فسرت لہ ھذا وھو جالس علی سریر من ذھب مرصع بالجواھر والدرر لا تعرف لہ قیمتہ قال لی اعد علی فاعدت فنزل عن سریرہ و مشی علی الارض و کانت قد رشت بالماء وھی ندیۃ فوضع خدہ علی الارض وبکی حتی تلت وجھہ بالطین ثم قال لی ھذا ھو الرب المعبود والاول القدیم الذی لیس یشبھہ احد وبنا بیتا لنفسہ واظہر انہ یخلو فیہ لمھم وکان یصلی فیہ سرا من غیر ان یطلع علی ذلک احد"[1]۔

(ابو محمد حسن بن عمرو بن حمویہ حرام بن حمویہ النجیرمی نے بصرہ میں ہم سے ہندوستان کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا کہ وہ ۲۸۸ھ میں جب منصورہ میں مقیم تھے تو وہاں کے ایک ثقہ اور معتبر بزرگ نے ان کو بتایا کہ ایک بڑے ہندوستانی راجہ نے جو را اور کشمیر بالا اور کشمیر زریں کے علاقوں پر قابض اور اس کا نام مہردک بن رائق تھا۔ ۲۷۰ھ میں امیر منصورہ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو خط لکھ کر فرمائش کی کہ ہندی زبان میں اس کے لیے اسلامی احکام و قوانین کی تفسیر و تشریح کی جائے۔ عبداللہ نے منصورہ کے ایک آدمی کو جو عراق کا رہنے والا نہایت ذہین، ہوشیار اور شاعر بھی تھا، اپنے پاس بلایا۔ اس شخص کی پرورش و پرداخت ہندوستان میں ہوئی تھی اور یہاں کی مختلف زبانیں اچھی طرح جانتا تھا، امیر نے اسے راجہ الور کی فرمائش بتائی تو اس نے ایک قصیدہ تیار کیا جس میں راجہ کی حسب ضرورت تمام باتیں بیان کر دیں اور اسے راجہ کے پاس بھیج دیا گیا جب وہ راجہ کے سامنے پڑھا گیا تو اس نے اسے بہت پسند کیا اور عبداللہ کو خط لکھا کہ قصیدہ نگار کو اس کے پاس بھیج دیا جائے عبداللہ نے اسے راجہ کے پاس بھیج دیا۔ وہ وہاں تین سال رہا۔ جب وہاں سے واپس آیا تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا۔ اس نے پورا حال تفصیل سے بیان کیا کہ جب وہ اس سے رخصت ہوا تو وہ دل و زبان سے اسلام قبول کر چکا تھا لیکن حکومت چھن جانے کے خوف سے اس کا اعلان نہیں کر سکتا تھا۔

منجملہ اور واقعات کے اس نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے ہندی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ چنانچہ میں نے تفسیر لکھی اور جب سورۃ یٰسین کی تفسیر تک پہنچا اور اس کے سامنے ارشاد الٰہی" قَالَ مَن يُحۡيِ ٱلۡعِظَـٰمَ وَهِيَ رَمِيمٞ " کی تفسیر بیان کر رہا تھا تو اس وقت وہ موتیوں اور جواہرات سے مرصع سونے کے ایک ایسے بیش قیمت تخت پر بیٹھا ہوا تھا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس نے کہا اس کی تفسیر پھر سے بیان کرو جب

---

1 بحوالہ: ندوی، مسعود علی، ہندوستان عربوں کی نظر میں، (دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۶۰ء) ج ۱، ص ۱۹۳۔۱۹۶

میں نے دوبارہ بیان کی تو وہ تخت سے نیچے اتر پڑا اور زمین پر چلنے لگا، حالانکہ زمین چھڑکاؤ کی وجہ سے تر تھی مگر وہ اپنا رخسار زمین پر رکھ کر رونے لگا یہاں تک کہ اس کا چہرہ مٹی زدہ ہو گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ یہی اصلی پروردگار، معبود اور ازلی وابدی ہے۔ اس کا کوئی ہم سر اور مشابہہ نہیں اس کے بعد اس نے ایک گھر تعمیر کروایا اور ظاہر کیا کہ امور سلطنت پر غور کے لئے تنہائی اختیار کی ہے۔ لیکن دراصل وہ اس میں پوشیدہ طریقہ سے نماز پڑھتا تھا جس کی کسی کو خبر نہ ہو۔)

یہ تاریخی روایت برصغیر کے اولین ترجمہ قرآن کی نشان دہی کرتی ہے۔

برصغیر کی ایک بے نظیر تفسیر شیخ علی بن احمد مہائمی (۷۷۶ھ / ۱۳۷۲ء۔۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء) کی "تبصیر الرحمن وتیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن" المعروف تفسیر مہائمی ہے جو کہ ربط آیات و نظم قرآن پر اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر سالم قدوائی کے بقول؛

"اس کی ایک بڑی خوبی ربط آیات ہے اس کے علاوہ دو اور باتیں ایسی ہیں جو اور لوگوں کے یہاں ہم کو نہیں ملتیں۔ پہلی تو یہ کہ ہر سورۃ سے پہلے اس کا تعارف اور اس کے نام کی توجیہہ دوسرے یہ کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر ہر سورۃ میں مختلف طریقوں سے سورۃ کے مضمون کے مطابق کرتے ہیں"۔

مفسر شیخ مہائمی خود فرماتے ہیں؛

"یہ نکات نظم قرآنی کا بہترین مجموعہ جن میں سے اکثر مجھ سے پہلے کسی جن وانس کی دسترس میں نہیں آئے تھے"[1]۔

تفسیر قرآن از حاجی عبدالوہاب بخاری (۹۳۳ھ) عجیب وغریب تفسیر رسول اللہ ﷺ کی نعت ومنقبت اور آپ ﷺ کے ذکر وتذکرہ سے کی گئی ہے گویا" ہمہ قرآن در شان او است " یعنی سارا کلام ربانی آنحضور ﷺ کی مدح میں ہے. بقول مولانا مناظر احسن گیلانی؛

"ہندوستان کے سوا ایسی تفسیر کہیں اور نہیں لکھی گئی"[2]۔

برصغیر کے قرآنی ادب میں ایک حیرت انگیز کارنامہ ابوالفضل فیضی (۹۵۴ھ / ۱۵۴۷ء۔۱۰۰۴ھ / ۱۵۹۵ء) کی صنعت مہملہ (غیر منقوط) میں پہلی اور مکمل تفسیر "سواطع الالہام" ہے[3]، جس کی مثال فصاحت وبلاغت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ فیضی کے ہم عصر مفسر شیخ یعقوب صرفی اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں؛

---

1 عمری، محمد عارف اعظمی، تذکرہ مفسرین ہند، (دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، ہند طبع دوم ۲۰۰۶ء) ج ۱، ص ۳۸،
یہ تفسیر والیان ریاست بھوپال کے زیر اہتمام ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں مطبع بولاق، مصر سے دو جلدوں میں طبع ہوئی۔

2 گیلانی، مناظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (لاہور س ن)، ج ۲، ص ۳۰۹؛ سہ ماہی "فکر و نظر" اسلام آباد، (برصغیر میں مطالعہ قرآن نمبر) ج ۳۶، ش ۳۔۴، (ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم: برصغیر میں مطالعہ قرآن۔ تراجم و تفاسیر)، ص ۷۷ یہ تفسیر مفقود ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں اس کے بعض اجزا دیئے ہیں۔

3 یہ تفسیر ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء میں نول کشور پریس، لکھنؤ سے بڑی تقطیع میں شائع ہوئی۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دربار

"ولعمری انه لم یقتدرولن یقتدر احد من اساطین الکلام علی ذلک الا برازوهو تفسیر الکلام المجید وتاویل الفرقان الحمید المرسوم ببداء الارقام والمرسوم بسواطع الالهام، ما مست مثله ایدی الافکار ولم یکتحل بنظیره اعین الاحقاب والاعصار"[1]۔

(بہ خدا کبھی نہ تو کوئی عالم ایسی کتاب لکھ سکا ہے اور نہ آئندہ لکھ سکے گا، جیسی عجوبہ روزگار کتاب سواطع الالہام ہے، اس سے پہلے انسانی تصور میں بھی یہ خیال نہیں آیا اور نہ صدیوں میں اس کی کوئی نظیر ملتی ہے۔)

بقول مولانا مناظر احسن گیلانی:

"یہ (سواطع الالہام) ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے ملک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی"[2]۔

علمی وادبی حیثیت سے قطع نظر، نئی جہت میں یہ ایک بے مثال اور عمدہ کوشش ہے۔ اسی طرح تیسویں پارہ کی منقوط تفسیر "جب شغب" برصغیر کے تفسیری ادب میں نادر کاوش ہے۔

علوم القرآن میں پہلی دفعہ شاہ ولی اللہ (۱۷۶۰ء) نے علوم پنجگانہ کی تحقیق انیق پیش کی۔ آپ نے پہلی بار علوم قرآنی کو علم المخاصمہ، علم الاحکام علم تذکیر باعلاء اللہ علم تذکیر ایام اللہ علم تذکیر الموت میں تقسیم کیا[3]۔

ایک اور منفرد کاوش خالص دہلی کی مستورات کی زبان میں اردو ترجمہ قرآن ہے[4]۔

اسی طرح چار جلدوں میں ایک لاکھ اشعار پر مشتمل منظوم تفسیر قرآن" زادالآخرۃ" از مولانا عبدالسلام بدایونی برصغیر کے تفسیری ادب کا سرمایہ افتخار ہے[5]۔

مزید برآں علماء کرام کے علاوہ برصغیر کے حکمران طبقہ میں سے بھی بعض کا قرآنیات کے ساتھ شغف کا مظاہرہ فقید المثال ہے۔ محمود غزنوی کے پوتے اور لاہور کے حکمران سلطان ابراہیم غزنوی (۱۰۵۹ء۔ ۱۰۹۹ء) ہر سال دو نسخے مصحف کتابت کر کے مدینہ اور مکہ مکرمہ بھیجا کرتے تھے۔ سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ء۔ ۱۲۶۵ء)

میں ایک زرتشت عالم آذر کیوان نے " این نامہ افصح از قرآن است " کے دعویٰ کے ساتھ ایک کتاب بھیجی۔ جس کے چودہ حصے تھے۔ اس کی ہر پہلی سطر فارسی میں لکھی ہوئی تھی اور جب اس کی تصحیف کرتے تو وہ عربی ہو جاتی تھی۔ اس کا درمیانی حصہ ترکی بن جاتا اور جب اس (ترکی) کی تصحیف ہوتی تو وہ ہندی بن جاتی۔ اس مختصر ادبی کاوش کے جواب میں فیضی نے یہ تفسیر لکھی۔ محسن فانی، دبستان مذاہب، ص ۲۷۶۔ ۲۷۹

1 فیضی، ابوالفیض، تفسیر سواطع الالہام، (نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۸۸۹ء)، ص ۳۹۷

2 گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۲ / ۲۵۸، ۲۵۴

3 الفوز الکبیر، (المکتبۃ العلمیہ، لاہور، ۱۹۷۰ء)

4 نسیم عثمانی، ڈاکٹر، اردو میں تفسیری ادب، (کراچی، س ن) ص ۸۵

5 بدایونی، عبدالسلام، زادالآخرۃ، (مطبوعہ ۱۲۴۴ھ) صفحات ۱۷۶۲ (اس کی دوسری جلد مسعود جھنڈیر لائبریری، میلسی (ملتان) میں موجود ہے۔

نے کتابت قرآن کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ قریباً انیس برس تک ہر سال اپنے ہاتھوں دو مصحف کی کتابت کرتا رہا[1]۔ ظہیر الدین بابر (۱۴۸۳ء۔۱۵۳۰ء) نے اپنے ایجاد کردہ طرز خطاطی "خط بابری" میں ایک مصحف لکھ کر مکہ مکرمہ بھیجا تھا[2]۔ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۱۸ء۔۱۷۰۷ء) نے قرآن کے دو نسخے کتابت کر کے ان کو مُطلا و مذہب خوبصورت جلدوں کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجا۔ اسی طرح سلطان دکن فیروز شاہ بہمنی (۱۳۹۷ء۔۱۴۲۲ء) نے بھی کتابت قرآن کو سلسلہ روزگار بنایا۔ گجرات کے حکمران مظفر شاہ (۱۵۱۱ء۔۱۵۲۶ء) ہر سال ایک مصحف کی کتابت کر کے حرمین شریفین بھیجا کرتے تھے[3]۔

مذکورہ بالا تذکرہ، برصغیر میں تدریس و تعلیم قرآن اور اہل علم کی ان کاوشوں سے سوا ہے جو انہوں نے علم و فن کی مختلف جہتوں اور زاویوں سے خدمت قرآن کے ضمن میں انجام دیں۔ یہ دوسرے خطوں میں ہونے والی ایسی تمام کاوشوں سے ہرگز کم نہیں، بلکہ کئی امور میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔

قرآن مجید کے مسیحی تراجم

اس قابل فخر ورثہ کے علاوہ برصغیر میں قرآنیات کے باب میں ایک نمایاں پہلو یہاں کے غیر مسلم اہل قلم کی کردہ کاوشیں بھی ہیں۔ قرآنیات پر دیگر تحریروں کے علاوہ ذخیرہ تراجم قرآنی میں ہندو، سکھ اور مسیحی مترجمین کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ترجمہ دراصل مترجم کے عقیدہ اور مسلک کی غمازی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ زبان دانی سے ہٹ کر Translators are Traitors (ان المتر ین ین) کی عملی تصویر پیش کرتے ہیں، جس پر بعض مسیحی اہل قلم کی تحریریں شاہد ہیں۔ برصغیر میں ان مسیحی اہل قلم کے تراجم و قرآنیات کے بارے تحریروں پر (ڈاکٹر سفیر) اختر راہی صاحب کا تبصرہ ان الفاظ میں ہے؛

> " [برصغیر میں] عیسائیوں نے قرآن کریم کے حوالے سے جو قلمی تحریری کام کیا ہے اس کا مقصد قرآن پاک کے صحیح مترجمین و مفسرین کے مقاصد سے بہت مختلف تھا اور خاصی حد تک نازیبا اور پست مقصد تھا۔ پادریوں کی ان کاوشوں کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ قرآن کریم کے منزل من اللہ، کتاب ہدایت اور خدا کے آخری پیغام ہونے کی بہر صورت (معاذ اللہ) تردید کی جائے اس کی صداقت و تعلیمات پر یقین و عقیدہ کو مسلسل کمزور کیا جائے۔ اس کوشش کے نتیجے

---

1 فرشتہ، ابوالقاسم، ہندشاہ، تاریخ فرشتہ، (نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۸۶۴ء)، ص ۴۸

2 بدایونی، عبدالقادر، منتخب التواریخ، (کلکتہ ۱۸۶۹ء)، ج ۱، ص ۸۹ بحوالہ: ششماہی "علوم القرآن" علی گڑھ، ج ۱۰، ش ۱۔۲ جنوری۔ دسمبر ۱۹۹۵ء، (ظفر الاسلام اصلاحی، کتابت قرآن عہد وسطی کے ہندوستان میں)، ص ۱۰۵

3 ایضاً

میں ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا اور ان کے چھاپے ہوئے ترجموں اور تفاسیر قرآن کو مسلمانوں میں کبھی بھی پذیرائی اور قبول عام نہیں ہوا"[1]۔

برصغیر میں مسیحی اہل قلم کی قرآنیات پر بعض کاوشوں کا جائزہ، ان کے پس پردہ مقاصد اور کار فرما سوچ کا تجزیہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

برصغیر میں مسیحی منادوں کی طرف سے قرآن مجید کے ترجمہ میں پہلا نام ہندوستان میں معروف مبشر، ہسپانوی نژاد پادری جیروم زیویئر (Jerome Xavier) (۱۵۴۹ء۔۱۶۱۷ء) کا ہے۔ اکبر کے دور میں وارد ہونے والا یہ مسیحی منادا اور کیتھولک یسوعی مناظرین کا سرخیل عربی سے نابلد تھا۔ مسلمانوں سے مناظرہ کے لیے اس نے بار بار اپنے پرتگیزی احباب سے فرمائش کی کہ اسے قرآن کا لاطینی، ہسپانوی یا پرتگیزی ترجمہ بھیجا جائے۔ اس نے کوشش کر کے ۱۶۱۵ء میں برصغیر میں ہی فارسی ترجمہ کروایا اور پھر خود ہی اسے پرتگیزی میں منتقل کیا[2]۔ اسے برصغیر میں مسیحی منادوں کی جانب سے قرآنیات کے ضمن میں ہونے والی اولین کوشش گردانا جا سکتا ہے۔

بعد ازاں انگریز مشنریز کے آنے تک مسیحی منادین و مناظرین کی طرف سے تراجم قرآنی کے باب میں کسی خصوصی کاوش کا ذکر نہیں ملتا۔ تبشیری وعظوں اور مناظروں میں قرآن پر گاہے بگاہے لب کشائی ہوتی رہی لیکن خاص اس موضوع پر کوئی تحریر معروف نہیں۔ اس کے بعد منظر عام پر آنے والی قابل ذکر کاوش فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (قیام ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء) میں مسیحی ارباب اختیار کی زیر نگرانی مسلم مترجمین کا کردہ ترجمہ قرآن ہے۔ برصغیر میں مسیحی اہل قلم کے قرآنیات پر کام کا جائزہ لینے سے قبل اس اہم تاریخی ترجمہ قرآن کا تذکرہ خالی از افادہ نہیں ہوگا

فورٹ ولیم کالج کے روح رواں اور فارسی، اردو اور سنسکرت کی شاہکار تحریروں کا ترجمہ کروانے والے ڈاکٹر جان بارتھوک گل کرسٹ John Borthwick Gilchrist (۱۷۵۹ء۔ ۱۸۴۱ء)[3] نے مسلم مترجمین سے قرآن کا اردو ترجمہ کرایا[4]۔ ان میں مولوی امانت علی شیدا، میر بہادر علی، مولوی فضل علی، حافظ غوث علی اور کاظم علی جوان کے اسمائے گرامی شمار کیے جاتے ہیں[5]۔ اس کا آغاز ذی الحجہ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں ہوا اور تکمیل رمضان ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء

---

1 سہ ماہی "عالم اسلام اور عیسائیت"، اسلام آباد، ج ۳، ش ۱۲، ۱۹۹۳ء، (اختر راہی، مسیحی اہل قلم کے اردو تراجم و تفاسیر)، ص ۴

2 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۲۵۷

3 مفصل حالات زندگی اور علمی کارناموں کے لیے: گلکرسٹ، اردو کا کلاسیکی ادب، قواعد زبان اردو، (ناشر، سید امتیاز علی تاج)، (مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۲ء)، ص ۱۱۔۳۵ مقدمہ

4 ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور (قرآن نمبر) نومبر ۱۹۶۹ء، (مولوی عبد الحق، پرانی اردو میں قرآن کے تراجم)، ج ۲، ص ۱۸۰

5 ابتدائی پانچ چھ سیپاروں کا ترجمہ مولوی امانت علی اور میر بہادر علی نے کیا۔ چھ سے اکیس پاروں تک مولوی فضل اللہ کے ساتھ

کو ہوئی [1]۔ ترجمہ قرآن کا مسودہ ۴۸۶ صفحات پر مشتمل تھا، جس میں سے صرف ۵۶ صفحات زیور طبع سے آراستہ ہو سکے [2]۔ کیونکہ اس کے بعد انتظامیہ کی تبدیلی کے ساتھ ہی کچھ نامعلوم سیاسی و انتظامی وجوہات اور ذاتی ناپسندیدگی کی بناء پر یہ اہم کام سرکار انگلشیہ کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔ ۱۹ مارچ ۱۸۰۷ء کو گورنر جنرل نے کالج کونسل کو باضابطہ مراسلہ لکھا کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل قرآن کے ترجمہ کی اشاعت کو، جسے گل کرسٹ نے تیار کروایا تھا، قابل اعتراض سمجھتے ہیں [3]۔ چنانچہ اس وقت کے کارپرداز اور متعلقہ ذمہ دار ڈاکٹر ہنٹر کو سیکریٹری کالج کونسل نے ہدایت کی کہ قرآن کے ترجمہ کے جتنے اجزاء چھپ چکے ہیں ان کے تمام مطبوعہ نسخے سیکریٹری گورنمنٹ کے حوالے کر دیجئے اور ساتھ یہ اقرارنامہ بھی داخل کیجئے کہ آپ نے یا ناشر نے اس کا کوئی نسخہ اپنے پاس نہیں رکھا [4]۔

آغاز ترجمہ کے وقت کونسل کے پیش نظر کون سی سیاسی، انتظامی یا مذہبی مصلحتیں تھیں جو عرصہ تکمیل کے دوران بدل گئیں اور یہ ترجمہ قرآن قابل اعتراض ٹھہرا، ان کی وضاحت سامنے نہ آ سکی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشاٹک سوسائٹی، کلکتہ [5] جبکہ دوسرا نسخہ آندھرا پردیش سنٹرل لائبریری (سابقہ نواب سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد) میں موجود ہے۔ حیدرآباد والا نسخہ خط نستعلیق، سائز ۲/۱ ۹ x ۸ سطر ۱۶ اور ۴۸۶ صفحات پر معریٰ ترجمہ

حافظ غوث شریک ہوئے۔ جبکہ بائیس سے آخری پارہ تک صرف مولوی فضل اللہ نے ترجمہ کیا جبکہ کاظم علی شروع سے آخر تک زبان کی اصلاح اور محاورے کی درستگی کے لیے شامل رہے۔ [شطاری، سید حمید، ڈاکٹر، قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک، (ایچ ای ایچ، دی نظامس اردو ٹرسٹ، حیدرآباد ۱۹۸۲ء)، ص ۱۹۵۔۱۹۶]

1 ایضاً، ص ۱۹۱، اس کی آغاز کی تاریخ " صراط المستقیم الحق ہے بالکل " سے ۱۲۱۸ھ نکالی گئی ہے۔ محقق کے مطابق غالباً یہ تاریخ اس کے ایک عدد کے تخرجے کے بغیر نکالی گئی ہے۔

2 سید محمد، بی اے، ارباب نثر اردو (مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۲۷) ص ۱۴۴۔۱۴۵ کے مطابق یہ طبع سورۃ فیل سے آخر تک دس سورتوں کے ترجمہ پر مشتمل تھی جس کے سرورق پر یہ عبارت درج تھی۔ " ترجمہ قرآن بزبان ہندی " لیکن " عالم اسلام اور عیسائیت " میں شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق سید محمد نے مطبوعہ نسخے سے ترجمہ قرآن کا جو نمونہ نقل کیا ہے وہ قرآن مجید کی آخری دس سورتوں میں سے کسی کا ترجمہ ہونے کی بجائے سورۃ ہود کی آیات ۶ تا ۱۱ کا ترجمہ ہے اس لیے سید محمد کی اطلاع مشکوک ہے۔ سہ ماہی " عالم اسلام اور عیسائیت "، اسلام آباد، ج ۵، ش ۱۱ نومبر ۱۹۹۵ء، (فورٹ ولیم کالج کا اردو ترجمہ قرآن)، ص ۱۷

3 Proceedings of the College of Fort William (1801-1805), p 298 بحوالہ " رخشندہ گل، اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات (پی ایچ ڈی مقالہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، غیر مطبوع)، ص ۱۸۶

4 ایضاً

5 خاکوانی، محمد باقر خاں، ڈاکٹر، پاکستان میں قرآن مجید کے تراجم وتفاسیر (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۶ء) ص ۲۶

ہے۔ اس میں دیباچہ، خاتمہ یا ترقیمہ وغیرہ کسی تحریر کا اہتمام نہیں کیا گیا[1]۔ اس نسخہ میں پارہ الم سے سورۃ انفال (پارہ ۱۰) کے نو رکوع تک سورتوں کی ترتیب درست ہے مگر اس کے بعد سولہ صفحات سورۃ حجر کی آیات "وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ" (الحجر ۱۵:۸۹) سے لے کر سورۃ نحل اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت "قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا" (بنی اسرائیل ۱۷: ۵۶) تک کے اوراق ہیں۔ اس کے بعد باقی سورۃ انفال اور مابعد کا ترجمہ ہے اور سورۃ بنی اسرائیل کا ماِبقی ترجمہ چونسٹھ صفحات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ترتیب درست ہے۔ یہ بے ترتیبی غالباً جلد سازی کے وقت ہوئی ہے[2]۔ تاہم اس کی حتمی وجہ کا تعین نہیں کیا جا سکا۔

فورٹ ولیم کالج سے اردو انشاء پردازی کی نئی راہ سامنے آتی ہے جو کہ مسجع، مقفع اور پر تصنع عبارتوں کی بجائے آسان شستہ اور سلیس اسلوب تحریر کی حامل تھی۔ اس ترجمہ کے بارے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رائے ہے۔

> " جہاں تک اردو زبان کی ساخت اور ترکیب کا تعلق ہے یہ ترجمہ پہلے کے تمام ترجموں کے مقابلہ میں زیادہ بامحاورہ اور سلیس ہے اگرچہ الفاظ کی رعایت رکھی گئی ہے"[3]۔

---

1 شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۸۶

2 ایضاً، ص ۱۸۹۔ ۱۹۰

3 ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ، لاہور (حوالہ سابقہ)، ص ۱۸۰

مسیحی قرآنی تراجم

(مکمل)

پادری احمد شاہ   ترجمۃ القرآن

زمانہ پریس، کان پور ۱۹۱۵ء

صفحات: ۵۰۸

تقسیم ہند سے قبل برصغیر میں اردو زبان میں مسیحی اہل قلم کے کردہ قرآن پاک کے دو مکمل تراجم منظر عام پر آئے۔ پہلا پادری عمادالدین (۱۸۳۳ء۔۱۹۰۰ء) کا ترجمہ قرآن تھا (جو نیشنل پریس، امرتسر سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا) جب کہ دوسرا، پادری احمد شاہ کا زیر نظر، ترجمہ ہے۔ اس کا اظہار اشاعت ہذا کے اس ابتدائی جملہ سے ہوتا ہے۔

"مسیحیوں کی طرف سے اردو زبان میں یہ قرآن کا دوسرا ترجمہ ہے"[1]۔

یہ دونوں تراجم بدون متن معرّیٰ ہی طبع ہوئے۔ چونکہ انجیل مقدس کے اصل متن کی عدم دستیابی کی بنا پر مسیحی معاشرہ میں فقط ترجمہ انجیل (لاطینی یا انگریزی) زیادہ رواج پا گیا تھا، غالباً اس پس منظر میں مسیحی اہل قلم کی طرف سے قرآن کو بائبل کی طرح بدون متن پیش کرنے کی یہ شعوری کاوش ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قرآنی متن کو تقدس اور احترام کا درجہ حاصل ہے اور ایسی اشاعت میں قرآنی تقدس کا احساس مفقود رہتا ہے۔ مسلم عقیدہ کے مطابق الفاظ قرآنی منزل من اللہ ہیں اور یہ کلام الٰہی ہونے کی بناء پر خاص تقدیس کے حامل ہیں۔ لیکن غالب مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ انجیل کے الفاظ من و عن الہامی نہیں بلکہ الہام و کشف کو انسانی الفاظ میں ڈھالا گیا ہے[2] اس لیے الفاظ اتنے اہم نہیں۔ پادری عماد الدین کے ترجمہ قرآن سے قبل مسلمانوں کے ہاں بدون متن، معرّیٰ ترجمہ قرآن کی اشاعت کی روایت موجود نہ تھی۔ زیر بحث ترجمہ دیکھ کر قرآنی احترام و تقدس کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔

سبب ترجمہ: مترجم پادری احمد شاہ کے نزدیک اس عہد میں مسلم تراجم قرآنی گروہی فکری چھاپ اور بامحاورہ نہ ہونے کی بنا پر غیر مسلموں کے لیے باعث الجھن تھے۔ اس عمومی رویہ کو دیکھتے ہوئے پادری صاحب نے ایسے بامحاورہ ترجمہ قرآن کا بیڑا اٹھایا جو مسیحی منادین کی ضروریات پورا کر سکے۔

"محمدی علماء کے ترجمے میں ایک بھاری نقص یہ ہے کہ ہر مترجم اپنے فریق کی رائے کا پابند ہو کر ترجمہ کو اسی پہلو سے ڈھالتا ہے۔۔۔۔ پس غیر محمدی کے لیے یہ ترجمے نہ صرف بے کار بلکہ الجھن میں ڈالنے والے ہیں۔ مجھ کو مسیحی منادوں کے لیے خاص طور سے محسوس ہوا کہ ایک ایسے ترجمے کی ضرورت ہے جو اردو میں عربی قرآن کو لفظ بہ لفظ اور حتی

---

1 احمد شاہ، پادری، ترجمۃ القرآن، (زمانہ پریس، کانپور ۱۹۱۵ء) بدون شمار صفحہ، زیر عنوان "التماس"

2 فانڈر، سی جی، پادری، میزان الحق، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۶۲ء)، ص ۱۶۴

الامکان بامحاورہ ادا کرے"۔[1]

مترجم نے اس ترجمہ میں درج ذیل امور خیال رکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔

۱ جہاں تک ممکن ہو بیرونی الفاظ نہ ملائے جائیں۔

۲ زبان بامحاورہ ہو۔

۳ عربی الفاظ کی ترتیب جہاں تک ممکن ہو قائم رہے۔

۴ جو الفاظ عربی کے زبان اردو میں رواج پاگئے ہیں ان کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ ان کی اصلی حالت قائم رہے۔

۵ شان نزول جن پر محمدی علماء کا اتفاق ہے بطور تحت حاشیہ اسباب وحی میں درج کر دیئے جائیں۔

۶ کسی امر متنازعہ پر کسی خاص فرقہ کی تائید نہ کی جائے بلکہ ناظرین خود اس سے اپنے لیے نتیجہ نکال لیں۔

۷ ترجمہ میں تعصب اور ذاتی رائے سے کام نہ لیا جائے[2]۔

ایک مبسوط مقدمہ لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا جسے اشاعت ہذا کے بعد الگ سے قارئین تک پہنچانے کا وعدہ تھا لیکن اس کی اشاعت یا لکھا جانا غیر معروف ہے۔

- "فہرست سور تہائے قرآن معہ نمبر شمار وصفحہ" کے عنوان کے تحت باعتبار حروف تہجی تین کالموں میں قرآنی سورتوں کی فہرست دی گئی ہے۔ پہلے کالم میں ترتیب توقیفی کے اعتبار سے سورت نمبر، دوسرے کالم میں نام سورت اور تیسرے میں صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔ پہلا اندراج سورت ابراہیم کا ہے اور آخری سورت یونس کا ہے۔ دو صفحات پر مشتمل اس فہرست کے پہلے صفحہ پر ۶۴ جبکہ دوسرے صفحہ پر ۵۶ اندراج ہیں[3]۔

- ہر سورت کے آغاز میں سورت نمبر، نام سورت، مکی / مدنی اور تعداد رکوع و آیات درج ہے۔ اسماء سور میں "ال" لکھنے کا التزام نہیں اور مسلم روایت کے برعکس بعض کا ترجمہ خطوط وحدانی میں لکھا ہے۔

مثلاً ۶۔ سورہ انعام (چوپائے) مکی ۲۰ ع آیات ۱۶۵[4]

- ہر صفحہ کے انتہائی اوپر دائیں جانب فارسی میں نام پارہ و نمبر جب کہ دائیں جانب نام سورت مع نمبر لکھا گیا ہے۔ مثلاً پارہ ہشتم ۶۔ انعام[5]

---

1 احمد شاہ، ترجمۃ القرآن، بدون شمار صفحہ، زیر عنوان "التماس

2 ایضاً

3 ایضاً

4 ایضاً، ص ۱۰۸

5 ایضاً، ص ۱۱۹

- مسلم روایت کے برعکس آیات کے نمبر اختتام آیات کی بجائے آغاز آیت میں دے کر شعوری طور پر بائبل کا انداز اپنانے کی سعی کی گئی ہے۔ نیز آیات کے نمبر فلوگل(Flugel) کے ۱۸۳۴ء میں لیپزگ(Leipzig) جرمنی سے شائع کردہ قرآن کریم کی ترتیب سے ہیں جو کہ ہمارے ہاں متداول مصحف سے مختلف ہے۔ اس میں تعداد آیات تو یکساں ہے لیکن آغاز و اختتام آیت میں اختلاف ہے۔
- ہر سورت سے قبل بسم اللہ کا ترجمہ "نہایت مہربان بڑے رحم والے اللہ کے نام سے" (صرف سورت فاتحہ سے قبل" نہایت مہربان اور بڑے رحم والے اللہ کے نام سے") ہے[1]۔
- جابجا کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ جنہیں ممکن ہے مسیحی قاری معمولی خیال کرے لیکن مسلم قاری ان سے صرف نظر نہیں کر پاتا۔ مثلاً

۔ ابتداء میں سورت ابراہیم کا نمبر ۱۴ کی بجائے ۱۴۱ لکھا ہوا ہے[2]۔

۔ ص ۴۳ کا آغاز سورۃ آل عمران سے ہو رہا ہے لیکن اوپر سورۃ بقرہ لکھا ہے۔

۔ پارہ ششم میں صفحہ ۹۰ سے لے کر صفحہ ۱۰۷ تک ہر صفحہ کے بائیں جانب مائیدہ مرقوم ہے جبکہ سورت کے آغاز پر نام مائدہ لکھا ہوا ہے۔

۔ ص ۲۰۹ پر سورت حجر کا نمبر شمار ۱۵ کی بجائے ۵ مرقوم ہے۔ اسی طرح سورۃ مریم کا شمار نمبر ۱۹ کی بجائے ۲۹ درج ہے۔ سولہویں پارے کا آغاز ص ۲۴۰ سے ہوتا ہے۔ مگر اسے ۲۴۱ پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اور صفحہ ۲۴۲ پر دوبارہ پارہ پنجدہ شش ودہم (پندرہواں و سولھواں) مرقوم ہے۔

۔ ص ۴۷۱ پر سورت کا نام بدون نمبر لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح ص ۴۸۳ پر ۲۹ واں پارہ اختتام پذیر اور ۳۰ ویں کا آغاز ہو رہا ہے۔ سابقہ اسلوب کے برعکس دونوں پاروں کا نام ذکر نہیں کیا گیا صرف ۳۰ ویں کا لکھا ہے۔

۔ ص ۴۰۹ پر لفظ "گشت" بغیر نقطوں کے، ص ۳۱۵ پر حمزہ کو ہمزہ، ص ۴۹۸ پر کنجوسی کو کنجو شی اور ص ۴۸۵ پر سورۃ النباء کو سورہ بنا لکھا گیا ہے۔

ان اسقام سے کتابت میں بے توجہی کا رویہ سامنے آتا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے ہاں دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے کلام الہی کی کتابت میں چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا بہت باریک بینی سے خیال رکھا جاتا ہے[3]۔

---

1 احمد شاہ، ترجمہ القرآن، ص ا

2 ایضاً، ص بدون نمبر شمار، فہرست سورہ

3 سر سید احمد خاں نے اپنی تفسیر بائبل " تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام" میں متن بائبل نقل کرنے میں اسلامی روایت کی پیروی کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیا۔ عبرانی ٹائپ کے حروف خصوصی طور پر منگوائے گئے، نیز عبرانی

- حاشیہ نگاری کے لیے متن میں "ـ" کی علامت بدون نمبر شمار دی گئی ہے۔ نیچے حاشیہ میں متعلقہ آیت نمبر کے ساتھ حاشیہ لکھا گیا ہے۔
- لفظی کی بجائے یہ بامحاورہ ترجمہ سہل، رواں اور سلیس ہے۔ گنجلک، ثقیل اور بلاغت و فصاحت کی حامل انشاء پردازی کی بجائے آسان اور سادہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ عبارت اس دور کی طرز تحریر کے مطابق ہے۔ "ں" کی بجائے "ن" کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "میں" کو "مین"، "ہیں" کو "ہین"، "نہیں" کو "نہین" "لائیں" کو "لاوین"، "ہاں" کو "ہان" اسی طرح "اس" کو "اوس" وغیرہ
- فارسی اور عربی تراکیب یا مفردات کو بھی کم جگہ دی گئی ہے۔ البتہ بعض قرآنی تراکیب و اصطلاحات کے ترجمہ میں عبارت کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ مثلاً

"الم (۱) اس کتاب مین کوئی شک نہین ہے متقیوں کے لیے رہنما ہے۔ جو ان دیکھے پر یقین رکھتے ہین اور درستی سے نماز پڑھتے ہیں اور ہماری دی ہوئی روزی مین سے دیتے ہین"[1]۔

یقیمون کا ترجمہ قائم کرنا کی بجائے پڑھنا مفہوم کو بالکل محدود کرنا ہے۔

- اس بات کا خاص اہتمام ہے کہ شان نزول یا پھر وہ آیات جن کا تعلق مسلم مفسرین نے یہود سے جوڑا ہے ان کے بارے حاشیہ آرائی کی جائے۔ جب کہ مترجم قرآن کے مخاطب اہل کتاب کے بڑے گروہ یعنی عیسائیوں سے متعلقہ بیانات کا ترجمہ کر کے خاموشی سے آگے گذر جاتے ہیں اور صرف اپنے مفید مطلب مقام پر حاشیہ آرائی کرتے ہیں۔ بطور محشی اہم مقام پر اپنی ذمہ داری سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ مائدہ کی آیت ۷۶۔۷۷ کا ترجمہ یوں کیا ہے؛

"(۷۶) بیشک وہ کافر ہوئے جو کہتے ہین کہ اللہ وہی مسیح ابن مریم ہے مگر مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی جو میرا اور تمہارا رب ہے عبادت کرو جس نے اللہ کا شریک مقرر کیا اسپر اللہ نے جنت کو حرام کر دیا اوسکا ٹھکانا آگ ہے ظالمون کا مددگار کوئی نہین (۷۷) بے شک وہ لوگ کافر ہوگئے جنھون نے کہا کہ بیشک اللہ تین مین کا تیسرا ہے بجز ایک اللہ کے کوئی اللہ نہین اور اگر وہ اس سے جو وہ کہتے ہین باز نہ آوین تو ان لوگون کو جو انمین سے کافر ہوئے بہت سخت عذاب ہوگا"[2]۔

مترجم کے عقائد کی تغلیط و تکفیر کرنے والی آیات کا بدون تردید و توضیح سادہ ترجمہ اس مناظراتی عہد کی تبشیری تحریروں کے مزاج کے برعکس اور پادری صاحب کی ابتدائی کتاب امہات المؤمنین (مطبوعہ ۱۸۹۴ء) کی بہ نسبت

زبان کے ماہر مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کے ساتھ ایک یہودی عالم کی خدمات حاصل کیں۔[سرسید احمد خاں، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام، (مکتبہ اخوت، لاہور، س ن)، بدون شمار صفحہ، حرف اول]

1 احمد شاہ، پادری، ترجمۃ القرآن، ص ۲

2 ایضاً، ص ۱

شائستہ ہے۔ مترجم سے آشنا قاری کو یہ رویہ ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ شاید یہ تعصب کے سطحی اظہار میں بتدریج تبدیلی کا آئینہ دار ہے۔

پادری صاحب ماخذ کی نشان دہی اور حوالہ دیئے بغیر ہی "روایت ہے" ، " بعض کا خیال ہے" ، " کہتے ہیں" کے الفاظ میں شان نزول بیان کرتے ہیں۔ قاری ان کے قول کی ثقاہت کو پرکھ نہیں سکتا کہ آیا یہ بات ان کی خود ساختہ ہے یا کسی مفسر کا شاذ قول ہے یا صحیح روایت ہے۔ نیز اس بارے مسلم علماء کے متفقہ بیان کردہ سیاق وسباق درج کرنے کے اپنے دعوی پر پورا اترتے دکھائی نہیں دیتے۔ حاشیہ آرائی میں اپنی فکر کو بھرپور طریقے سے سمونے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً سورت فاتحہ کا پس منظر دیتے ہوئے رقم طراز ہیں،

" بعض کا خیال ہے کہ یہ سورۃ دو مرتبہ نازل ہوئی اس سورۃ کی بابت کہا جاتا ہے کہ دعوی نبوت سے قبل جب حضرت محمد صاحب مکان سے دور صحرا مین ہوا کرتے یعنی گھوما کرتے تھے تو اکثر آواز سنائی دیتی تھی "یا محمد" جسکو سن کر حضرت خوف زدہ ہو جایا کرتے تھے اور جب اسکا ذکر ورقہ بن نوفل سے جو ایک مسیحی عالم تھا کیا تو اوس نے کہا کہ خوف مت کرو بلکہ غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے جب اس پر عمل کیا تو معلوم ہوا کہ یہ آواز جبرئیل کی ہے۔ اور اوس نے یہ سورۃ حضرت کو پڑھائی گویا تلاش حق کا گر سکھلا دیا"[1]۔

اسی طرح سورت فاتحہ کے متعلق کہتے ہیں؛

منظر سورۃ (فاتحہ) مین اتنی ہی درخواستین ہین جس قدر خداوند (یعنی حضرت عیسی علیہ السلام) کی دعا مین ہین۔ محمدی اس کو اپنی ہر نماز مین کئی دفعہ پڑھتے ہین"[2]۔

حاشیہ آرائی میں بعض مقامات پر مترجم نے کلام الٰہی کو رسول اللہ کے ذہنی پس منظر کا اظہار گردانا ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت ۱۵ کا ترجمہ "یہ ایسے لوگ ہین جنھوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید کی پس اون کی تجارت نے اون کو کچھ نفع نہ پہونچایا اور نہ انہوں نے ہدایت پائی" لکھ کر اس کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں؛

" دعوے نبوت سے پہلے محمد صاحب خود صیغہ تجارت میں مشغول تھے ممکن ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوا ہو"[3]۔

اخذ شدہ غلط نتیجہ پر مبنی ان خط کشیدہ الفاظ سے مترجم کے دعوی کی رکاکت کے ساتھ ساتھ تعصب بھی آشکار ہوتا ہے۔ جس سے احتراز کے وہ خود مدعی تھے۔

اسی طرح سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۳۴ میں مذکور لفظ شیطان کے ذیل میں لکھتے ہیں؛

---

1 احمد شاہ، ترجمہ القرآن، ص ا

2 ایضاً

3 ایضاً

" آیت ۲۳ میں ابلیس استعمال ہوا ہے اور آیت ۳۴ مین شیطان۔ نئے عہد نامے کے عربی ترجمے مین بھی ابلیس استعمال ہوا ہے۔ سورۃ کہف آیت ۴۸ مین ابلیس کو جنون مین سے بتلایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صاحب نے فارس اور ہندوستان کے جنون کے اور پریون کے افسانون سے متاثر ہو کر ابلیس کو جنون مین سے بتلایا ہے "[1]۔

مترجم کی اس حاشیہ آرائی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مبشرین میں معروف پادری گولڈ سیک کی تصنیف "ینابع القرآن" (طبع ۱۹۰۹ء) ان کے مد نظر ہے۔

اکثر حاشیہ میں قرآنی آیات کی تائید کرنے والے بائبل کے بیانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً دیکھو زبور ۱۰۴ (ص ۵، تحت سورۃ بقرہ آیت ۳۴)، سورۃ بقرہ آیت ۶۱: مرقس ۸ : ۳۰ (ص ۱۰۱، تحت سورۃ مائدہ آیت نمبر ۸۲) وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ بائبل کی روایت کے حوالے سے مسلم مفسرین کی بعض آراء کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرۃ آیت ۲۴۹ میں مذکور لفظ " سکینہ " کے تحت رقم طراز ہیں:

"لفظ "سکینہ " اپنی اصل مین عبرانی ہے محمدی مفسرین نے تسکین سے تعبیر کیا ہے جو بالکل غلط ہے کیونکہ سکینہ اور تابوت دونون کے معنی صندوق کے ہین لفظ تابوت کے لیے سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۹ کو دیکھو یہ قصہ سلاطین باب ۴، ۵، ۶ سے اخذ ہے"۔

بعض مقامات پر مترجم کی عربی زبان میں درک کی نفی ہوتی ہے۔ مثلاً سورۃ بقرۃ آیت نمبر ۱۴ کا ترجمہ درست نہیں ہے۔ "اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ "کا ترجمہ "اللہ ادن سے تمسخر کرتا ہے اور ادن کو گمراہی کے چکر مین ڈالے رکھتا ہے" کیا گیا ہے۔ یہاں يَعْمَهُونَ کے فعل کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ڈالی گئی ہے جب کہ اصلاً فعل کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ پہلے مسیحی اردو مترجم پادری عمادالدین صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں، " خدا ان سے ٹھٹھہ کرتا ہے اور ان کی شرارت میں انہیں کھنچتا ہے وہ بہکتے ہیں"[2]۔

ترجمہ میں حروف کے معنی کا اہتمام کبھی کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے جس سے معنی بدل جاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ آیت ۱۹ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ میں" يَكَادُ "کا ترجمہ نہیں کرتے اور آیت کا فعل حال میں یوں ترجمہ کرتے ہیں،

"بجلی ان کی بینائی کو جھپٹ کرلے جاتی ہے جب روشنی معلوم ہوتی ہے تب چلتے ہین جب تاریکی چھا جاتی ہے تب کھڑے رہ جاتے ہین اگر اللہ چاہے تو اون کی سماعت اور بصارت کو لے جائے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"[3]۔

نیز سورۃ الحجر کا ترجمہ پتھر کیا گیا ہے حالانکہ یہ حجر ظرف ہے جو کہ قوم صالح کا مسکن ہے نا کہ حَجر بمعنی پتھر۔

---

1 احمد شاہ، ترجمۃ القرآن، ص ۵

2 عمادالدین، لاہز، ترجمہ قرآن بہ اردو زبان، (امرتسر ۱۸۸۶ء)، ص ۳

3 احمد شاہ، ترجمۃ القرآن، ص ۳

الفاظ کی گہرائی اور زبان کی باریکیوں کے بارے عدم تفکر کے مظاہرہ سے مترجم اپنا مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ مسیحی منادین کو قرآنی محتویات سے آشنا کروانے کی غرض سے کیا گیا یہ ترجمہ قرآن مسلم افکار کی صحیح تصویر کشی نہیں کرتا۔ مترجم کے پیش نظر قرآنی مضامین کو مخصوص زاویہ نگاہ سے قاری کے سامنے رکھنے کی ضرورت نے اس کاوش کی علمی وقعت کو بہت حد تک گھٹا دیا ہے، یہ کہنا چنداں غلط نہ ہوگا کہ مخصوص روش کی بنا پر یہ ترجمہ عام مسلم قاری کے لیے نہیں کیونکہ یہ عربی سے نابلد مسیحی منادین کے لیے کیا گیا ہے۔

پادری عماد الدین   ترجمہ قرآن بہ اردو زبان

نیشنل پریس، امرتسر، ۱۸۹۴، بار اول[1]

صفحات: ۳۰۴

اردو رسم الخط میں یہ اشاعت ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مقدمہ ۲ جبکہ اختتام پر ۹ صفحات کا اشاریہ اور صحت نامہ (تصحیح اغلاط) بھی شامل ہے۔

زیر نظر ترجمہ قرآن کو برصغیر کے مسیحی تراجم قرآنی میں تقدم حاصل ہے۔ اس سے قبل مسیحی حلقہ کی طرف سے امریکن پریسبٹیرین مشن کی طرف سے ۱۸۴۴ء میں لدھیانہ سے شاہ عبد القادر دہلوی کا ترجمہ قرآن رومن رسم الخط میں شائع ہو چکا تھا۔ ارتداد سے قبل اکبر آباد کی مسجد میں امامت کروانے، عربی زبان پر عبور اور علوم شرعیہ میں رسوخ رکھنے کی بنا پر مسیحی مترجم کی اس کاوش کو خصوصی اہمیت ہے۔

اس پہلے مکمل مسیحی ترجمہ قرآن کا سبب پادری صاحب دیباچہ کے ابتداء میں یوں بیان کرتے ہیں؛

> " از طرف بندہ مترجم عماد الدین لاہز واضح ہو کہ یہ ترجمہ قرآن کا عربی سے اردو میں بمراد فائدہ عام جو میں نے لکھ (لکھ) دیا اس کا پہلا سبب مرزا غلام صاحب قادیانی کا وہ قول[2] ہوا جو انہوں نے مسٹر آتھم سے کہا کہ جانتے کیونکر بتوجہ دیکھ سکتے ہیں کیا وہ عربی سیکھہ (سیکھ) کے دیکھیں ایسی تکلیف عقلاً و نقلاً جائز نہیں کہ غیر ملک کے لوگوں کو دیجائے۔ چاہیے کہ قرآن کے حامی اس کا ترجمہ کر کے کہیں (کہیں) کہ سب لوگ بتوجہ دیکھیں مگر ان کی طرف اب تک عام فہم عبارت میں اس کا ترجمہ نہ ہوا۔ وہ لفظی ترجمے دو معزز بزرگوں سے ہوئے جو عربی خوانوں کے فائدے کے لیے ہیں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ جب سے ہندوستان میں اسلام آیا ابتک عام فہم عبارت میں قرآن کا ترجمہ انھوں نے نہ

---

1 بقول ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) اس کا ایک اور ایڈیشن رومن رسم خط میں کلکتہ سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ (القرآن فی کل اللسان، (ادارہ عالمگیر تحریک قرآن، حیدر آباد دکن، طبع ثالث ۱۳۶۶ھ)، ص ۵،۶

2 مرزا صاحب نے سابقہ مسلم اور نو مسیحی پادری عبد اللہ آتھم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ آپ لوگ کبھی انصاف کی پاک نظر کے ساتھ قرآن کریم کو نہیں دیکھتے۔ قادیانی، غلام احمد، مرزا، جنگ مقدس، (قادیان)، ص ۱۵۱

کیا۔[1] اور فی الحال علماء محمدیہ زور تفسیریں لکھنے پر بہت ہے مگر محققین بانصاف صرف متن دیکھنے کے محتاج ہیں تاکہ مدعی کا خالص دعویٰ پہلے سنیں پھر گواہوں کی چستی یا سستی جو کچھ ہو تفسیروں سے دریافت کر کے اپنی تمیزوں سے اپنے لئے آپ فیصلہ کریں۔ لیکن مجھے امید نہیں رہی کہ علماء محمدیہ کا عام فہم ترجمہ عربی سے الگ کر کے کبھی رائج کرینگے شاید یہ نمونہ دیکھے کچھ کریں تو اچھا ہے۔ پس ان کی طرف سے ناامید ہو کے یہہ ان کا بوجہہ (بوجھ) تمام ہندوستان کے فائدہ کے لیے میں نے اٹھایا۔ اور مرزا صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی کہ قرآن کو دوبارہ نہ صرف بہ توجہ دیکھا بلکہ بتوجہ اس کا ترجمہ کیا اور نہایت کوشش کی کہ کہیں مجھ سے امانت میں خیانت نہ ہو کیونکہ عدالت الٰہی میں حاضر ہونا ہے "[2]۔

ترجمہ کے ماخذ:

پادری صاحب رقم طراز ہیں؛

"(یہ) ترجمہ لکھتے وقت کتب مفصلہ ذیل میز پر میرے سامنے تھے۔(۱) لفظی ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب کا (۲) کچھ لفظی بامحاورہ دہلی ترجمہ شاہ عبد القادر صاحب کا (۳) فارسی ترجمہ آقا جمال صاحب مجتہد ایران کا ہے جو سالگذشتہ (سال گذشتہ) میں درمیان بمبئی کے چھپا عمدہ ہے اور فصیح اور نہایت صحیح ہے۔(۵) تفسیر جلالین (۶) تفسیر قاضی بیضاوی (۷) تفسیر الفوز الکبیر (۸) تفسیر مدارک التنزیل (۹) تفسیر حسینی۔ یہہ تفسیر بہت عمدہ اور جامع ہے کہ بہت سی تفسیروں کے خیالات اسمیں جمع ہیں (۱۰) تفسیر اتقان فی علوم القرآن (۱۱) قاموس در علوم لغت (۱۲) منتھی الارب در لغت (۱۳) صراح"[3]

---

1 پادری صاحب کا یہ دعویٰ تاریخی حقائق کے خلاف ہے کیونکہ اس وقت تک قرآن پاک کے کئی ایک تراجم ہو چکے تھے مگر منظر عام پر کم آئے تھے اس کی ایک وجہ اس دور تک جاری مسلم علماء کے ہاں یہ ایک نزاعی بحث تھی کہ قرآن کریم کا ترجمہ جائز بھی ہے یا نہیں۔ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ علمائے دین کی مخالفت ترجمہ و تفسیر کے کام میں مانع رہی" " فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی نگرانی میں مسلم علماء نے جو ترجمہ قرآن کیا اس کے بارے مرقوم ہے،"شروع ترجمہ میں خلقت نے اس بات میں بہت سی شورش کی تھی کہ بنا اس ترجمے کی ہوتی ہے نہایت دین و آئین سے برخلاف ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ ہندی میں ہوتا ہے آخرش جو اہل علم تھے انھوں نے جواب دیا کہ اگر فارسی میں ترجمہ ہوا ہے تو ہندی میں کیا کفر ہے۔(شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۹۳)۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۸ء (لاہور) میں ڈپٹی نذیر احمد نے کہا، " ۔۔۔۔ میرے مذہب میں قرآن کا ترجمہ گناہ ہے کیونکہ ترجمہ میں معجزہ بیانی نہیں آسکتی۔" کیونکہ ان کے خیال میں، " اگر ہم قرآن کو اصل زبان میں سمجھتے ہوتے تو ہم اس سے کہیں بہتر مسلمان ہوتے جیسے اب ہیں، بعد ازاں ان کی یہ رائے بدل گئی اور انہوں نے خود بامحاورہ شگفتہ زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ [صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار، (مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۱ء)، ص ۲۶۵، ۲۶۴]

2 عماد الدین، ترجمہ قرآن بہ اردو زبان، ص ۱

3 ایضاً، ص ۲

- ہر سورت کا آغاز میں عدد سورت، نام، مکی، مدنی اور تعداد آیات و رکوع کا ذکر کیا گیا ہے۔

مثلاً (۲) سورہ بقرہ مدنی ہے آیات ۲۸۶ رکوع ۴۰

- بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ " اللہ رحمن رحیم کے نام سے شروع کرتا ہوں " ۱۱۳ سورتوں کی بجائے سورۃ توبہ سمیت ۱۱۴ سورتوں کے شروع میں دیا گیا ہے۔
- آیات کے نمبر اختتام کی بجائے (بطرز انجیل) شروع آیت میں دیئے گئے ہیں۔ نیز آیات کے نمبر فلوگل کے ۱۸۳۴ء میں لیپزگ (Leipzig) جرمنی سے شائع کردہ قرآن کریم کی ترتیب سے ہیں جو کہ متداول مصاحف قرآنی سے مختلف فیہ ہے۔ اس میں تعداد آیات تو یکساں لیکن آغاز و اختتام آیت میں فرق ہے۔
- متن کے باہر " ع " سے پارے کے رکوع کی نشاندہی کی گئی جس کے اوپر رقم رکوع مندرج ہے مگر آیات، رکوع اور سورت کے رکوع کے نمبر کا اظہار نہیں کیا گیا۔ جیسے ۴ع۔ تیسویں پارے میں سورۃ النازعات کے بعد رکوع نمبر نہیں دیئے گئے۔
- ہر رکوع نئی سطر سے شروع کیا گیا ہے۔
- آغاز پارے کا اظہار متعلقہ آیت / الفاظ کو تحت الخط یعنی ان پر ایک لائن کھینچ کر کیا گیا ہے
- اگرچہ اس وقت فورٹ ولیم کالج اور سر سید کی تحریک کے نتیجہ میں معاصر مذہبی ادب میں آسان انشاء پردازی اور اردو محاورہ کا استعمال راہ پا چکا تھا۔ لیکن عربی، فارسی اور ہندی ترکیبات کے عام استعمال کی وجہ سے ترجمہ ہذا میں یہ اسلوب نہیں ہے۔ تحریر میں پرانی اردو کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔
- رسم الخط کے حوالہ سے اکثر "ھ" کی بجائے "د" اور "ں" کی بجائے "ن" کا مشاہدہ عام ہے۔ مثلاً کچھہ، یھہ، کھین، پھلے وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ مقالہ میں اس کی منقول عبارتوں کو بعینہ اسی رسم الخط میں نقل کر دیا گیا ہے۔
- زبان دانی کے اعتبار سے اپنے دور کی تحریروں کے ہم پلہ ہے۔

نمونہ ترجمہ

- (۱) الم اس کتاب میں کچھ شک نہیں ہے اہل خوف کے لیے ہدایت ہے (۲) جو ان دیکھے (ان دیکھے) پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور جو کچھہ (کچھ) انکو ہم نے دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (پادری صاحب کے ہم سفر اسلام سے ارتداد کرنے والے نو مسیحی سلطان محمد پال نے یہاں الصلوۃ کا ترجمہ دعا کیا ہے [1])
- سورۃ اخلاص مکی ہے آیات ۴

اللہ رحمن و رحیم کے نام سے شروع کرتا ہوں

(۱) تو کہہ اللہ ایک ہے (۲) اللہ بے نیاز ہے (۳) اسنے کوئی نہیں جنا اور نہ وہ خود جنا گیا (۴) اور اسکا ہمسر کوئی نہیں۔

1 پال، سلطان محمد، سلطان التفاسیر، (ایم کے خاں مہان سنگھ، لاہور س ن)، ص ۲۲

- بعض اوقات مفردات کے معانی ہندی محاورہ یا الفاظ میں کیے ہیں حالانکہ معاصر مسلم و مسیحی تحریروں میں ان کے مترادف آسان اردو الفاظ مستعمل تھے۔ جیسے انداد ا ہمتا وقودھا بالن وغیرہ
- ترجمہ میں قوسین کا اضافہ کر کے توضیحات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مثلاً

۔اللہ تجھے خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی جو خدا کا کلمہ (یعنی عیسیٰؑ) کا مصدق اور ایک سید ہے اور عورتوں سے پاک اور ایک نبی ہو گا۔ (آل عمران ۳ : ۳۸)

- بعض اوقات ان قوسین میں آیات کا سیاق و شان نزول بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ اصحاب کہف ورقیم ہماری نشانیوں میں سے کچھ اچنبا تھے۔ (یہ وہ بعض عیسائی کہلاتے ہیں جو بعہد دقیانوس پہاڑ کی غار میں چھپے تھے جب مسیحی مارے جاتے تھے۔ (الکھف ۱۸ : ۱۸)

- وہ اپنی خواہش کا پیرو ہے اسکا کام از حد گذشتہ ہے (وہ امیہ بن خلف یا عنیہ بن حفص تہا کہ صحبت سے حضرت کی منع کرتا تہا) (الکھف ۱۸ : ۲۳)

۔ انکا ارادہ ہے کہ طاغوت (یعنی شیطان مراد کعب بن اشرف یہودی) کی طرف فیصلہ کے لیے مقدمہ لیجائیں (النساء ۴ : ۹۳)

- بعض جگہ محذوف الفاظ کو قوسین میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۔ پہر اسکے بعد ایک سال آیگا جس میں لوگ بارش پائیں گے اور (انگور) نچوڑیں گے۔ (یوسف ۱۲ : ۹۴)

- بعض آیات میں مستعمل عربی مفرادات کو ترجمہ میں اس طرح استعمال کر کے رعایت لفظی کا مظاہرہ کیا ہے۔

۔اے مسلمانوں تم (محمد کو) راعنانہ کہا کرو انظرنا کہا کرو۔ (البقرہ ۲ : ۱۰۴)

۔ کیا ان کافروں نے نہ دیکھا کہ آسمان اور زمین رتق تھے (یعنی شیء واحد) پھر ہمنے انہیں فتق کر دیا (یعنی جدا جدا) (انبیاء ۲۱ : ۳۱)

- نیز فارسی تراکیب کا بھی بر موقع استعمال کیا گیا ہے۔

۔ مشرق اور مغرب خدا کی ہے جدھر تم منہ کرو ادھر خدا کا مونہہ ہے خدا فراخ دانندہ ہے۔ (بقرۃ ۲ : ۱۱۵)

- اردو میں غیر مستعمل ہندی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

۔ جو خدا کے سوا انداد (ہمتا) ٹھہراتے ہیں۔ (بقرۃ ۲ : ۱۵۸)

۔ اور جو مورث مرد یا عورت کلالہ ہو (یعنے کہنڈی چہری (کُھنڈی چُھری) یعنے اوت نپوت جسکے نہ باپ ہے نہ بیٹا اور خصم والیوں کا لینا بھی حرام ہے۔ (النساء ۴ : ۱۵)

- جہاں قرآن نے مسیحی عقائد پر تنقید کی ہے وہاں مسیحی مترجم خاموشی سے بلا کسی تعلیق کے گذر جاتے ہیں۔

۔ اے اہل کتاب اپنے دین میں مبالغہ نہ کرو اور خدا کی نسبت صرف حق بات بولو۔ مسیح ابن مریم اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے جسے اسنے مریم کی طرف ڈالا تھا اور روح ہے اس میں سے (یعنی خدا میں سے) پس تم اللہ پر اور اسکے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین نہ کہو باز آؤ۔ (النساء ۴ : ۱۷۱)

۔ وہ کافر ہیں جو مسیح ابن مریم کو اللہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ مسیح بن مریم اور اس کی ماں کو اور سب کو جو زمین میں ہیں ہلاک کرنا چاہے تو کون اس کے ارادہ کو روک سکیگا۔ (المائدہ ۵ : ۱۹)

- اردو محاورہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

۔ اور جو نصیحت انھیں ملی تھی اس سے حظ اٹھانا بھول گئے۔ (المائدۃ ۵ : ۱۶)

- ایک جگہ کتابت کی غلطی سے ترجمہ میں تبدیلی آگئی۔

۔ " مسیح کا بندہ ہونے سے ہرگز بُرا نہ مانیگا اور نہ مقرب فرشتے " (النساء ۴ : ۱۷۰) جو کہ دراصل " مسیح اس کا بندہ ہونے سے ہرگز بُرا نہ مانیگا " تھا۔

- بعض مقامات پر قوسین میں مسلم عقائد کے خلاف توضیحات درج ہیں۔

۔ اور تجھے گمراہ پایا (کہ سب کے ساتھ بت پرست تھا) پھر ہدایت کی (اسلام کی) اور تجھے محتاج پایا (جب مکہ میں تھا) پھر تونگر کر دیا (مدینہ میں) (الضحیٰ ۹۳ : ۶۔۷)

- بعض مقامات پر معنوی اعتبار سے منفی مفہوم ادا کرنے والے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۔ اے اہل کتاب ہمارا رسول (محمد) بیان سنانے کو تمہاری طرف اس وقت آیا ہے جبکہ رسولوں میں گھاٹا (گھاٹا) پڑ گیا تھا۔ (المائدہ ۵ : ۱۹)

۔ اللہ نے بھی مکر کیا اور اللہ مکاروں میں اچھا مکار ہے۔ (آل عمران ۳ : ۵۴)

آخر میں ۷ صفحات پر مشتمل ایک انڈیکس بعنوان " فہرست بعض مضامین قرآن معہ بعض اشارات بحث طلب " کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے۔ نقد مسیحیت پر مبنی قرآنی مقامات کا ترجمہ کرتے ہوئے پادری صاحب بلا تعلیق اس مقام سے گذر گئے۔ لیکن قرآن کے بارے اپنی فکر کو اس فہرست میں عیاں کیا ہے۔ جہاں قرآنی بیانات کا ایک پادری کی نظر سے مفہوم کشید کرتے ہوئے تحریف معنوی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمہ قرآن کا یہ حصہ مسیحی نقطہ نظر سے مفید مطلب ہے۔ بعض عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۔ تبوک کی راہ میں مجاہدین قرآن پر ہنستے تھے[1]۔

۔ تثلیث کو نہ مانو، نساء ۱۶۹ مائدہ ۷۷ا، تثلیث کیا شئ ہے اللہ سے الگ عیسیٰ و مریم کو بھی خدا ماننا تثلیث ہے۔ مائدہ ۱۱۶۔ ۱۲۰[2]

۔ رحمن۔ یہہ لفظ حضرت نے کلیسا سے لیا عرب میں مروج نہ تھا اہل مکہ نہیں جانتے اور نہیں مانتے کسی اہل کتاب خبر دار سے پوچھہ کہ رحمن کیا ہوتا ہے۔ رعد ۲۹ مریم ۷۰ و انبیاء ۳۷ فرقان ۶۰، ۶۱[3]

۔ زبعری قریشی نے مباحثہ میں محمد کو بند کر دیا اسپر قریش نے تالیاں بجائیں۔ زخرف ۵۷[4]

۔ سدرۃ المنتہیٰ (نجم ۱۴) غالباً یہہ مطلب مکاشفات ۲۲۔ ۲ سے بتصرف لیا ہے[5]۔

۔ شیطان نبیوں کے خیالوں میں بوقت نبوت کچھہ ڈالدیا کرتا ہے (حج ۵۲،۵۱)[6]

۔ دعویٰ نبوت سے پہلے حضرت نے قریش کو خوب ٹٹول لیا تھا کہ اگر کوئی نبی ان میں اٹھے اور کوئی کتاب ان میں بھی نازل ہو وہ مانیں گے یا نہیں اور انہوں نے قسمیں کھائی تھیں کہ مانیں گے جب دعویٰ نبوت ہوا تو اب نہیں مانتے ہیں (فاطر، صافات ۱۶۷)[7]

۔ ہر متنفس گنہگار ہے (نحل ۶۳، فاطر ۴۴) عصمت انبیاء کا خیال قرآن سے نہیں صرف مسیح یسوع کی عصمت کا اقرار قرآن کرتا ہے (آل عمران ۳۲،۳۱) کہ اسے اور اس کی والدہ کو شیطان نے نہیں چھوا[8]۔

۔ لوگ بے فائدہ فصاحت لفظی مانگتے پھرتے ہیں کوئی عیسائی اس پر توجہ نہ کرے۔ قرآن ہر گز فصاحت لفظی کا مدعی نہیں ہے ایک لفظ بھی ایسا دعویٰ نہیں دکھاتا۔ عبارت کے اعتبار سے اہل عرب نے صاف کہا کہ ہم اس قرآن کی مانند بنائیں گے۔ (انعام ۹۳)[9]

۔ وحی یا الہام شیطان سے بھی ہوا کرتا ہے یعنی شیطان بھی وحی کرتا ہے (انعام ۱۲۱، ۱۱۳، ۱۱۲) وحی یا الہام جو

---

1 عماد الدین، ترجمہ قرآن بہ اردو زبان، ص ۲۹۸

2 ایضاً، ص ۲۹۸

3 ایضاً، ص ۲۹۹

4 ایضاً

5 ایضاً، ص ۳۰۰

6 ایضاً

7 ایضاً، ص ۳۰۱

8 ایضاً

9 ایضاً، ص ۳۰۲

اللہ سے ہے اس کی تین قسمیں ہیں(شوری ۵۰) اور تینوں قسموں میں صرف دوسری قسم کا الہام محمد کو ملا ہے (۵۱) قرآن کے کسی مقام سے ثابت نہیں کہ پہلی اور دوسری قسم کے الہام میں سے کچھ بھی کبھی محمد کو ملا ہو آیت ۵۱ میں تیسری قسم پر انحصار ہے۔ اس لیے رسول کریم کا قول کہلایا ہے اور واضح رہے کہ یہ تیسری قسم الہام کی غیر مقبول ہے[1]۔

1 عمادالدین، ترجمہ قرآن بہ اردو زبان، ص ۳۰۳

مسیحی قرآنی تراجم و تفاسیر

(جزوی)

پادری جے علی بخش   تفسیر قرآن

مرکنٹائل پریس، لاہور ۱۹۳۵ء

صفحات: ۲۷۵

یہ شان نزول اور عہد نامہ قدیم و جدید کی روشنی میں کی گئی ۸۶ مکی سورتوں کی تفسیر ہے۔ جس کا سب سے اہم پہلو سورتوں اور آیات کی زمانی تقسیم ہے۔

پادری صاحب بحیثیت مفسر اس بات کے مدعی ہیں کہ

- قرآن فہمی کے لیے بائبل کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔
- قرآن کی تشریح و تفسیر میں کتب سماوی کو نظر انداز کر کے احادیث نبوی کی الجھن میں پڑنے کی وجہ سے اہل اسلام قرآن کا حقیقی مطلب سمجھنے سے قاصر رہے[1]۔

چنانچہ مذکور بالا اسلوب تفسیر اس امید پر اپنایا گیا ہے کہ

"اس کے ذریعہ اہل اسلام قرآن کو سمجھنے کی خاطر دیگر کتب سماوی کا مطالعہ زیادہ ذوق و شوق سے کرنے لگیں گے اور یوں مسلمانوں اور مسیحیوں میں جو جدائی کی خلیج ہے وہ عبور ہو سکے گی[2]۔

- مکی سورتوں کو زمانی اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں امام جلال الدین سیوطی، نولڈیکے، ولیم میور اور مولوی نذیر احمد کی بیان کردہ ترتیب نزولی کا تقابلی جدول (ص ۴۔۶) اور مکی سورتوں کے خواص بیان کیے گئے ہیں[3]۔

مکی سورتوں کا تعارف ان الفاظ میں کروایا گیا ہے؛

"پہلا حصہ ۶۰۹ء سے ۶۱۳ء تک اس چار سال کے عرصہ میں ۴۸ سورتیں نازل ہوئیں۔ ان میں عجیب لطافت پائی جاتی ہے۔ ستاروں بھری راتوں کا مشاہدہ، پہاڑوں پر پو پھٹنے کا نظارہ، الغرض فطرت کی خوبصورتی کا عمدہ بیان اس میں ہوا ہے ـــــ یہاں جتنے جملے ہیں وہ مقفی اور بار دیف ہیں گو وزن میں یکساں نہیں آیات بھی چھوٹی چھوٹی ہیں اور موسیقی کا لطف دکھاتی ہیں ـــــ طرز تحریر ولولہ انگیز اور اشتعال خیز ہے یہ ایسے شخص کے الفاظ ہیں جو یقین دلانے پر تلا ہوا ہے اور وہ جوش اور زور اب تک باقی ہے یہ ابتدائی سورتیں عموماً مختصر سی ہیں"[4]۔

---

1 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، (مرکنٹائل پریس، لاہور ۱۹۳۵ء) ص ۱۔۲

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۷۔۱۰

4 ایضاً، ص ۱۰

دوسرے حصے کا تعارف یوں کروایا گیا ہے۔

"دوسرا حصہ اکیس سورتوں پر مشتمل ہے جو دعویٰ نبوت کے پانچویں اور چھٹے سال سے علاقہ رکھتی ہیں۔اس حصہ میں وہ جوش وجدت نظر نہیں آتی جو پہلے حصے میں جوش زن تھی۔ان کے طرز عبارت میں تبدیلی پائی جاتی ہے آیات وسور کچھ طویل ہیں اور عجائبات فطرت کی قسم کھانے کی بجائے قرآن کی قسم کھانے کا ذکر ہوتا ہے۔اور زیادہ تکلف اور انانیت کا اظہار ہے۔اور خدا کے خاص الفاظ لفظ "قل" سے شروع ہوتے ہیں۔اور یہ دعوے ہیں کہ یہ سورتیں خدا کا کلام ہیں اور محمد صاحب سنانے والے ہیں۔(یہ دعویٰ ہے کہ) یہ مکاشفہ (وحی) ماقبل مکاشفات کا مصدق ہے۔مکی سورتوں کے اس حصے میں نصف کے قریب یہودی قصے ہیں۔پہلے حصے میں ایسا کوئی قصہ نہ تھا"[1]۔

اس طرح تیسرے حصے کے بارے یوں رطب اللسان ہیں؛

"مکی سورتوں کا تیسرا حصہ دعویٰ نبوت کے ساتویں سال سے ہجرت مدینہ تک کے عرصہ پر محیط ہے۔باوجود مضامین کے تکرار کے پہلی فصاحت وبلاغت کی جھلک بھی نمودار ہے۔اس حصے کا لہجہ بھی زیادہ نرم ہے۔فطرت کے عجائبات کا بار بار ذکر ہے۔ معجزے دکھلانے کے مطالبے کا جواب دیا گیا ہے۔اس حصہ میں قصے بہت تھوڑے ہیں۔المختصر قرآن کے مکی حصہ میں عقائد ومسائل کا چنداں ذکر نہیں۔شرع وقانون بھی شاذ ونادر ہی ملتے ہیں۔ان سورتوں میں نہ پیچ در پیچ رسوم ہی کا ذکر ہے۔نہ عقائد کی بحث ہے۔تمدنی اور دینی شرع جو مسلمانوں میں مروج ہے وہ یہاں عنقا کا حکم رکھتی ہے۔یہاں کی وہ آواز ہے جو بیابانوں میں چلا رہی ہے کہ" اے میری امت سنو!خداوند تمہارا واحد خداوند ہے"[2]۔

- " سورتوں کی فہرست "کے عنوان سے تفسیر کردہ سورتوں کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے فہرست دی گئی ہے۔ اس میں نمبر شمار، ترتیب نزول اور مروجہ کے عنوان تین کالموں ترتیب کی فہرست دی گئی ہے ایک کالم صفحہ کا بنایا گیا ہے مگر صفحہ نمبر نہیں دیئے گئے۔[3]

سب سے پہلی "سورۃ العلق" اور آخری "سورۃ تطفیف" ہے۔

- مکی سورتوں کا تعارف ان الفاظ میں کروایا گیا ہے۔"ان مکی سورتوں میں ایک خاص طرز اور تجویز پائی جاتی ہے جو مدنی سورتوں سے بہت مختلف اور متفرق ہے۔مکی سورتوں میں تو محمد صاحب محض ایک واعظ یا نبی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔مدبر ملک یا شارع کی حیثیت سے نہیں اس عرصہ میں ان سورتوں کا یہ مقصد نہیں کہ انسان کے سامنے کوئی شرع یا ضابطہ قوانین پیش کریں بلکہ یہ ہے کہ واحد خدا کی پرستش کی دعوت لوگوں کو دی جائے۔

---

1 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۱۰

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۱۲۔۱۴

ان سورتوں میں توحید الٰہی کے سوا نہ کسی خاص دیگر عقیدے کا ذکر ہے نہ شرع و رسوم کا نہ تمدنی و تعزیری قاعدے قواعد پیش کیے گئے"[1]۔

○ ہر سورت کے آغاز میں انتہائی دائیں جانب باریک خط میں سورۃ مکی اور بائیں جانب سورۃ کا قرآنی نمبر درج ہے۔ جبکہ درمیان میں سورت کا نام بمعہ نمبر جلی خط کے ساتھ مرقوم ہے سورتوں کے ناموں کے ساتھ ال نہیں لکھا گیا جیسے علق(۱۴) کورت(۳۹) تکاثر(۵۷) ماعون(۵۸) کافرون(۵۹) فلق(۶۱۹ نجم(۲۶) نمل(۱۵۹) انعام(۱۵۹)

پچاس آیات قسمیہ کی نشاندہی کر کے انجیلی تعلیم پیش کی ہے کہ " تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لیے پوری کرنا لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا نہ تو آسمان کی کیونکہ خدا کا تخت ہے نہ زمین کی کیونکہ وہ اس کے پاؤں کے نیچے کی چوکی ہے"[2]۔

پھر قرآنی اور انجیلی تعلیمات کی تطبیق یوں کی گئی ہے" مخفی نہ رہے کہ یہ انجیلی تعلیم انسانوں کو قسم کھانے سے منع کر رہی ہے نہ خدا پر کوئی پابندی ڈال رہی ہے اور قرآن شریف میں یہ قسمیں خدا سے منسوب ہیں اور ایسے لوگوں کو قائل کرنے کے لیے وہ یہ قسمیں کھاتا ہے جو بغیر قسم کے کسی بات کا اعتبار ہی نہ کرتے تھے[3]۔

اس ضمن میں بعض جگہ عربی گرائمر کے معروف طریق سے ہٹ کر نکتہ آفرینی فرماتے ہیں جیسے "والتین" کی واؤ کو قسمیہ قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں" اگر یہاں بجائے قسم کھانے کے" غور کرو" ترجمہ کریں بہتر ہوگا انجیر پر غور کرو[4]۔

سورۃ نون کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جب نون لفظ کے طور پر لکھا جائے گا تو اس کے معنی دوات کی سیاہی کے ہیں لیکن جب صرف ن لکھا جائے تو اس کے معنی سیاہی کے نہیں۔ اس سورہ میں ذوالنون کا ذکر آیا ہے۔ ذوالنون میں نون کے معنی مچھلی کے ہیں مسیحی ایمانداروں کا نشان مچھلی تھا۔ جن دنوں میں مسیحی دین ممنوع قرار دیا گیا تو مسیحیوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے مچھلی کا نشان قرار دیا۔ مچھلی کے لیے یونانی لفظ (Lxus) ہے اس کے الگ الگ حروف سے مراد یسوع مسیح ابن خدا نجات دہندہ ہیں اس زمانے کے مسیحی اس نشان کو بخوبی سمجھتے تھے لیکن بت پرست اور مشرکین اس کے معنی سے واقف نہ تھے۔ چونکہ مسلمان مفسرین مسیحی اصطلاحوں سے ناآشنا تھے اس لئے اس لفظ

---

1 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص۸۔۹

2 متی ۵: ۳۴

3 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص۔۱۷۔۱۸

4 ایضاً، ص۸۱

کے معنی سمجھنے سے وہ عاری رہے"[1]۔

بعض مقامات پر اپنے ہم مذہب مسیحی مفسر سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ جیسے سورۃ العادیات کی تفسیر میں رقم طراز ہیں؛

" پادری احمد شاہ نے جو حدیث نقل کی ہے(پادری احمد شاہ نے منذر بن عمر انصاری کی قیادت میں بنو تمامہ کی طرف ایک دستہ بھیجے جانے کی روایت بلاماخذ ذکر کی ہے جو کہ مدنی دور کا واقعہ ہے ص ۵۰۲۔۵۰۳) ہمیں اس سے اتفاق نہیں کیونکہ اگر اس حدیث کو صحیح مانیں تو یہ سورت مدنی ٹھہرے گی نہ (کہ) مکی۔ کیونکہ مکہ میں جب تک محمد صاحب ہجرت سے پہلے رہے وہاں ایسا رسالہ بھیجنے کی کوئی گنجائش نہ تھی ایسی ساری مہمیں مدنی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں"[2]۔

سورۃ التکاثر کی آیات کا یعقوب ۱:۵۔۳ سے تقابل کر کے لکھتے ہیں کہ ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کے پڑھنے سے پتہ لگتا ہے کہ محمد صاحب کو قدیم مقدس کتابوں کا علم کس قدر حاصل تھا خواہ بذریعہ تلاوت خواہ بذریعہ روایت اس لئے مسلمانوں کا بھاری نقصان ہوا جب انہوں نے کتب مقدسہ کا مطالعہ چھوڑا اور محض روایات اور احادیث کو اپنا ہادی و رہنما بنایا[3]۔

سورۃ مریم کی آیت ۳۳ کی تفسیر میں پادری صاحب کا کہنا ہے کہ اگرچہ مسلمان مسیح کی صلیبی موت اور مردوں سے جی اٹھنے کو تسلیم نہیں کرتے لیکن قرآن اس تاریخی امر کا منکر نہیں۔ قرآن انجیل و توریت کا مصدق ہونے کی بناء پر ان کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ "اس لئے یہ مفسران قرآن کا فرض ہے کہ ان بیانوں کو تطبیق دیں"[4]۔

قرآن نے " وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ " (نساء۴: ۱۵۷) کہہ کر مسیح کی صلیبی موت کا قطعی انکار کیا ہے۔ جب ایسی موت ہی نہیں تو پھر جی اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پادری صاحب، مصدق کتب سماوی، قرآن کے ہم نوا بن کر بڑی چابک دستی سے انجیلی عقیدہ منوانا چاہتے ہیں۔ قرآن کتب سماوی کی صرف الہامی تعلیمات کا مصدق ہے۔ جب کہ مروجہ بائبل میں انسانی خیالات کی آمیزش والے بیانات بھی موجود ہیں۔[5] جن کی تصدیق بڑی چابک دستی سے یہ کہہ کر کروانا چاہتے ہیں کہ اگر قرآن نے بائبل کے کسی بیان کی مخالفت کی تو اپنے دعویٰ میں صادق نہیں رہے

---

1 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۱۶،۱۷

2 ایضاً، ص ۵۵

3 ایضاً، ص ۵۸

4 ایضاً، ص ۱۳۲

5 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۶۴" کتب مقدسہ میں انسانی و الٰہی دونوں اجزاء پائے جاتے ہیں"؛ مینلی، ہماری کتب مقدسہ، ص ۴۸،" پاک نوشتوں میں ہر جگہ انسانی پہلو نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔۔۔(بائبل میں) ربانی اور انسانی عناصر ناقابل جدا ہیں"۔

گا۔[1] حالانکہ جب خود ہی ان کتب میں انسانی خیالات کی آمیزش کو تسلیم کر چکے ہیں تو پھر خالص وحی آسمانی پر مبنی قرآن سے ان حصوں کی تصدیق کیوں کر ممکن ہے۔

بعد ازاں سورۃ مذکور کی آیت ۳۵ میں ابنیت مسیح کی بابت بحث کرتے ہوئے اس تطبیقی فکر کا "عالیشان مظاہرہ" کیا گیا ہے۔ انجیلی بیان کے برعکس قرآن نے عقیدہ مسیح ابن اللہ کی نفی کی ہے۔ قرآن وانجیل کے اس تخالف کو دور کرنے کے لیے پادری صاحب لفظ ابن کی توضیح میں بعض عربی تراکیب مثلاً ابو ہریرہ، ابن السبیل اور امہات المؤمنین سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

> " قرآن نے اس لفظ پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اس غلط معنی پر جو بعض بدعتی لوگ اس سے منسوب کرتے اور مریم کو والدہ خدا ٹھہرا کر عوام کی ٹھوکر کا باعث ہوئے۔ اس لیے ہماری رائے میں صحیح معنوں میں لفظ ابن کا استعمال غلط نہیں بلکہ جسمانی معنی میں اس کا استعمال غلط ٹھہرایا گیا۔ پس ہماری سمجھ میں یہاں بھی قرآن اناجیل کے خلاف نہیں "[2]۔

اگرچہ "ابن خدا" بمعنی خدا کے بیٹے کی اصطلاح یہود میں مستعمل تھی لیکن وہ مسیحیوں کی مانند غلو کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ قرآن حکیم بصراحت غلو سے منع کرتا ہے اور عیسیٰؑ ابن مریم کو (حقیقتاً یا مجازاً) ابن اللہ کہنے سے روکتا ہے[3]۔ عقیدت پر مبنی ابن اللہ کی اصطلاح کی تشریح نے مسیحیت میں غلو کا راستہ کھولا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں اگر کہیں یہ کلمات اپنے لیے استعمال کیے ہیں تو یہ قدیم یہودی روایت کے مطابق تھا جن مخصوص معنوں میں بیٹے کی اصطلاح آج استعمال کی جاتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس کی تعبیر ڈھونڈھنا عبث ہے۔ بعد میں مسیحی دنیا ان الفاظ کو حقیقت پر محمول کرتے ہوئے طویل کلامی و فلسفیانہ مباحث میں کھو گئی۔ پادری صاحب کا روحانی معنوں میں ابن کا استعمال مان لیا جائے تو تاریخ کلیسیا میں چار صدیوں تک اس کی توضیح و تعین میں کی جانے والی کلامی مباحث کا کچھ جواز نہیں بنتا جن میں بیٹے کے جوہر، مرتبہ، قدامت، اصلیت کا تصفیہ طے کیا گیا۔

○ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس تفسیر کا علمی تجزیہ کرتے ہوئے تبصرہ کیا ہے۔ مولانا نے مسیحی منادین کی طرف سے کیے جانے والے تفسیر و ترجمہ قرآن مجید کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور کو فانڈر سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک محیط قرار دیا ہے۔ اور اس دور میں لکھی جانے والی تفسیروں کو صورتاً و معناً مخالف اسلام بتلایا ہے۔ اور دوسرا دور تو مسیحی دیسی پادریوں کا شمار کیا ہے۔ جس میں ان کی تفسیروں کو صورتاً تو موافق مگر معناً مضر و مخالف گردانا ہے۔ پہلی روش کی مثال میں کتاب " عدم ضرورت قرآن " از جی ایل ٹھاکر داس کا نام لیا ہے (اس کے رد میں مولانا

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۷۳

2 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۱۳۳

3 سورۃ النساء ۴ : ۱۷۱

نے تقابل ثلاثہ رقم کی) دوسرے دور کا آغاز سلطان محمد پال کی تصنیف "ہمارا قرآن" سے شروع کر کے لکھا ہے کہ:

"پادری جے علی بخش صاحب کی تفسیر دوسری قبیل سے ہے۔۔۔ اس میں ایک ایک سورت کو لے کر کتب سابقہ سے موافق بتایا ہے۔ اس سے یہ بھی غرض ہے کہ قرآن شریف ان کتب سے ماخوذ ہے۔ مگر جو مسئلہ قرآن اور انجیل (بلکہ بقول مسیحیان مناظرین بائبل) میں اختلافی ہے جہان اس کا ذکر آیا ہے وہاں سے پادری صاحب بڑی عقل مندی سے خاموشی سے نکل گئے ہیں۔۔۔ ان آیات (سورۃ مریم رکوع ۵) میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر کرنا محض اس غرض سے ہے کہ مسیح کی الوہیت کا ابطال ہو اور مسیحیوں کے عقیدہ متضمن بہ الوہیت کی اصلاح ہو۔ پادری جے علی بخش صاحب ان آیات سے بعزت واحترام گذر گئے۔ نہ مسیحی عقیدے کی تائید کی نہ قرآنی فرمان کی تصدیق"[1]۔

شان نزول بیان کر کے مسلم روایت کو مشرف بہ بائبل بنانے کی سوچ سورۃ القدر میں بالکل واضح ہو جاتی ہے جب پادری صاحب لیلۃ القدر کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی رات تھی جو شب قدر کہلاتی ہوگی۔ اس آیت کے نازل ہونے سے شب قدر نہیں کہلائی۔ بائبل سے اس کا جواب یہ ملتا ہے "یہ خداوند کی وہ رات ہے جو چاہیے کہ خوب یاد رکھی جائے ۔۔۔ خداوند کی وہی رات ہے جسے چاہیے کہ سارے بنی اسرائیل اپنے قرنوں میں یاد رکھیں" یہودیوں کی سالانہ عید فسح اسی رات کی یادگاری میں منائی جاتی تھی۔ اور یہودیوں کا کلیسائی سال اسی وقت سے شروع ہوا۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس آیت میں بھی وہی مشہور رات سمجھی جائے"[2]۔

سورۃ عبس کے شان نزول میں انجیلی احکام[3] ذکر کیے گئے ہیں اور نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ اگر قرآن میں اس نوشتے کی طرف اشارہ مان لیا جائے تو محمد صاحب پر سے اعتراض اٹھ جاتا ہے[4]۔

سورۃ کہف میں ذوالقرنین کو دارا اول ہستاسب قرار دیتے ہیں۔ جس نے ۵۲۱ ق م سے ۴۸۵ ق م تک حکومت کی اور جس نے یہودیوں کو ہیکل بنانے کی اجازت دی تھی[5]۔

سورۃ مریم آیت ۲۳ سے ۲۵ کے متعلق کہتے ہیں "دیکھو طفولیت کی انجیل جو نئے عہد نامہ کے اپوکرفا میں داخل ہے،

---

1 سہ ماہی "عالم اسلام اور عیسائیت" اسلام آباد، مئی ۱۹۹۲ء، ص ۱۳

2 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۷۶

3 یعقوب ۲: ۱۔۷

4 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۷۳۔ ۷۴

5 عزرا ۴: ۵، ۲۴: ۵: ۵: ۶: ۱ (ص ۲۳۷)

۲۶۔۳۲ دیکھو گہوارہ میں مسیح کا بولنا بھی اس انجیل طفولیت میں داخل ہے"[1]۔

قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ بائبل و قرآن میں بظاہر تطبیق کی اس کاوش کا بین السطور مقصد قرآن کو یہودی و مسیحی نوشتوں سے ماخوذ اور بعض انجیلی عقائد کی قرآن سے تصویب کرانا ہے۔ اس بات کا التزام بھی ہے کہ مسلمانوں سے غیر محسوس طریقے سے بائبل کی وہ حیثیت تسلیم کروائی جائے جو مسیحیوں کے ہاں مسلمہ ہے۔ پادری صاحب کی اس تفسیر کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے ہاں قرآن کی مسلمہ حیثیت کو متشکک بنانے اور اسے دوسری کتب سماوی کا چربہ ٹھہرانے کے سوا اور کچھ بھی سامنے نہیں آتا۔

پادری سلطان محمد پال سلطان التفاسیر

ایم کے خان مہاں سنگھ، لاہور س ن

صفحات: ۱۸۴

سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے چھٹے رکوع تک کی تفسیر پادری صاحب کی ادارت میں جاری مسیحی جریدہ" المائدہ" (لاہور) میں بالاقساط ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۴ء کے دوران چھپی، جسے بعد ازاں مجلد شائع کیا گیا۔ بعد ازاں دوسرے مسیحی جریدہ" النجات " (لاہور) میں اس تفسیری سلسلہ کو آگے بڑھایا گیا، لیکن اس کی کتابی شکل میں اشاعت نہیں ہو سکی۔ اس تفسیر کے شائع شدہ حصہ میں مسیحی نقطہ نظر سے لغت اور کتب سابقہ کی روشنی میں تفسیر کی گئی ہے۔ قدماء مفسرین طبری، رازی اور بیضاوی کی تشریحات و روایات کو بنیاد بنا کر قرآن پر اشکالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سرسید کی تشریحی آراء پر بھی بحث کی گئی ہے۔ معاصر متداول تفاسیر فتح البیان، تفسیر حقانی، تفسیر وحیدی، مولوی عبداللہ چکڑالوی، مرزا غلام احمد قادیانی اور محمد علی لاہوری قادیانی کی تفسیری آراء بھی بطور استشہاد پیش کیے گئے ہیں۔

پہلے قرآنی متن اور اس کا پادری صاحب کا کردہ ترجمہ دیا گیا ہے پھر لفظاً لفظاً تفسیری پہلو سے بسیط گفتگو کی گئی ہے۔ پادری صاحب کی اس طرز تفسیر کے سوا کسی اور مسیحی اہل قلم نے تفسیر قرآن پر اس طرح قلم نہیں اٹھایا۔ یہ بات بھی خصوصی طور پر قابل ذکر ہے کہ مسلم علماء کی طرف سے مسیحی تفسیری کاوشوں کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ صرف مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس تفسیر کا جواب "برہان التفاسیر" کے نام سے لکھا ہے۔ دیگر ایسی کسی تفسیری تحریر کو قابل التفات خیال نہیں کیا گیا۔

پادری صاحب کے اسلوب اور طریق استدلال کا اندازہ درج ذیل عبارت سے ہو جاتا ہے:

" اکثر مسلمان ہم مسیحیوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ چونکہ تثلیث کی تعلیم انسانی سمجھ سے بالاتر ہے اس لئے یہ تعلیم

---

1 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۱۳۱

خدا کی طرف سے نہیں ہے کیونکہ خدا ایسی تعلیم نہیں دیتا ہے جس کو انسان نہ سمجھ سکے۔ ہم اس قسم کے معترضین سے یہ کہتے ہیں کہ تثلیث کو تو کروڑوں انسانوں نے سمجھ لیا لیکن حروف مقطعات کو کس انسان نے سمجھا ہے۔ ایک نے بھی نہیں۔۔۔ پس یہ کس قدر ظلم ہے کہ آپ انجیل جلیل کی صرف ایک تعلیم کو محض اس خیال سے کہ وہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے رد کرتے ہیں لیکن قرآن شریف کی چودہ باتوں (حروف مقطعات) کو جو سراسر بعید از فہم اور دور از عقل ہیں بلاچون وچرا تسلیم کرتے اور ان پر ایمان رکھتے ہیں"[1]۔

یہاں پادری صاحب نے تلبیس سے کام لیتے ہوئے قاری کو الجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں عقیدہ تثلیث اور حروف مقطعات کا موازنہ قیاس مع الفارق ہے۔ تثلیث سمجھ کر نہیں محض عقیدت سے مسیحی مؤمنین نے تسلیم کی ہے۔ اگر پادری صاحب اپنے پیش رو پادری گولڈ سیک کی کتاب " اسلام میں مسیح" ص ۱۸ کا مطالعہ کر لیتے تو کروڑوں انسانوں کے تثلیث سمجھنے کی بات نہ کرتے۔ پادری گولڈ سیک صراحتاً لکھتے ہیں،"

ہم یہ دعوٰی نہیں کرتے کہ ہم مسیح کی الوہیت کا مسئلہ پورے طور پر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے اسرار تثلیث کا تعلق ہے۔۔۔ بے شک تثلیث کا مسئلہ نہایت مشکل اور سر مکتوم ہے۔ لیکن اگر عقل سے بالاتر ہو اور عقل میں نہ آسکے تو بھی خلاف عقل نہیں"[2]۔

مفسرین ومحدثین کے اختلاف رائے سے من مانے نتائج کشید کرنا اس تفسیر میں پادری صاحب کا طرہ امتیاز ہے۔ مثلاً" کسی جزو قرآن کے لیے اس کا بتواتر نقل ہونا ضروری ہے یا نہیں" پر مفسرین کی آراء پیش کر کے کہا ہے کہ "یقیناً سورۃ فاتحہ کو قرآن سے خارج کرنا پڑے گا کیونکہ اس کی نقل میں تواتر نہیں"[3]۔

امت مسلمہ کے ہاں تواتر کی حد تک مقبول حقیقت کے برعکس پادری صاحب کا یہ دعوٰی یقیناً ان کی لاعلمی پر مبنی نہیں ہے۔ اگر قاری اسی اصول کو کتب مقدسہ خصوصاً انجیل پر منطبق کرنا چاہے تو پادری صاحب کسی طریق سے بھی اس کا تواتر سے نقل دکھلانے سے قاصر ہیں۔ نیز اگر انہوں نے انجیل کے پیغام کو اسی اصول پر پرکھ کر نیا دین قبول کیا تھا تو انہیں اس بات کی صراحت کرنی چاہیے تھی۔ اگر وہ اجمالاً اس اصول کو کتب سماوی کی نقل میں ثابت کر دیتے تو اس حوالے سے مسلم معترضین کی طرف سے اٹھائے گئے بہت سے اشکالات خود بخود دور ہو جاتے۔

اسی طرح سورت فاتحہ کے شان نزول میں ابو اللیث سمرقندی، امام سیوطی، امام فخر الدین رازی کے مختلف فیہ بیانات نقل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے؛ "ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فی الحقیقت سورۃ فاتحہ قرآن کا کوئی جزو یا حصہ نہیں بلکہ

---

1 پال، سلطان التفاسیر، ص ۲۸

2 بحوالہ: سوہدروی، ہدایت اللہ، اسلام اور عیسائیت، (گوجرانوالہ س ن) ، ص ۵۸

3 پال، سلطان التفاسیر، ص ۵

آنحضرت کے ایک طویل زمانہ کے انتخابات کا ایک نہایت عمدہ مجموعہ ہے"[1]۔

جاہلی شاعر امیہ بن ابی الصلت کے اشعار بیان کر کے کہتے ہیں کہ یقیناً امیہ کے اسی قسم کے اشعار نے آنحضرتؐ کو اس طرف متوجہ کیا ہو گا کہ آپ کتب مقدسہ کا استقصا کریں اور امیہ کے اشعار کو قدرے تفصیل کے ساتھ الحمد کی صورت میں مرتب کریں۔

" امیہ کے ان سحر افگن اور روح افزا اشعار کو سن کر آپ کو یقین ہوا ہو گا کہ ان سب کی اصل اور ماخذ کتب مقدسہ ہی ہیں۔ اس لیے بلا تاخیر کتب مقدسہ کی طرف آپ نے رجوع کیا ہو گا۔ اور انہی کتابوں میں سے دیگر قرآنی امور کی طرح الحمد کو منتخب فرمایا ہو گا"[2]۔

سورت فاتحہ کو ایک جاہلی شاعر کی تحریک سے متاثر ہو کر کتب مقدسہ سے منتخب بتلانے کے لیے پادری صاحب کسی ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ محض اپنا گمان ہی کافی خیال کرتے ہیں۔

تطبیق کے عنوان سے دو کالموں میں سورۃ الحمد اور صحف مطہرہ کے متعلقہ بیانات کا تقابل کیا گیا ہے[3]۔ اس سورت کی تفسیر کا اختتام پادری ویری کے ان الفاظ سے کرتے ہیں،

" سورۃ فاتحہ کی اس کے حقیقی مقصد کے لحاظ سے کوئی مسیحی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا یہ اول سے آخر تک ایک مخلصانہ دعا ہے جس کو مسیحیانہ طور پر ادا کیا گیا ہے۔ ہر ایک شخص اس کے جواب میں آمین کہہ سکتا ہے " میں کہتا ہوں کہ صرف آمین نہیں بلکہ اس کو ورد کر سکتا ہے اور پڑھ سکتا ہے کیونکہ یہ بائبل مقدس کے وہ جواہر ریزے ہیں جنکو ایک نئے طرز اور نئے اسلوب کے ساتھ ایک ہی سلک میں پرو دیا گیا ہے"[4]۔

پادری صاحب آیت نمبر ۴۴ کی تفسیر میں لفظ راکع بمعنی حنیف مراد لے کر اس کا مصداق مسیحی راہب ٹھہراتے ہوئے رقم طراز ہیں؛ " پس وارکعوا مع الراکعین " کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ (ان حنیف) راہبوں کے ساتھ خدا کے آگے جھکو"[5] دلچسپ بات یہ ہے کہ پادری ٹھاکر داس صاحب اس کے برعکس حنفاء کی بابت لکھتے ہیں،" یہ لوگ اصل میں بدعتی تھے طالمود کی رو سے حنیف کے لفظی معنی ریاکار ہیں، چار خدا کو نہ دیکھیں گے، ٹھٹھے باز، دروغ گو، اور غماز"[6]۔

پادری ٹھاکر داس صاحب کے مد نظر رسول اللہ ﷺ کی ذات پر حملہ آور ہونا تھا چنانچہ یہ معنی ذکر کر دیئے۔

---

1 پال، سلطان التفاسیر، ص۵

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۱۸۔۲۰

4 ایضاً، ص ۲۱

5 ایضاً، ص ۱۴۹

6 ٹھاکر داس، جی ایل، انجیل یا قرآن، (کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لدھیانہ ۱۹۱۰ء)، ص ۳۵

پادری سلطان محمد پال صاحب کے پیش نظر اہل اسلام کو مسیحی عمائدین کی پیروی کا سبق پڑھانا تھا چنانچہ حنیف کے معنی پاک باز لوگوں پر منطبق کر کے "ان راہبوں کے ساتھ خدا کے آگے جھکنے" کا مشورہ دے ڈالا۔ ایسے حربوں سے برصغیر میں لکھے گئے مسیحی علم الکلام کی اخلاقی و اندرونی کمزوری کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اور موقع بموقع سچائی کو پامال اور پینترا بدل کر وار کرنے کا ہنر خوب آزمایا گیا ہے۔

اس تفسیر میں مسلم مفسرین خصوصاً امام رازی، السیوطی اور بیضاوی کی تفسیری آراء کو ان کے تناظر سے ہٹا کر پیش کر کے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آسان اسلوب اور لغوی و تفسیری فنی مباحث کی حامل برصغیر میں یہ واحد مسیحی تفسیری کاوش ہے جسے عالمانہ انداز میں لکھا گیا ہے اور جس کا مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا گیا۔ اس سے پادری صاحب کی مسیحی حلقے میں قدر و منزلت بڑھی اور اپنے رسالہ "المائدہ" میں قسط وار اشاعت کے دوران انہوں نے کتابی اشاعت کے لیے تعاون زر کی اپیل[1] کی تو نتائج توقع سے کہیں بڑھ کر نکلے۔

مسیحی نقطہ نظر کی حامل مذکورہ کاوشوں ترجمۃ القرآن از پادری احمد شاہ، ترجمہ قرآن بہ اردو زبان، از پادری عمادالدین، تفسیر قرآن از پادری جے علی بخش اور سلطان التفاسیر از پادری ایس ایم پال کا غالب حصہ نقد و تنقیص قرآن پر مشتمل ہے۔ ان میں قرآنی مطالب کی تفہیم مقصود نہیں بلکہ حریف کو ذہنی خلجان میں مبتلا کرنے کی تگ و دو تھی۔ کہا جاسکتا ہے یہ مسیحی اہل قلم نقد و جرح کے اصول و اسلوب سے مخاطب کا دل جیتنا تو درکنار اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی طرف التفات نہ کرنا مسلمانوں کا تعصب نہیں گردانا جاسکتا بلکہ عدم سنجیدگی اور ان کی علمی وقعت و معیار کا پست ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم علماء کی طرف سے اس پر قلم نہیں اٹھایا گیا صرف ایک کاوش علمی پائے کی تھی جس کا جواب مولانا ثناء اللہ امرتسری نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے دیا۔

سورہ فاتحہ

(اس پر مفسر کا نام درج نہیں)[2]

کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لودیانہ ۱۹۰۰

صفحات: ۱۰

زیر نظر صرف سورۃ فاتحہ کی متوسط تفسیر ہے جس میں دیگر مسیحی کاوشوں کے برعکس نقد و تنقیص کی بجائے تائید توصیف کا رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً

---

1 پال، سلطان التفاسیر، بیک ورق

2 " اردو میں عیسائیت پر لکھی گئی کتب" از رخشندہ گل (پی ایچ ڈی مقالہ) (غیر مطبوع، پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں بغیر وضاحت کے بطور مصنف پادری رؤس کا نام درج ہے۔

"کیونکہ یہ فاتحہ جس کو آپ بار بار دھراتے ہیں بہت اچھی ہے"[1]۔

"حاصل کلام ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کی تعلیم بہت خوب ہے"[2]۔

ابتداء میں اخلاقی پند و نصائح کے رنگ میں قلم اٹھانے کے بعد مَٰلِكِ يَوْمِ ٱلدِّينِ کی تفسیر میں تبشیری پیغام سامنے آگیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مرقوم ہے۔

'مَٰلِكِ يَوْمِ ٱلدِّينِ' اور اس سبب سے آخری دن ہر ایک آدمی کا اس کے اعمال کے مطابق انصاف کرنا ہو گا۔ اس حالت میں وہ عدالت کے دن کس طرح سے رحم ظاہر کر سکتا ہے؟ اور مالک یوم الدین کیونکر رحیم ہو سکتا ہے۔ یہ مشکل محض انجیل مقدس کی تعلیم سے حاصل ہو جاتی ہے"[3]۔

آگے اس مشکل کا انجیلی حل بیان کیا ہے کہ، "انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ سیدنا مسیح نے گنہگاروں کے لیے اپنی جان دی اور گناہ کے لیے کفارہ ادا کیا۔ اس کفارہ کے وسیلہ سے راست باز خدا گنہگاروں پر رحیم ہو سکتا ہے"[4]۔ لیکن ساتھ یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کفارہ کے وسیلہ کے بغیر کون سی مشکل صفت رحیمیت میں رکاوٹ بنتی ہے۔

"غَيْرِ ٱلْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ" کی مسلم تفسیر کے مطابق بر بنائے تخصیص ال "مغضوب" اور "ضالین" سے خاص گروہ مراد ہیں۔ اور یہاں قرآن کے مخاطب گروہ بالترتیب یہود اور نصاریٰ متصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس مسیحی تفسیر میں آیت مذکور کی درج ذیل تفسیر عموم کرتے ہوئے تشریح کے تقاضے نبھانے سے پہلو تہی کا رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

"اکثر اشخاص برائی کی طرف جاتے ہیں۔ خدا ان سے ناراض ہوتا ہے اور وہ آخر کار دوزخ میں اپنا حصہ پائینگے۔ اگر ہم ان کے ساتھ چلیں تو ہم ان کے ساتھ ہلاک ہوں گے"[5]

آخر میں قبول عیسائیت کے لیے یوں دعوت دی گئی ہے،

"بھائیو! اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ خدا کی رحمت میں شریک ہوئیں اور اگر آپ انصاف کے دن رہائی پانا چاہتے ہیں تو سیدنا مسیح کا شاگرد ہونا اور اپنا بوجھ اس پر ڈالنا چاہیے"[6]۔

---

1 سورۃ فاتحہ، (کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لودیانہ ۱۹۰۰ء)، ص ۲

2 ایضاً، ص ۵

3 ایضاً، ص ۷

4 ایضاً، ص ۷

5 ایضاً، ص ۵

6 ایضاً، ص ۱۰

حالانکہ پادری صاحب کے قول کی انجیل تصویب نہیں کرتی[1]۔ قرآن کی نفی اور نجات کو حضرت عیسیٰؑ سے لازم ٹھہراتے ہوئے دعوت دی گئی ہے؛

"سیدنا مسیح ہی خدا کی راہ ہے۔ کوئی اور نجات کی راہ نہیں ہے نجات قرآن کو دھرانے سے نہیں ملتی۔ لیکن صرف سیدنا مسیح پر ایمان لانے سے ملتی ہے۔۔۔ بھائیو! سیدنا مسیح پر ایمان لاؤ[2]۔

آسان اسلوب میں لکھی گئی اس تحریر میں عمومی تبشیری لٹریچر کے برعکس کوئی کلامی اور منطقی بات نہیں کی گئی۔ بغیر دلیل کے سادہ الفاظ میں دعاؤں کی تکمیل اور آخرت میں نجات کو مسیح پر ایمان لانے سے مشروط کرتے ہوئے قبول عیسائیت کی دعوت دی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کی دعاؤں کی تکمیل مسیحی نوشتوں پر ایمان لانے سے ہی ممکن بتلائی گئی ہے۔

عامۃ الناس کے لیے لکھی گئی یہ تفسیر اہل علم کے لیے خاص اہمیت کی حامل نہیں۔

ان تفسیری کاوشوں کے علاوہ مسیحی ارباب کلیسا نے اپنی تقدیم کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ کیونکہ برصغیر کے اردو تراجم میں سب سے زیادہ متداول یہی ترجمہ رہا۔ پادری ٹی پی ہیوز لکھتے ہیں ؛"مسلمان علماء کے نزدیک شاہ عبدالقادر کا ترجمہ نہایت وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے[3]"۔

۱۸۴۴ء میں پریسبٹیرین مشن کے تحت رومن رسم الخط میں مسیحی حلقہ کی جانب سے پہلا ترجمہ قرآن شائع کیا گیا جس پر مترجم کے نام کی بجائے" پادریان پریسبتیریان" مرقوم تھا۔ جارج سیل کے مقدمہ سے ماخوذ تنقیدی نوٹس کے ساتھ شائع شدہ اس ترجمہ کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ یہ شاہ عبدالقادر کا کردہ ترجمہ ہی تھا۔ ڈاکٹر احمد خاں کے مطابق اس کا ایک نسخہ برٹش لائبریری، برطانیہ میں نمبر ۲۔ ای۔ ۱۴۱۰۴ پر موجود ہے[4]۔

ڈاکٹر صالحہ شرف الدین رقم طراز ہیں؛

"یہ ترجمہ امریکی مشن کی جانب سے کیا گیا ہے۔ مترجم کا نام پر ساتاریان ہے۔ اس ترجمہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان ناقص ہیں اور ان کی غلطیوں پر بحث کی گئی ہے۔ نیز عیسائی مذہب پر مسلمان جو اعتراض کرتے ہیں اس کا جواب بھی عیسائی نظریہ کے تحت دیا گیا ہے[5]"۔

---

1 مصنف کے اس دعویٰ کے برعکس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے،" ہر آدمی اپنی صلیب آپ اٹھائے"(متی ۱۰ : ۳۸)

2 سورۃ فاتحہ، ص ۱۰

3 ا۔و۔ نسیم، رسالہ " اردو" ماہ جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۵۷، ۵۸ بحوالہ شطاری ص ۱۵۹

4 ڈاکٹر احمد خاں، قرآن کریم کے اردو تراجم، (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷، بار اول)، ص ۱۳۴

5 یہ ترجمہ مطبعۃ پیغام دہلی سے ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں طبع کیا گیا ہے۔ صالحہ شرف الدین، ڈاکٹر، قرآن حکیم کے اردو تراجم، (قدیمی کتب خانہ، کراچی، س ن)، ص ۹۸

۱۸۷۶ء میں برصغیر میں خدمات سرانجام دینے والے ٹی پی ہیوز T.P. Hughes اور پادری ای ایم ویری E M Wherry نے مشنریوں کی سہولت کے لیے شاہ عبدالقادر کے ترجمے کو رومن رسم الخط میں چھپوایا۔اس میں حرف آغاز، مقدمہ اور تفسیری منہج کے بارے معلومات بھی دی گئی ہیں[1]۔

۱۸۹۴ء میں مشہور پادری اور ہندوستان میں مسلمانوں سے مناظرہ کرتے رہنے والے ای ایم ویری نے جارج سیل کے قدیم ترجمہ و حواشی کو اصل اساس قرار دے کر ایک مستقل تفسیر چار جلدوں میں انگریزی زبان میں شائع کرائی اس تفسیر میں بیضاوی، کشاف، جلالین و تاریخ ابوالفداء وغیرہ کے حوالے تو سیل ہی کے دیئے ہوئے موجود تھے ویری نے جن جدید ماخذوں کے حوالے دیئے ہیں وہ یہ ہیں۔ تفسیر روفی (معلوم نہیں کہ اس نام سے کون سی فارسی تفسیر مراد ہے) ، تفسیر حسینی (ملا حسین واعظ کاشفی کی ایک چلی ہوئی تفسیر) تفسیر فتح الرحمن (غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی کے فارسی حواشی مراد ہیں) حواشی شاہ عبدالقادر دہلوی (موضح قران مراد ہے)[2]۔

برصغیر کے مسیحی تراجم قرآنی کا جائزہ لیتے ہوئے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا مسلم مسیحی مناظراتی ادب بہت وقیع اور وسیع ہے جس میں طرفین کی طرف سے اسلام اور عیسائیت پر متنوع تحریریں سامنے آئیں اور اسی ضمن میں مسیحی اہل قلم کے قرآن کریم کے تراجم و تفسیر بھی منصۂ شہود پر ظاہر ہوئے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اگرچہ بہت سے مسلم علماء نے بائبل کے داخلی اور خارجی پہلو پر ثقاہت کے حوالے سے قلم اٹھایا لیکن ترجمہ و تفسیر بائبل پر مسلم کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ مسیحی نقطہ نظر سے غیر معتبر انجیل برناباس کے اردو ترجمہ از مولوی محمد حلیم انصاری[3] اور جزوی تفسیر بائبل " تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام" از سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ء)[4] کے سوا اور کوئی مسلم کاوش معروف نہیں ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم علماء کی اکثریت بائبل میں تحریف لفظی کے قائل تھی،اس لیے انہوں نے اسے درخور اعتناء ہی نہیں سمجھا۔

---

1 یہ ترجمہ لدھیانہ مشن پریس،لدھیانہ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔

2 سہ ماہی،عالم اسلام اور عیسائیت،اسلام آباد، جلد ۴ شمارہ ۱ ،جنوری ۱۹۹۴ء (دریا آبادی، عبدالماجد، مولانا، قرآن پاک کے انگریزی تراجم)، ص ۷۔۸

3 انصاری، محمد حلیم، مولوی، انجیل برنباس (اردو) (کشمیر بک ڈپو، لاہور، ۱۹۱۶ء) ، صفحات ۳۶۹

4 سرسید احمد خاں ، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام ، (غازی پور) یہ جزوی تفسیر بائبل تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ دس مقدموں پر مشتمل پہلی جلد ۱۸۶۲ء اور توریت کی کتاب پیدائش کی تفسیر پر محتوی دوسری جلد ۱۸۵۶ء میں طبع ہوئی جب کہ ۱۸۸۷ء میں سامنے ہونے والی تیسری جلد انجیل متی باب اول تا باب پنجم کی تفسیر پر مشتمل ہے

صاحب موج کوثر جان آرنلڈ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں؛

"اگر تفسیر بائیبل کا کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہو گا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو قرآن ضرور جھوٹ ہے"[1]۔

بائبل کی ثقاہت پر معترض ہونے کے باوجود مسلم علماء نے کلیسیا کے ہاں رائج بائبل سوسائٹیوں کے کردہ تراجم پر اعتماد کیا۔ جب کہ اس کے برعکس مسیحی منادین فرقہ بندی اور عدم فصاحت کی آڑلے کر مسلمانوں کے کردہ تراجم پر اعتماد کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ مثلاً پادری ای ایم ویری شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کی نسبت منادین کے لیے عمادالدین کے کردہ ترجمہ کو بہتر گردانتے ہیں[2]۔ اگر کلیسیا کو مسلمانوں میں متداول تراجم پر اعتماد نہیں تھا تو چاہیے تھا کہ کلیسیا کی زیر نگرانی ایک مستند ترجمہ کا اہتمام کیا جاتا اور مسلم مترجمین کی غلطیوں کو آشکار کرتے۔ دوسری طرف مسیحی کارپردازوں کی زیر نگرانی مسلم علماء کا کردہ ترجمہ قرآن بوجوہ منظر عام پر نہیں آنے دیا گیا۔ یوں ان حالات میں بظاہر انفرادی کاوش اور کلیسیا کی نگرانی سے ماوراء کردہ تراجم مسلم قارئین کے ہاں سادگی سے قابل قبول نہیں۔

---

1 محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۹ء، بار ہفتم)، ص ۸۴

2 Wherry, The Muslim Controversy, p vi (Preface)

قرآنیات پر مسیحی کتب

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں مکمل اور جزوی تراجم قرآنی کے ساتھ ساتھ قرآنیات پر بھی غالب تنقیدی رویہ کے ساتھ لکھی گئی کتب موجود ہیں۔ نیز قرآنیات سے ہٹ کر لکھی گئی اکثر کتب میں بطور استشہاد قرآنی آیات نقل کی گئی ہیں یا ان سے استدلال کیا گیا ہے۔ ان کتب کا تعارفی جائزہ پیش خدمت ہے۔

پادری احمد شاہ مراۃ القرآن

مشن سٹیم پریس، لودیانہ ۱۹۱۰ء

صفحات: ۱۱۱

ترجمہ قرآن کے علاوہ یہ رسالہ مرتب کے سلسلہ مطالعہ قرآن کا دوسرا نمبر ہے[1]۔ ترتیب نزولی کے اعتبار سے منتخب ۸۲ سورتوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآنی بیانات کا یہ مجموعہ مخصوص زاویہ نگاہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ تذکرہ نبی ﷺ پر مشتمل آیات کے اس مجموعہ کی کوئی ابواب بندی یا فصول کی تقسیم نہیں کی گئی۔ مسلم روایت کے برعکس آیات کے نمبر اختتام کی بجائے آغاز آیت میں مندرج ہیں۔ ابتدا میں ترتیب کتاب کی بجائے حروف تہجی کے اعتبار سے سورتوں کے نام اور صفحہ نمبر کے ساتھ فہرست دی گئی ہے۔ اس کے بعد ۳ صفحات کا دیباچہ اور ایک صفحہ اغلاط نامہ کا ہے۔

مجرد متن کا ترجمہ معہ حوالہ جات پیش کیا ہے۔ سلیس ترجمہ میں بعض جگہ پر عربی حروف کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب کہ بعض مقامات پر برائے توضیح خطوط وحدانی کے ساتھ مزید الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ آیات کا ترجمہ اکثر مقامات پر مؤلف کے ۱۹۱۵ء کے مطبوعہ اردو ترجمہ قرآن سے لفظی اعتبار سے مختلف ہے اور بعض جگہ معناً بھی۔ مثلاً

ترجمہ از مراۃ القرآن (۱۹۱۰ء)	ترجمہ قرآن از مترجم (۱۹۱۵ء)
کیا اہل مکہ کو تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں ایک آدمی کی طرف الہام بھیجا کہ لوگوں کو ڈرائے اور ایمان داروں کو بشارت دے کہ خدا کے پاس ان کے لئے رتبہ اور صداقت ہے کافروں نے کہا کہ یہہ شخص (محمد) صریح فریبی ہے۔(۱۶) اور جب ہماری صاف آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں جو ہماری ملاقات سے ناامید ہیں یوں کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لا یا اسی کو بدل ڈال تو کہہ میرا یہہ کام نہیں کہ اپنی	کیا لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا ہے کہ ہم نے انہیں میں سے ایک مرد کی جانب وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈرائے اور ایمانداروں کو خوشخبری دے اور ان کا قدم ان کے رب سے سچا ہے۔۔ کافر کہنے لگے کہ بے شک یہ تو صریح جادوگر ہے(۱۶) لیکن جب ہماری کھلی آیتیں ان پر پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کی امید نہیں کہتے ہیں کہ لا ایک قرآن اس کے سوا نیا اس کو بدل ڈال کہہ دے کہ میرا کام

1 احمد شاہ، پادری، مراۃ القرآن، (مشن سٹیم پریس، لودیانہ ۱۹۱۰ء) ص۵۔ اس کا پہلا سلسلہ انگریزی زبان میں ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا جس میں باختصار تاریخی واقعات وقصص قرآنی کا بیان ہے۔

طرف سے اسے بدلوں میں اسی کے تابع ہوں جو مجھے الہام ہوتا ہے اگر میں رب کا گناہ کروں تو مجھے یوم عظیم کے عذاب کا خوف ہے (۱۷) تو کہہ اگر خدا چاہتا تو میں تم پر قرآن نہ پڑھتا نہ وہ تمہیں اس کی خبر دیتا میں تو اس سے پہلے تم میں ایک عمر تک (۴۰ برس) رہ چکا ہوں (اور کبھی کچھ نبوت و الہام کا ذکر نہ تھا) کیا تم نہیں سمجھتے (۱۸) اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے مجرموں کا بھلا نہیں ہوتا[1]۔

نہیں کہ میں اس کو بدل ڈالوں میں تو اسی بات کا تابع ہوں جو میری طرف وحی آتی ہے اور اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو اس بھاری دن کے عذاب سے خوف ہے۔(۱۷) تو کہہ کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ تم کو اس کی خبر کرتا کیونکہ میں اس سے پہلے ایک عرصہ تک رہ چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے (۱۸) اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے بے شک مجرموں کا بھلا نہیں ہو گا[2]۔

'کلمة الحق یراد بہ الباطل' کے مصداق اس مجموعے سے رسول اللہ ﷺ کی ذات کی ایسی تصویر کشی مقصود ہے جس سے آپ ﷺ کی شخصیت و منصب نبوت مجروح کیا جاسکے۔ جس کا اظہار مرتب کے ان الفاظ سے ہوتا ہے

" اس (قرآن) میں ناظرین کو محمد صاحب کی ذات خاص کی بابت یہہ بیانات ملیں گے۔ محمد صاحب کا صبر و حلم دیکھو سورہ لہب، ان کی فرسودگی دیکھو سورہ ضحی، اخلاقی کمزوری دیکھو سورۃ عبس، بنی اسرائیل، نور، احزاب، تحریم، ان کی کمزوری دیکھو سورہ شعراء، نمل، یونس، کہف، نحل، اللہ محمد صاحب کو منع کرتا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو ورنہ عذاب ہو گا دیکھو سورۃ شعراء، بنی اسرائیل، گاہے فضول خرچی کی بابت تنبیہہ ہوتی ہے محمد صاحب معجزات کرنے سے عاجز ہیں دیکھو سورۃ بنی اسرائیل، محمد صاحب شک و شبہ کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں دیکھو سورۃ یونس، ھود محمد صاحب پر عتاب ہوتا ہے سورہ انعام، ان کو ہدایت ہوتی ہے کہ اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں سورۃ مومن ۔۔۔۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ تمام باتیں قرآن ہی سے بیان کرائی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو بالترتیب بیان ہوں مگر پھر بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہہ ترتیب بالکل درست ہی ہے"[3]۔

پادری صاحب مکی و مدنی دور میں نازل شدہ احکامات میں فرق کر کے رسول اللہ کو حالات کے ساتھ بدلنے والی شخصیت دکھلانا چاہتے ہیں۔ وہ واضح طور پر لکھتے ہیں:

"(اس مجموعہ میں) ہر سورت میں جو عبارت محمد صاحب کی زندگی پر کچھ بھی روشنی ڈالتی تھی اس کو اخذ کر لیا گیا اور مکہ اور مدینہ کی سورتوں کو الگ الگ کر کے دکھایا گیا تا کہ دونوں زمانوں کے مابین جو بین فرق ہے وہ آشکار ہو جائے"[4]۔

---

1 احمد شاہ، پادری، مرآۃ القرآن، ص ۲۵

2 احمد شاہ، پادری، ترجمۃ القرآن، ص ۱۷۱،۱۷۲

3 احمد شاہ، پادری، مرآۃ القرآن، ص ۴۔۵

4 ایضاً، ص ۶

یہ کاوش پادری صاحب کے ذہن رسا تخیل کی جدت نہیں بلکہ انگریز پادری ایڈورڈ سیل کی تصنیف " کشف القرآن " کا چربہ معلوم ہوتی ہے، جس میں یہی باتیں مغربی ذہن کے ساتھ کی گئی ہیں[1]۔

پادری احمد شاہ مفتاح القرآن

ای، جے لعزرس اینڈ کمپنی، بنارس ۱۹۰۶ء

صفحات: ۱۹۰

دو حصوں پر مشتمل یہ مصادر قرآن کریم کا مکمل اشاریہ، جامع فہرست اور مختصر لغت ہے۔ پہلا حصہ اشاریہ جب کہ دوسرا حصہ فہرست اور معانی پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کو ترتیب دینے کا مقصد پادری صاحب دیباچہ میں بزبان انگریزی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

" By using it, a large amount of information regarding the text of Quran may be readily acquired"[2]

اشاریہ میں بہ ترتیب حروف تہجی قرآن کے جملہ کلمات یوں درج ہیں کہ اول عربی اور پھر بغرض تلفظ رومن خط میں قرآنی لفظ لکھا گیا ہے۔ بعدہٗ صرف افعال کے مصدر اور آخر میں وہ تمام قرآنی مقامات دیئے گئے ہیں جہاں جہاں وہ لفظ آیا ہے۔ پھر حوالہ میں سورت کا نمبر، اور آیت نمبر اس کے نیچے سورت کا نام، بدون 'ال' ، اور رکوع کا نمبر درج کیا گیا ہے۔ سورت کا نمبر قدرے جلی انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ مثلاً

40 41
مومن 5

میں 40 سورت کا نمبر، 41 آیت نمبر، مومن نام سورت اور 5 رکوع نمبر ہے۔

اس کے بعد فرہنگ ہے جس میں تمام قرآنی الفاظ کے انگریزی اور اردو دونوں میں معنی دیئے ہیں۔

مرتب مسلمانوں کی قرآنی اشاریہ نگاری کو ناقص قرار دیتا اور اس ضمن میں وہ "نجوم الفرقان"[3] کا ذکر کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہ قرآنی متن کے تمام الفاظ پر محتوی نہیں۔ حوالہ جات کے اعتبار سے اغلاط کی بھرمار ہے جس سے کوئی صفحہ بھی مبرا نہیں۔ بعض حوالہ جات محض یادداشت کی بنا پر مندرج ہیں[4]۔

---

1 دیکھیں کشف القرآن (پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۰۲ء) پر تبصرہ، ص ۱۴۳

2 Ahmad shah, Rev. Miftahul Quran, (E.J.Lazarus & Co. Benares 1906), Preface

3 اورنگ زیب عالمگیر کی طرف معنون نجوم الفرقان از مصطفی بن محمد سعید ۱۲۹۲ء میں لکھی گئی۔ پادری صاحب ۱۸۸۰ء میں شائع شدہ الفاظ قرآنی کا یہ اشاریہ ملاحظہ کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔

4 احمد شاہ، مفتاح القرآن، دیباچہ، بدون صفحہ شماری

پادری صاحب فلوگل کے مرتب شدہ اشاریہ کو عربی زبان کا ناقص علم رکھنے والوں کے لیے غیر مفید قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ مصدری اعتبار سے فعل کو بنیاد بنا کر ترتیب دیا گیا ہے اور مذکورہ قاری کو اس اسلوب میں متعلقہ قرآنی لفظ ڈھونڈنا کار مشکل ہوتا ہے۔ نیز فلوگل کے دیئے گئے سورتوں اور آیات کے نمبر برصغیر میں متداول قرآنی اشاعت سے مختلف ہے[1]۔

دیباچہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے نجوم الفرقان سے مدد لی ہے لیکن اس میں اسے بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اشاریہ جاتی کام جتنا عمدہ ہے مرتب کی عربی لغت میں عدم پختگی اتنی ہی کھٹکتی ہے۔

اکبر مسیح تاویل القرآن

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور، ۱۹۰۲ء

صفحات: ۱۶۰

یہ کتاب دیباچہ، چار ابواب، خاتمہ اور ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ مصنف نے جس عزم کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اسے سرورق پر عنوان کتاب کے نیچے ان الفاظ کے ساتھ واضح کیا ہے۔

> "(تاویل القرآن) جس میں قرآن شریف کی صحیح تفسیر کا اصول قائم کرنے کی غرض سے اس کی تالیف یعنی جمع و ترتیب کی سچی تاریخ سنائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ کل کا جزو متعلقہ ہے جو اپنے بیان کرنے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ سے جن کی پوری تصدیق کرتا ہے ہرگز مستغنی نہیں"[2]

دیباچہ میں مسلمانوں کی قرآن فہمی کو ناقص قرار دیتے ہوئے بعض غیر مقبول مسلم تفسیری آراء نقل کی گئی ہیں[3]۔

باب اول میں "القرآن الکتاب" کے عنوان سے قرآن کے بارے مسلم عقیدہ بیان کرتے ہوئے اس کی حیثیت صرف مصدق بائبل قرار دی گئی ہے۔

باب دوم "اصول تفسیر قرآن بالحدیث" پر مشتمل ہے جس میں بعض مسلم آراء سے تفسیر قرآن بالحدیث کو بے اعتبار گردانا گیا ہے۔ اور توریت کو مفصل قرار دیتے ہوئے قرآن ایک نامکمل کتاب گردانی گئی ہے۔

باب سوم تاریخ قرآن کے زیر عنوان پانچ فصول پر محتوی ہے۔ اس میں سبعۃ احرف اور جمع و ترتیب قرآن کے بارے مختلف فیہ روایات پیش کی گئی ہیں۔ اور آخر میں بعض روایات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن میں بعض آیات درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔ نقصان قرآن پر بعض شاذ اور غیر مقبول آراء سے استشہاد کیا گیا ہے۔

---

1 احمد شاہ، پادری، مفتاح القرآن، دیباچہ، بدون صفحہ شماری

2 اکبر مسیح، تاویل القرآن، (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۰۲ء) سرورق

3 ایضاً، دیباچہ ص ۵۔۱۶

باب چہارم میں " اہل قرآن کے خیالات کی تنقید " پیش کی گئی ہے۔ جس میں مولوی عبد اللہ چکڑالوی کے خیالات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آیت رجم پر بحث کی ہے۔

خاتمۃ الکتاب میں انا لہ لحافظون کی مسیحی نقطہ نظر سے تاویل کی گئی ہے جب کہ ضمیمہ میں نواب، مولوی اور پادری کے درمیان ایک فرضی مباحثہ کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی قرآن فہمی کی بابت مصنف رقم طراز ہے،

" یہ بات کیسی ہی حیرت افزا ہو مگر سراسر راست ہے۔ تمام جہان میں جن لوگوں نے سب سے زیادہ قرآن سمجھنا چاہا اور سب سے کم سمجھا وہ مسلمان ہیں "[1]۔

مسلم تفسیری ادب پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے،

" بعض عالموں نے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کی ہجو میں کہا تھا فیہ کل شی ء الا التفسیر اس میں تمام جہان کی باتیں ہیں بجز تفسیر کے اب معلوم ہوا کہ وہ مقولہ اہل اسلام کے سارے دفاتر تفسیر پر صادق آتا ہے "[2]۔

مسیحی تراجم قرانی پر یہ لن ترانی کی گئی ہے؛

"ہم بلا مبالغہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ایک حرف عربی نہ جانے صرف پامر صاحب کا ترجمہ قران اور راڈول صاحب کے فوائد تفسیری اور جارج سیل کا دیباچہ پڑھ لے تو وہ علمائے زید بکر سے زیادہ قرآن شریف پر حاوی ہو جائے گا "[3]۔

کتاب میں ان روایات کو بنیاد بنا کر نقص قرآن کا دعویٰ کیا گیا ہے جو مسلم اصول کے مطابق یا تو مردود ہیں یا جن میں منسوخ آیات کی خبر دی گئی یا پھر انہیں سیاق سے ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً بکری کا آیات کا کھا جانا یا سورت احزاب کی منسوخ آیات، وضع سورۃ حفد و سورۃ خلع، صحابہ کے مصاحف کا اختلاف[4] وغیرہ۔

مسیحی منادوں کی دیگر کاوشوں کی نسبت اس کتاب کا اسلوب قدرے شستہ متصور کیا جا سکتا ہے۔ مگر بنیادی خامی یہ ہے کہ مصنف لفظی ہیر پھیر سے دعویٰ کو دلیل بنا کر قاری کو الجھانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ علماء کی تحریری لغزشوں سے فائدہ اٹھا کر قرآن کی استنادی حیثیت کو مشکوک ٹھہرانا ہی ان کا واحد نصب العین اور طرہ امتیاز ہے۔ بائبل اور قرآن کے باہمی موازنہ کو قصداً نظر انداز کرتے ہیں۔

---

1 اکبر مسیح تاویل القرآن، ص ۵

2 ایضاً، ص ۶

3 ایضاً، ص ۷

4 ایضاً، ص ۷۶، ۸۵، ۹۹، ۱۰۴، ۱۲۸

اکبر مسیح   تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۱۹ء

بار دوم: ۱۹۵۹ء صفحات : ۲۴۰ (جائزہ میں اشاعت ہذا مد نظر ہے)

مسیحی لٹریچر میں قدرے شستہ تحریر کی حامل یہ کتاب اکبر مسیح نے اعجاز القرآن کے موضوع پر لکھی ہے۔ مصنف آغاز سے ہی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ اس کا مقصود مخالفت قرآن نہیں بلکہ قرآنی فصاحت کے متعلق عمومی مسلم نظریہ کی نفی ہے۔

" ہم قرآن شریف کے ہرگز نہیں بلکہ اس کی نسبت صرف مسلمانوں کے ایک قدیم اور محبوب مگر غلط خیال کی مخالفت کرنے والے ہیں جس کو ہم قرآن فہمی میں عارض سمجھتے ہیں"[1]۔

وہ قرآن فہمی میں حائل ہونے والی غلطیوں کی اصلاح کرنے کے مدعی ہیں، لیکن قاری کو ابتداء سے ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر مسلمانوں کے نظریہ اعجاز قرآن میں تشکیک پیدا کرنا مقصود ہے۔

مصنف مسلم مفسرین کی آراء کو بطور استشہاد پیش کرتے ہوئے ان کی شاذ آراء حتی کہ غیر ثقہ اقوال کو بھی جواز بنا کر قرآن پر معترض ہوتا ہے۔ اس کی قرآن فہمی تاریخی اعتبار سے ہے نہ کہ تعلیم کی رو سے۔ وہ مکی اور مدنی دور میں تفریق پیدا کرتے ہوئے مکی دور میں مسلمانوں کو عاجز جبکہ ثانی الذکر دور میں ایسے صاحب السیف قرار دیتا ہے جنہیں مذہبی جوش کے ساتھ سوائے جنگ و جدل کے کوئی اور کام نہ ہو۔ نیز مکی دور کی وحی کو جاہلی شعراء سے موازنہ کرتے ہوئے اس کے ہم پلہ یا کمتر ثابت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن کو مادی معجزہ کی حیثیت سے پرکھنا چاہتا ہے جیسے عصائے موسیٰؑ، احیائے موتیٰ از عیسیٰؑ وغیرہ

یہ کتاب ایسے عام قارئین کے ذہنوں کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتی ہے جن کا دنیاوی لحاظ سے تو بہت علم ہو لیکن مذہبی علم میں کورے اور ناخواندہ گردانے جائیں۔

اس کتاب سے مترشح ہوتا ہے کہ مصنف قرآن کے طرز نزول سے ناواقف ہیں۔

مصنف کا عربی زبان پر عبور کے دعویٰ کے برعکس ایک بنیادی کمزوری یہ عیاں ہوتی ہے کہ وہ عربی زبان کی لغت اور بلاغت کے بنیادی مباحث سے نابلد ہیں۔ حالانکہ کسی امر میں دخل دینے کے لیے مہارت بنیادی شرط ہے۔ نیز مصنف زبان پر عدم ابلاغ کامل کا اعتراض کر کے خدا کی قدرت کو محدود کر دیتے ہیں۔

---

1   اکبر مسیح، تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۵۹ء)، دیباچہ (ب)

ناقد نے لسانی اعتبار سے کوئی ایسا معروف معیار نہیں مقرر کیا جس پر قرآنی فصاحت وبلاغت کو پرکھا جا سکے۔ سامی زبانوں میں نقص تو نکالتے ہیں مگر الہامی زبان کا تعین نہیں کرپاتے اور نہ اس کی خصوصیات گنواتے ہیں۔ یہی ان کے نقد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

انہوں نے الہام پر قلم اٹھاتے ہوئے بعض مسلم علماء کی آراء اور اپنی ذاتی رائے پر حصر کیا ہے مگر الہام کے بارے اپنی مذہبی کتب سے اس پر روشنی نہیں ڈالی۔ شاید مسلم نظریہ وحی اور مسیحی نظریہ الہام میں واضح تفاوت کی بنا پر اس بارے سکوت اختیار کیے ہوئے ہیں۔

غیر عالمانہ ہونے کے باوجود طرز تحریر عامیانہ نہیں بلکہ نئے اسلوب کے ساتھ بظاہر استدلالی، منطقی اور معقولی (Rational) ہے۔

اکبر مسیح سلک مروارید

پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۲۸ء

صفحات: ۱۰۵

سلک مروارید رسالہ " تجلی" لاہور میں شائع ہونے والے اکبر مسیح کے بعض مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے دو مضامین " خداوند کی دعا اور سورۃ فاتحہ " اور قرآن وابن اللہ" ہمارے دائرہ تحقیق میں شامل ہیں۔

اول الذکر مضمون میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے؛

> " اگر کوئی چاہے کہ دنیا کی مقدس کتابوں سے ایک ایسی دعا چھانٹ کر نکالے جو بنی آدم کی اعلیٰ روحانیت کے تقاضے کو پورا کرے۔ ان کے مذہبی جذبات کی پاک ترین آرزوؤں کا جواب ہو ایسی کہ جب کوئی بندہ خدا اس کو پڑھے تو سب لوگ جن کے دل اپنے خالق کی طرف سیدھے ہیں جو حق کو خدا کی ملک اور اپنا ورثہ سمجھتے ہیں اس کے ساتھ بلا تامل آمین بول اٹھیں۔۔۔۔ اس کو دو دعائیں ملیں گی اور دونوں حسن اتفاق سے سامی قوموں کے دینی تجربہ کا نتیجہ ہیں۔ ایک خداوند کی دعا انجیل میں اور دوسری فاتحہ قرآن میں"[1]

وہ پوری سورۃ فاتحہ کا ماحصل اھدنا الصراط المستقیم کو قرار دیتے ہیں کہ اس سورۃ میں بس صرف اتنی ہی دعا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں[2]۔ تاہم وہ یہاں یہ نکتہ فراموش کر گئے ہیں کہ صراط مستقیم ہی انسان کا اصل مقصود ہے۔ اور اسی میں اس کی فلاح مضمر ہے۔ جب صراط مستقیم حاصل ہو گیا تو سبھی کچھ مل گیا۔

---

1 اکبر مسیح، سلک مروارید، (لاہور ۱۹۲۸ء)، ص ا

2 ایضاً، ص ۳

تصوفانہ رنگ میں سورۃ فاتحہ کو روحانیت کی پہلی سیڑھی قرار دیتے ہوئے اسے روحانی سفر میں سالک کا پاتراب گردانا گیا ہے۔ بعد ازاں انجیل کی دعا اور فاتحہ کی آیات کی تطبیقی تشریح یوں کی گئی ہے کہ گویا وہ اس کی نقش ثانی ہے[1]۔ مثلاً

" الحمد پڑھتے ہوئے جب الصراط المستقیم میری زبان سے نکلتا ہے تو فوراً مجھے وہ یاد آجاتا ہے جس نے فرمایا تھا" راہ حق اور زندگی میں ہوں" اور جب انعمت علیہم تو قرآن کا فرمودہ قال اللہ یا عیسی ابن مریم اذکر نعمتی علیک وعلی والدتک "[2]

مسیحی عقائد کو تشریح میں یوں سمونے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلم نقطہ نظر سے قبول نہیں کی جاسکتی۔

" اے ہمارے باپ، خدا کو باپ کہہ کر پکارا ہے۔ اس خطاب میں خدا کو رب بھی مانا، رحیم بھی، رحمان بھی۔ باپ ہو کر وہ تمام عالم کا خالق ہوا یعنی رب العالمین اور باپ ہی ہو کر وہ رحیم ورحمان۔ اور اس سے کچھ زیادہ ہوا"[3]۔

آخر میں آریہ سماج کے بانی مہارشی سوامی دیانند کی کتاب " ستیارتھ پرکاش " میں فاتحہ پر کیے گئے اعتراضات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ریویو آف ریلیجنز(قادیان) نمبر ۱۱، ۱۲، ۱۹۰۲ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک قول" یہ دعا جو سورۃ فاتحہ میں ہے انجیل کی دعا سے بالکل نقیض ہے "کا جواب دیا گیا ہے۔ یہاں پر ان کا قلم سنجیدگی اور متانت کی بجائے سطحیت کا رنگ اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے حریف کے ایک جسمانی عیب کی بناء پر اسے رکیک انداز میں یوں مخاطب کرتے ہیں۔

" اب ہم کو یہ کہنے کہ ضرورت نہیں کہ ہم مرزا صاحب کے اس قول کو کہ فاتحہ کی دعا انجیل کی دعا سے بالکل نقیض ہے مثل ان کے تمام دعوؤں کے مردود سمجھتے ہیں۔ اور انہوں نے صرف ایک ہی آنکھ سے کام لیا اگر خدا ان کو دونوں آنکھیں روحانی عطا فرماتا تو اپنے اس قول سے اور اس کے وجود سے وہ بہت شرمندہ ہوتے "[4]۔

اپنے دوسرے مضمون قرآن اور ابن اللہ میں اکبر مسیح لفظ ابن کے لفظی معنی واستعاری مفہوم سے مسیحی عقیدہ ابنیت کی راہ ہموار کرنے کی سعی ناتمام کر رہے ہیں۔ اس پر آریہ وتالمودی روایات سے استشہاد بھی کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی جسٹس امیر علی کی تحریر نقل کرتے ہیں جس میں وہ ادبی پیرائے میں کہتے ہیں؛

---

1 اکبر مسیح، سلک مروارید، ص ۳۔۱۱

2 ایضاً، ص ٦

3 ایضاً، ص ٦

4 ایضاً، ص ١٦

" آسمانی باپ نے اپنے خادم (محمد ﷺ) کے ذریعے اپنے بھکے ہوئے بال بچوں کو پھر اپنی طرف بلایا "[1]۔

اس ساری تحریر میں مصنف کوئی قرآنی آیت نقل نہیں کرتے سوائے ایک سورۃ اخلاص کے جسے وہ ایک تلمودی روایت سے اخذ شدہ بتلاتے ہیں۔ قاری کے لیے یہ تحریر ذہنی تھکاوٹ کے سوا کوئی مثبت تاثر قائم نہیں کرتی۔

ریورنڈ انوار الحق الناسخ والمنسوخ (Abrogation in the Koran)

میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ ۱۹۲۶ء

صفحات: ۷۷ (انگریزی ایڈیشن)

(اس کتاب کے اردو اور انگریزی ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ راقم کی رسائی انگریزی ایڈیشن تک ہوئی)

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں قرآن کریم پر خارجی نقد کے باب میں جمع و تدوین، اختلاف قرآت اور ناسخ و منسوخ میں سے آخر الذکر پہلو پر بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ علوم القرآن کی فنی مباحث میں مسیحی اہل قلم کا درک نہ ہونا ہو سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب علوم القرآن کے کسی ایک پہلو پر لکھی گئی معدودے چند تحریروں میں سے ہے۔

اندرون سرورق پر سورہ بقرہ کی آیت "مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَآ"[2] درج ہے۔ آغاز کتاب میں یوں تحریر ہے۔

"Knowledge of abrogated verses is essential and one of the helps to the study of the Koran, and it is sealed subject to Indian Maulvies in general with the exception of few great Arabic Scholars (Maulanas). I have ventured to write this book for the general Information of my friends (Mohammadans as well as Christians".[3]

ماخذ کتاب میں تفسیر جلالین، الناسخ والمنسوخ لابی القاسم، راڈویل کا ترجمہ قرآن اور فلوگل کا اشاریہ قرآن مذکور ہیں۔

---

1 اکبر مسیح، سلک مروارید، ص ۲۵

2 البقرۃ ۲: ۱۰۶

3 انوار الحق، ریورنڈ، الناسخ والمنسوخ (Abrogation in the Koran) (میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ ۱۹۲۶ء)، ص preface

ابتداء میں مسلم نقطہ نظر سے منسوخ کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

۱ منسوخ التلاوۃ والاحکام

۲ منسوخ التلاوۃ لیکن حکم باقی

۳ منسوخ الحکم لیکن تلاوۃ باقی[1]

ناسخ و منسوخ کی تعریف و توضیح کرنے کے بعد مؤلف نے سورتوں کو چار گروپوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ سورتیں جن میں ناسخ اور منسوخ دونوں قسم کی آیات ہیں۔

۲۔ وہ سورتیں جن میں صرف منسوخ آیات ہیں۔

۳۔ وہ سورتیں جن میں صرف ناسخ آیات ہیں۔

۴۔ وہ سورتیں جن میں ناسخ اور منسوخ دونوں قسم کی آیات نہیں ہیں۔[2]

بعد ازاں ابتدائی تین گروپوں میں شامل سورتوں کی صفحہ ۷، ۸، اور ۹ پر الگ الگ فہرست دی ہے۔

اس ابتدائی تمہید کے بعد تمام کتاب ناسخ و منسوخ آیات کی فہرست پر مشتمل ہے۔ اس فہرست کو مرتب کرنے کے علاوہ مرتب نے اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کیا۔

جدول کی صورت میں یہ فہرست آیت چھ کالموں پر مشتمل ہے۔ پہلے کالم میں منسوخ آیت، دوسرا آیت نمبر اور تیسرا کالم سورۃ کا نمبر ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ چوتھے کالم میں ناسخ آیت، پانچواں کلام آیت نمبر اور چھٹا کالم سورۃ نمبر پر مشتمل ہے۔ عمودی طور پر کالم میں پہلے عربی میں آیات درج ہیں اور ان کے نیچے والے خانے میں ان آیات کا انگریزی ترجمہ مندرج ہے اور اس میں مروجہ ترتیب سے آیات نمبر کے ساتھ بریکٹ میں فلوگل کے بیان کردہ آیت نمبر بھی دیئے گئے ہیں۔

مرتب نے اس جانب قطعاً کوئی اشارہ نہیں کیا کہ درج شدہ آیات پر منسوخ اور ناسخ کا حکم کس نے لگایا ہے یا پھر مرتب ہی ان آیات کے منسوخ و ناسخ ہونے کا مدعی ہے۔ اور نہ ہی کسی مسلم مصدر کا ذکر کرتے ہیں۔

اشاراتی فہرست مرتب کرنے کے علاوہ اس موضوع پر مسلم یا مسیحی نقطہ نظر سے کوئی رائے زنی نہیں کی گئی ہے۔ شاید مؤلف مسیحی ناقدین قرآن کے لیے صرف یہ فہرست ہی مرتب کرنے کا خواہش مند رہا ہو۔

---

1 انوار الحق، ریورنڈ، الناسخ والمنسوخ، ص ۵

2 ایضاً، ص ۶

پادری ای ایم ویری　　آئینہ قرآن

امریکن مشن پریس، لودیانہ ۱۸۸۱ء

صفحات: ۱۰۶

پادری ای ایم ویری کی یہ کاوش قرآن کے اشاریہ پر مبنی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کردہ اس اشاریہ میں کسی کلمہ کے متعلقہ قرآنی بیانات پر عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور پھر ان قرآنی مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً قرآن کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت ۴۶ ضمنی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ جس میں ہر عنوان کے متعلق مذکور قرآنی مقام کی نشان دہی کی گئی ہے۔ (اکثر تمام متعلقہ مقامات کی نشاندہی نہیں کی گئی) اس میں پہلے سیپارہ کا نمبر دیا گیا ہے پھر سورت کا نام اور پھر پارے کا رکوع نمبر درج کیا گیا ہے۔ مثلاً

۔ قرآن وحی سے لکھا گیا۔ سیپارہ۔۶ سورۃ نساء ۲۳ رکوع؛ سیپارہ۔۱۵ سورۃ کہف ۴ رکوع[1]

۔ قرآن میں محمد (ﷺ) کا نام سیپارہ۔۱۵ سورۃ انبیاء ۱ رکوع[2]

۔ قرآن عزت والی کتاب ہے سیپارہ۔۲۷ سورۃ واقعہ ۳ رکوع[3]

دیگر مسیحی کاوشوں کی طرح یہ بھی سادہ قرآنی اشاریہ ہے۔ جس کا مقصد مسیحی اہل قلم کے لیے قرآنی مقامات کی تلاش میں آسانی پیدا کرنا ہے۔ اس میں کوئی فکری یا نظریاتی پہلو سے قابل ذکر کام نہیں ہے۔

پادری ای ایم ویری　　دین اسلام

امریکن ٹریکٹ سوسائٹی، لودھیانہ ۱۹۰۵ء

صفحات: ۵۲

یہ کتاب ایک تجربہ کار مشنری اور پختہ ذہن کے حامل مسیحی کے قلم سے دین اسلام کا تعارف ہے۔ پانچ ابوب پر مشتمل اس تحریر کی فصل اول تعارف قرآن پر محتوی ہے۔

آغاز وحی کے ذکر میں پادری صاحب اپنا نظریہ قرآن یوں پیش کرتے ہیں،

"محمد صاحب کی نبوت کا شروع یہی تھا۔ اس وقت سے بیس برس تک برابر اس عجیب وغریب شخص کے اظہار اور بیانات بڑی ہوشیاری سے لکھے گئے اور کلام اللہ کے طور پر پیش کیے گئے۔ تمام قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا اور نبی

1　پادری ای ایم ویری، آئینہ قرآن، (امریکن مشن پریس، لودیانہ ۱۸۸۱ء)، ص ۸۲

۴　ایضاً، ص ۸۳

۵　ایضاً، ص ۸۳

کے تجربوں اور مومنین کے حالات کے رنگ میں رنگا گیا۔ قرآن کے مختلف حصوں کا مختلف موقعوں پر حسب ضرورت اظہار اور استعمال کیا گیا جب کبھی نبی کو کوئی ضرورت پیش آئی اور کوئی ذاتی فائدہ ملحوظ اور مد نظر ہوا فوراً آسمانی الہام وضع کیا گیا"[1]۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں،

"وحی قرآن کا یہ ایک خاصہ نظر آتا ہے کہ وہ آنحضرت کی ضروریات اور تمام کاروائیوں کے حسب حال خوب ہی زمانہ سازی کرتا ہے۔ قرآنی الہامات اور آنحضرت کی کاروائیوں میں ایک نہایت گہرا تعلق ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے آنحضرت کے سوانح عمری اور حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہونا از حد ضروری ہے"[2]۔

پادری صاحب کی تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ قرآن مکی اور مدنی دور کے حالات وواقعات کے نتیجہ میں آپؐ کے ذہن کی پیداوار ہے نہ کہ الٰہی تعلیمات پر مبنی آسمانی صحیفہ ، اوراس زمانہ ساز وحی کی تعلیمات مخاطبین اور ذاتی احوال کی تبدیلی کے نتیجہ میں ارتقاء پذیر رہیں۔

مغرب سے تعلق رکھنے والے پادری صاحب ہندوستان میں بیٹھ کر ان مستشرقین کے افکار کو بڑے شدومد سے پیش کر رہے ہیں جن کی مسلمانوں سے براہ راست معاملت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کا نقطہ نظر نہیں جان سکے تھے۔ لیکن پادری صاحب کا مسلم نکتہ نظر سے واقف ہونے اوران اعتراضات کے شافی جوابات معلوم ہونے کے باوجود وہی راگ الاپے جانا کسی اور مقصود کی نشان دہی کرتا ہے۔

اگلی بحث میں مسئلہ ناسخ ومنسوخ کو ضرورت دعویٰ نبوت کی اختراع قرار دیا گیا ہے۔ جس سے مصنف کی انجیل سے کم آشنائی عیاں ہوتی ہے کیونکہ خود انجیل الہامی تعلیمات میں ناسخ ومنسوخ کی مؤید ہے[3]۔

کتاب میں بعض خود ساختہ عقائد بھی مسلمانوں کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً آسمانی کتب کے متعلق کہتے ہیں؛

" جن کتابوں کو مسلمان اعتقادی طور پر مانتے ہیں ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ تعداد میں ۱۰۴ ہیں اور سب کی سب الہامی ہیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ ان کتابوں میں سے ایک سو غائب ہو گئیں۔(چار باقی ہیں)[4]

---

1 ویری، دین اسلام، ص ۵۔۶

2 ایضاً، ص ۱۱۔۱۲

3 پولوس رسول کہتے ہیں کہ، " پہلے حکم کی تو کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب سے تنسیخ ہوتی ہے،(عبرانیوں ۷ : ۱۸) افسیوں کے نام خط ۲ : ۱۵؛ حاشیہ کیتھولک بائبل اعمال الرسل ص ۱۷۵؛ فانڈر، میزان الحق، ص ۳۰ دیباچہ

4 ویری، دین اسلام، ص ۲۸

انبیاء کی تعداد کے بارے مصنف کا کہنا ہے کہ انبیاء کے بارے میں مسلمان خیال کرتے ہیں کہ ان کا شمار ایک لاکھ چوالیس ہزار ہے۔۔۔ علاوہ بریں مسلمان یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ تین سو پندرہ رسول خاص پیغام کے ساتھ بھیجے گئے الہامی احکام کے اجراء کی غرض سے ہادی کے عہدہ پر ممتاز کیے گئے۔ ان میں سے چھ انبیاء عزام کہلاتے ہیں[1] قرآن میں دابۃ الارض کی نشانیوں کے بارے بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے[2]۔

روزوں کے فرائض کی انجام دہی کے متعلق یوں لب کشائی کی گئی ہے؛ "صبح سے لے کر شام تک پارہ نان یا قطرہ آب روزہ دار کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا"[3]۔

بعض عقائد مسلمانوں کے سر یوں منڈھے گئے ہیں کہ قاری بادی النظر میں اسلام کو ایک غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب خیال کرنے لگ جاتا ہے۔ قرآنی جہاد کا تعارف کرواتے ہوئے اس وقت مغرب کے سب سے بڑے سیاسی حریف ترکوں کی طرف آرمینیا میں منسوب وحشیانہ مظالم کے افسانوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ترک فوج کا کوئی انفرادی فعل ظلم و بربریت کے درجے میں آتا ہے یا نہیں، لیکن مصنف اسے اسلام کے کھاتے میں ڈال کر اسے معطون کرنا چاہتا ہے۔ ظلم خواہ کسی فریق کی جانب سے ہو، قابل نفرت و مذمت ہے۔ پادری صاحب ہندوستان میں بیٹھ کر آرمینیا میں ترکوں کے مظالم تو ذکر کر رہے ہیں، لیکن خود ان کے ہم قوم، ہم مذہب اور ہم وطن انگریزوں فرانسیسیوں، ہسپانویوں اور ولندیزیوں نے جو انسانیت سوز مظالم مقامی ہندوستانی باشندوں پر ڈھائے ان کا تذکرہ گول کرنا پادری صاحب کے نہ صرف ضمیر خفتہ کا غماز ہے بلکہ ایسے رویے کی نشان دہی کرتا ہے جو سراسر انسانیت کے خلاف ہے۔ یعنی اگر کوئی مسیحیوں پر ظلم کرے تو وہ لامحالہ وحشی مذہب کی نمائندگی کرتا ہے لیکن اگر مسیحی خود کسی پر ظلم ڈھائیں، جس کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں جابجا ملتا ہے، تو وہ ان کا حق ہے۔ کیا انسان کہلانے کا حق صرف مسیحی مذہب کے پیروکاروں کو ہی ہے۔ اس دوہرے معیار کا کیا جواز؟

آخر کس ضرورت نے پادری صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اسلام سے ناآشنا لوگوں کے سامنے خود ساختہ عقائد اور اختراعی امور کو اسلام کی طرف منسوب کر کے مقصد براری کریں۔ اسلام کے عقائد کو جھوٹ بول کر غیر فطری اور انسانی بساط سے باہر گردانا دیانت داری کے خلاف ہے۔ اگر وہ راہ حق پر ہیں تو انہیں ڈر کس بات کا۔ صداقت کو اپنا آپ منوانے کے لیے بیساکھیوں اور جھوٹے سہاروں کی ضرورت ہی کب پڑی ہے۔ البتہ باطل اپنی بقا کے لیے ہاتھ

---

1 ویری، دین اسلام، ص ۲۹

2 ایضاً، ص ۳۱

3 ایضاً، ص ۳۵

پاؤں ضرور چلاتا ہے۔ جھوٹ بول کر لوگوں کو فریق مخالف سے متنفر کرنا کون سی سچی تعلیم کا تقاضا ہے۔ کہیں یہ رویہ پادری برکت اللہ کے نزدیک "رسول مقبول پولس" کی میراث تو نہیں جو یہ فرماتے ہیں؛

"میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئی ہے تو پھر مجھ پر کیوں گناہ گار کی طرح فتویٰ دیا جاتا ہے اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی نکلے"[1]۔

خلاف حقیقت من گھڑت ایک واقعہ بھی درج کیا گیا ہے کہ فتح اسکندریہ کے بعد اس کے کتب خانہ کے متعلق حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر وہاں کی کتابیں قرآن سے مطابقت رکھتی ہیں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں اور اگر وہ قرآن کے خلاف ہیں تو ضرور انہیں برباد کر دینا چاہیے[2]۔ تاریخ کے اوراق میں مندرج یہ افسانہ تو مؤلف کو نظر آیا (جس کی تردید خود مسیحی مصنفین نے بھی کی ہے[3]) اور انہوں نے اس سے مطلب براری بھی خوب کی۔ مگر حضرت عمرؓ کا بیت المقدس میں مسیحیوں کے گرجا میں نماز ادا نہ کرنے کے صحیح واقعہ کا ذکر قصداً گول کر دیا۔ تعصب کا یہ حال ہے کہ مفتوح مسیحی قوم کے کتب خانہ پر مسلم تصرف کے افسانہ کی دہائی صدیوں بعد بھی مسیحی دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس مسلم رواداری کے مظہر حقیقی واقعہ کا اخفاء مسیحی دیانت کے بارے خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتا۔

قرآن پر اس قسم کے الزامات کے ساتھ ساتھ ان الفاظ میں تاثیر قرآن کے معترف ہیں۔

"اول، یہ کہ قرآن کی عبارت نہایت عمدہ ہے اور اصل زبان کا لہجہ بہت ہی شیریں ہے جب کوئی قرآن پڑھتا ہے تو سننے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش الحان کو دلکش سرود سنا رہا ہے۔ ہزارہا لوگ ایسے ہیں جو قرآن کا شاید حرف بھی نہیں سمجھتے لیکن سنتے وقت عبارت ولہجہ کے باعث بالکل مجذوب ہو جاتے ہیں۔

دوم، اس کتاب میں توحید پر بہت زور دیا گیا ہے اور خدا کی وحدت کی سچائی اور نجات کے باب میں خدا پر توکل کرنے کے بیانات عموماً لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچتے اور مائل کرتے ہیں"[4]۔

یہ خالصتاً پختہ مگر متعصب فکر کے حامل ایک ایسے مسیحی مناد کی تحریر ہے جو کسی سطح پر بھی اسلامی روایات کو قبول کرتے ہوئے مطالعہ اسلام کے روادار دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ مصنف کی تحریر میں عدل کو بروئے کار لاتے ہوئے خوش دلی سے کوئی بات کہنے کا اسلوب مفقود ہے۔ اور قلم کے پیچھے تعصب، معاندانہ اور جانبدارانہ رویہ پر مبنی

---

1 رومیوں ۳: ۷۔۸

2 ویری، دین اسلام، ص ۱۶

3 معروف مستشرق منٹگمری واٹ کے مطابق یہ کہانی قریب قریب یقیناً گھڑی ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہ سوچنے کی بنیادیں موجود ہیں کہ فتح اسکندریہ سے کئی برس پہلے کتب خانہ شہر سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ (سہ ماہی "اسلام اور مغرب"، اسلام آباد، ج ۱، ش ۱، جنوری ۲۰۰۲ء، (منٹگمری واٹ، مستشرقین کا مطالعہ قرآن)، ص ۹۸

4 ویری، دین اسلام، ص ۱۴

فکر جھلک رہی ہے۔ مخصوص فکر اور ظن و تخمین سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں اسلام کو پرکھنے کے یک طرفہ مسیحی رویے کا اظہار اس کتاب سے بخوبی ہوتا ہے۔ ایک عام قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جس دین کے پیشواکو جھوٹ اتہام دوسروں کے سر منڈھنے اور دوہرا معیار اپنانے میں کوئی باک نہ ہو کیا یہ ان کا انفرادی فعل ہے یا خدمت دین کی جوش پر مبنی دینی تربیت۔ اگر دینی تربیت کا نتیجہ ہو تو ارباب دین کے لیے سوچنے کا مقام ہے اور اگر انفرادی رویہ ہے تو ایسے کور باطن کا کیا گلہ۔ عام مسیحی کو ضرور پرکھنا چاہیے کہ فرد و دین میں سے کسے مجرم ٹھہرائے؟

بحیثیت مجموعی کتاب اگرچہ پختہ قلم کار مسیحی کی کاوش ہے لیکن اس میں تحقیق کا عنصر مفقود ہے۔ اس بات کا اہتمام قصداً کیا گیا ہے کہ بات کہتے وقت غیر محسوس انداز میں مخاطب فریق کی دل آزاری کا پہلو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اخفائے حق کے ساتھ ساتھ دوہرے معیار اور غیر مہذب الفاظ کے شعوری انتخاب نے مصنف کی اسلام کے بارے قلبی کیفیت کو آشکار کیا ہے۔

پادری ای ایم ویری   ہدایت المُمترین

کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لدھیانہ ۱۹۰۱ء

صفحات: ۱۶

برصغیر کے مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں سب سے زیادہ مسئلہ تحریف زیر بحث رہا ہے۔ زیر تبصرہ مختصر کتابچہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ تحریر اس دعویٰ کے ساتھ لکھی گئی ہے کہ؛

> " قرآن کی شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ توریت و انجیل کے نسخے جو محمد صاحب کے وقت موجود تھے تحریف نہیں ہوئے لیکن صحیح و معتبر تھے اور نیز یہ کہ وہ کتب مقدسہ جنہیں قرآن تصدیق کرتا ہے اب تک صحیح ہیں اور فی الحال عیسائیوں کے پاس موجود ہیں"[1]۔

اپنے اثبات دعویٰ کے لیے چار دلائل دیے گئے ہیں مصنف یہود و نصاریٰ کو دی گئی الکتاب کے عمومی ذکر پر مبنی سات آیات سے استنباط کرتے ہیں اور اس میں تفسیر بیضاوی میں کردہ بعض آیات کی تشریح کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ پھر ماقبل عہد رسالت کے بائبل کے ترجمہ شدہ پانچ نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے جو دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن یہاں تدلیس یہ ہے کہ دعویٰ تو منزل من اللہ بائبل کے ماقبل عہد رسالت نسخوں کی موجودگی کا ہے لیکن ذکر ان یونانی اور سریانی ترجموں پر مبنی ناقص نسخوں کا کیا جا رہا ہے جن کی تدوین مختلف افراد کے ہاتھوں کئی

---

1 ویری، ای ایم، پادری، ہدایت المُمترین، (کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لدھیانہ ۱۹۰۱ء)، سرورق

سالوں میں ممکن ہوئی جو کہ بجائے خود تحریف بائبل کی ایک دلیل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ممکنہ تحریف کاالزام یہ کہہ کر مسلمانوں کے سر تھوپا گیاہے کہ،

" اگر یہہ کتابیں محمد صاحب کے بعد تحریف ہوئیں تو آپ لوگ اس بات کے ذمہ دار ہیں کیونکہ محمد صاحب کے انتقال کے بعد پانچ برس کے اندر سوریہ اور فلسطین کے تمام کتب خانے اہل اسلام کے ہاتھ آگئے جن میں توریت وانجیل کے سینکڑوں نسخے تھے کیا یہہ سب تحریف ہوگئے؟اگر ہوئے توکیونکر ہوئے؟" [1]

بادی النظر میں پادری صاحب یہ الزام عائد کرتے ہوئے تاریخ سے بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں حالانکہ برصغیر کی اس قد آور مناد شخصیت کا تاریخ کا ناقص مطالعہ ان کی ذات سے میل نہیں کھاتا۔اصل بات یہ ہے کہ وہ دانستہ تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر جواب دہی سے پہلو تہی کرتے ہوئے بار ثبوت مخالف پر ڈالنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔کیونکہ اوراق تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں جن سے ثابت کیا جاسکے کہ مسلم فتوحات کے دوران اہل کتاب کے مقدس نوشتوں کو مسلم فاتحین نے جبراً چھینا ہو، تلف کیا ہو، جلایا ہو، یا ان کو پیروکاروں کو ان کے مطالعہ سے روکا ہو، یا ان سے چھین کر اپنی طرف سے کچھ ملا کر انہیں پڑھنے پر مجبور کیا ہو، حالانکہ چھاپہ خانہ سے قبل یہ بات نہایت آسان تھی۔

پادری ایس ایم زویمر تین مذاہب

پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۲۹ء

صفحات: ۳۰

عرب وسطیٰ میں خدمات سرانجام دینے والے معروف مسیحی مناد کے اس بزبان انگریزی کتابچہ کے اردو ترجمہ میں یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے احکام عشرہ کو تورات، انجیل اور قرآن وحدیث میں سے تقابلی انداز میں پیش کیا گیاہے۔ان میں ذات باری تعالیٰ، شرک، خدا کے نام کی قسم کھانا، سبت اور جمعہ، والدین کی خدمت، قتل، زنا، چوری، جھوٹ اور پڑوسی کے بارے احکامات شامل ہیں۔

مصنف پہلے توریت پھر انجیل اور بعد ازاں قرآن معہ حدیث سے عبارتیں نقل کرتا ہے۔

مؤلف نے صرف مذکورہ نصوص کے تراجم پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے اپنے تبصرہ، توضیح وتشریح یا تعلیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن غیر محسوس انداز میں مخصوص طریقے سے تدلیسی حربے اختیار کیے ہیں۔مثلاً چوری

---

1 ویری، ہدایت المسترین، ص ۲۱

کے بارے قرآنی سزا کو شنیع دکھلانے کے لیے توریت و انجیل سے چوری نہ کرنے کا حکم نقل کیا گیا ہے سزا کی آیت نہیں لکھی گئی جب کہ قرآن کی سزا کی آیت مقابل میں پیش کی گئی ہے[1]۔ جس سے بادی النظر میں قرآن متشدد نظر آتا ہے اور یہی مصنف کا مقصود ہے۔

اس ساری کاوش کا مقصد شریعت موسوی کو شریعت محمدی پر برتر ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ مؤلف بین السطور یہ باور کروانا چاہتا ہے کہ اگر اسلامی شریعت کو موسوی شریعت کا تسلسل قرار دیں تو احکام الٰہی ترقی کی بجائے تنزلی کی تصویر پیش کریں گے۔

اس دور میں استعمار کی چھتری تلے ہندوستان میں مغربی مبشرین کی احساس تفاخر پر مبنی تحریروں کی اشاعت سے مسیحیت کی بالادستی اور مخاطب کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا مسیحی منادوں کا مقصود تھا جس کے لیے انہوں نے کافی کتب شائع کیں یہ کتابچہ بھی اس سلسلہ کی کڑی ہے۔

ایل بیون جونز　　　　اہل مسجد (مترجم: جے سبحان)

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور

بار دوم: ۱۹۵۲ء صفحات: ۴۳۴ (جائزہ میں اشاعت ہذا مد نظر ہے)

مدراس یونیورسٹی کے فیلو پادری ایل بی جونز نے اہل مسجد کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کا تعارف انگریزی زبان میں کروایا تھا جس کا ترجمہ مقامی نومسیحی نے کیا۔ دوسرے باب کی پہلی فصل قرآن کے نام سے موسوم ہے۔ مصنف بلادلیل اس بات کے مدعی ہیں کہ؛

"نئے عہدنامہ سے قرآن ذرا ہی بڑا ہے۔۔۔ اور یہ ایک ہی دماغ کے غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے"[2]۔

مصنف کو یہ بات عجیب محسوس ہوتی ہے کہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ہاں بعض دفعہ قرآن کی تعظیم توہمات تک جا پہنچتی ہے[3] نیز اگر کوئی قرآن پر نکتہ چینی کرتا ہے تو آپ ﷺ کو بہت ناگوار گذرتا[4]۔

مصنف کے مطابق آپ ﷺ کے دور میں اسلام کی اصل صرف قرآن تھی اور قانونی انتظامات محدود تھے[5]۔

آپ ﷺ پر قرآن کی بے ربط آیت حالات کے نتیجہ میں پیش کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔

"بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں ہنگامی ہیں یعنی ان کا تعلق خاص حادثہ یا خاص ضرورت سے ہے"[1]۔

---

1 زویمر، ایس ایم، پادری، تین مذاہب، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۲۹ء)، ص ۲۵

2 جونز، ایل بیون، اہل مسجد (مترجم: جے سبحان)، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۵۲ء)، ص ۴۷ ب پ

3 ایضاً، ص ۷۲

4 ایضاً، ص ۷۴

5 جونز، اہل مسجد، ص ۶۹، ۷۰

نیز، "اگرچہ عرب کا حافظہ نہایت تیز تھا تاہم غلطی سے بری نہیں تھا یہاں تک کہ بعض اوقات خود محمد صاحب کے حافظہ نے ان کو دھوکہ دیا (دیکھو سورۃ بقرۃ آیت ۱۰۰)[2]

آپ ﷺ کا یہود کے ساتھ واسطہ پڑا تو مصنف کے نزدیک؛

" یہودی محمد صاحب کے دعویٰ کی تردید کرتے اور اس کا مضحکہ اڑاتے تھے اور محمد صاحب ان کو ذلیل کرنے کے درپے تھے۔ مثلاً محمد نے یہودیوں پر الزام لگایا کہ وہ اپنی پاک کتابوں کی باتوں کو چھپاتے اور دھوکا دیتے ہیں اور پھر ہولناک دھمکیاں دے کر انہیں ڈرایا۔ (سورۃ نساء، آیت ۵۰) "[3]

یہ اخذ کردہ نتیجہ دراصل عہد متذکرہ کے پادری صاحب کے قبیل کے مستشرقین کے ذہنی رویہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں وہ قاری کی رائے پر اثر انداز ہو کر اسے صحیح یا غلط کی تمیز کا موقع دیے بغیر غیر محسوس طریق سے ذہن بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخی واقعہ بیان کرتے ہوئے غیر ثقہ اور غلط معلومات درج کی گئی ہیں۔ مثلاً حضرت علیؓ کی بابت ہے کہ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کے قبول اسلام کی خوشی میں ننگی تلوار لیے مسلمانوں کے گروہ کے آگے آگے کعبہ کو جا رہے تھے[4]۔ حالانکہ دونوں صحابہ کرام نے ایک ہی دن اسلام قبول نہیں کیا تھا جیسا کہ تحریر سے تاثر سے پایا جاتا ہے آپ ﷺ کے بارے جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ ایک نبی یا کسی محترم شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتی اور مسلم قوم کو سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حوالے سے ایک طلب جاہ و مال کے حریص ڈاکو صفت گروہ بنا کر پیش کیا گیا ہے[5]۔

مصنف من مانے نتائج اخذ کر کے اسلام سے ناواقف قاری کے ذہن پر تو شاید کچھ اثر انداز ہو لیکن مسلم قارئین کے سامنے اس کی علمی تدلیس بخوبی عیاں ہو جاتی ہے۔

ریورنڈ ایڈورڈ سیل   عقائد اسلامیہ

---

1 ایضاً، ص ۴۷ الف

2 ایضاً، ص ۴۷ الف

3 ایضاً

4 ایضاً، ص ۲۳

5 ایضاً، ص ۳۱

امریکن مشن پریس، لکھنؤ ۱۸۸۳ء

صفحات: ۲۹۱

مدراس یونیورسٹی کے فیلو پادری ایڈورڈ سیل کی یہ کتاب اسلام اور مسلمانوں کے تعارف پر مبنی ہے۔ کتاب درج ذیل چھ ابواب پر محیط ہے۔

باب اول	اصول اسلام
دوسرا باب	تفسیر و تشریح قرآن و حدیث
تیسرا باب	مسلمانوں کے فرقے
چوتھا باب	عقائد اسلام
پانچواں باب	احکام اسلام
چھٹا باب	مسلمانوں کے تیوہار اور روزے

پہلے اور دوسرے باب میں تعارف قرآن پر وحی، قرآن کا معجزہ ہونا، ترتیب، عثمانؓ کا قرآن کو جمع کرنا، الہام، ہفت قراءت، مفسر کا کام، قرآن کے الفاظ اور آیات، ان الفاظ کا استعمال، استخراج دلائل از قرآن، قرآن کی حسن، ناسخ و منسوخ کو حوالے سے قلم اٹھایا گیا ہے۔

دیباچہ میں مصنف رقم طراز ہے؛

"میں نے معتبر کتابوں سے اور نیز رسوم مروجہ سے یہ بتانا چاہا ہے کہ دین اسلام دراصل کیا ہے اور اس کا اثر لوگوں پر اور قوموں پر کیا ہے۔ دوسرے جو کچھ اس وقت تک اسلام کی نسبت لکھا گیا ہے یا تو محض تعصب سے یا بطور رائے زنی کے لکھا گیا ہے اس کا حال دریافت کرنے کے واسطے اس کے علوم سے واقفیت ہونا اور ان لوگوں میں رہنا ضروری ہے۔ میں نے کم و کاست جو کچھ تحقیق ہوا لکھا ہے اور جو کچھ یورپ کے مصنفوں سے اخذ کیا ہے وہ صرف بطریق توضیح کے ہے"[1]۔

قرآن کا تعارف میں پادری صاحب لکھتے ہیں؛

"ہر فرقہ کے مسلمان اس کتاب کی نہایت تعظیم کرتے ہیں پڑھنے کے بعد کسی اونچی جگہ پر طاق یا تختہ ہو، رکھتے ہیں کوئی بغیر وضو کیے نہ اسے پڑھ سکتا ہے نہ ہاتھ لگا سکتا ہے۔ (لا یمسه الا المطهرون سورة ۵۶ و ۷۸) اور جب تک کوئی اشد ضرورت نہ ہو ترجمہ نہیں کرتے اور ترجمہ کے ساتھ عربی متن ضرور چھپتا ہے۔ یعنی ترجمہ ہمیشہ حامل المتن[2]

---

1 ایڈورڈ سیل، عقائد اسلامیہ، امریکن مشن پریس، لکھنؤ ۱۸۸۳، ص ۱ (مقدمہ)

2 ایضاً، ص ۵۔ برصغیر میں مسیحی کارپردازوں کی طرف سے بائبل کے معرّیٰ ترجمہ کے بعد قرآن کریم کے معرّیٰ تراجم بھی سامنے آئے۔ ان کی تاثیر سے بعض مسلم علماء کے معرّیٰ تراجم قرآن بھی طبع کیے گئے مگر انہیں قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

ہوتا ہے۔۔۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن باعتبار عبارت اور معانی اور ترتیب الفاظ اور اخبار اور احکام کے فصاحت کا معجزہ ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر ذی اختیار اور اولوالعزم نبی کے عہد میں جس قسم کی باتوں کا چرچا اور عام رواج ہوتا تھا اسی قسم کے معجزے دکھائے جاتے تھے"[1]۔

الہام اور وحی کی بحث میں مسلم و مسیحی نقطہ نظر کا تقابل ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

" بہر نہج محمد صاحب کا الہام مسیحیوں کے الہام سے مختلف ہے اور مسلمان اسے نہایت ناقص قسم کا الہام جانتے ہیں۔ یہ بات کہ الہام جس طرح مستلزم جانب الٰہی کو ہے ایسے ہی جانب انسان کو بھی ہے (اس کا تعلق دونوں سے ہے) محمدیوں کو نہ صرف غیر معلوم ہے بلکہ بالکل ان کے مخالف ہے"[2]۔

جمع و ترتیب قرآن پر مسلم عقیدہ کے برعکس یوں خامہ فرسائی فرمائی ہے؛

" جب نبی نے انتقال کیا تو وحی آنا موقوف ہوا اور کل قرآن کی کوئی درست نقل اس وقت موجود نہ تھی جس سے معلوم ہوتا کہ فلاں احکام زیادہ لحاظ کے قابل ہیں اور فلاں احکام کم لحاظ کے قابل ہیں۔ اور یہ کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا کہ نبی نے کسی حصے کی کوئی خاص احتیاط کی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ترتیب نہ تھی جس پر بوقت جمع کرنے قرآن کے اس کی سورتیں ترتیب دی جاتیں۔ کیونکہ قرآن جیسا کہ اب موجود ہے تاریخی یا عبارتی ترتیب سے بالکل معرا ہے۔"[3]

یہاں پادری صاحب یہ فراموش کر گئے ہیں کہ جس خوبی کی وہ تلاش قرآن میں کرتے ہیں آیا اسے بائبل خصوصاً عہد نامہ جدیدہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ان کا یہ فرمانا محض یک طرفہ فیصلہ ہے اور وہ جمع و تدوین قرآن کی تاریخ سے واقف نہیں یا ضرور تا اغماض برتتے نظر آتے ہیں۔

پادری صاحب معترف ہیں کہ قرآن مروجہ میں وہی باتیں ہیں جو محمد صاحب نے فرمائی تھیں اس سبب سے اسلام کی اصل و بنیاد اسی پر ہوگئی ہے[4]۔

حریت فکر اور اخلاق و تمدن کی بہترین تعلیمات کا حامل قرآن لوگوں کو خود ساختہ جکڑ بندیوں اور انسانوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کا داعی ہے[5]۔ لیکن پادری صاحب کی نظر میں؛

---

1 ایڈورڈ سیل، عقائد اسلامیہ، ص ۸

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۱۰۔۱۱

4 ایضاً، ص ۱۲

5 اس قرآنی دعوت کو ایرانی دربار میں مسلم سفیر نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے " لنخرج العباد من عبادة العباد الی عبادة الله" یعنی اسلام کے پیروکاروں کی گردن پر کوئی انسانی جوا نہیں ہوتا نہ کسی دنیاوی قیصر کا نہ کسی مذہبی قیصر (پوپ) کا

"غرضیکہ اس کتاب کے احکام جیسا کہ محمد صاحب نے چاہا تھا تمام دنیا کے مسلمانوں کے واسطے ایک قید اور تمام دینداروں کے حق میں خیالوں کی آزادی کی بڑی روک اور تمام معاملات مدنی و اخلاقی و دینی کی تجدید و ایجاد کے واسطے بڑی مزاحمت ہو گی"[1]۔

احکامات قرآنی پر مصنف کا تبصرہ اقوام عالم کی تاریخ سے ناواقفیت کا مظہر ہے۔ قرآن نے سوچنے کی دعوت دی اور فکر و عمل کے نئے ابواب وا کیے اور یہ اس وقت ہوا جب پادریوں کے زیر اثر پورا یورپ جہالت میں ڈوبا پڑا تھا اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھا۔ خود پادری صاحب کے وطن میں تمدنی ترقی بھی مسلمانوں کی دین ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ان کے پادری ہاتھ یا منہ دھونے پر لوگوں کو مطعون کرتے تھے اور مسلمان آراستہ و پیراستہ حمام میں غسل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ آج کی ترقی جدید ٹیکنالوجی کی ترقی ہے لیکن یورپ میں تہذیبی ترقی کا آغاز اندلس سے مسلمانوں کے سیاسی غلبہ کے بعد ہی ہوا۔ یہ قرآنی تعلیمات کی مخالفت سے ممکن نہ تھا۔

بحیثیت مجموعی اس کتاب میں ایک مسیحی ذہن کے ساتھ اسلامی عقائد کا تعارف کروایا گیا ہے۔ اور اسلامی مسلمات کی یک طرفہ مخصوص ایسی وضاحت کی گئی ہے جسے کبھی مسلمانوں کے ہاں قبولیت نہیں مل سکی۔

ڈاکٹر ایڈورڈ سیل کشف القرآن (مترجم: منشی محمد اسمعیل)

پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۰۲ء

صفحات: ۱۹۹

انیسویں صدی میں مغرب میں مذہب کو سماجی رویوں کی روشنی میں جانچنے کی تحریک کے اثرات بہت جلد مغرب سے باہر بھی آن پہنچے۔ صرف ملحد اور سیکولر افراد ہی نہیں بلکہ مسیحی مبشرین اور مستشرقین بھی اس کا ذریعہ بنے۔ زیر تبصرہ کتاب "کشف القرآن" اس کی ایک نظیر ہے۔ اس میں قرآن کا کلام الٰہی کی بجائے معاشرتی رویوں اور حالات و واقعات کے تناظر میں تجزیہ کی کوشش کی گئی ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ مؤلف پہلے سے طے شدہ نتیجہ پر پہنچنے کی حکمت عملی پر کاربند نظر آتا ہے)

حیات محمد ﷺ کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کو پرکھنے کی یہ کاوش دو ابواب پر مشتمل ہے جس میں وحی قرآنی کو تاریخی اعتبار سے مکی دور اور مدنی دور کے واقعات کے تابع ظاہر کیا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی فقرات مؤلف کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں جس سے صاحب تحریر کی فکری جہت اور عمومی مزاج کا اظہار ہوتا ہے۔

" اس کتاب سے محمد صاحب کے سوانح عمری اور ان کی زندگی کے تمام واقعات مراد نہیں ہیں بلکہ یہ قرآن کے مندراج انکشاف کی تاریخ ہے۔ جس سے اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ قرآن نے کس طرح موجودہ صورت اختیار کی اور

---

1 ایڈورڈ سیل، عقائد اسلامیہ، ص ۱۳

کہاں تک آنحضرت کی اپنی ہی زندگی کے واقعات اس کی بیخ و بن ثابت ہوتے ہیں۔ اس پہلو سے قرآن پر نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن اقوام سے اسے سابقہ پڑا ان کے حق میں کس قدر حسب ضرورت رخ بدلتا رہا ہے۔ اس کے احکام کی مناسبت اس کے عذرات اور زجر و عتاب وغیرہ پر غور کرنے سے ہم صاف نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کس نادر طور سے اسلام کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختصر الہامی فقرے نازل ہوتے رہے"[1]۔

مؤلف قرآن کی ترتیب نزولی کی روشنی میں سیرت النبی کے مطالعہ کا خواہش مند ہے اس لیے وہ ترتیب توقیفی پر معترض ہے کہ یہ ازروئے تاریخ بالکل غیر حقیقی ہے[2]۔ اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا مؤلف کا سیرت النبی کا قرآنی مطالعہ ہی مقصود ہے؟ کتاب کا داخلی جائزہ اس بات کی نفی کرتا ہے بلکہ اس سوال کے تناظر میں اس بات کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے کہ دراصل اس کے پیش نظر قرآن کو واقعاتی ضرورت کا نتیجہ ظاہر کرنا رہا ہے تاکہ اس کے الہامی دعوٰی کی تکذیب کی جائے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ عہد نامہ جدید کی کتب تقریباً چار سو سال کے عرصہ دراز کے دوران کانٹ چھانٹ کے بعد محض اس بناء پر شرعی حیثیت اختیار کر گئیں کہ انہیں بزرگوں کی سند سے پایا گیا ہے[3]۔ اور قرآن کی ترتیب توقیفی جو وحی الٰہی کی روشنی میں بحکم خدا مقرر ہوئی اسے بنیاد بنا کر ثقاہت قرآن کو مشکوک بنانے والے کے پیش نظر اپنی کتابوں کی شرعی و استنادی حیثیت کی کمزوری کو چھپانے کا سوال تھا۔ اس کے پیچھے یہ ذہنی رویہ ضرور کارفرما ہوگا کہ "بہترین دفاع دراصل جارحیت سے ہی ممکن ہے"۔

مؤلف کے خیال میں آغاز میں آپ ﷺ نے نبوی جذبہ کے تحت نہیں بلکہ لوگوں اور اپنے ملک کی بھلائی کی خاطر وعظ و نصیحت شروع کی۔ اور اہل مکہ نے اپنے قدیمی رسم ورواج کے بدلنے کی بناء پر آپ کی مخالفت کی لیکن انہیں آپ سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہیں خطرہ اس وقت محسوس ہوا جب اس اندیشہ نے سر اٹھایا کہ ان کی سلطنت چھن جائے گی۔ لیکن یہاں انہوں نے عرب کے داخلی اور قبائلی رواج کو قطعاً نظر انداز کر کے ایک وہمی صورت پر تکیہ کیا ہے جس سے اس کی حیثیت بری طرح مجروح ہوتی ہے۔

ابتدائی دور کے اسلوبِ قرآن کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛

---

1 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن (مترجم): منشی محمد اسمٰعیل (پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۰۲ء)

2 ایضاً، ص ۲

3 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۰۷ "کارتھیج میں ۳۹۷ء میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور یہ کونسل ہمارے موجودہ عہد جدید کی تمام کتابوں کی فہرست دیتی ہے، اور یہ کہتی ہے" ہم نے اپنے باپ دادا سے پایا ہے کہ یہ کتابیں کلیسیا میں پڑھی جائیں"۔

" ابتدائی زمانہ کی مکی سورتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبارت نہایت شستہ، فصاحت سے پُر اور شاعرانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے"۔

جنت و دوزخ کا قرآنی تصور ان کے نزدیک حالات کے تقاضے کی مرہون تھا ۔ کیونکہ بمرور ایام جب آپ ﷺ کے ساتھیوں کو بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو ان کے مطابق،

"اب محمدؐ نے ایک نئے پیرایہ تقریر کو اختیار کیا اور انسانی طبیعت کے حیوانی وشہوانی پہلو کی طرف مائل ہوگئے چنانچہ آپ نے اپنے پست ہمت اور خستہ خاطر پیروؤں کی جماعت کی ہمت بڑھانے کے لیے بہشتی خوشیوں یعنی عروسی پلنگوں مشک وکستوری اور شراب طہور کا نقشہ کھینچ دکھایا۔۔۔ اس سے محض یہی غرض نہ تھی کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمان اپنی ہمت نہ ہاریں بلکہ کفار مخالفین کو مرعوب ومغلوب کرنا بھی بدرجہ غایت ملحوظ و متصور تھا"[1]۔

ہجرت حبشہ کے بارے پادری صاحب کے تخیل کی پرواز یہاں آکر ختم ہوتی ہے کہ،

" اگر اس کے چند سال بعد خود محمد صاحب بھی مدینہ میں نہ جارہتے تو اے بی سینا (حبشہ) میں تشریف لے جاتے اور بجائے اسلام کے کسی مسیحی بدعتی فرقہ کے بانی ہوتے"[2]۔

مصنف مدعی ہے کہ:

" اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنحضرتؐ نے کبھی بائبل کا مطالعہ کیا۔ آنحضرتؐ کے بیانات بائبل شریف سے تو کچھ مطابقت نہیں رکھتے پر یہودیوں کے ربیوں کے قصہ کہانیوں اور تذکرۃ الاولیاء سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرور آپ کی چند یہودیوں سے آشنائی اور دوستی تھی جن سے آپ نے وہ تمام سرمایہ مضامین جمع کیا جس کا آپ نے بعد میں قرآنی وحی والہام کے پیرایہ میں ذکر کیا ہے"[3]۔

- مصنف کی مکی اور مدنی سورتوں میں تفریق کرنے کی غیر حقیقی کوشش اس بناء پر ہے کہ مکی اور مدنی دور کے قرآن میں بعد المشرقین دکھلایا جاسکے۔

- مصنف مدنی دور کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ کفار مکہ، یہود مدینہ اور مفسدین، مسلمانوں اور اسلام کے خلاف معاندانہ کاروائیوں سے بری الذمہ تھے جو بھی عسکری واقعات پیش آئے وہ مصنف کے نزدیک آپ ﷺ کی ہی ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ تھے۔ عام قاری اس تاثر کو اخذ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ غیر جانبداری کی بجائے مصنف صف مخالف میں کھڑا مخالفین اسلام کے وکیل صفائی کا کردار نبھاتا محسوس ہوتا ہے۔ اور ان کے ہر غلط وناجائز فعل سے صرف نظر کرتے ہوئے ساری ذمہ داری نبی اکرم ﷺ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ رویہ جہاں اصول

---

1 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص ۲۱-۲۲

2 ایضاً، ص۔ ۳۲

3 ایضاً، ص۔ ۶۳-۶۴

تحقیق کی نفی کرتا ہے وہیں پہلے سے طے شدہ نتائج کو لفظی ہیر پھیر سے منوانے کی شعوری کوشش کا بھی پتا دیتا ہے۔ مصنف دراصل کہنا یہ چاہتا ہے کہ دنیاوی جاہ و حشمت کے طالب محمد ﷺ میں کوئی ایسی خوبی موجود نہیں تھی جس کا ذکر کیا جائے اور کوئی انسانی برائی ایسی نہیں جس کا ارتکاب مسلمانوں کے نبی نے نہ کیا ہو۔ مصنف کا یہ افسوس ناک رویہ سنجیدہ اور سلیم الفطرت طبائع کے لیے ہر گز قابل قبول نہیں۔

اعتراض برائے اعتراض مصنف کا خاصہ معلوم ہوتا ہے جس کی مثال حج کی فرضیت کے بارے طویل بیان ہے۔ یہاں بہتان والزام تراشی، تضاد بیانی، غلط بیانی اور حسد و احساس کمتری کا مشاہدہ بیک وقت کیا جاسکتا ہے؛

" ایک طرح سے حج کا قائم رکھنا اسلام کی پائیداری کا باعث معلوم ہوتا ہے لیکن جس قدر اس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اسی قدر اصلاح وبہتری کی کم امید ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستوں کی حج کی رسم کو اسلام میں داخل کرنا نہ صرف بت پرستوں کی خواہشات کے مقابلہ میں ایک کمزوری کا نشان تھا بلکہ اس سے عقل وانصاف کا بھی خون ہو گیا"[1]

شوق اعتراض میں مصنف یہ یاد نہیں رکھتے کہ چند صفحات قبل عیسائیوں سے غزوۂ تبوک کے بعد حاصل شدہ اسلامی قوت وسطوت کے بارے میں وہ تحریر کر چکے ہیں؛

" اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ تمام مخالفت اور ہر طرح کے خوف و خطر کا خاتمہ ہوا "[2]۔

نیز "یہ کہ باشندگان عرب کو دائے تابعداری کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی چنانچہ انہوں نے اطاعت قبول کر لی[3]"۔

یوں مصنف کی تضاد بیانی اور موقع بموقع بات بدلنے کی ضرورت پوری طرح آشکار ہو گئی۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جب مخالفت اور خوف و خطر کا خاتمہ ہو گیا تو پھر بت پرستوں کی خواہشات کے آگے گھٹنے ٹیکنے چہ معنی دارد؟ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی میں اس کی کوئی ادنیٰ سی نظیر نہیں مل سکتی کہ آپ ﷺ بت پرستوں کی خواہشات کو خاطر میں لائے ہوں؟ کیونکہ اسلامی رویہ تو "لا اعبد ما تعبدون" کا اعلان کرتے ہوئے "لکم دینکم ولی دین" کا علی الاعلان اظہار ہے۔ نیز اگر ان کی خواہش قبول کرتے ہوئے مداہنت کا شکار ہونا تھا تو مکہ سے ہجرت کی کیا ضرورت ٹھہری؟

فتح مکہ کا نتیجہ مصنف یوں نکالتا ہے،" اب تمام مخالفت رفع دفع ہو گئی اور کعبہ سے بت پرستی کے تمام تعلقات منقطع کیے گئے مسلمانوں کے سوا کسی کو کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ رہی"[4]۔

---

1 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص ۱۹۰

2 ایضاً، ص ۱۸۳

3 ایضاً، ص ۱۸۵

4 ایضاً، ص ۱۸۶

۹ ہجری میں فرض ہونے والے حج کو مصنف کا بت پرستوں کی خواہش کے تابع ٹھہرانا، جب کہ بت پرستی سے تمام علائق توڑ لیے گئے تھے، سراسر حقائق کی نفی ہے اور انہیں توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی شعوری کاوش اور تلبیس و تدلیس کی واضح مثال ہے۔ مزید بر آں عقل و انصاف کے خون کی بھی کوئی وضاحت پیش نہیں کی گئی۔ اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ حج کیونکر اصلاح و بہتری میں روکاٹ ہے۔ دراصل حج مسلمانوں میں ابراہیمی یادگار کے طور پر باقی ہے۔ مسیحیت نے خود تو یہودیت کی ضد میں دین ابراہیمی سے تمام علائق توڑ لیے اس لیے مسیحی مناد اس بات کے روادار نظر نہیں آتے کہ ابراہیم کے دین کی کسی نشانی کو اسلام میں باقی دیکھ سکیں۔ اگر حج کا رکن اسلام میں باقی نہ ہوتا تو یہی لوگ مسلمانوں پر دوسرے رنگ میں معترض ہوتے اور یہ طعنہ دیتے کہ اسلام کا دین ابراہیمی سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ دین توحید، اسلام تو خدا کے تین اقانیم کو برداشت کرنے کا روادار نہیں ۳۶۰ بتوں کے پجاری ذہن کی خواہش کو کیونکر برداشت کر سکتا ہے۔ پادری صاحب کا یہ قول اپنی بات کی آپ تردید کرنے کی بڑی عمدہ مثال ہے۔

عالمگیریت اور اتحاد امت کے حج جیسے عظیم مظاہرہ کے مقابل عیسائیت ایسے کسی شعار سے تہی دامن ہے۔ حج پر معترض ہوتے وقت مصنف مسیحی ذہن کے اس احساس کمتری کو چھپانے سے قاصر رہا ہے۔ اس کا معاندانہ رویہ اس وقت مزید نمایاں ہو جاتا ہے جب وہ حج کی اثر انگیزی کے خلاف زبان کھولتا ہے۔

> " اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اسلام میں ہر طرح کی بہتری اور اصلاح کا روکنے والا حج ہی ہے۔ اور اسلام میں اصلاح تو ہو سکتی ہے جب کہ اہل اسلام اصلاح کی خواہش کو ظاہر کریں۔ پر حج کی دوامی قید سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ برخلاف اس کے یہ ماننا پڑتا ہے کہ حج کی مداومت سے مسلمان متعصب اور دن بدن اپنے عقائد پر زیادہ پختہ ہوتے جاتے ہیں"[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ حج تعصب پیدا نہیں کرتا بلکہ ختم کرتا ہے۔ امریکی نو مسلم جیفرے لینگ امریکی سفید فام باشندوں کو مخاطب کر کے اپنے حج کا تبصرہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے؛

> " وہ (امریکی) یقیناً تسلیم کر لیتے کہ ملت واحدۃ انسانیۃ کیا ہے اور پھر رنگ و نسل کے فرق کی بنیاد پر دوسروں کی قدر و قیمت تعین کرنا چھوڑ دیتے اور دوسروں کو تکلیفیں بھی نہ پہنچاتے"[2]۔

جس وقت پادری صاحب حج کو باعث تعصب گردان رہے تھے انہی ایام میں خود ان کے وطن میں نسلی تعصب کی بناء پر سفید فاموں کے لیے مختص گرجوں میں سیاہ فام مسیحی قدم نہیں رکھ سکتے تھے اور سفید فام کے گرجے میں

---

1 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص ۱۸۹

2 جیفرے لینگ، سر تسلیم خم ہے (مترجم: ڈاکٹر تصدق حسین راجا) الصدیق پبلشرز، اسلام آباد ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۳

تفاوت مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جب کہ ابتداء سے ہی حج میں یہ فرق روا نہیں رکھا گیا جہاں ایک بادشاہ ادائیگی حج کر رہا ہے وہیں ایک مفلوک الحال دوسری نسل کا عام مسلمان حج کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ مساوات کا یہ مظاہرہ تعصب کو ہر ممکنہ حد تک ختم کر دیتا ہے۔ اور اگر آدمی کے ذہن سے یہ تفاوت دور نہ ہو تو مسلمان برادری کے ہاں یہ لائق قبول نہیں۔ اس سلسلے میں جبلہ بن ایہم کی مثال کافی ہے[1]۔ پادری صاحب کا انسداد تعصب کے بڑے ذریعے کو باعث تعصب گردانناان کی اپنی کم مذہبی کی اور احساس کمتری کا اظہار ہے۔

اپنے مذہب پر پختگی کی تعلیم ہر مذہب میں پائی جاتی ہے خود بائبل بھی اپنے پیروکاروں سے اسی کی متقاضی ہے[2]۔ کیا مسیحی اپنے ایمان میں عدم پختگی کا الزام برداشت کریں گے؟ مذکورہ بالا پیرے میں پختگی عقائد پر شکوہ کے حوالے سے مصنف کے دلائل کی وقعت کارطفلاں سے زیادہ قدر وقیمت کی حامل نہیں۔ نیز پادری صاحب کوئی نہ کوئی اعتراض کرنے کے شوق میں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ بات کی زد کہاں پڑے گی۔ کیا خود پادری صاحب اپنے مذہب میں پختہ نہیں تھے؟ ان تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ مخاطب فریق کے جذبات اوراس کا واجب انسانی احترام مؤلف کے نزدیک ثانوی حیثیت کا حامل بھی نہیں تھا۔ بائبل اور کلیسا کی تاریخ سے دوسروں کو لاعلم تصور کرنے والے پادری صاحب کا یہ "مسلمان متعصب" کا نرالا فرمان اپنے ہم قوم مذہبی تاجر مجاہدوں کے انسانیت سوز جرائم کی پردہ داری کی ناکام کوشش ہے۔ ایک جگہ لکھا گیا ہے،

" آنحضرت نے اپنے مومنین کو صلح وسلامتی کا ایک حرف میراث میں نہ دیا بلکہ ان میں کشت وخون کی ایسی پھونک مار گئے کہ اس سے ان کے دلوں میں مذہبی دیوانگی کی روح ہمیشہ قائم رہتی ہے "[3]۔

مصنف بڑی نکتہ رسائی سے رسالت مآب ﷺ کو جاہ مال اور دنیاوی قوت وطاقت کی حریص مکہ کی ایک معمولی شخصیت کے رنگ میں دکھلانا چاہتا ہے جس نے اپنی مسلسل کوشش سے مدینہ میں آکر ایک حکمران کا مقام حاصل کر لیا۔ اور (نعوذ باللہ) اس کے لیے نبوت کا ڈھونگ رچانے کی منصوبہ بندی کی۔ وہ آپ کے ہر کام اور کوشش کو باقاعدہ پیشگی منصوبہ بندی کا حصہ ٹھہراتا ہے۔ ساری کتاب اس مقصد کے حصول لیے آپ ﷺ کے ہر فعل کو سوچا سمجھا ٹھہراتی ہے اور حالات کے تحت نئے حکم گھڑنے کے الزام سے پُر ہے۔

پادری صاحب اپنی بات منوانے کے لیے دلائل کی بجائے الزامات کی بھرمار سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ پوری کتاب میں مصنف کی شعوری کوشش یہی رہی ہے کہ حصول طاقت کے ساتھ ہی آپ ﷺ کے رویہ کو بتدریج درشت

---

1 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص۱۸۹

2 استثناء۶: ۶

3 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص۱۸۷

ہوتا دکھلایا جائے۔ اور یہی اس کتاب کا ماحصل ہے۔

ڈاکٹر سیل نے اسے ۱۹۰۹ء میں مدراس سے بھی شائع کروایا۔ اس قسم کی کتابوں کی بار بار اشاعت فریقین میں صلح و آشتی کی بجائے مذہبی کے ساتھ ساتھ معاشرتی دوری کا سبب بنتی رہی۔

پادری برکت اللہ توضیح البیان فی اصول القرآن

پنجاب ریلجئس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۳۹ء

صفحات: ۶۹

کتاب میں ترتیب مضامین درج ذیل ہے۔

فصل اول حضرت محمد صرف قوم عرب کے رسول تھے۔

فصل دوم تصور خدا

فصل سوم اصول اخوت

فصل چہارم اصول مساوات

فصل پنجم اصول عبادت

فصل ششم اصول شریعت

فصل ہفتم قرآن غیر مکمل کتاب ہے

آخری بحث "قرآن بائبل کا محتاج ہے" کے عنوان پر ہے۔

پادری صاحب نے اسلامی اصولوں کی عدم عالمگیریت ثابت کرنے کے لیے اس عزم سے قلم اٹھایا ہے کہ؛

" اس مختصر رسالہ میں ہم فقط اسلامی اصول پر ہی بحث کرنے پر اکتفا کریں گے اور ان شاء اللہ یہ ثابت کریں گے کہ اسلامی اصول دین بذات خود غیر مکمل اور ناقص ہیں اور عالمگیر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم اپنے استدلال کی بناء قرآن اور صرف قرآن پر ہی رکھیں گے تاکہ برادران اسلام پر اتمام حجت ہو جائے اور کسی فرقہ کو مجال انکار نہ ہو"[1]۔

سب سے پہلے نبوت محمدیہ کو صرف عرب تک ہی حصر کرنے پر زور دیتے ہوئے سورۃ شعراء آیت ۲۱۴، سورۃ شوریٰ آیت ا، سورۃ انعام آیت ۱۱ اور زخرف آیت ا پیش کی گئی ہیں کیونکہ ان میں مخاطبین عرب اور اہل مکہ تھے۔ مصنف کے نزدیک اہل کتاب کو مخاطب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب انہیں معتبر گردانتے تھے اور آنحضرت ؐ نے بھی قرآن کو بائبل کا مصدق اور اس کی تفصیل قرار دیا ہے۔

---

1 برکت اللہ، پادری، توضیح البیان فی اصول القرآن (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۳۹ء)، ص ۲

"اور آنحضرت نے کفار کو کہا کہ تمہارے دلوں میں یہود و نصاریٰ کی کتب کا وقار ہے پس قرآن کو مان لو کیونکہ یہ قرآن اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں موجود ہے کیا اہل مکہ کے لیے (اس کی صداقت کی دلیل) یہ کافی نہیں کہ اس قرآن کے مضامین) سے علماء بنی اسرائیل واقف ہیں۔ یونس: ۳۸؛ طہ ع ۸ ؛ شعراء ع ۱۱؛ بقرہ ع ۲۶؛ حدید ع ۱۱؛ یوسف ع ۱۲؛ بقرہ ع ۱۲؛ انعام ع ۱۱، ۱۹؛ مائدہ ع ۷، ۹، ۱۰؛ نساء ع ۷؛ بقرہ ع ۵، ۱۱؛ مومن ع ۶ "[1]۔

اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ

" پس مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت کا پیغام اہل عرب تک محدود تھا۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ جس طرح اہل یہود و نصاریٰ شرک اور بت پرستی کو ترک کرکے ابراہیم خلیل اللہ کے مذہب کے پیرو ہیں، اسی طرح آپ کے ہم عصر کفار عرب بھی بت پرستی اور شرک سے منہ موڑ کر خدا کی توحید پر ایمان لائیں"[2]۔

فاضل مؤلف نے بطور استشہاد مستشرق ایف بہل کا خیال نقل کیا ہے کہ " ابتداء میں اسلام کا ہرگز منشاء یہ نہ تھا کہ غیر عرب کو اپنا حلقہ بگوش کرے"[3]۔

قاری یہ بات محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ پادری صاحب خود یسوع علیہ السلام کی "اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں "کی تخصیص کو تاویلات سے عموم میں بدل لیتے ہیں[4]۔ مگر یہاں قرآن کے طرز تخاطب "یا ایہا الناس "کے عموم کو یک سر نظر انداز کر گئے ہیں۔ اور اس پر ایک حرف بھی نہیں لکھتے۔

تصور خدا کے بارے مسیحی اور اسلامی تعلیمات کا تقابل کرتے بزعم خویش یہ نتیجہ نکالا گیا ہے؛

" پس اسلامی تصور (خدا) موجودہ نسل کے لیے ناقص ہے لیکن مسیحی تصور خدا ایک کامل تصور ہے جو تمام اقوام ممالک وازمنہ کے لوگوں کے لیے بشارت کا باعث رہا ہے"[5]۔

یہاں پادری صاحب یہ تاریخی نقطہ فراموش کر گئے کہ اس "کامل مسیحی تصور خدا" کو تشکیل دینے اور منوانے کے لیے کلیساء کو صدیاں لگیں اور جبر سے کام الگ سے لینا پڑا۔

اصول اخوت کے عنوان کے تحت یہ بیان داغا گیا ہے کہ

" قرآن انسانی اخوت کو محدود کر کے لاتعداد انسانوں کو اخوت کے دائرہ سے خارج کر دیتا ہے۔ اور ان خارج شدگان کی

---

1 برکت اللہ، توضیح البیان فی اصول القرآن، ص ۶

2 ایضاً، ص ۶

3 ایضاً، ۸

4 متی ۱۰: ۵؛ ۱۵: ۲۴

5 برکت اللہ، توضیح البیان فی اصول القرآن، ص ۱۳

نسبت حکم دیتا ہے کہ (اے مسلمانوں) ان کو یہاں تک قتل کرو کہ فتنہ (یعنی غلبہ کفر) نہ رہے"[1]۔

جہاد سے متعلقہ آیات کے سیاق و سباق سے ہٹ کر اور خاص کو عموم بنا کر آیت کے ایک جزء سے استدلال کرنا مسیحی اہل قلم کا خاص وصف ہے۔ اور قرآنی تعلیمات کے بارے غیر سنجیدہ رویے کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مزید بر آں اسلامی نظریہ قرآن کو تاریخی حوالے سے مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جسے احکام قرآنی کو ان کے صحیح تناظر سے ہٹا کر من مانے نتائج اخذ کرنے کی کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اصول مساوات کے عنوان کے تحت پادری صاحب کو قرآن میں مساوات کے کوئی اصول دکھائی نہیں دیتے بلکہ غلامی، تقوی اور عورتوں کے بارے قرآنی تعلیمات کا یوں جائزہ لیا گیا ہے کہ اسلام مساوات سے تہی دامن نظر آئے۔[2] تاریخ میں غلاموں اور عورتوں کو پہلی دفعہ قعر مذلت سے نکال کر انسانوں کی صف میں کھڑے کرنے والے دین اسلام کے بارے پادری صاحب کا یہ تجزیہ ان کی قلت فہم قرآن کا غماز اور ان کے سامنے مخصوص ہدف کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ اگر قرآنی تعلیمات کے بالمقابل بائبل میں غلامی، پارسائی اور عورتوں کے بارے تعلیمات کو مد نظر رکھتے تو لازماً اس سے مختلف نتیجہ پر پہنچتے۔ نیز اگر وہ مسیحی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیتے تو ان کے علم میں یہ بات آجاتی کہ کفار کو تو چھوڑیے خود ان کے اپنے ہم مذہب مسیحیوں سے اصلاح عقیدہ کے نام پر ارباب کلیسیا نے جو "اصول اخوت" اپنایا اس کے ذکر سے ہی انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ خود پادری صاحب اپنی دوسری تصنیف سلطنت مغلیہ اور مسیحیت میں اسے کلیساء کی تاریخ پر بد نما دھبہ قرار دیتے ہیں[3]۔

اصول شریعت کے تحت چھ صفحات پر محیط نقد میں قرآنی عائلی احکامات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور خصوصاً طلاق کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلام میں عورت خاوند کی غلامی سے سوائے ترک مذہب کے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی۔ " لیکن اب اہل اسلام نے شور و غل مچا کر حکومت ہند سے قانون پاس کروا کر عورت کے لیے یہ راہ فرار بھی بند کروادی ہے"[4]۔

پادری صاحب بعض مسلم علماء کے درمیان عورت کے ترک اسلام سے عائلی قوانین کی نئی صورت حال پر ہونے والی نزاعی بحث سے اپنے پسندیدہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ دراصل ان مسلم علماء کے مابین عائلی قوانین پر بحث کا ایک خاص پس منظر تھا۔ استعماری اثرات کے نتیجہ میں اٹھنے والی جدت پسندی کی لہر کی لپیٹ میں کئی مسلمان علماء آ

---

1 برکت اللہ، توضیح البیان فی اصول القرآن، ۱۴

2 ایضاً، ص ۲۵۔۳۵

3 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۷۷

4 برکت اللہ، توضیح البیان فی اصول القرآن، ص ۵۰

گئے۔ قدامت پسند اور ان جدت پسند علماء کے مابین کئی امور پر نزاعی بحث چھڑ گئی۔ عائلی حوالے سے چھڑی بحث میں طرفین کے کمزور پہلوؤں سے نتیجہ اخذ کر کے پادری صاحب مفید مطلب نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ اس بحث کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

" پس روشن خیال مسلمان ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں کہ قرآنی شرائع ملک و قوم عرب سے مختص ہیں اور ان کا اطلاق دنیا کے دیگر ممالک پر نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر قرآنی احکام اور اسلامی شریعت میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت ہے "[1]۔

تحلیل عقد پر وارد اعتراضات خود انجیل پر بھی منطبق ہوتے ہیں اسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا[2]۔

ساتویں فصل میں قرآن حکیم کے متعلق قلم اٹھاتے ہوئے پادری صاحب اس بات کے مدعی ہیں کہ قرآن ایک غیر مکمل کتاب ہے۔ اور یہ غیر از قرآن کی محتاج ہے۔ اس بحث میں پادری صاحب فکری اعتبار سے افراط و تفریط کا شکار دو مسلم گروہوں (اہل قرآن و اہل حدیث) کی آپس کی علمی چشمک، فکری اختلاف و مسلکی حمیت کا مظاہرہ کرنے والی تحریروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علماء کی اس صف میں مولانا ثناء اللہ امر تسری، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولوی احمد اللہ امر تسری، مولوی عبداللہ چکڑالوی، سر سید احمد خاں اور نواب محسن الملک نظر آتے ہیں۔ " قرآن کو مکمل کتاب ماننے والے " ان فضلاء کی تحریروں سے پادری صاحب یہ کشید کرنا چاہ رہے ہیں کہ قرآن ایک غیر مکمل کتاب ہے۔ مسلکی حمیت میں گھرے گروہوں کی بعض تاویلات سے جنہیں خود کبھی اہل اسلام میں پذیرائی نہیں ملی، پادری صاحب کا یوں استنباط کرنا کچھ دوسرے مقاصد کی پردہ دری کرتا ہے۔ اگر ان علماء کے قلم سے کوئی ایسی تحریریں نکلی ہیں جو علمی معیار اور قرآنی مضامین پر پورا نہیں اتر سکیں تو ان سے یہ نتیجہ کشید کرنا کہ خود قرآن غیر مکمل کتاب ہے، ایسی کاوش ہے جسے تلبیس کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ مستشرقین، عقل پرست ملحدانہ افکار کے حامل افراد کے اٹھائے ہوئے بعض فلسفیانہ سوالات کے جواب دینے کی ضرورت نے مسلم علماء سے کہیں کہیں کمزور یا رکیک باتیں کہلوا دیں۔ (مثلاً سر سید کا معاد، معجزوں اور ملائکہ کے بارے مختلف فیہ آراء) پادری صاحب کو ان فلسفیانہ اصولوں کا جائزہ بھی لے لینا چاہیے تھا تا کہ خود ان کی حقیقت بھی عیاں ہو جاتی۔ مگر انہوں نے علمی لغزشوں کو اصول بنا کر یا نتیجہ قرار دے کر اس سے قرآن پر حملہ آور ہونے کی راہ نکالی ہے اور پھر اسے عین تحقیقی تقاضا قرار دیا ہے۔

---

1 برکت اللہ، توضیح البیان فی اصول القرآن، ص ۵۵

2 متی ۱۹: ۱۔۱۲

پادری جی ایل ٹھاکر داس انجیل یا قرآن

کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لدھیانہ ۱۹۱۰ء

صفحات: ۱۸۴

کتاب مذکور مسیحی نقطہ نظر سے عقائد، تعلیمات اور احکام کے حوالے سے قرآن اور انجیل کے تقابلی جائزہ پر مشتمل ہے۔ بقول مصنف؛

" جس میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ انسان کے ایمان اور عمل پر (قرآن اور انجیل میں سے) کون سی کتاب حکم رکھتی ہے" [1]۔

کتاب تمہید اور پانچ مقدمات پر محتوی ہے۔ تمہید میں انجیل کی الہامی حیثیت اور قرآن کی تائیدی شہادت کی بابت بحث کی گئی ہے۔ بعد ازاں دین اسلام کا پس منظر واضح کرنے کی غرض سے پہلے مقدمہ میں قبل از اسلام عربوں کے دینی اور تمدنی حالات ذکر کیے گئے جن میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے نشو و نما پائی۔ اصل میں مصنف یہاں اپنے ایک دعویٰ کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے کہ قرآن اس دور کے انسانی خیالات کی تاثیر سے پاک نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قرآن کلام الٰہی نہیں ہے۔ مصنف کے اس اصول پر اگر بائبل کو پرکھا جائے تو اس میں انسانی خیالات کی آمیزش ماننے کے باوجود مسیحی اسے کلام الٰہی قرار دیتے نہیں تھکتے [2]۔

دوسرے مقدمہ میں قرآن کے سابقہ انبیاء حضرت آدم، ابراہیم، سلیمان، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے تاریخی قصص اس حوالے سے بیان کیے گئے ہیں کہ یہ توریت و انجیل میں مذکور قصص کے نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں میں مروج غیر الہامی روایات سے متشابہ ہیں۔

تیسرا مقدمہ خدا اور اس کی صفات کے بارے قرآنی اور انجیلی بیانات کے فرق پر مشتمل ہے۔

جبکہ چوتھے مقدمہ میں اسلام اور مسیحیت کے تصور نجات پر تقابلی بحث کی گئی ہے۔

پانچواں اور آخری مقدمہ اخلاقی شریعت کے بیان کے بارے ہے اس میں تین فہرستوں میں نیکی کے کاموں کا اس انداز میں ذکر کیا گیا ہے کہ انجیلی تعلیمات اعلیٰ و ارفع اور عقلی اعتبار سے قرآن سے بالاتر نظر آئیں۔ اور یہ کہ قرآن کا ان اخلاقی کاموں کے بارے رویہ مہذبانہ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک عام قاری بھی با آسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ مصنف اپنے دعویٰ کے اثبات میں مکمل طور پر ناکام ہوا ہے۔

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، سرورق

2 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۶۴ "کتب مقدسہ میں انسانی و الٰہی دونوں اجزا پائے جاتے ہیں"۔

اہل اسلام کے ہاں جو تعلق قرآن اور صاحب قرآن میں ہے وہ مروجہ مسیحیت میں حضرت عیسیٰ اور متداول انجیل میں نہیں دکھلایا جاسکتا۔ مسیحیت کی اس بنیادی کمزوری کو چھپانے اور اعتراض سے بچنے کے لیے پادری صاحب اس کا کوئی جواز پیش کرنے کی بجائے قرآن اور پیغمبر اسلام کے زمانی اور فعلی تعلق پر معترض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مسلم علماء نے کبھی بھی مسیحیت کی اس کمی پر انگشت نمائی نہیں کی۔ جو خوبی کسی متلاشی حق کو اسلام کے سمجھنے میں سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے اسی کو عیب ٹھہرا کر حکم لگادینا مسیحی اہل قلم کی اخلاقی کمزوری کی دلیل ہے نہ کہ ان کے مؤقف کی قوت کا باعث۔ اس کمزوری کو چھپانے کے لیے اکثر مسیحی اہل قلم کی جانب سے بلند آہنگ دعاوی کیے جاتے ہیں۔ اس کی نہایت اعلیٰ مثال پادری صاحب کے ان الفاظ میں ملتی ہے؛

"خداوند یسوع مسیح کی اپنی زندگی کی تواریخ بھی انسانی روایتوں کے بس میں نہ چھوڑی گئی تھی بلکہ چشم دید گواہوں نے روح القدس کی تاثیر سے اس کو قلم بند کیا"[1]۔

پہلی نظر ہی میں اہل علم پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پادری صاحب کے اس بیان کی تائید کلیسا کی تاریخ سے ہرگز نہیں ہوتی۔ عہد نامہ جدید کے منصہ شہود پر آنے کے معاملات پادری صاحب کے دعاوی کو قطعاً سہارا نہیں دیتے۔ انجیل لوقا کی پہلی اور انجیل یوحنا کی آخری سطور پادری صاحب کے مؤقف کی مکمل نفی اور مسلم نقطہ نظر سے کیے جانے والے اعتراضات کے محکم ہونے پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہیں[2]۔

چونکہ مروجہ اناجیل وحی کی حفاظت کے قرآنی معیار کی رفعت کو چھونے سے قاصر ہیں۔ مسلم آبادی سے واسطہ پڑنے والے عیسائی معتقدین کو تسلی و تشفی کی ضرورت نے مسیحی منادین کے اس قسم کے دعاوی کو جنم دیا تاکہ بائبل کے متعلق مؤقف کی کمزوریاں اور نقائص چھپا سکیں۔ اس تناظر میں مسیحی اہل قلم کی قرآن اور صاحب قرآن پر ہر صورت معترض ہونے کی شدید ضرورت دین کی بجائے سیاسی، سماجی اور تمدنی زیادہ ٹھہرتی ہے۔ مصنف تعلّی سے جس بات کو منوانے کا خواہاں ہے حقائق اس کی بخوبی نفی کرتے ہیں اور یسوع کی زندگی کی تواریخ انسانی روایتوں پر ہی حصر کرتی دکھائی دیتی ہیں جس سے مفر نہیں۔ مسیحی مبشرین کی قرآن پر حملہ آور ہونے کی ایک عمومی ضرورت ہر

---

1 ٹھاکرداس، انجیل یا قرآن، ص۸

2 (چونکہ بہتوں نے اس پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے ان کو ہم تک پہنچایا اس لیے اے معزز تھیفلس! میں نے مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے ان کو تیرے لیے ترتیب سے لکھوں) لوقا ۱: ۱۔۳؛
(وہی شاگرد ہے جو ان باتوں کی گواہی دیتا ہے اور جس نے ان کو لکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی گواہی سچی ہے اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کے لیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی) یوحنا ۲۱: ۲۴۔۲۵

جگہ نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ جن اقوام نے اس سے قبل مسیحیت کی آغوش میں پناہ لی تھی ان میں سے چند ایک کے پاس اگر چہ اپنا تہذیبی ورثہ موجود تھا مگر وحی کی روشنی سے محروم تھا۔ اس لئے وہ بآسانی مسیحیت میں جذب ہو گئے (اصل بات یہ ہے کہ یونانی تہذیب و فلسفہ نے مسیحیت کو اصل مرکز سے ہٹا کر نئی نہج پر ڈال دیا تھا اور ان کے مشرکانہ تہذیبی ورثے نے مسیحیت پر ہمہ گیر مستقل اثرات چھوڑے جنہیں بعد میں مستقل مذہبی استناد حاصل ہو گیا) مگر برصغیر میں معاملہ یکسر مختلف تھا۔ تاریخ میں "اکال الامم" سے ملقب ہندوستان میں ہندومت اپنے مقابلہ پر آنے والے ہر نظریہ کو نگل جانے کی تاریخ رکھتا تھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں رام اور رحیم کو ایک جاننے جیسی کئی تحریکوں کے باوجود اسلام ایک ہزار سال تک اپنی سخت جانی ثابت کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں مسلمان قوم مسیحی مبشرین کے لیے پتھریلا میدان ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ علمی دلائل میں ان کا ہر لحاظ سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسی ضرورت نے مسیحی منادوں کا رخ ٹھوس علمی و عقلی دلائل سے موڑ کر سوقیانہ اور رکیک حملوں کی طرف کر دیا۔ اثرات کے اعتبار سے یہ رویہ کسی صورت بھی قابل ستائش نتیجہ کا حامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات استعماری دور کے خاتمے کے باوجود اب تک دیکھنے میں آتے ہیں۔

مسلم نقطہ نظر سے اس پر یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ پادری صاحب کے مذکورہ کسی چشم دید گواہوں کی یسوع کے ساتھ کوئی ایک ملاقات بھی ثابت نہیں چہ جائے کہ وہ یسوع کی پوری زندگی کے شاہد ہوں۔ بلکہ یہ مزعومہ انجیل نویس بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود اناجیل بھی اس بات کی ہرگز مدعی نہیں کہ انہوں نے یسوع کی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہے[1]۔ چنانچہ پادری صاحب کے اس دعویٰ کی کوئی دلیل دستیاب نہیں کہ یسوع مسیح کی زندگی کی تواریخ انسانی روایتوں کے بس میں نہیں چھوڑی گئی بلکہ معاملہ قطعاً اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ پادری فانڈر صاحب کا متذکرہ اعتراف ہمارے مؤقف کی بھرپور تائید کرتا ہے۔ یوں پادری صاحب کے اس دعویٰ کی حیثیت محض قاری کو مرعوب کرنے کو سوا اور کچھ نہیں رہتی۔

مصنف کا منہج یہ ہے کہ وارد شدہ اعتراض کو ہی اپنا دعویٰ بنا کر پیش کرتا ہے پھر اسے ہی دلیل بنا لیتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۸ پر موسیٰ علیہ السلام کے خود تورات لکھنے کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ مسلم نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں۔ لیکن وہ اس کا ثبوت بہم پہنچانے کی بجائے پہلے اس کا بغیر دلیل دعویٰ کرتے ہیں پھر اسی کو بنیاد بنا کر اس سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کی دوسری مثال مذکورہ بالا دعویٰ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ،

" یسوع مسیح کی اپنی زندگی کی تواریخ بھی انسانی روایتوں کے بس میں نہیں چھوڑی گئی بلکہ چشم دید گواہوں روح القدس کی تاثیر

---

1 یوحنا ۲۱: ۲۵

سے اس کو قلم بند کیا"[1]۔

اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی بلکہ اسی دعویٰ کو ہی بطور دلیل ذکر کیا گیا ہے۔

پادری صاحب لکھتے ہیں، "عرب اجنبی معلموں کو گرفتار کر کے اپنے لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھلانے کی شرط پر انہیں آزاد کرنے کا وعدہ کرتے تھے"[2]۔

یہاں پادری صاحب نے اہل اسلام کی ایک خوبی کو اہل عرب سے منسوب کرنا چاہا ہے۔ قاری یہاں پر ان کے محتاط رویے کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام کی توصیف کسی بھی طور ان کے قلم سے نکلنے نہ پائے۔ مصنف جنگ بدر کے قیدیوں کی مشروط رہائی کے نادر واقعہ کو عمومی اصول بنا کر استشہاد کرتے ہیں جب کہ تاریخی حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔

مصنف رقم طراز ہے؛

" عرب میں یہودی مذہب اور اس کی قدیم روایتوں اور مسیح کی انتظاری کا ایسا چرچا تھا اور ایسی رونق تھی جن کے درمیان محمد صاحب پیدا ہوئے اور بڑھے اور وہ سبق سیکھے جو قرآن کی تقریروں میں پیش کیے گئے ہیں"[3]۔

مصنف کے مدنظر یہاں قاری کے ذہن میں دو باتیں ڈالنے کی کوشش ہے۔

۔ یہود اس وقت ایک نجات دہندہ مسیح کے منتظر تھے۔ آپ ﷺ نے حالات سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اپنے آپ کو اس نجات دہندہ کے طور پر پیش کر دیا۔

۔ قرآن اس دور کے انسانی خیالات کی تاثیر سے پاک نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قرآن کلام الٰہی نہیں ہے۔

یہ پادری صاحب کی غلط بیانی اور الزام تراشی کی واضح مثال ہے۔ عرب میں مسیحیت کی موجودگی کی وجہ سے وہ لوگ مسیحی اقوام سے واقف تھے اور انہیں مسیح ناصری کی آمد کا حال بھی معلوم تھا۔ مصنف نے التباس سے کام لیتے ہوئے یہود کے نئے نبی کے انتظار کو مسیح پر چسپاں کر دیا۔ نیز خود رسول اللہ ﷺ بھی کبھی مسیح ہونے کے مدعی نہیں ہوئے۔ اگر وہ ایسا دعویٰ کرتے تو مسیحی بلا تامل انہیں جھٹلا دیتے کہ وہ نبی تو ناصریہ میں تشریف لا چکے ہیں۔

یہ الزام کہ قرآن انسانی خیالات کی تاثیر سے پاک نہیں کا جائزہ اگلے صفحات میں لیا جائے گا۔ سر دست صرف یہ کہنا ہے کہ یہی بات وہ انجیل میں تسلیم کرنے کے باوجود اسے کلام الٰہی تصور کرتے ہیں۔ پادری فانڈر صاحب مسلمانوں کو "بن مانگا" مشورہ دیتے ہیں کہ

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص۸

2 ایضاً، ص۱۴

3 ایضاً، ص۱۵

"اگر وہ [مسلمان] یوں کہیں کہ قرآن محمد صاحب کی تصنیف ہے توان کا مقدمہ زیادہ مضبوط ہو۔ دراصل اس قسم کے امتیازی اصول صرف قرآن کے لئے ہی وضع کیے جاتے ہیں"۔

یہ مشورہ اس لیے دیا گیا کہ قرآن کے از اول تا آخر حرف بحرف الہامی ہونے کے ٹھوس مسلم عقیدے میں کوئی لچک پیدا کی جائے اور پھر اسے الہامی سے انسانی کلام کی سطح پر لا کر دیگر انسانی کلاموں جیسا گردانا جاسکے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلقہ قرآنی بیانات کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ جعلی انجیلوں سے لیے گئے ہیں[1]۔ حالانکہ بعض قصص کی متداول مسیحی اناجیل سے تائید ہوتی ہے۔ مروجہ مسیحیت سے مخالف نقطہ نظر رکھنے اور عرصہ دراز تک کلیسا میں متداول رہنے والی ان تحریروں کو جعلی قرار دینا مسیحی مصنفین کی مذہبی مجبوری ہے۔ تین چار صدیاں متداول رہنے کے بعد اگر کلیسائی کونسلوں میں رد کرنے کی بجائے انہیں منتخب کر لیا جاتا تو ہمارے ہاتھوں میں موجود اناجیل جعلی کے درجہ میں ٹھہرتیں۔

پادری صاحب یسوع کے ہاتھوں جزوی نسخ کا اقرار بڑی سادگی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

" ایسی باتیں جو مذہبی لڑکپن کی تجویزیں اور اصل عبارت کا کوئی جزو نہیں ہیں یسوع مسیح نے بند کر دیں "[2]

اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ محمد ﷺ قربانیوں کے عارضی ہونے اور بند ہو جانے کی بابت کتب انبیاء اور انجیل کی خبر سے بالکل بے خبر رہے[3]"۔

مسیحی اہل قلم نسخ کے اصولی ہونے کا تو اقرار کرتے ہیں لیکن جب قرآن میں نسخ کی بات کی جاتی ہے تو نسخ کو خدا کی بھول کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

مصنف یہ الزام عائد کرتا ہے کہ؛

" جب مشرکین مکہ نے قرآن کو وحی کی حیثیت نہ دی اور اسے "یعلمہ البشر" کا مقام دیا بلکہ ساتھ یہ بھی کہ "وقالوا اساطیر الاولین اکتبھا " کہہ کر محمد صاحب کے دعویٰ کے قائل نہ ہوئے۔ آخر تلوار کے زور سے انہیں منوایا گیا تھا[4]"

مصنف کا تلوار کے زور سے جبراً منوانے کا یہ الزام بے بنیاد اور خلاف حقائق ہے۔ تاریخ اسلام کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ پادری صاحب کا قلم یہاں کس حد تک انصاف سے ہٹ گیا ہے۔ یہ الزام عائد کرتے وقت

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۱۶

2 ایضاً، ص ۱۳۴

3 ایضاً، ص ۱۴

4 ایضاً، ص ۲۰

پادری صاحب کلیسا کی تاریخ یکسر فراموش کر گئے ہیں جہاں "جذبہ کروسیڈز" اور "مذہبی تطہیر" کے باب میں رقم تلوار اور جبر کی "فتوحات" کے سامنے تمام تبشیری "سنہلے اصول"* دم توڑ جاتے ہیں۔

ایمان بالرسالت کے مسلم عقیدہ پر یوں لب کشائی کی گئی ہے۔

"قرآن میں یہ بات ضرور پائی جاتی ہے کہ خدا ہی اکیلا معبود ماننا چاہیے۔ مگر یہ بھی تاکیداً پایا جاتا ہے کہ جیسی اطاعت اللہ کی کرو ویسی رسول کی بھی کرنی چاہیے اور جیسے اللہ پر ایمان لاؤ ویسے محمد اس کے رسول پر بھی ایمان لانا چاہیے"۔

چند سطور کے بعد مزید لکھتے ہیں؛

"محمد نے خداوند مسیح کی شان گھٹانے کی غرض سے یوں تصفیہ کیا کہ ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل یعنی نہیں مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول تحقیق گذرے ہیں اس سے پہلے رسول، تو پھر اس طور سے اپنے رسول ہونے کو خدا کی عبادت والی شان کی برابری میں کیوں رکھا"[1]۔

مسلم عقیدے کے مطابق عبادت صرف اور صرف خدائے واحد اللہ تعالیٰ کی جاتی ہے اور ایمان بالرسالت کے تحت رسول کی اطاعت ہوتی ہے نہ کہ اس کی عبادت۔ پادری صاحب یہاں اطاعت کو عبادت کا ہم معنی قرار دینے کا التباس کر رہے ہیں۔ پادری صاحب الوہیت مسیح کی بابت قرآنی نصوص کو مسیح کی شان گھٹانے والی قرار دیتے ہیں۔ اگر مسیح کی شان واقعتاً وہی تھی جو ان کے پیروکاروں کے ہاں متصور کی جاتی ہے تو بہت بہتر ہوتا کہ وہ اپنی بات کی سند فرامین یسوع سے لاتے تاکہ آشکار ہو جاتا کہ قرآنی بیان ان سے متصادم ہیں۔ پادری صاحب کی یہ الزام تراشی محض قاری کی توجہ ہٹانے کے لیے ہے اور ان کی یہ دہائی اقوال مسیح کی عدم موجودگی اور دلائل کے عنقا ہونے کی بنا پر ہے۔ شان مسیح عطیہ خداوندی ہے نہ کہ کونسلوں کے فیصلہ کی محتاج۔

علاوہ ازیں حاشیہ میں پروفیسر مار گولیتھ کے حوالے سے پادری صاحب ایک اور غلط بیانی کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے استعمال شدہ پانی کے لیے یہ انتظام کیا کہ وہ پانی برتنوں میں بند کر کے نو مریدوں کو بطور مقدس تبرکات بھیجا کرتے تھے۔ یہ بلا دلیل الزام آج تک ان کے علاوہ کسی مسلم و غیر مسلم نے نہیں کیا تھا۔ نہ تو مستشرق مذکور اس کی کوئی مثال دے پائے اور نہ ان کے خوشہ چین پادری ٹھاکر داس۔

قرآن کے سماجی احکامات اور عائلی قوانین کو مخصوص تبشیری ذہن کے ساتھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"مگر قرآن کے نیک کاموں کی کچھ اور ہی کیفیت ہے۔ چنانچہ کچھ تو اہل عرب کی طبیعت والے ہیں جیسے کثرت ازدواج،

---

* پادری صاحب طنزاً "اسلام کے سنہلے" اصول لکھتے ہیں۔

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۸۲

طلاق، غلام رکھنا، بدلا لینا اور کچھ انہیں کے دستوروں میں سے ہیں۔ جیسے حج اور کعبۃ اللہ کی تعظیم، کچھ محمد صاحب کی اپنی طبیعت کے ہیں جیسے دین کے لیے جنگ کرنی، محمد کو نبی ماننا"[1]۔

یہاں پادری صاحب قیاس مع الفارق کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بات نیک کاموں کی گئی ہے اور مثال عائلی اور معاشرتی قوانین کی پیش کی گئی ہے۔ نیز احکام کو استہزائی انداز میں عرب کے کسی دستور یا نبی اکرم کی ذاتی خواہش کا نام دے کر غلط بیانی کی گئی ہے۔ کیونکہ کعبۃ اللہ کو شعار اللہ کہا گیا ہے۔ عرب دستور کے مطابق نہیں بلکہ شعائر اللہ سمجھ کر کعبہ کی تعظیم کرتے تھے۔ جہاد کو آپ ﷺ کی کشور کشائی کی خواہش بنا کر پیش کرنا مستشرقین کا خاصہ ہے، جس کی بازگشت پادری صاحب کے قلم سے سنائی دی جاری ہے۔

نیک کاموں کی فہرست میں "بت پرستی کی ممانعت" کے عنوان کے تحت بائبل اور قرآنی احکامات کو تقابلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اس میں " ان الذین تدعون من دون اللہ ۔۔۔ یسمعون بھا " آیت نقل کر کے یہ الزام تراشی کی گئی ہے، " باوجود اس کے کعبہ اور سنگ اسود کی تعظیم جائز باثواب رکھی گئی ہے"[2]۔

علاوہ ازیں پادری صاحب کا اس کتاب میں ایک سے زائد بار مثلاً صفحہ ۱۵۱، ۱۵۳ پر کعبۃ اللہ اور حج پر تنقید کرنا اس احساس محرومی کا لاشعوری اظہار معلوم ہوتا ہے کہ مسلم کے ہاں کعبہ اور یہود کے ہاں ہیکل سلیمانی کی موجودگی میں نصاری کے پاس اس جیسا کوئی انبیاء سے منسوب مقدس مرکز نہیں ہے۔ اس احساس کا اظہار بار بار حج اور کعبۃ اللہ پر نقد کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ " سیقول السفھاء من الناس ما ولھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا " آیت نقل کرنے کے بعد مصنف اس میں مذکور تحویل قبلہ کی غرض یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز اس لیے پڑھتے تھے کہ یہود خوش ہو کر آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں۔ لیکن

" اس سے آپ کا اصل مطلب پورا نہ ہوا یعنی یہودی ایمان نہ لائے تو آپ نے یہ حکم دیا اور اس سے آپ کی مقصود عربوں کی خاطر داری تھی"[3]۔

ص ۱۵۳ پر پھر یہی اعتراض دہرایا گیا ہے لیکن یہاں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ یہود آپ ﷺ سے معجزوں کے طالب تھے جس میں ناکامی کی بناء پر آپ ﷺ نے تحویل قبلہ کا حکم دیا۔ یہاں خلاف حقیقت بات یہ ہے کہ آپ ﷺ سے معجزوں کے طالب کفار مکہ رہے تھے نہ کہ یہود جس کے متعلق پادری صاحب بھول گئے کہ موسیٰ کے معجزے بنی اسرائیل پر بے اثر رہے۔ خود یسوع کے معجزے بنی اسرائیل کو رام کرنے میں ناکام رہے۔ جس کی

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۱۲۳

2 ایضاً، ص ۱۲۷

3 ایضاً، ص ۱۳۳

وجہ سے تبشیری سرگرمیاں غیر اقوام میں جاری کرنا پڑیں۔ نیز معجزات نبوت کا لازمہ نہیں ہوتے البتہ اس کا خاصہ ہوتے ہیں۔ خود حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ جھوٹے نبی آئیں گے اور معجزے دکھائیں گے۔ ایمان والوں کا ایمان ڈول جائے گا۔ پادری صاحب کا بار بار نبی اکرم ﷺ سے معجزات کا طلب کرنا کیا اس فرمان کو پورا کرنے کی شعوری کوشش تو نہیں؟ جبکہ پادری صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ مذہبی لڑکپن کی تجویزیں بند ہو جاتی ہیں لہذا اب معجزوں کا دور گذر گیا[1]۔ اس لیے نبی کو اس کی تعلیم اور اس کی اثر انگیزی کے تناظر میں پرکھنا چاہیے۔ نیز یوحنا نبی نے تو سرے سے ہی کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ کیا پادری صاحب انہیں بھی نبی ماننے میں متامل ہوں گے؟

تعظیم کعبہ کے متعلق رقم طراز ہیں؛

" محمد کو نہ تو یہ خیال آیا کہ کسی خاص جگہ کا مقدس اور قابل تعظیم ہونا خدا کو پسند نہیں اور کہ خانہ کعبہ میں کچھ نہیں بلکہ ہر ایمان دار کو چاہیے کہ خدا کے لیے مقدس ہیکل بنے[2] "

پادری صاحب کا یہ اصول کہ کسی خاص جگہ کا مقدس اور قابل تعظیم ہونا خدا کو پسند نہیں سرے سے ہی غلط ہے۔ جیسا بائبل میں ہے کہ جب موسی علیہ السلام کو حوریب کے پہاڑ پر جھاڑی میں سے شعلے نظر آئے اور انہوں نے دیکھا کہ جھاڑی روشن تو ہے مگر جل نہیں رہی۔ تب موسی اشتیاق سے اسے دیکھنے قریب گئے تو خدا نے اسے جھاڑی کے بیچ سے پکارا اور کہا؛ "اے موسی! وہ بولا میں حاضر ہوں۔ اس نے کہا یہاں نزدیک مت آ اپنے پاؤں سے جوتی اتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس سرزمین ہے"[3]۔

اپنے دعوی کو ٹھوس ثبوت سے ثابت کرنا، اور مجمل بات کہہ کر معترض ہونا دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

حرمت شراب کے قرآنی حکم کا بائبل سے تقابل کرتے ہوئے پادری ٹھاکر داس صاحب قرآن کے تدریجی حکم ممانعت پر معترض ہیں۔ انہوں نے اس بارے طبی اور طبعی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن کے الہامی طریق کار پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ؛

" بائبل میں شراب کا پینا حرام نہیں رکھا گیا ہے لیکن نشہ بازی کی ہر زمانہ میں بڑی صفائی کے ساتھ ممانعت ہوتی رہی ہے "[4]۔

پادری صاحب کے موقف کی بنیاد ٹھوس دلائل کی بجائے اسلام سے تعصب کی شکل میں سامنے آتی ہے کہ وہ باوجود شراب نوشی کو برا جاننے کے قرآن کے اس پر حکم حرمت پر معترض ہوئے ہیں یہ رویہ ایک عام قاری کی فہم

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ۱۳۴

2 ایضاً، ص ۱۵۶

3 خروج ۳: ۴، ۵

4 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۱۷۵

سے بالاتر اور اسے الجھن میں ڈالنے والا ہے۔ مسیحی تعلیمات کی خاموشی کے برعکس مے نوشی کی ممانعت کس نے کی اور اس کی شرعی حیثیت کیا تھی، اس کی وضاحت پادری صاحب نہ کر سکتے تھے نہ ہی کی۔ پھر یہ امر بھی تنقیح طلب ہے کہ جب شراب نوشی شرعاً ممنوع ہی نہیں تھی تو ممانعت کرنے والی ہستی نے اس کی ممانعت کس طرح کی۔ اور شرعاً مے نوشی جائز ہونے سے آخر کون سی قباحت پیش آتی تھی کہ شرعی حکم کی ممانعت کرنا پڑی۔ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ خدا کی بھول تھی جسے انسانوں نے اپنے ذاتی تجربہ سے درست کیا۔

اس بات کو مستحسن گردانا جا سکتا تھا اگر پادری صاحب غیر جانب داری سے قرآن حکیم کی توصیف و تائید کرتے یا پھر شراب نوشی کے کوئی مفید پہلو ڈھونڈتے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے قرآنی حکم کے اسقام واضح کرتے۔ اس سے عام قاری یہ تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شراب نوشی کو غیر مفید جاننے کے باوجود بربنائے مذہبی تعصب وہ قرآنی حکم کی تحسین کا اعتراف کرنے کی اخلاقی جرات کا حوصلہ نہیں پا رہے۔ مدمقابل کی صحیح بات کی تصویب کرتے ہوئے اس کی خوبی کا اعتراف کرنا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ تصنیف مسیحی لٹریچر کے عمومی رویہ کی آئینہ دار ہے۔

پادری ٹھاکر داس ریویو براہین احمدیہ

یوپی مشن پریس، لودھیانہ

صفحات: ۸۰

دعویٰ نبوت سے قبل مرزا غلام احمد قادیانی کی وجہ شہرت بننے والی کتاب " براہین احمدیہ " ہے۔ انہوں نے ۱۸۸۰ء میں مسیحی اہل قلم کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں پچاس حصوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب لکھنے کا اعلان کیا جس میں سے صرف پانچ حصے ہی براہین احمدیہ کے نام سے منصہ شہود پر آئے۔ یہ کاوش مسیحی منادوں کے دل آزار لٹریچر کے ستائے مسلمانوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں خاصی حد تک کامیاب رہی۔ دوسری طرف مسیحی حلقوں سے مرزا صاحب کے رد میں تحریریں منظر عام پر آنے لگیں۔ انہی میں سے ایک کاوش زیر تبصرہ کتاب ہے۔ پوری تحریر تو نہیں لیکن " دعویٰ نسخ کی تحقیق" کے نام سے صفحہ ۶۵ تا ۸۷ کا ضمیمہ ہمارے دائرہ تحقیق میں آتا ہے اس لیے صرف اس ضمیمہ کا جائزہ لیا جانا مقصود ہے۔

پادری جی ایل ٹھاکر داس اس بات کے مدعی ہیں کہ قرآن اگلی کتابوں تورات و انجیل کا ناسخ نہیں ہو سکتا کیونکہ

ا قرآن اپنے ثبوت صداقت میں اگلی کتابوں کا مصدق ہونے دا عی ہے۔ یوں وہ ناسخ نہیں بلکہ اپنی تصدیق کے لیے ان کا محتاج ٹھہرتا ہے۔

۲ قرآن کہتا ہے کہ میری باتیں اگلی کتابوں کے موافق ہیں پھر یہ ان کا ناسخ کیونکر ہو سکتا ہے۔

۳ مسلمانوں کو توریت، انجیل اور قرآن یکساں ماننے کا حکم ہے جو کوئی ان میں سے کسی کو ناقص جانے وہ جہنمی ہے (منسوخ جاننے سے اگلی کتابیں ناقص ٹھہریں گی)

۴ قرآن اگلی کتابوں کی تعمیل اپنے پیروکاروں پر ثابت کرتا ہے۔ اگر انہیں منسوخ کرنا تھا تو ان کی "تبعیت" قائم نہ رکھتا۔

۵ چونکہ خود رسول اللہ کو دفع شک کے لیے اگلی کتابوں اور رسولوں کی طرف رجوع کا حکم دیتا ہے اس لیے قرآن ان کا ناسخ نہیں ہو سکتا۔

۶ قرآن دراصل اگلی کتابوں کی تنسیخ کے لیے نہیں بلکہ عبرانی اور یونانی زبان میں ان پہلی کتابوں کو اہل عرب کے لیے عربی زبان میں پیش کرنے کی غرض سے ان کے مثل کے طور پر نازل ہوا ہے[1]۔

اپنے ان دعوٰی کے لیے وہ قرآنی آیات سے استنباط کرتے ہیں۔ (ان اعتراضات کا جائزہ تیسرے باب میں لیا جائے گا) یہ بات واضح رہے کہ نبوت محمدیہ انسانی راہنمائی کے الہامی سلسلہ کی آخری کڑی ہے اور انہی عقائد کو پیش کرتی ہے جن کی تعلیم پہلے انبیاء نے دی۔ مسلم تشریح کے مطابق نسخ سے مراد عقائد نہیں کی بلکہ احکام کی تنسیخ ہے یعنی صرف سابقہ انبیاء کی نبوت کو ان کے عہد تک تحدید کرنا اور ان کے احوال و ظروف کے مطابق عبادات و مسائل کی راہنمائی پر مبنی تعلیمات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے نئے حالات کی متقاضی نئی شریعت کا مدعی ہونا ہے۔

پادری ٹھاکر داس عدم ضرورت قرآن

لودیانہ مشن پریس، لودیانہ ۱۸۸۶ء

صفحات: ۱۴۶

برصغیر کے مسیحی لٹریچر کا عمومی مزاج کسی بھی دوسرے مذہب کے دعوتی لٹریچر سے یکسر مختلف ہے۔ عمیق جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس میں مسیحیت کی دعوت، مخاطب کے مذہب کی تحقیر و اہانت اور تکذیب سے نتھی کی گئی ہے۔ جس حلم، نرمی اور انسانیت نوازی کو مسیحی مذہب کی نمایاں خصوصیات گردانا جاتا ہے، قاری عہد مذکور کا مسیحی لٹریچر اس سے عاری پاتا ہے۔ عمومی تاثر یہی ہے کہ اس کا سبب مسیحی استعمار کی زیر سرپرستی تبشیری سرگرمیوں کا مخصوص مفاد کے تابع ہونا ہے۔ اس کی ایک مثال زیر تبصرہ کتاب گردانی جا سکتی ہے۔

---

1 ٹھاکر داس، ریویو براہین احمدیہ، (یوپی مشن پریس، لودھیانہ)، ص ۶۵۔۷۸

سات فصول پر مشتمل اس کتاب کی تمہید میں مصنف قرآن کے الہامی دعوٰی کو خلاف حقیقت قرار دے کر اسے ایک جعلی دستاویز کی حیثیت دیتا ہے۔ اس کے مطابق چونکہ قبل از قرآن الہامی مذاہب کی کتب سچی راہنمائی سے لبریز ہیں اس لیے ان کی موجودگی میں قرآن کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ لوگوں کے لیے نبی کی ضرورت کیوں اور کن حالات میں نبی آتا ہے" اس کے لیے کچھ وجوہات پیش کرتا ہے[1]۔

دیگر محتویات کتاب یوں ہیں۔

فصل اول بعنوان "عدم ضرورت قرآن از روئے امور اخلاقیہ" میں دو کالموں میں بائبل اور قرآن کی اخلاق تعلیمات کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ قرآن کی دینی اور اخلاقی تعلیمات سے یہ نتیجہ کشید کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی نئی چیز نہیں اس لیے اس کی ضرورت نہیں[2]۔

فصل دوم " عدم ضرورت قرآن از روئے مقررے امور اخلاقیہ " کے عنوان سے ہے جس میں قرآن کا بائبل کے ساتھ تقابل کرکے بائبل کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کا نتیجہ قرآن کو عملی اعتبار سے ناقص قرار دیا گیا ہے[3]۔

فصل سوم " عدم ضرورت قرآن از روئے طریق الحیات" نامی ہے جس میں عقیدہ نجات پر بحث کرتے ہوئے مسیح کے کفارے کو بنیاد بنا کر قرآن کے نظریہ نجات کو ناقص ٹھہرایا گیا ہے[4]۔

فصل چہارم کا عنوان " عدم ضرورت قرآن از روئے واقعہ جو کبھی وقوع میں نہ آئے" قائم کیا ہے۔ اس میں کچھ قرآنی قصص اور تاریخی واقعات بیان کر کے دعوٰی کیا گیا ہے کہ یہ فرضی ہیں کیونکہ اس کے بعض بیانات کی انجیل سے تصویب نہیں ہوتی اس لیے وہ خلاف واقعہ ہیں[5]۔

فصل پنجم " عدم ضرورت قرآن از روئے بیان واقعات جو مخلوط اغلاط ہیں" کے عنوان سے ہے۔ جس میں پادری صاحب مدعی ہیں کہ قرآن اپنے الہامی راہنما ہونے کے دعوٰی میں سچا نہیں کیوں کہ اس میں سچ کے ساتھ جھوٹ کی بھی آمیزش ہے۔ ساتھ ہی ضمیمہ کے تحت مسلم اخبار "منشور محمدی" ۲۵ جمادی الاول ۱۲۹۸ھ، ج ۱۰

---

1 ٹھاکر داس، جی ایل، پادری، عدم ضرورت قرآن، (لودیانہ مشن پریس، لودیانہ، ۱۸۸۶ء) ص ۳

2 ایضاً، ص ۱۹۔۲۵

3 ایضاً، ص ۳۲۔۴۰

4 ایضاً، ص ۴۳۔۵۱

5 ایضاً، ص ۵۳۔۵۹

ص ۵ پر واقعہ تصلیب کے بارے ایک مسیحی بیان پر تعلیقات کا تعاقب کیا گیا ہے۔[1]

فصل ششم کا عنوان " عدم ضرورت قرآن از روئے امور متعلقہ آئندہ" قائم کیا گیا ہے۔اس میں قرآن کو آئندہ زندگی کے بارے راہنمائی سے قاصر گردانا کیا گیا ہے اور اس کا بائبل سے تقابل کیا گیا ہے[2]۔

فصل ہفتم " ضرورت انجیل مقدسہ اور عدم ضرورت قرآن کی توضیح" میں سابقہ روش کے برعکس قرآن سے تقابل نہیں بلکہ مسیحی نوشتوں کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے۔ یہ دراصل "منشور محمدی" رجب ۱۲۹۸ھ ج ۱۱ میں اللہ دیا نامی شخص کے ضرورت قرآن پر لکھے گئے مضمون کا الزامی اسلوب میں جواب دیا گیا ہے[3]۔

فصل ہشتم کا عنوان " وہ نبی پر گفتگو" ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کے بارے بائبل میں پیشین گوئیوں پر کلام کیا گیا ہے اور اس ضمن میں لفظ فارقلیط پر بحث کی گئی ہے[4]۔

اس ساری کاوش میں مصنف نے اپنا دعویٰ اس بنیاد پر قائم کیا ہے کہ چونکہ قرآن کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا بلکہ سابقہ الہامی کتب میں وہ تعلیمات آچکی ہیں اس لیے اس کی ضرورت نہیں۔حالانکہ مصنف کو اگر قرآن سے معمولی شناسائی ہوتی تو قرآن کا یہ بیان اس کے سامنے ہوتا کہ یہ سابقہ الہامی تعلیمات کا ہی تسلسل اور ان سابقہ کتب کی تصدیق کرتے ہوئے ان کی تکمیل کرنے آیا ہے۔ مصنف مسلمانوں سے غلط میدان میں ایک غلط الزام کا دفاع کروانا چاہتا ہے جس کا مسلم حلقے کی طرف سے کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا گیا اگر اسے مصنف کی حقائق واقعات سے لاعلمی قرار نہ دیا جائے تو اسے مصنف کی دانستہ جھوٹ بیانی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآن کی ضرورت کا انکار اس لیے بھی کیا گیا ہے کہ بعض قرآنی واقعات ایسے ہیں جو بائبل سے مطابقت نہیں کرتے مثلاً؛

> " کعبہ ابراہیم نے بنایا جیسا سورۃ بقرہ رکوع ۱۵ آیت ۱۲۷ میں لکھا ہے اور جب اٹھانے لگا ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور اسمعیل اتہی۔ پھر کعبہ عبادت کا پہلا گھر ٹھہراتا۔ سورۃ عمران رکوع ۱۰۔ آیت ۹۹۔ تحقیق پہلا گھر جو ٹھہرا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور نیک راہ لوگوں کو جہاں کے۔
>
> کیا یہہ باتیں قابل تسلیم ہیں؟ کیا ابراہیم کبھی مکہ گیا اور کعبہ تعمیر کیا؟ اور کیا رسومات مکیہ ابراہیم سے نسبت رکھتی ہیں؟ اس قدیم اور مستند تواریخ یعنے توریت میں ابراہیم کے سفر و سکون کا احوال حسب ذیل مندرج ہے؟۔۔۔ خدا کا ابراہیم کو بت پرستوں میں سے بلانا، اپنے تئیں اس پر ظاہر کرنا اور اس سے وعدے کرنا اور اطاعت کا عہد کروانا اور عہد کا نشان

---

1 ٹھاکر داس، عدم ضرورت قرآن، ص ۶۱۔۸۲

2 ایضاً، ص ۸۴۔۹۰

3 ایضاً، ص ۹۱۔۱۳۱

4 ایضاً، ص ۱۳۱۔۱۴۶

مقرر کرنا وغیرہ سب اس کے مکہ میں جاکر کعبہ تعمیر کرنے اور سنگ اسود کی تعلیم مقرر کرنے کی مانع ہے یہ کبھی نہیں ہوا۔۔۔ایسی باتوں سے قرآن کی عدم ضرورت لاحق ٹھہرتی ہے"[1]۔

وفور جذبات میں پادری صاحب یہ فراموش کر گئے کہ بعض انجیلی مقامات کی بھی عہد نامہ عتیق سے تصویب نہیں ہوتی جیسے متی ۲: ۲۳؛ یہودہ کا عام خط ۹[2]۔ نیز قدیم مؤرخین کا تصلیب کے بارے خاموش رہنا کیا اس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں ٹھہر سکتا؟ کیا قرآنی بیانات کی صداقت کے لیے اپنائے گئے اصول کو عہد نامہ جدید پر منطبق کر سکتے ہیں اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

اسی طرح نجات کے لیے کفارہ کو لازم ٹھہراتے ہیں اور اس بحث میں بائبل اور قرآن کے بیانات کے تقابل میں اونٹ کی قربانی کے بارے سورۃ حج آیت نمبر ۳۶[3] پر یوں حاشیہ آرائی کی گئی ہے؛

" کفارہ قرآن۔ سورۃ حج رکوع ۵ آیت ۲ اور ہر فرقہ کو ہم نے ٹھہرا دی قربانی کہ یاد کریں اللہ کو چوپایوں کے ذبح پر۔ سو اللہ تمہارا ایک ہی ہے سو اسی کے حکم پر رہو۔ آپ نے بمطابق بت پرست عربوں کے اونٹ کی قربانی کا حکم دیا اس جانور کی قربانی توریت کتاب احبار باب ۱۱ آیت ۴ میں منع ہے[4]۔۔۔ اونٹ کی قربانی کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ قرآن اپنے تئیں توریت کا مصدق بتلاتا ہے مگر ساتھ ہی بت پرستوں کی تصدیق بھی (خلاف توریت) کرتا ہے۔ لازم تھا یہ ملونی وقوع میں نہ آتی اور توریت کی واجبی بھی تصدیق کرتا۔ لہٰذا ایسے مصدق کی ہرگز ضرارت نہ تھی"[5]

پادری صاحب کا قرآن پر معترض ہونا دراصل انجیل پر انگشت نمائی کے مترادف ہے۔ انہی آیات کے حوالے سے کیتھولک بائبل کمیشن پاکستان کی طرف سے شائع شدہ کلام مقدس میں مرقوم ہے؛

" موسیٰ کی شریعت نے کھانے میں بہت چیزوں کو منع کیا تھا (احبار ۱۱) مگر شریعت انجیل سے تکمیل کو پہنچ گئی اور کوئی کھانے کی چیز حرام یا ناپاک نہ رہی"[6]۔

---

1 ٹھاکر داس، عدم ضرورت قرآن، ص ۵۶۔۵۷

2 " اور ناصرت نامی ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔" (متی ۲ : ۲۳)؛ "لیکن مقرب فرشتہ میکائیل نے جب شیطان سے تکرار کر کے موسیٰ کی لاش کی بابت بحث کی تو اسے جرات نہ ہوئی کہ لعن طعن کر کے اس پر نالش کرے بلکہ کہا کہ خداوند تجھے ڈانٹے"۔ (یہودہ کا خط: ۹)

3 وَٱلۡبُدۡنَ جَعَلۡنَٰهَا لَكُم مِّن شَعَٰٓئِرِ ٱللَّهِ لَكُمۡ فِيهَا خَيۡرٞۖ فَٱذۡكُرُواْ ٱسۡمَ ٱللَّهِ عَلَيۡهَا (الحج: ۳۶)

4 سب چوپائے جن کے کھر چرے ہوں اور جگالی کرتے ہوں تم کھاؤ لیکن ان میں سے جو جگالی کرتے ہیں اور جن کے کھر ہوتے ہیں تم نہ کھاؤ۔ اونٹ اگرچہ وہ جگالی کرتا ہے مگر اس کے کھر چرے ہوئے نہیں سو وہ تمہارے لیے ناپاک رہے گا (احبار ۱۱ : ۴)

5 ٹھاکر داس، عدم ضرورت قرآن، ص ۵۰۔۵۱

6 کلام مقدس، (کیتھولک بائبل کمیشن پاکستان، ۲۰۰۷، اشاعت نہم) ص ۲۱۱۔ حاشیہ

پولوس رسول رومیوں کے نام خط میں غیر مبہم الفاظ میں واضح کرتے ہیں؛

"وہ جو کھاتا ہے اسے جو نہیں کھاتا حقیر نہ جانے اور وہ جو نہیں کھاتا اس پر جو کھاتا ہے عیب نہ لگائے کیونکہ خدا نے اس کو قبول کر لیا ہے پوتو کون ہے جو دوسرے کے نوکر پر عیب لگاتا ہے"۔۔۔ میں جانتا اور یسوع میں یقین رکھتا ہوں کہ کوئی چیز بذات خود حرام نہیں لیکن جو اسے حرام سمجھتا ہے اس کے لیے حرام ہے"[1]۔

انجیل کا توریت کے حکم کی تنسیخ، ترمیم یا مخالفت کا حق تو مسلم لیکن اسی انجیلی حکم کی قرآن موافقت کرے تو قبول نہیں۔ قاری کے نزدیک انجیلی حکم کے موافق قرآنی حکم کو ملعونی ٹھہرانا ضد اور تعصب کے ساتھ مخالفت برائے مخالفت کے زمرے میں ہی آسکتا ہے۔ کیونکہ پادری صاحب کا طریق استدلال غیر معقولی ہے کہ اگر قرآن بائبل کی موافقت کرتا ہے تو دونوں کی تعلیمات ایک ہی ہونے کی بنا پر قرآن کی ضرورت نہیں۔ جس کا اظہار پوری کتاب میں کیا گیا ہے۔ اور جہاں قرآن نے توریت میں جزوی تنسیخ یا ترمیم کا حق استعمال کیا ہے تو پادری صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں اگر مصدق ہوتا تو مخالفت نہ کرتا" لہذا ایسے مصدق کی ہرگز ضرورت نہیں"[2]۔

مسیحی نقطہ نظر سے لکھی گئی اس کتاب میں مصنف متانت اور سنجیدگی کی بجائے نخوت و تکبر کے لہجہ میں تکذیب قرآن پر قلم اٹھاتا ہے جس سے مسلم قارئین کی دل آزاری اور مسیحی حلقوں سے حصول داد و جلب زر کے سوا کچھ مقصود نظر نہیں آتا۔

خواجہ موازنہ انجیل و قرآن

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور، ۱۹۲۵ء

صفحات: ۱۴۱

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں قرآن مجید پر مختلف پہلوؤں سے قلم اٹھایا گیا ہے۔ اگرچہ بہت قلیل مگر ایک اسلوب یہ اپنایا گیا کہ قرآن اور بائبل کی تعلیمات کا تقابل کرتے ہوئے مطلب براری کی جائے اور اپنی پسند کا نتیجہ نکالا جائے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی قبیل سے ہے۔

کتاب ہذا میں ابواب بندی یا فصول کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ دو کالموں میں مختلف عناوین کے تحت پہلے کالم میں قرآنی جب کہ دوسرے میں بائبل کی تعلیمات مندرج ہیں۔ ان کے نیچے حاشیہ آرائی میں روایتی مسیحی ذہن کے ساتھ قرآنی بیانات پر تنقیدی آراء اور تفوق انجیل پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

---

1 رومیوں ۱۴ : ۱۴،۳

2 ٹھاکر داس، عدم ضرورت قرآن، ص ۵۱

تمہید کے بعد ابتداء میں خدا تعالیٰ کے عنوان کے تحت صفات باری تعالیٰ پر ۲۶ عناوین کے تحت موازنہ قرآن و انجیل کیا گیا ہے۔ اسی طرح مذہبیات کے تحت نماز، روزہ، حج، خیرات، قربانی، حلال و حرام، عمل کرنا، توکل، قسم، تبلیغ کے عناوین قائم کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں حقوق العباد، جہاد، زنا، لعان، والدین اور عورت پر دونوں کتب کی تعلیمات کا موازنہ کیا گیا ہے۔ آخری تقابل شخصی زندگی کے موضوع پر ہے جو شراب، جھوٹ، ان شاء اللہ، تکبر، تولنا اور دینوی شان و شوکت پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں پہلے قرآن پھر بائبل کی متفرق تعلیمات نقل کی گئی ہے۔

تمہید میں مصنف رقم طراز ہے؛

"میں نے مناسب جانا کہ بائبل اور قرآن کی جس قدر آیتیں مجھے ملیں مضامین کے اعتبار سے انہیں جمع اور مرتب کر کے یکجا اور باہم مقابل لکھدوں تا کہ کم از کم ان دو مذاہب (اسلام اور عیسائیت) کا جو ایک ہی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اچھی طرح سے موازنہ اور مقابلہ ہو سکے"[1]۔

ہندو مذہب کے بارے لکھتے ہیں؛

"ہندو تو ایک تجارتی قوم ہے جسے مذہب اور اس کی نشر و اشاعت اور تائید و تبلیغ سے کچھ سروکار نہیں ہاں بعض ہیں جو چند رسومات کو جو ان تک نسلاً بعد نسل پہنچی ہیں، پابندی اور احتیاط کے ساتھ ادا کرتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کا رخ اور دماغ کا میلان دوسری سمت یعنی دنیوی ترقی اور تجارت کی طرف ہے۔ اور علاوہ ازیں ان کا مذہب بھی تبلیغی نہیں"[2]۔

پُر امن مسیحی رویہ کے تفوق کا دعویٰ، جو عہد مذکور کے استعماری پس منظر میں خلاف حقائق گردانا جا سکتا ہے، ان الفاظ میں کیا گیا ہے؛

"عیسائی اس درجہ امن پسند اور صلح جو ہیں کہ بجز معدودے چند افراد کے سب کے سب صرف اپنی مذہبی خوبیوں پر قانع ہیں اور وہی دوسروں کو پیش کرتے ہیں۔ مباحثہ و مناظرہ کو بمنزلہ مقابلہ و مجادلہ کے سمجھتے ہیں اور اس جھگڑے کے میدان میں داخل ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ ان میں سے اکثر اس بات کے قائل ہیں کہ صرف اپنے مذہب کی صداقت پیش کی جائے اور دیگر مذہب کی تکذیب سے اجتناب کیا جائے"[3]۔

تاریخ سے واقف قاری بخوبی جانتا ہے کہ مذہبی اشتعال انگیزی، تنفر اور مخالف کی تحقیر و تکذیب کا رویہ کس گروہ کی طرف سے سامنے آیا۔ شاید اس منفی رویہ پر مبنی مسیحی لٹریچر، برصغیر کے ادیان کے مابین علم الکلام کا سب سے غالب حصہ ہو نیز جن خوبصورت اور معصوم الفاظ میں یہ لن ترانی کی گئی ہے خود ہی جابجا کتاب میں اس کی مخالفت

---

1 خواجہ، موازنہ انجیل و قرآن، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۲۵ء)، ص ۱۳

2 ایضاً، ص ۱۲

3 ایضاً

کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی حمیت کی تنقیص اور عیب جوئی میں یوں شکوہ کناں ہیں؛

" مسلمانوں کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں غیرت، حمیت اور جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ گو بسا اوقات اس کا استعمال نہایت غلط اور ناجائز طریق پر ہوتا ہے۔ ان مسلمانوں میں جو مذہبی دلچسپی رکھتے ہیں یہی جوش جو ان کا قومی امتیاز اور نشان بن چکا ہے اس رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے کہ مذہب کے نام ہر شخص اپنی جان اور مال کو خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو جاتا ہے[1]"۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جو چیز مسلم ایمان کا تقاضا گردانی جاسکتی ہے شاید مصنف کا اپنے ہم مذہبوں میں مفقود ہونے کے احساس کا نتیجہ اسے اتہام بنا کر پیش کرنا ہو۔ مصنف مدعی ہیں کہ انہوں نے انتخاب مضامین میں نہایت دیانت و امانت کا حق ادا کیا ہے اور ان کے نزدیک اس لحاظ سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے[2]۔

وحی والہام کے مسلم و مسیحی نظریہ کا فرق واضح کرتے ہوئے مسلم نظریہ کو ناقص ٹھہرانے کی کوشش کی ہے؛

" اب رہی حقیقت الہام، سو اس میں مسلمانوں کو ایک اصولی غلطی لگی ہوئی ہے۔ اور وہ بنائے فاسد بر فاسد رکھے چلے جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وحی یا الہام وہی ہے جو خدا کے کسی پر دار کارندے جبریل کی وساطت سے آسمان سے زمین پر پہنچا جو کچھ خدا نے فرمایا انسانی الفاظ اور عربی زبان میں فرمایا جو لفظ بلفظ جبرئیل امین نے حضرت محمد صلعم کو آسنایا اور آپ نے یاد کر لیا یا دوسروں کو حفظ کروایا دیا اسے کہتے ہیں وہ کلام خدا۔ مگر مسیحی عقیدہ اور انجیل کی تعلیم کے مطابق خدا مضمون القاء کرتا ہے اور ایک پیغام دیتا ہے جسے ملہم خدا کی روح کی ہدایت کے مطابق اپنے الفاظ میں اپنی زبان اور محاورات میں بیان کرتا ہے اور خدا فقط اسے اعلیٰ و خطا اور افراط و تفریط سے بچائے رکھتا ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کر لو کون سا الہام معقول اور کونسا طریق الہام قابل قبول ہے"[3]۔

وحی کا اعلیٰ تصور مسلم نظریہ ہے یا مسیحی یہ قاری خود ہی عمومی تجزیہ سے دیکھ سکتا ہے کہ اصولی غلطی کہاں پر پائی جاتی ہے۔ قرآن کا وحی پر کھنے کا دعویٰ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں پایا جاتا (لو کان من غیر عند الله لوجدوا فیه اختلافًا کثیراً) یہ صرف اسی صورت ممکن تھا کہ ایک وسیلہ سے نازل شدہ الفاظ اپنی اصلی حالت میں ہی محفوظ ہو جاتے جیسا کہ قرآن اس پر پورا اترتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اپنے اپنے الفاظ میں انسانی ذہن کی آمیزش سے پیش کردہ کلام بہت سے تضادات کا حامل ہو سکتا ہے۔ (جیسا کہ عموماً بائبل میں تضادات و اختلافات کی حتمی وجہ بیان نہیں کی جاتی) مصنف اپنے کمزور دعویٰ کو ہی بطور دلیل پیش کر رہا ہے۔

---

1 خواجہ، موازنہ انجیل و قرآن، ص ۱۲

2 ایضاً، ص ۱۲

3 ایضاً، ص ۱۷۔۱۸

قرآنی آیت " تو کہہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میرے تابع ہو اللہ تم سے محبت رکھے گا"۔(آل عمران ۳ : ۲۹) کا موازنہ انجیل کے اس بیان سے کرتے ہیں؛" جو محبت خدا کو ہم سے ہے اس کو ہم جان گئے اور ہمیں اس کا یقین ہے خدا محبت ہے جو محبت میں قائم رہتا ہے وہ خدا میں قائم رہتا ہے اور خدا اس میں قائم ہے"۔(یوحنا۴ : ۱۶)[1]۔پھر اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہیں؛

"خدا کی اس عدیم النظیر محبت کا جس صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان ہے کسی اور مذہبی کتاب میں نہیں ملتا اور بالخصوص قرآن میں تو اس کا نشان ہی نہیں۔ہاں ایک آیت جو لکھ دی گئی ہے مگر اس میں بھی مشروط الہی محبت کا تذکرہ ہے۔یعنی اگر کوئی خدا سے محبت رکھے اور حضرت محمد صلعم کے تابع فرمان ہو جائے تو خدا اس سے محبت رکھے گا یہ محبت کی توہین اور اس لفظ کی ہتک ہے"[2]۔

مسلمان" الودود" کی صفت سے متصف ذات باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں جسے اپنی مخلوق سے محبت دنیا میں محبت کی معراج کی حامل ماں سے ستر گنا زیادہ ہے۔وہ ذات خالق، مالک، اور الہ بھی ہے۔اس سے محبت کے آداب و تقاضے کا پتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی مل سکتا ہے تاکہ کوئی افراط و تفریق کا شکار نہ ہو۔پادری صاحب نے اسے نجانے کیوں ہتک گردانا ہے۔

کتاب کے آغاز میں خوش کن اور غیر جانب داری کا دعویٰ ہے لیکن طریق کار روایتی مسیحی علم الکلام کا اپنایا ہے جس میں مطمع نظر تفوق انجیل ہے۔ دل آزار تبصرے سے مصنف کی ذہنی کیفیت عیاں ہے۔ مقصد تالیف علمی امور کی تنقیح و تفہیم کی بجائے کلیسیا کی تنظیمی ضروریات محسوس ہوتی ہیں۔اگر مثبت سوچ کے ساتھ قرآن اور بائبل کا موازنہ کرتے اور متفرق تعلیمات کو پیش کرتے تو دونوں اقوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث ہوتی۔ مگر تفوق و تفاخر اور ادنیٰ و کم تر ثابت کرنے کا تکلف علمی و معقولی اسلوب کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔موازنہ میں مسلمانوں کو دعوت کی بجائے ان کی خوبیوں کو خامیاں بنا کر پیش کرنے کا احساس زیادہ نمایاں ہے۔ اپنی غلطی یا خامی پر نظر کرنے کا امکان کم بلکہ اخفاء کا بتکلف اہتمام کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کتاب کا جواب ۱۲۲ صفحات پر مشتمل " حسن اسلام" کے نام سے مرزا محمد صادق نے دیا جو اسلامیہ سٹیم پریس، لاہور سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔

---

1 خواجہ، موازنہ انجیل و قرآن، ص ۲۲

2 ایضاً

ماسٹر رام چندر	اعجاز قرآن

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۸۹۵ء

صفحات: ۱۱۷

" تحریف قرآن" نامی کتاب کے مصنف، دلی کالج، دہلی کے ماہر ریاضیات ماسٹر رام چندر صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں وحی کے اعجازی پہلو کے اعتبار سے قرآن کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب پانچ فصول اور ایک تتمہ پر مشتمل ہے۔ مضامین کی درجہ بندی یوں کی گئی ہے۔

فصل اول	معجزہ وحی کی تفتیش میں

فصل دوم	خاص ان لوگوں کا تذکرہ جن سے حضرت محمد نے تعلیم پائی

فصل سوم	جبرئیل قرآن کے بیان میں

فصل چہارم	اس دین کے بیان میں جو جبرئیل قرآن نے حضرت محمد کو سکھلایا یعنی دین ابراہیم

فصل پنجم	اس بیان میں کہ کس معنی سے قرآن ایک معجزہ ہے۔

تتمہ	اس بیان میں کہ موافق قرآن و حدیث کے یہ عقیدہ محمدیوں کا کہ فصاحت قرآن ایک معجزہ ہے باطل ہے۔

قرآن اور رسالت محمدیہ کے بارے پادری صاحب کا نظریہ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے؛

" اگر حضرت محمد جھوٹے نہیں تو ضرور یہ مذہب اہل اسلام کا نسبت وحی قرآن کے غلط ہے، اور یہی درست معلوم ہوتا ہے"[1]۔

معترضین قرآن کے مرغوب موضوع ماخذ وحی کے بارے پادری صاحب رقم طراز ہیں؛

" تعلیم کرنے والا حضرت محمد کا فرشتہ آسمانی نہیں تھا بلکہ ایک یا کئی فرشتے ارضی تھے یعنی کئی آدمی اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے"[2]۔

ان " ارضی فرشتوں" کی ٹوہ میں پادری صاحب نے خیالی گھوڑے دوڑانے کی بے نظیر مثالیں قائم کی ہیں۔ وحی قرآنی کو مطعون کرنے کے لیے یہ نرالا نکتہ بیان گیا ہے کہ خدیجہ بیوی حضرت محمد ﷺ نے توریت اور انجیل کو پڑھا جن سے آپ مستفید ہوئے اور یہ کہ خود حضور اکرم " بطور گماشتہ کے واسطے تجارت کے خدیجہ کی

1	رام چندر، ماسٹر، اعجاز قرآن، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۸۹۵ء)، ص ۱۸

2	ایضاً، ص ۲۹، ۳۵

طرف سے ملک شام میں جہاں نصاری اور یہود بکثرت آباد تھے اکثر جاتے تھے اور متلاشی دین حق کے دل سے تھے۔ پس عرصہ پندرہ سال میں یہود و نصاری سے سن سنا کر دو جلدیں مثل قرآن کے حفظ کر سکتے تھے"[1]۔

ان باتوں سے نہ صرف پادری صاحب کا حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا وطیرہ سامنے آتا ہے۔ بلکہ یہ بات بھی آشکار ہوتی ہے کہ ان کا استدلال کس قدر رکیک، سطحی، تضادات سے مملو اور خلاف واقعہ تھا۔ مثلاً مذکورہ بالا روایت کو ہی پرکھ لیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بطور نمائندہ حضرت خدیجہؓ سفر شام کو بکثرت اسفار میں تبدیل کرنا جھوٹ بیانی کے رویہ کو آشکار کرتا ہے۔ دوران سفر مقدس نوشتوں کی دو جلدیں حفظ کرنے کا الزام دوسرے مسیحی ناقدین کے الزامات کی نہ صرف تردید کرتا ہے بلکہ موقع بموقع بات بدلنے کا وطیرہ بھی سامنے آتا ہے جس میں دیگر مسیحی ناقدین مثلاً ٹھاکر داس[2] آپ کو انجیل سے بالکل بے بہرہ گردانتے ہیں کہ آپ نے انجیل کو نہ پڑھا نہ سنا اور قرآنی بیانات کی بائبل سے مخالفت کی وجہ بھی یہی بے علمی قرار دیتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کتب سابقہ سے واقف تھے تو پھر پادری صاحب کا عائد کردہ الزام بھی غلط ٹھہرتا ہے کہ آپ ﷺ مکہ میں مسیحی غلاموں سے سیکھنے جاتے تھے۔[3] یا پھر اپنی بیوی سے سبق حاصل کرنے کی کیا تک ہے۔ پادری صاحب کے بقول توریت و انجیل سے واقف حضرت خدیجہؓ " امیر عورت خاندانی اہل مکہ سے تھی پس ظاہر ہے کہ وہ فصیح عربی بولتی ہو گی"[4]۔ جس کا نتیجہ وہ یہ نکالتے ہیں کہ آپ ان سے انجیل سن کر اسے وحی بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ جب یہ سب کچھ گھر میں موجود تھا تو پادری صاحب نے یہ ناحق تکلیف کی کہ، " اب دریافت کرنا چاہیے کہ کون سا آدمی ہے جس کی طرف مشرکین مکہ گمان لے گئے کہ وہ حضرت محمد کو تعلیم کرتا تھا"[5]۔

پادری صاحب کی اس دریافت کا اہل مکہ کو علم نہ ہو سکا کہ آپؐ اپنے سسرالی رشتہ دار اور مسیحی اہل قلم کے ممدوح ورقہ بن نوفل یا اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے تعلیم وحی حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ انہوں نے تو ایک عجمی غلام سے اخذ کرنے کا الزام دھرا تھا۔

---

1. رام چندر، اعجاز قرآن، ص۹، ۱۱
2. ایضاً، ص۱۶
3. ایضاً، ص۲۱
4. ایضاً، ص۲۴
5. ایضاً، ص۲۱ یہاں پادری صاحب جبر یسار، عابش غلام حویطب اور سلمان فارسی کے نام گنواتے ہیں۔

حضرت سلمان فارسی کے متعلق وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ مکہ نہیں بلکہ ہجرت کے بعد مدینہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

جبرئیل قرآن کے باب میں پادری صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جبرئیل مقدس ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ وہ شخص بدتر ابلیس تھا اور کوئی آدمی سخت بدعتی اہل کتاب میں سے تھا۔[1]

پادری صاحب اعجاز قرآن مسلمانوں کا گھڑا ہوا نظریہ بنا کر پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق " محمد ﷺ کے وہم و گمان میں بھی یہ امر نہیں تھا کہ باعتبار فصاحت اور بلاغت کے قرآن ایک معجزہ ہے "[2]۔

بعض مقامات پر پادری صاحب اپنے من مانے نتائج حاصل کرنے کا نادر نمونہ پیش کرتے ہیں؛

" حدیث میں یہ مذکور ہے کہ کعبہ میں جا کر اور حجر اسود یعنی کالے پتھر کے سامنے قائم ہو کر عمر نے کہا: اے کالے پتھر تو کچھ نہیں۔ لیکن بخاطر حضرت محمد تجھے بوسہ دیتا ہوں۔ یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ عمر عبادات اور آداب کعبہ پر اعتقاد دل سے نہ رکھتے تھے "[3]۔

قول عمرؓ اور اس سے برآمد کردہ نتیجہ پادری صاحب کے طرز استدلال کا آئینہ دار ہے جہاں معاندانہ سوچ حقائق کو قبول کرنے میں آڑے آتی ہے۔

مصنف کا طرز تحریر اسی تندی و تیزی سے مملو ہے جس کا مظاہرہ اس عہد کے مقامی نو مسیحی اپنا فرض منصبی گردانتے تھے۔ اکثر مقامات پر اپنی بات کا قرینہ بنانے کے لیے "کیا ہو گا، ہوا ہو گا، سنا ہو گا پڑھا، ہو گا" وغیرہ کی گردان موجود ہے یعنی وہم و گمان سے تصویر کشی کر کے اس میں اعتراض کی رنگ آمیزی کر کے پیش کرنا مصنف کا خاصہ ہے مثلاً یہ کہ حضرت محمد ﷺ نے کہ متلاشی دین حق کے تھے حالات توریت انجیل کے یہود و نصاریٰ سے بلاشبہ سنے اور دریافت کر لیے ہوں گے[4]۔

مسلم مفسرین کی کمزور آراء اور غلطیاں پوری کتاب میں مصنف کا سرمایہ اعتراض ہے۔ کتاب کے مضامین کا تانا بانا ظن و تخمین پر بنایا گیا ہے بعض جگہ اعتراضات کی نوعیت ایسی ہے کہ قاری پڑھ کر پادری صاحب کی تخیلاتی پرواز کو بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ داخلی تناقضات، رکیک طرز استدلال، اور من مانے نتائج حاصل کرنے کی خواہش اور اعتراض برائے اعتراض کرنے کی ضرورت نے اس کتاب کو سنجیدہ، متین اور تحقیقی نظر رکھنے والے صاحبان کی نگاہوں میں کوئی قابل ذکر علمی کاوش کا مقام و مرتبہ نہیں دیا ہے۔

---

1 رام چندر، ماسٹر، اعجاز قرآن، ص ۴۷

2 ایضاً، ص ۱۱۴

3 ایضاً، ص ۸۷

4 ایضاً، ص ۱۱

ماسٹر رام چندر　　تحریف قرآن

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۸۹۳ء

صفحات ۲۱۰

برصغیر کے مسلم مسیحی لٹریچر کا ایک معتدبہ حصہ "ردعمل" پر مبنی ہے۔ جس میں ایک فریق کے دوسرے پر اعتراض کو واپس لوٹانے کا مظاہرہ بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جانبین کی طرف سے "تحریف" کا موضوع سب سے زیادہ ہدف بنا رہا۔ اس رویہ میں معقولیت سے زیادہ مخالف کو چت کر کے اپنے مؤیدین سے حوصلہ افزائی کا عنصر غالب رہا، خواہ اس کے لیے سطحی دلائل سے کام چلایا جائے یا حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔ مسیحی تحریروں کے تجزیہ سے عیاں ہوتا ہے کہ اس اسلوب کے ساتھ ساتھ اکثر متانت و سنجیدگی کو بھی پرے دھکیل دیا جاتا ہے۔

ثقیل اور قدیم اردو اسلوب میں لکھی گئی یہ کتاب دیباچہ اور پانچ فصول پر مشتمل ہے۔ عنوان کتاب سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں قرآن کو محرف گردانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"تحریف قرآن موافق تفسیر حسینی کے" کے عنوان سے قائم کی گئی پہلی فصل میں تیرہ دفعات رقم کی گئی ہیں۔ جن میں اختلاف قراءت کو بنیاد بنایا گیا ہے[1]۔

۱۳۵ دفعات پر مشتمل فصل دوم" تحریف قرآن موافق تفسیر بیضاوی" کا موضوع بھی اختلاف قرآءت ہے[2]۔

فصل سوم "اس بیان میں کہ قرآن اس قدر محرف ہے کہ اس پر کچھ اعتبار نہیں ہو سکتا ہے" کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ جس میں ۷ دفعات میں اہل سنت علماء کی شیعہ کے رد میں تحریریں خصوصاً شاہ عبدالعزیز کی تصنیف "تحفہ اثناء عشریہ" اور جواب میں شیعہ تحریریں نقل کی گئی ہیں[3]۔

فصل چہارم کا عنوان ہے "اس بیان میں کہ جیسے علمائے شیعہ تحریف قرآن کو ثابت کرتے ہیں اسی طرح علماء سُنی بھی تحریف قرآن ثابت کرتے ہیں"۔ یہ ۳۲ دفعات پر محیط ہے۔ اس میں منسوخ آیات کے بارے بخاری اور مسلم کی روایات اور کلینی میں مروی شیعہ روایات کو غلط تناظر میں پیش کر کے مطلب براری کی گئی ہے[4]۔

1　رام چندر، ماسٹر، تحریف قرآن، (پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۸۹۳ء)، ص ۲۳۔۳۸

2　ایضاً، ص ۳۸۔۱۱۰

3　ایضاً، ص ۱۱۱۔۱۲۱

4　ایضاً، ص ۱۲۱۔۱۵۶

فصل پنجم تتمہ پر مشتمل ہے۔ اس میں ۶ دفعات میں نسخ اور اختلاف قرآت کا نتیجہ تحریف قرآن کی صورت میں پیش کرتے ہوئے رسول اللہؐ کی نبوی حیثیت کو مجروح کیا گیا ہے۔ اختتام کتاب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسیحی دعویٰ دہرایا گیا ہے[1]۔

دیباچہ میں پادری صاحب رقم طراز ہیں؛

"پس بباعث بے غوری اور زبردستی صاحبان محمدی کے یہہ رسالہ لکھا گیا اور ثابت کیا گیا کہ قرآن میں قرات مختلفہ فقط ہزاروں اور لاکھوں نہیں ہیں بلکہ بے شمار اور لاتعداد ہیں اور یہہ تحریفات لفظی اور معنوی ہیں اور تحریفیں جملوں کی اور آیتوں کی بھی ہیں اور ناقلان اور کاتبان قرآن خاص محمد صاحب کے زمانہ کے ایسے دنیادوست تھے کہ انہوں نے یقیناً قرآن کی تحریف کی۔ پس قرآن مروجہ حال ہرگز قابل اعتبار نہیں[2]۔"

اپنے اس دعویٰ کو تفسیر حسینی اور تفسیر بیضاوی سے اختلاف قرأت کی شاذ، جمع و تدوین قرآن کی مختلف فیہ، اور نسخ قرآن سے متعلقہ مردود روایات خصوصاً کتب شیعہ کی جمع کرکے بزعم خویش تحریف قرآن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی انفرادی تفسیری رائے کو مسلمانوں کے ہاں متفق سمجھ کر اس کی بنیاد پر تحریف ثابت کرنا اس کتاب کا خاصہ ہے۔ مصنف کا طرز استدلال اس مثال سے واضح ہوتا ہے؛

"سورۃ ہود آیت ۳ میں ایک لفظ فعمیت یعنی چھپائی گئی آیا ہے۔ اس پر بیضاوی یہہ لکھتا ہے و قری فعماھا علی ان الفعل اللہ ترجمہ اور بعض نے پڑھا چھپایا اس کو موافق اس کے کام اللہ کا ہے (یعنی چھپایا اس کو اللہ نے) انتی یہاں ظاہر ہے کہ لفظ فعمیت لفظ فعما سے بدلا گیا ہے اور ایک لفظ ھا زیادہ کیا گیا اور یہہ تحریف جملہ کی بڑی ہے اور گو اس تغیر سے اس خاص مقام کے معنی میں کچھ چنداں فرق نہیں آتا ہے لیکن ایسے تغیرات سے مقاموں میں معنی میں اختلاف عظیم پیدا ہو سکتا ہے"[3]۔

قاری سطحی استدلال اور غلط نتائج اخذ کرنے کا بخوبی مشاہدہ کر سکتا ہے۔ زیر تبصرہ یہ کتاب غیر علمی انداز میں مفہوم مخالف کشید کرنے کی ایک نظیر ہے۔

---

1 رام چندر، تحریف قرآن، ص ۱۵۷۔ ۲۱۰

2 ایضاً، ص ۲۵

3 ایضاً، ص ۶۸

پادری سلطان محمد پال   تصحیف التحریف

ایم کے خان۔ مہان سنگھ باغ، لاہور ۱۹۲۵ء

صفحات: ۷۱

برصغیر میں مسلم مسیحی علم الکلام میں معرکۃ الآراء موضوع "تحریف بائبل" ہے، جس پر جانبین کی تحریریں شاہد ہیں الزامی کتاب، جواب، جواب الجواب اور پھر اس کا جواب غرض اس رویہ سے یہ باب خاصا وسیع ہوتا چلا گیا۔ زیر بحث تحریر کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے جس میں مصنف نے مولانا ابو سعید محمد حسین (بٹالوی) کی تحریف بائبل پر ایک تحریر[1] کا جواب دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور مولوی محمد علی مونگیری کی تحریروں کا جزوی تذکرہ بھی کرتا ہے۔

سرورق پر آیت " لا تبدیل لکلمت اللہ "[2] مندرج ہے۔

آغاز میں عدم تحریف بائبل پر پادری صاحب ایک بہائی تحریر پیش کرتا ہے جس کا محرر پادری صاحب کے دعویٰ کے مطابق مرزائیت ترک کر کے بہائی بن گیا تھا[3]۔ مسلم مخاطب کے سامنے بہائی تحریر بطور دلیل پیش کرنا پادری صاحب کی بات کی اہمیت کم کرتے دکھائی دیتی ہے۔ بعد ازاں عہد رسالت میں بائبل کی تحریری دستیابی اور قرآن میں الکتاب (بائبل) کے تذکرہ اور اس کے محافظ ہونے کے بناء پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انجیل مروجہ کو قبول کیا[4]۔

اگلے صفحات میں ان احادیث کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جن میں تحریف بائبل کا بیان ہے کہ "آنحضرت کن معنوں میں تورات وانجیل کو محرف کہتے تھے " کا عنوان قائم کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ؛

" حضرت محمد تورات وانجیل کو صحیح باور کرتے تھے صرف اہل کتاب کو یہ الزام دیتے تھے کہ وہ ان کتابوں پر عمل نہیں کرتے "[5]۔

قرآن کے مہیمن ہونے کے بارے پادری صاحب رقم طراز ہیں؛

---

1 یہ بحث مولانا نے اپنی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالہ اشاعت السنۃ نمبر ۲، جلد ۷، صفحہ ۱۹۳ تا ۲۰۸ پر کی ہے۔

2 سورۃ الانعام ۲: ۳۴

3 پال، سلطان محمد، پادری، تصحیف التحریف، (لاہور ۱۹۲۵ء)، ص ۳

4 ایضاً، ص ۱۷

5 ایضاً، ص ۳۰

"پھر قرآن اس قصر الٰہی کا پاسبان ہونے کی آرزو رکھتا ہے اور ان کی نگہبانی پر فخر کرتا ہے۔ مگر وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے ہم کو مجبوراً باور کرنا پڑتا ہے کہ قرآن پاؤں پسارے خراٹے بھر بھر سوتا رہا۔ بے ایمان اہل کتاب نے ان کو خراب بھی کر ڈالا حتی کہ وہ نہ اب اس لائق ہے کہ اس کی تعظیم مثل کلام اللہ کی جائے نہ اس لائق کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ اور ان کو تورات وزبور وانجیل کہا جائے۔ گویا قرآن، جو کہتا ہے، " لا مبدل لكلمات الله "، " خدا کی باتیں کوئی نہیں بدل سکتا" بدل گیا اور باطل ہو گیا۔" اور وہ آیات جو تورات وانجیل کو "نور و ہدایت" کہتی ہیں منسوخ ہو گئیں اور وہ آیات جو اہل کتاب کو" ان پر حکم کرنے اور ان کو قائم کرنے" کی ہدایت کرتی ہیں جھوٹی ہو گئیں "[1]۔

پادری صاحب نے قرآن کی صفت مہیمن کی تدلیساً غلط اور تضحیک آمیز تشریح کی ہے۔ قرآن فہمی کے لیے تعصب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کی ضرورت ہے ورنہ وہ اپنے مسلم پس منظر میں اسی قرآن میں اس وحی الٰہی سے بخوبی واقف تھے "يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِۦ ۙ وَنَسُوا۟ حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا۟ بِهِۦ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ (وہ کلام کو اس کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جس بات کی ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھول گئے اور تو ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت پر آگاہ ہوتا رہے گا۔)[2]

تاریخ شاہد ہے کہ اہل کتاب بائبل پر تحریف کی خاص عنایت سے باز نہیں رہ سکے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم علماء ہمیشہ اسے آشکار بھی کرتے رہے ہیں۔ مثلاً احمد دیدات فارقلیط کی بحث میں بیان کرتے ہیں، "کتاب مقدس میں مرقوم ہے

"Howbeit when he the Sprit of Truth, is come, he will guide you into all truth. For he shall not speak of himself but whatsoever he shall hear, that shall he speak and he will show you things to come." John 16 / 13

اوپر دی گئی آیت میں وہ یعنی He کی تعداد گنئے جو سات ہے۔ ایک مذکر کے صیغہ کے لیے ایک ہی آیت میں دیئے گئے سات اسماء اشارہ (Pronouns)۔ پروٹسٹنٹ مسیحیوں کی انجیل کی ۶۶ اور رومن کیتھولک انجیل کی ۷۳ کتابوں میں کوئی ایک بھی اور آیت ایسی نہیں ہے جہاں کسی مذکر یا کسی مونث یا کسی مخنث کے صیغہ میں ساتھ اسمائے اشارہ دیئے گئے ہوں۔ سات اسماء اشارہ نے روح (Ghost) کو تو اس مکالمہ سے خارج کر دیا بے شک وہ (Holy) روح القدس تھی یا نہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے جب وہاں (جنوبی افریقہ) کی مسیحی مشنریوں سے ایسی ایک آیت میں سات بار لفظ وہ He بصیغہ مذکر استعمال کیے جانے کے بارے میں وضاحت مانگی تو مسیحی مشنریوں نے انجیل مقدس کے اردو ورژن میں

---

1 پال، سلطان محمد، تصحیف التحریف، ص ۲۱

2 المائدہ ۵: ۱۳ ترجمہ پادری احمد شاہ، مطبوعہ کانپور ۱۹۱۵ء اس طبع میں آیت کا نمبر ۱۶ دیا گیا ہے۔ پادری عماد الدین صاحب نے یہاں حظ کے معنی حصہ کی بجائے حظ بمعنی لطف کیا ہے۔ ترجمہ آیت مذکور

اس آیت میں تحریف کر کے He کی جگہ she , she , she لکھ دیا تا کہ مسلمان اس آیت کو حضرت محمد ﷺ کی طرف منسوب نہ کر سکیں کیونکہ پیغمبر خدا تو مرد (مذکر) تھے اور لفظ She ان کو اس پیشین گوئی سے رد کر سکتا تھا۔ بائبل میں کیے جانے والے اس فریب کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مسیحی مشنریاں یہ چالاکی خصوصاً دکھاتی ہیں کہ وہ مقامی زبان کے کئی الفاظ کو بائبل میں گڈمڈ کر دیتی ہیں۔ ان کی تازہ ترین چال کو میں نے افریقی بائبل میں پکڑا اوپر بیان کی گئی آیت میں مقامی لفظ Troosrer بمعنی Comforter کو بدل کر Voorspraak (یعنی) Mediater میں بدل دیا گیا ہے۔ جب کہ مقامی لفظ Die Heilige Gees بمعنی Holy Ghost شامل کر کے اس آیت کو بدل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ انجیل مقدس جیسی الہامی کتاب کے انگریزی ورژن میں بھی اسی متذکرہ آیت میں دن دیہاڑے اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ تحریف کرنے کی جسارت تو یورپ کے کسی مسیحی عالم نے حتی کہ Jehova's witness جیسوں نے بھی نہیں کی۔ اندازہ لگالیں مسیحی کس طرح کلام الٰہی "گھڑتے" ہیں۔[1]

نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلم حلقہ کی جانب سے کی گئی تنقید کی روشنی میں وقتاً فوقتاً اصلاح وترامیم کی مزید مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً کتاب ۲۔ ملوک ۲۴: ۸ میں یویاکین کی تخت نشینی کے وقت عمر اٹھارہ سال بیان کی گئی تھی۔ مگر ۲۔ تواریخ ۳۶: ۹ میں تضاد ختم کرنے کے لیے اسے آٹھ سال سے بدل کر اٹھارہ سال لکھا گیا ہے۔ یہ تبدیلی کرنے والا کوئی عام ادارہ نہیں بلکہ کیتھولک بائبل کمیشن پاکستان کے زیر اہتمام کیتھولک اساقف کی ہدایت و اجازت سے اصلی متن کے مطابق مستند ترجمہ اشاعت ۱۹۵۸ء میں کی گئی ہے۔ جب کہ پاکستان بائبل سوسائٹی، لاہور کے زیر اہتمام شائع شدہ کتاب مقدس طبع ۱۹۹۸ء میں ۲۔ تواریخ ۳۶: ۹ میں یہ غلطی تاحال درست نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاؤں پسارے سویا نہیں رہا بلکہ اہل کتاب اپنی عادت شنیعہ سے باز نہ رہ سکے اور اس قرآنی الزام کو پایہ ثبوت تک پہنچا کر دم لیا۔ مسلم علماء نے اپنا فریضہ تن دہی سے انجام دیا اور ان کی اس خیانت علمی کو طشت ازبام کرنے میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں کی۔ یہ ایسی قرآنی پیشین گوئی ہے جو بار بار پوری ہوئی۔

قرآن کے مصدق الکتاب ہونے کی تشریح ایک قدم بڑھ کر یوں کی گئی ہے،

" ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کی ان تمام کتابوں کی جو عیسائیوں کے پاس تھیں قرآن شریف تصدیق کرتا ہے۔ بلکہ صرف اسی کتاب کو جس الانجیل کے نام سے ان کے پاس تھیں اور چونکہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی اناجیل اس نام سے شامل ہیں اس لیے قرآن شریف کو انکا مصدق تو طوعاً و کرہاً ہونا ہی پڑے گا۔[2]

پادری صاحب کے بقول قرآن کو " طوعاً و کرہاً" جن اناجیل کا مصدق ہونا پڑے گا وہ اس کا مکلف ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اناجیل جن مؤلفین کی طرف منسوب ہیں ان کی طرف سے الہامی ہونے کا کوئی دعویٰ سامنے ہی نہیں آیا ہے

---

1 ایف نیاز، اکرم طیب، خطبات شیخ احمد دیدات، (لاہور ۲۰۰۶ء)، ص ۱۶۲۔۱۶۳

2 پال، سلطان محمد، تصحیف التحریف، ص ۵۲

اور قرآن صرف اسی منزل انجیل کی تصدیق کرتا ہے جس کا ذکر یسوع مسیح یا رسولوں کی زبانی ان مروجہ اناجیل میں آیا ہے[1] نہ کہ " لوگوں سے ٹھیک پوچھ کر لکھی جانے والی لوقا[2]، یونانی کلامی انداز میں لکھی جانے والی یوحنا، بے سلیقہ مرقس کی تصنیف[3] یا اختراعات پر تکیہ کرنے والے متی[4] کی تصدیق کا ذمہ دار ہے۔

یہ رسالہ اس دور کی مناظرانہ تحریروں کا نمونہ پیش کرتا ہے جس میں قبولیت کی بجائے کٹ حجتی اور مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے اپنے قلمی جوہر دکھلائے گئے ہیں۔ شدت جذبات میں عورتوں کی طرح کوسنے دینے کا تحریری مظاہرہ اس رسالہ میں جابجا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مولانا محمد علی مونگیری صاحب کو یوں خطاب کیا ہے؛

" تیرے اللہ کی تحریر و کتابت پر افسوس جس کے قلم سے نکلے ہوئے جزئیات و قصص و حکایت پر حرف آئے۔۔۔ اس سے تو مرزا غالب ہی اچھے رہے "[5]۔

ایک اور جگہ یوں لکھا ہے؛

" مولوی رحمت اللہ خاں و وزیر خاں ساری عمر یہی بیان کرتے کرتے مر گئے اور آپ بھی یہی رو رہے ہیں "[6]۔

مناظرانہ اسلوب اور سطحی انداز تحریر مصنف کی شخصیت کے علمی ہونے کے تاثر کو کم کر دیتی ہے۔

پادری سلطان محمد پال ویدقرآن اور بائبل کی دعائیں

اے کے خاں، مہاں سنگھ باغ لاہور، ۱۹۲۶ء

صفحات: ۴۴

اس کتاب میں دعا اور خالق معبود سے مانگنے کے موضوع پر قرآن مجید سے ۵۹ ادعیہ کا بائبل کی ہم معنی دعاؤں سے تقابل کیا گیا ہے۔ بالترتیب بائبل، قرآن اور وید کی دعائیں تین کالموں میں بیان کی گئی ہیں۔ اپنی اس کاوش کا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

" اگر آپ قرآن مجید کی دعاؤں کو جو اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں غور سے پڑھیں تو آپ کو بے حد تعجب ہو گا کہ ان

---

1 متی ۲۴ : ۱۴، ۲۶ : ۱۳؛ مرقس ۱:۱؛ ۱۵، ۱۳ : ۱۰، ۱۴ : ۹؛ اعمال ۱۵:۷؛ رومیوں ۱ : ۱؛ ۱۵، ۱۱ : ۲۸، ۱۵ : ۲۰ ؛ ا۔ کرنتھیوں ۴ : ۱۶، ۹ : ۱۳، ۱۶؛ گلاطیوں ۱: ۱۱، ۲: ۲؛ فلپیوں ۱: ۲، ۷، ۱۲، ۱۶؛ کلسیوں ۱: ۵، ۲۔ تھسلنکیوں ۱: ۹

2 لوقا ۱:۱

3 موریس بوکائے، قرآن بائبل اور سائنس، ص ۸۶، ۸۹

4 متی ۲۷: ۵۰۔ ۵۳

5 پال، سلطان محمد، تحیف التحریف، ص ۳۶

6 ایضاً، ص ۳۱

دونوں میں طرز بیان اور خصائص زبان کے سوا کچھ اختلاف نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ عربی زبان کی صنائع و بدائع اور عبرانی زبان کے محاسن و مزائن سے قطع نظر کر کے دونوں کی دعاؤں پر غور کریں تو فی الفور معلوم ہو گا کہ جن اصول پر بائبل مقدس کی دعائیں مبنی ہیں انہی اصول پر قرآن مجید کی دعائیں بھی مبنی ہیں"[1]۔

بائبل اور قرآن مجید کو دعا کے موضوع پر یکساں ثابت کرنے کے بعد اس چیز کی صراحت کی گئی ہے کہ دعا کے مفہوم میں کتاب مقدس اور قرآن مجید سے ویدوں کو قطعاً اختلاف ہے[2]۔ ویدوں کی دعاؤں کا وصف بیان کیا گیا کہ؛

"ویدوں کی دعاؤں میں نہ صرف یہی ایک وصف ہے کہ ان میں کینہ توزی اور عداوت پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جس کو ایک صلح پسند شخص جس کا سینہ لوث عداوت سے پاک ہو ہر گز پسند نہیں کرے گا بلکہ ایک وصف اور بھی ہے جو ایک مہذب شخص کے لیے نہایت مکروہ اور قابل نفرت ہے وہ یہ کہ بعض منتر پایہ تہذیب سے بالکل گرے ہوئے ہیں"[3]۔

مسلمانوں اور مسیحی منادوں کے درمیان شدید کشمکش اور مقابلہ کے دور میں لکھی گئی اس کتاب کا حالات و واقعات کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو اس کے تین مقصد نمایاں ہوتے ہیں۔

۱ مسلمان بائبل اور قرآن کو ایک سمجھتے ہوئے شعوری طور پر مسیحیوں کے قریب ہوں اور انہیں تسلیم کر لیں۔

۲ اپنے مسیحی قارئین کے ذہن میں اس خیال کو مزید راسخ کرنا کہ قرآن بائبل کا چربہ ہے۔

۳ وید پر نقد کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں آریہ سماج کے مقابل مسلمانوں کی اخلاقی حمایت حاصل کرنا اور ان کے خلاف دونوں گروہوں کو ایک کرنے کی غرض پنہاں ہو سکتی ہے

پادری سلطان محمد پال   ہمارا قرآن

ناشر: ایم کے خان مہاں سنگھ، لاہور ۱۹۲۸ء

صفحات: ۲۰۶

دیباچہ اور تمہید ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ باقاعدہ ابواب بندی نہیں کی گئی بلکہ ۱۵۷ عنوانات قائم کر کے دو کالموں میں قرآن اور بائبل کے بیانات پیش کیے گئے ہیں جن میں ۴۲ عنوانات ذات و صفات الہی کے متعلقہ ہیں۔ پہلے کالم میں بائبل کی تعلیمات اور اس کے مقابل دوسرے کالم میں اسی مضمون کی متعلقہ قرآن مجید کی آیات کو جمع

---

1 پال، سلطان محمد، پادری وید قرآن اور بائبل کی دعائیں (اے کے خاں، مہاں سنگھ باغ لاہور، ۱۹۲۶ء)، ص ۳۔۴

2 ایضاً، ص ۷

3 ایضاً، ص ۱۲

کیاہے۔ ان آیات کا حوالہ اور عنوان قائم کرنے کے بجز مرتب نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ مقدمہ میں مسیحی دین کو ادیان مروجہ پر فضیلت کا دعویٰ کر کے سات فضائل دیے گئے ہیں۔[1] دیباچہ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہودیت و مسیحیت میں اشتراک کا خیال محض وہم باطل ہے[2] جب کہ اسلام اور مسیحیت کے درمیان موجود تعلق کی بابت ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانے کا دعویٰ کیا گیا ہے؛

" قرآن نے اہل اسلام کو مسیح کے خلاف کچھ کہنے یا ماننے کی صرف یہ نہیں کہ آزادی نہیں بلکہ بشدت منع فرمایا ہے۔ پس اصول کے لحاظ سے اسلام اور مسیحیت میں جو رشتہ ہے وہ کسی دوسرے میں پایا ہی نہیں جاتا"[3]۔

اسی کے ساتھ ساتھ برصغیر میں مسیحیوں کے دوسرے بڑے مخاطب ہندو مت کے حوالے سے مرقوم ہے؛

" اگر ویدوں اور بائبل کا مقابلہ کیا جاتا اور ان دونوں میں تشابہ نکل آتا تو ہم مان لیتے کہ ہندو دھرم اور مسیحیت میں کوئی رشتہ موجود ہے۔ لیکن ایسا کرنے کی نہ ہندوؤں کو ہی جرات ہے اور نہ کسی اور کو"[4]۔

بلکہ مصنف اس دور کے حالات میں اپنی مسیحی برادری سے شکوہ کناں ہے کہ ایک عیسائی جس تلطف اور مدارات کے ساتھ ایک آریہ سے پیش آتا ہے کسی مسلمان کے ساتھ اسی طریق پر ہرگز نہیں مل سکتا ہے۔ یہ جان کر کہ آریوں کے نزدیک مسیح سے بدتر شاید ہی کوئی اور شخص ہو[5] تب بھی وہ ان کے ساتھ بھائی چارہ رکھنے میں پس و پیش نہیں کرتا ہے"[6]۔

پادری صاحب مسلم مسیحی نزاع کی بابت ایک بنیادی پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہیں؛

" طرفین کے ان نااہل اور نالائق مباحثین، مناظرین کی بدولت جو تعصب و جہالت کے خباثت آلود مجسمے ہوتے ہیں آج مسلمانوں اور عیسائیوں کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کی بیخ کنی میں کوتاہی نہیں کرتے"[7]۔

پھر اس شکل میں اس کا تدارک بیان کرتے ہیں؛

---

1 پال، ایس ایم، پادری، ہمارا قرآن (ایم کے خان مہاں سنگھ، لاہور ۱۹۲۸ء) ص ۲

2 ایضاً، ص ۳

3 ایضاً

4 ایضاً، ص ۴

5 ایضاً، ص ۲۶ پر پادری صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت ستیارتھ پرکاش از سوامی دیانند صاحب سے ۱۰ ہزلیات بقید صفحہ نمبر نقل کی ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور بائبل اور خدا کے متعلق اس کتاب سے ۳۱ مغلظات نقل کی ہیں۔

6 ایضاً، ص ۲۳۔۲۴

7 ایضاً، ص ۲۳

" خدا کا وہ وعدہ جس کا اس نے ابراہیم سے ذکر کیا تھا اس وقت تک تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا ہے جب تک کہ عیسائی اور مسلمان گذشتہ را صلوٰۃ کہہ کر آئندہ کے لیے باہم صلح نہ کر لیں۔" نیز، " دونوں فریق ان امور سے احتراز کریں جن سے خواہ مخواہ رنجش پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے کے بزرگوں کا احترام ملحوظ رکھیں جب کسی خاص مسئلہ پر مباحثہ ہو تو اس طرح پر ہو کہ تیسرا شخص یہ سمجھے کہ دو حقیقی بھائی کسی امر کا تصفیہ کر رہے ہیں۔ اگر مباحثہ ہو تو اصول پر ہو، فروعات سے قطعاً احتراز کیا جائے" (خدا کا ابراہیم سے وعدہ تکوین ۱۲: ۱۔۳ ؛ ۱۷: ۱۔۵ ؛سورۃ البقرۃ ۱۲۴، ۱۲۸)"[1]۔

"ہمارا قرآن" میں بائبل اور قرآن میں باہمی موافق بیانات کا نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً صفت خداوندی الرفیع کے بارے نقل کیا گیا ہے۔

رفیع	رفیع
خداوند ساری امتوں پر بلند و بالا ہے اس کا جلال آسمانوں پر ہے (زبور ۱۱۳: ۴)	رفیع الدرجات ذوالعرش ترجمہ: درجوں کا بلند کرنے والا صاحب عرش ہے۔ (۴۰: ۱۴)

پادری صاحب نے اس کتاب میں صرف بائبل اور قرآن کے باہم موافق بیانات کو ایک جگہ جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا[2] لیکن بعض مقامات پر بائبل کے بیانات کے مقابل قرآن کی بجائے حدیث سے موافقت دکھلائی ہے[3]۔

پادری سلطان محمد پال صاحب ہندو دھرم سے مسیحیت کی آغوش میں آنے والے افراد کے اپنے نئے مذہب پر اثر انداز ہونے کے بارے لکھتے ہیں؛

" بعض ہندو نژاد مسیحیوں کی تو شبانہ روز کوشش ہی یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مسیحیت کو متہند بنائیں، دیوالی کے چراغاں کو جو صریحاً ایک بت پرستانہ رسم ہے اپنے عید ولادت کے ایام میں منانے لگے۔ گرجوں میں بتوں کے نصب کرنے پر مضامین لکھنے لگے۔ مسیحی ہونے کی بجائے ہندو مسیحی نام تجویز کرنے لگے۔ اگر یہی لیل و نہار رہا تو کچھ تعجب نہیں کہ گاندھی ازم کی لہروں میں ہون کنڈ کے کناروں جا لگیں"[4]۔

اس ساری سعی کا مقصد قرآن کا بائبل سے اخذ شدہ دکھلانا مقصود ہے۔ پادری صاحب بہت سادگی سے بین السطور مسلم قاری کے ذہن میں اس اعتراض کی جگہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جنھیں مستشرقین بہت شد و مد سے پیش کرتے رہے ہیں کہ قرآن بائبل کا چربہ ہے۔ اس کا اظہار ان کے قلم سے ان الفاظ میں ہوتا ہے؛

" یہ بھی یاد رہے کہ 'ہمارا قرآن' بائبل اور قرآن کا موازنہ اور مقابلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی غرض محض یہ ہے کہ مسیحی

---

1 پال سلطان محمد، ہمارا قرآن، ص ۲۴۔۲۵

2 ایضاً، ص ۸

3 ایضاً، ص ۱۷۱۔۱۷۲، ۲۰۵

4 ایضاً، ص ۲۴

اور مسلم برادران جان لیں کہ قرآن کا کس قدر حصہ بائبل سے ماخوذ ہے۔ اور یہی وہ حصہ ہے جو قرآن کی جان ہے"[1]۔

پادری صاحب ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ بھی نکالتے ہیں کہ؛

" اسلام کو جو کچھ بھی سمجھا جائے آخر وہ مسیحیوں کا ایک فرقہ ہی ہے"[2]۔

پس ان کی اس کاوش کو اس فرمان کے تناظر میں دیکھنا غلط نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ مخاطب مسلم فریق کا اسے قبول کرنے میں متامل ہونا ہر گز بے جا نہ تھا۔ پادری صاحب کا یہ دعویٰ ہر لحاظ سے محل نظر ہے۔ اگر وہ مسیحیت اور اسلام کی مشترکہ تعلیمات کی بناء پر باہمی رواداری کی دعوت دیتے تو اسلامی دعوت "تعالوا کلمة سواء بیننا و بینکم" کے تحت مسلم حلقے سے ضرور مثبت رویہ سامنے آتا۔ لیکن کلیسیا کے تاریخی پس منظر میں شاید پادری صاحب اسلام کو ایک مسیحی فرقہ قرار دے کر اسے " تطہیر عقائد" کے تحت احتساب کے کٹہرے میں کھڑے کرنا چاہتے ہیں۔

پادری سی.جی فانڈر میزان الحق
پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۱۴ء
صفحات: ۴۷۹

برصغیر کے مسیحی تبشیری لٹریچر میں بائبل ثانی کی حیثیت کی حامل " میزان الحق" کے تذکرہ کے بغیر یہ باب ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس نے یہاں کے مسلم مسیحی مناظراتی ادب پر سے زیادہ اثرات ثبت کیے اور مذکور ہر دو حلقوں میں زبردست تموج پیدا کیا۔ مسلم مخاطبین کے لیے مسیحی منادین کے پاس سب سے بڑا علمی مرجع یہی تھا دوسری طرف مسلم علماء کے لیے بھی یہ ایک چیلنج تھا جسے انہوں نے باحسن قبول کیا۔ جس کا ثبوت اس کے رد میں مسلم علماء کی کردہ تصانیف کثیرہ ہیں۔

میزان الحق کا سب سے پہلے ۱۸۲۹ء میں جرمن زبان میں بعنوان Wage Der Wahrheit کا مسودہ مکمل ہوا۔ پھر ۱۸۳۱ء میں آرمینیائی زبان میں اس کا ترجمہ ماسکو سے شائع ہوا۔ جبکہ ۱۸۳۵ء میں اس کا فارسی ترجمہ شوشا Shusha (روس) سے ہی شائع ہوا۔ ہندوستان میں اس کے فارسی ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۳۹ء، آگرہ سے ۱۸۴۹ء میں جب کہ اردو ترجمہ مرزاپور سے ۱۸۴۳ء اور آگرہ سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا۔ لاہور سے اس کا نیا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں اور قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۲ء میں حواشی سمیت پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کی طرف سے منظر عام پر آیا۔ آخری طبع میں بعض ایسے مندرجات ہیں جو پادری فانڈر صاحب کے دسمبر ۱۸۶۵ء / شعبان ۱۲۸۲ھ میں آنجہانی ہونے کے بعد

---

1 پال، سلطان محمد، ہمارا قرآن، ص۹

2 ایضاً، ص۲۱

ضبط تحریر میں لائے گئے۔ لیکن اس اشاعت میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ ترمیم واضافہ کس کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ قاری اسے اصل مصنف کی ہی تحریر سمجھتا ہے۔ اس میں اظہار الحق از مولانا رحمت اللہ کیرانوی طبع ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء)، ہدایت الطالبین دراصول الدین از ملا محمد تقی کاشانی طبع ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء)، ینابع الاسلام طبع ۱۸۹۹ء و ینابع القرآن از پادری ڈبلیو گولڈ سیک طبع ۱۹۰۹ء کے حوالے دیے گئے[1]۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ میزان الحق شروع سے ہی حک وحذف کا شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ جب میزان الحق کے جواب میں سید آل حسن کی "استفسار" منظر عام پر آئی تو خود پادری فانڈر صاحب کو اس میں اصلاح وترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ میزان الحق کی طبع جدید ۱۸۴۹ء (فارسی) اور ۱۸۵۰ء (اردو) بلاوضاحت ترمیم شدہ ایڈیشن تھے۔ یہ ترامیم اتنی معمولی نہ تھیں کہ نظر انداز کر دی جاتیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ان ترامیم کا جائزہ اپنی تصنیف " معدل اعوجاج المیزان" میں لیا۔ مولانا کیرانوی نے یہ ضرورت اس لیے محسوس کی کہ ان تبدیلیوں سے ناواقف قاری یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مسلم علماء نے میزان الحق کے حوالہ جات غلط نقل کیے ہیں۔ اس کتاب میں اصلاح وترمیم کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کی وضاحت نہ تو مصنف خود کرتا ہے اور نہ بعد میں قطع وبرید کرنے والوں نے اس کا تذکرہ ضروری سمجھا۔ تعاقب کے نتیجہ میں نئی تصنیف نہ کرنا اور ایک ہی کتاب میں قاری کو مطلع کیے بغیر اصلاحات کرتے چلے جانا مخصوص رویہ اور ان دیکھی ضروریات کا مظہر اور علمی دیانت کے خلاف ہے۔

تین حصوں پر منقسم اس کتاب کے ۲۰ ابواب ہیں۔ پہلا حصہ چار جب کہ دوسرا اور تیسرا حصہ آٹھ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں تیسرا، چوتھا اور چھٹا باب بالترتیب اعجاز القرآن، تعلیمات قرآن، معجزات محمدی از قرآن اور قرآن ومسلم تفاسیر میں مندرج سیرت محمدی کی مباحث پر محتوی ہے۔

دیباچہ میں سچے الہام کی شناخت کے لیے چھ معیارات قائم کیے گئے ہیں۔ جنہیں کلامی انداز میں وضع کرتے ہوئے بائبل کی تصویب اور قرآن کی تردید کا نتیجہ حاصل کرنے کا مقصد مد نظر رکھا گیا ہے۔

مصنف نے بظاہر غیر جانب داری سے قاری کو قبول حقیقت کی دعوت دی ہے؛

"اس (تحقیق کے) معاملہ میں قومی اور دینی تعصب سے دست بردار ہونا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آنکھوں پر

---

1 فانڈر، میزان الحق، ا۔ ص ۵۵ حوالہ ینابع القرآن، " ینابع القرآن میں دکھلایا گیا ہے" ۲۔ ص ۳۵۷ " ینابع القرآن کے مصنف نے اس بات۔۔۔۔۔" ۳۔ ص ۳۷۵ " اس سوال کا خاطر خواہ وکامل جواب ینابع الاسلام میں دیا گیا ہے ینابع الاسلام میں مرقوم ہے" ۴۔ ص ۳۷۶ " ینابع الاسلام کا مصنف" ۵۔ ص ۶۵ " حاجی رحمت اللہ دہلوی اپنی کتاب اظہار الحق مطبوعہ ۱۲۸۴ھ جلد اول کے صفحہ ۱۱، ۱۲ پر۔۔" ۶۔ ص ۹۴ " ملا محمد تقی کاشانی اپنی تصنیف ہدایت الطالبین دراصول الدین میں جو ۱۲۸۵ھ کو اختتام کو پہنچی صفحہ ۱۶۶ پر۔۔۔۔۔" نیز ص ۳۸۲ پر اسی کتاب کا حوالہ موجود ہے۔

پردہ ڈال دے اور لوگ نور خدا کو دیکھنے سے محروم وبے بہرہ رہیں"[1]۔

اس تصنیف کا مقصد؛ "بنی آدم کی زبان میں مرقوم کتاب کے اوراق میں جہاں تک خدائے تعالے کی ذات پاک کا اظہار ہو سکتا ہے اس کے مطابق کلام اللہ بائبل ہے یا قرآن" معلوم کرنے کی کوشش بتلایا گیا ہے[2]۔

اس ضمن میں مصنف قرآن اور بائبل کو پرکھنے کے مدعی ہیں کہ آیا

۔ قرآن اور بائبل دونوں من جانب اللہ ہیں؟

۔ قرآن سے بائبل کے الہام کی تکمیل ہوئی ہے؟

۔ یا قرآن اور بائبل کی تعلیمات باہم متناقض ہیں تو ان میں سے کلام خداوندی کون سا ہے؟[3]

پادری بائبل اور قرآن کے تقابل کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ہوشیاری سے صرف بائبل کے متعلقہ قرآن کے تصدیقی بیانات سے استشہاد کر لیتے ہیں اور تعلیمات کا تقابل وموازنہ نہیں کرتے۔ جیسے پہلا باب" بائبل کے حق میں قرآن کی شہادت" پر مبنی ہے۔[4] مصنف بائبل کے بارے ان قرآنی بیانات سے استشہاد کا حق رکھتے تھے لیکن تقابلی دعویٰ کے بعد انہیں قرآن وبائبل کا تقابل وموازنہ کرنا چاہیے تھا، قرآن سے استشہاد نہیں کیوں کہ جس سے تقابل و موازنہ مقصود ہو اسی کو تائیدی استشہاد کے طور پیش کرنا علمی تدلیس ہے۔

پادری صاحب نے دیباچہ میں بغیر نام لیے اسلام پر انگلی اٹھانے کی غرض سے ایک اصول وضع کیا تھا۔

"ہر فرد بشر کا ضمیر دروغ گوئی، فریب دہی، زناکاری، دزدی (چوری)، راہزنی اور خون ریزی وغیرہ بد افعال کو مذموم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ بعض حالتوں میں جھوٹا مذہب لوگوں کو ایسا گمراہ کر دیتا ہے کہ ان مذکورہ بالا بد افعال کا ارتکاب اگر کسی معلم دین یا نبوت کے مدعی کے حکم سے کیا جائے تو مجرمانہ فعل نہیں"

پھر اسی اصول کی وضاحت میں رقم طراز ہیں؛

" یہ وہم کہ خدائے تعالیٰ کسی زمانہ میں زناکاری کو جائز قرار دیتا ہے اور کبھی منع فرماتا ہے یا بعض اوقات کسی اپنے پسندیدہ انسان پر اپنی خوشنودی کے اظہار وثبوت میں اسے اخلاق شریعت کو توڑنے کی اجازت دیتا ہے ایسا ہی باطل و بے بنیاد ہے جیسا بعض بت پرستوں کا۔۔۔"[5]۔

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۲۱

2 ایضاً، ص ۳۶

3 ایضاً، ص ۳۶

4 ایضاً، ص ۴۳

5 ایضاً، ص س ل

پادری صاحب کے وضع کردہ اصول کی اسلام بھی تغلیط نہیں کرتا۔ مخصوص پس منظر میں اس اصول سے مقصود پیغمبر اسلام کی ذات اور اسلامی تعلیمات کو نشانہ بنانا ہے۔ لیکن یہ پادری صاحب کی قلت تدبر کا نتیجہ ہے کہ اسلام اور بانی اسلام کو ہدف بناتے بناتے خود بائبل کے بیانات کو پس پشت ڈال گئے۔ درج بالا اصول کی روشنی میں بائبل کے درج ذیل بلا تبصرہ بیانات پادری صاحب اور ان کے متبعین کو دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔

بائبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک قاتل قرار دیتی ہے[1]۔ اگرچہ بائبل داؤد علیہ السلام کو نبی تسلیم کرتی ہے۔(ملوک اول ۹ : ۵؛ اعمال کی کتاب ۲ : ۲۹) لیکن ساتھ ہی اس پسندیدہ(نبی چونکہ خدا کے پسندیدہ ہوتے ہیں)اور دیگر مقدس شخصیات سے مختلف اخلاقی جرائم منسوب کیے ہیں۔

خون ریزی و قتل مخالف	ا۔سیموئیل۱۷: ۲۶۔۲۶، ۱۸:۲۶: ۲۰۔۳۰، ۲سیموئیل۴: ا۔۱۲
راہ زنی	ا سیموئیل ۳۰: ۲۰
زنا	۲ سیموئیل ۱۱: ۴
فریب دہی	۲ سیموئیل ۱۱: ۱۵
چوری	لوقا۱۹: ۳۰
دروغ گوئی	رومیوں کے نام خط ۳ : ۷

قرآن کے وحی الٰہی ہونے سے انکار کے لیے ایک لمبی تمہید کے بعد وہ پولوس کے ایک فرمان کے سہارے قاری کو یہ بتلاتے ہیں کہ انجیل کے سوا کوئی اور دوسرا الہام ہرگز قابل قبول نہیں[2]۔

مصنف ایسی کڑیاں باہم جوڑ کر اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنا چاہتا ہے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا ربط و ضبط نہ ہو۔ مثلاً پادری صاحب اناجیل کے ضبط تحریر میں لائے جانے کا تدوین قرآن سے تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

" اگر مسیح کے صعود کے بعد اناجیل کا لکھا جانا قابل اعتراض ہے تو یہی اعتراض قرآن شریف کے متعلق بھی کیا جاسکتا ہے۔ قرآن بھی تو جیسا مشکوۃ المصابیح اور دیگر مستند کتب اسلامیہ میں مرقوم ہے، حضرت محمد کی وفات کے بعد جمع کیا گیا تھا"[3]۔

قرآن کے تدوینی کام کو انجیل کے ضبط تحریر سے ملانا بڑی چابک دستی سے جھوٹ کو سچ میں ملانے کے مترادف

---

1 خروج ۲ : ۱۲

2 خود عیسائی دنیا میں ایسے بھی عیسائی رہے ہیں جو انجیل میں یوحنا حواری کی کتاب کی تعلیمات کے مطابق خدا کی طرف سے موعود نئی سچائی کے منتظر رہتے تھے۔

3 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۰۴

ہے مسلمان وہ قرآن ایک جگہ جمع کر رہے تھے جس کو وہ رسول اللہ کی زبان سے نہ صرف سن چکے تھے بلکہ حفظ بھی کر چکے تھے اور آپ ﷺ کی زیر ہدایت لکھ بھی چکے تھے۔ انہوں نے بڑی ذمہ داری اور جان فشانی سے اس کام کو مکمل کر لیا مگر اناجیل کا معاملہ اس سے کس طرح میل کھاتا ہے؟ وہ تو انجیل نویس کی اپنی مرضی پر منحصر تھا کہ کیا لکھے اور کیا چھوڑ دے[1]۔ پھر مواد کی صحت و عدم صحت کا مسئلہ الگ تھا جسے کسی طریق سے حل نہیں کیا گیا جو قبول کیا محض خوش عقیدگی سے جو رد ہوا محض سوئے ظن سے۔

" تاریخی واقعہ یہ ہے جب کلیسیا کے قصہ گوؤں نے اپنا نظام قائم کر لیا تو انہوں نے جتنی تحریریں مل سکتی تھیں اکٹھی کر لیں پھر انہوں نے رائے شماری سے فیصلہ کیا کہ اس مجموعہ کی کون سی کتابیں کلام الٰہی ہونی چاہئیں اور کون سی نہیں۔ انہوں نے متعدد کتابوں کو مسترد کر دیا بعض کو مثلاً اپوکریفا میں شامل کتابوں کو مشکوک قرار دے دیا اور وہ کتابیں جنہیں کثرت سے ووٹ ملے انہیں کلام الٰہی قرار دے دیا۔ اگر وہ کوئی اور فیصلہ کرتے تو اس وقت سے جتنے لوگ عیسائی کہلاتے ہیں ان کا ایمان کچھ اور ہوتا کیوں کہ بعض (یعنی عوام) کا ایمان بعض (یعنی ارباب کلیسیا) کے ووٹ کے تابع ہے۔ یہ لوگ جنہوں نے سب کچھ کیا، کون تھے ہمیں کچھ معلوم نہیں انہوں نے اپنے لیے کلیسیا کا عمومی نام اختیار کیا اور ہم بس اس کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں"[2]۔

بعض علاقوں میں رواج پانے والی مختلف کتابوں میں سے کلیسا کے عقائد کی تائید کرنے والی کتابوں کا انتخاب بطور مقدس کتب کر لیا گیا۔

"دوسری صدی کی آخر تک بعض علاقوں اور اقوام میں بوجوہ کوئی خاص کتاب رواج پا کر مقبول ہو چکی تھی۔ مثلاً انجیل متی شام کے علاقہ میں، لوقا یونان میں اور مرقس روم میں مقبول تھی"[3]۔

یوں بین فرق کو نظر انداز کر کے محض لکھے جانے کو بنیاد بنا کر اپنا استدلال پیش کرنا ایک غیر علمی حربہ ہے۔ بائبل کے داخلی تناقض و تضادات پر پردہ ڈالنے کے لیے اختلافِ قرآءت قرآن کا سہارا لیا ہے۔ قرآنی اختلاف قراءت کی مثال دے کر بائبل کو اس کے اختلاف متن سے بری قرار دیا گیا ہے[4]۔ یہ مصنف کا قیاس مع الفارق ہے یا پھر وہ ان دونوں کے درمیان فرق روا رکھنے سے قاصر ہیں۔

---

1 اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے اور اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں سما نہ سکتیں۔ یوحنا ۲۱ : ۲۵

2 Thomas Paine , The Age of Reason, Paris and London , 1794 , p. 10 – 1

3 ساجد میر، عیسائیت، ص ۲۷۳

4 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۲۹

پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے ہاں عہد نامہ عتیق کی کتب پر اختلاف کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

"اگر رومن کیتھولک کلیسیا کی زائد کردہ کتابیں بائبل میں شامل کر بھی لی جائیں تو مسیحی دین کی کسی تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی"[1]۔

لیکن پادری صاحب اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ پروٹسٹنٹ کلیسیاء کیتھولک کلیسیاء کی مصدقہ سات کتب تسلیم نہ کرتے ہوئے ان کے الہام کی نفی کرتے ہیں اور اگر نفی الہام سے نقص ایمان واقع نہیں ہوتا تو

۔باقی کتب کا بھی کیوں انکار نہیں کیا جا سکتا؟

۔کس الہام کی نفی سے نقص ایمان لازم آتا ہے اور کس سے نہیں؟ ان میں حد فاصل کیا ہے؟

۔نیز اگر اس سے مسیحی تعلیم میں تبدیلی نہیں آتی تو پھر پروٹسٹنٹ فرقہ کو ان کتب کے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے اور وہ انہیں قبول کرنے میں کیوں متامل ہیں؟

۔اور کیا عدم تبدیلی تعلیم کو جواز بنا کر موجودہ کلام مقدس میں حک و حذف کی مشق آج بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ اگر نہیں تو کیوں؟

عقیدہ تثلیث کی تائید میں پادری صاحب رقم طراز ہیں؛

"(تثلیث کی) اس تعلیم کو ماننا خدا کو الکافی والصمد (سورۃ اخلاص) اور غیر متغیر ماننے کی راہ سے تمام عقلی مشکلات کو دور کر دیتا ہے۔ اگر تعلیم تثلیث کو قبول کر لیا جائے تو خدا کی توحید پر ایمان اور قرآن میں خدا کے لیے صیغہ جمع متکلم کے درمیان باہمی موافقت و مطابقت بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس سے قبل تثلیث کے بارے بیان کرتے ہیں کہ صفات کی کثرت وحدت الٰہی کی متناقض نہیں ہیں"[2]۔

پادری صاحب نکتہ آفرینی کے بل پر عقیدہ ابنیت کی نفی کرنے والی سورۃ اخلاص سے تثلیث کی تائید چاہتے ہیں۔ توحید فی الذات کی تعلیمات پر مشتمل آیات قرآنیہ کی تثلیث سے تطبیق چاہنا پادری صاحب کے پورے علم الکلام کی ماہیت کا عکاس ہے۔ اور ان کی مجبوری و ضرورت کا بھی پتہ دیتا ہے۔

"اب بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد قرآن کے متن کی اصل عبارت سے کچھ حصہ خارج کر دیا گیا ہے اور کچھ آیات اور سورتیں زائد کر دی گئی ہیں۔۔۔ غالباً زید نے قرآن کی یہی مندرجہ بالا جلد تیار کی تھی اور اس کے سوا قرآن کا کوئی اور مکمل نسخہ کہیں موجود نہ تھا لہذا دوسرے مسلمانوں کے قرآنی علم کا دارومدار جب تک انہوں نے چند حصے لکھوا نہ لئے بالکل روایات پر تھا"[3]۔

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۴۱

2 ایضاً، ص ۲۳۰

3 ایضاً، ۳۲۹،۳۲۷

قرآنی علم کا دارومدار روایات پر بتلانا تلبیس اور حقائق سے روگردانی کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ترغیب دلانے پر مسلمانوں نے قرآن پاک کو آپؐ سے سن کر لفظاً لفظاً حفظ کر رکھا تھا۔ نیز خود آپ ﷺ کا کئی صحابہ سے متعدد مواقع پر قرآن کی تلاوت سننا ثابت شدہ امر ہے۔ پادری صاحب نے عمداً تدوین قرآن کی تاریخ کو نظر انداز کیا ہے۔

بائبل میں ترجمہ در ترجمہ سے پیدا ہونے والی قباحتوں کو چھپانے اور قاری کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے پادری صاحب بعض الزامی مباحث بھی اٹھاتے ہیں۔

ان الزامات میں سے ایک قرآن کے خالص عربی میں نہ ہونے کے بارے میں ہے۔ پادری صاحب بعض غیر عربی قرآنی الفاظ جیسے فرعون، آدم و عدن، ابرہیم، ہاروت و ماروت و صراط و حور و جن و فردوس تابوت، طاغوت، زکوۃ، ملکوت، جرو سکینہ و ماعون و تورات و جہنم "پیش کرکے یہ دعویٰ کیا گیا ہے

"قرآن کی زبان بالکل خالص عربی نہیں ہے۔ اگر عربی الفاظ لوح محفوظ پر مرقوم تھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی جو عبرانی و یونانی، اکدین و حبشی و فارسی الفاظ کے لکھے جانے کی مانع ہوتی لیکن ہمارے نزدیک عربی تحریر ثبوت کی محتاج ہے"[1]۔

یہ دعویٰ قابل تحقیق ہے کہ یہ متذکرہ الفاظ ان زبانوں سے ماخوذ ہیں یا ان زبانوں میں قدیم عربی زبان سے اخذ کیے گئے تھے۔ نیز قرآن نے اسم معرفہ کو اس کی اصل حالت میں رہنے دیا ہے نہ کہ تراجم بائبل کی طرح ان کا بھی ترجمہ کر دیا ہے۔ اسم معرفہ کے ترجمہ سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں بائبل خود اس پر شاہد عدل ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ آرامی زبان بولنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل آج اپنی اصل زبان میں ناپید ہے۔ بعض عربی الفاظ کو دوسری زبانوں سے ماخوذ بتلا کر قرآن کی خالص زبان پر تو معترض ہونا لیکن مکمل انجیل کا اپنی اصل زبان میں محفوظ نہ رہنے کے بارے میں چپ سادھ لینا علمی خیانت کی مثال اور قاری کو اندھیرے میں رکھنے کا مظاہرہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خود مسیحی قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صحیح نام دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مزید برآں پادری صاحب کے مطابق؛

"علاوہ بریں قرآن کی عبارت میں چند جملوں کی ساخت ایسی ہے کہ اگر وہ قرآن سے باہر کسی اور کتاب میں پائی جائے تو غلط سمجھی جائے گی۔ ایسے جملے بکثرت نہیں" بعد ازاں یہ تین قرآنی عبارتیں پیش کی گئی ہیں تلک عشرۃ کاملۃ (البقرۃ ۲: ۱۹۲)، القلوب الذین (الرعد: ۲۸)، ان ھذان لسحران (طہٰ: ۲۶) مندرج ہے[2]۔

مستشرقین اور مسیحی مناد وں کے مرغوب موضوع ماخذ قرآن کے حوالے سے پادری صاحب رسول اللہ ﷺ

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۳۳۳۔۳۳۴

2 ایضاً، ص ۳۳۴

کا کچھ مسیحی افراد سے تعلق ثابت کرتے ہیں جن سے بقول پادری صاحب آپ ﷺ سیکھ سکتے تھے۔ اس ضمن میں وہ آپ ﷺ کا سفر شام، مصری لونڈی مریم (حضرت ماریہؓ قبطی کے نام کی مغالطہ آمیزی)، ورقہ بن نوفل، ام حبیبہؓ، سلمانؓ فارسی (جنہیں پادری صاحب مسیحی گردانتے ہیں)، عبداللہؓ بن سلام (قبل از اسلام یہودی ربی) یسار اور ابو تکیبتھ (دو مسیحی غلام) اوس (راہب) حضرت زیدؓ (جنہیں سریانی مسیحی گردانا گیا ہے) کے نام پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کو بن مانگے مشورہ سے نوازتے ہیں؛

" اگر اہل اسلام یوں کہنے پر راضی ہوں کہ قرآن کو حضرت محمد صاحب نے الہام سے خود تصنیف کیا اور جبرائیل نے ان کو نہیں لکھوایا تو ان کی دلیل زیادہ مضبوط ہو"[1]۔

یہ فرمان ان کے اپنے موقف کی داخلی کمزوری کا غماز ہے۔ وہ دراصل مسلم نظریہ وحی کو "بپتسمہ" دینے کے خواہاں ہیں۔ نیز حفاظت وحی کی مسلم روایت کے مقابل مسیحی روایت تہی دامن ہے۔ پادری صاحب دوسروں کی خوبی کا اقرار کرنے کی بجائے انہیں اپنے برابر لا کھڑا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ دوسرے لوگ آپ کے بنائے ہوئے معیارات کیوں قبول کریں؟ اصل بات تو یہ پرکھنا ہے کہا جو کلام وحی کے نام پر پیش کیا گیا ہے وہ کس قدر عمدہ تعلیم اپنے اندر رکھتا ہے اور اس کی اثر انگیزی انسانی طبائع پر فطرت کے لحاظ سے کیا ہے؟

میزان الحق کے تیسرے حصے کا پانچواں باب معجزات محمدیہ کے بارے بحث پر محتوی ہے۔ آغاز میں ہی لکھتے ہیں

" کسی آدمی کے فی الحقیقت نبی ثابت کرنے کے لیے ہرگز ضروری نہیں کہ اس کو صاحب معجزات بھی ثابت کیا جائے"[2]

اسی ضمن میں اقرار کرتے ہیں، " داؤد، یرمیاہ اور دیگر بڑے بڑے انبیاء کو معجزات کی مہلت نہ ملی"[3]۔ نیز یوحنا، جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے سے ماقبل تمام انبیاء سے بڑا قرار دیا تھا[4]۔ ان کے بارے بھی پادری صاحب اقراری ہیں کہ انہوں نے بھی کوئی معجزہ نہیں دکھلایا۔ لیکن وہ یہ اصول آنحضرت ﷺ کے نبوت کی تصدیق کے لیے بدل لیتے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کی نبوت تسلیم کرنے کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی صداقت کے معجزہ دکھلائیں۔ پھر سوال کرتے ہیں کہ، " ہم دریافت کرتے ہیں کہ آپ نے کون سے معجزے دکھلائے تھے"۔[5]

دراصل مسیحی مبشرین وحی والہام اور اس کی محفوظیت کے بارے مسلم روایت سے مقابلتاً بڑھ کر کچھ پیش کرنے

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۳۴۶

2 ایضاً، ص ۳۹۱

3 ایضاً، ص ۳۹۲

4 متی ۱۱:۱۱؛ لوقا ۷: ۲۸

5 فانڈر، میزان الحق، ص ۳۹۳

سے قاصر تھے۔ نتیجتاً ان کے لب و لہجے میں مایوسی پر مبنی کرختگی، خواہ شعوری انداز میں یا غیر ارادی طور پر، در آئی جسے خود مسیحی تعلیمات سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے ہی مذہب کی اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں بلا ملال پامال کیا۔ اسی ضرورت نے انہیں دوہرا معیار اپنانے، دوسروں کی دل آزاری کرنے اور ان کے جذبات کچلنے پر مجبور کیا۔ اس کی ایک مثال زیر تبصرہ کتاب ہے۔

پادری عماد الدین تحقیق الایمان

مطبع آفتاب پنجاب، لاہور ۱۸۶۶ء

صفحات ۱۵۴

نو مسیحی پادری عماد الدین کو اپنے احوال و واقعات کے سبب اسلام میں تشکیک پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجہ میں انہوں نے مسیحیت قبول کر لی۔ وہ اس رسالہ میں ان شکوک کو مسیحی قلم سے پیش کرتے ہیں۔ وجہ تالیف لکھتے ہیں؛

"اہل مسلمانوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو (میرے) یہ شکوک رفع کریں تاکہ اسلام کی حقیقت ثابت ہو سکے اور مسلمانوں کے کام آوے نہیں تو خود بھی یہ راہ راست قبول کریں لہذا یہ رسالہ لکھا گیا اور اپنی تحقیقات اس رسالہ میں درمیان ایک مقدمہ اور دو باب و ایک خاتمہ کے بیان کی گئی اور نام اس کا "تحقیق الایمان" رکھا گیا"[1]۔

ابتداء میں اسلام اور مسیحیت کو پرکھنے کے چھ اصول تحقیق بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں تحریف بائبل پر اعجاز عیسوی از مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ثقاہت قرآن کو کم کرنے کے لیے ص ۹ تا ۱۲ وضعی سورۃ نورین اس الزام کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ نے قرآن میں درج نہیں کی تھی[2]۔

اعجاز القرآن پر قلم اٹھاتے ہوئے مسیلمہ کی قرآن کے مقابلہ میں تک بندی "الم تر الی ربک کیف فعل بالحبلی" پیش کی گئی ہے[3]۔ فیضی کی تفسیر قرآن "سواطع الالہام" سے کلام پیش کرتے ہوئے یہ تقابل کیا گیا ہے کہ

"اگر نظم کتاب دلیل نبوت کی ہے تو فیضی بالاولی نبی ہو سکتا ہے"[4]۔

آخری باب میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

---

1 عماد الدین، لاہز، تحقیق الایمان، (مطبع آفتاب پنجاب، لاہور ۱۸۶۶ء)، ص ۲

2 ایضاً، ص ۹۔ ۱۲

3 ایضاً، ص ۳۰

4 ایضاً، ص ۳۴

پادری صاحب اسلام سے منحرف شدہ شخصیت تھی۔ اپنے نئے مذہب کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے انہوں نے علمی معیار کا خیال نہیں رکھا بلکہ دلائل پیش کرتے ہوئے "شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار" کی تصویر بنے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس جوش میں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ان کی کہی بات کا مآل کیا ہو گا۔ مثلاً "ہدایت المسلمین" میں نماز کے لیے تحدید وقت پر معترض ہیں کہ اگر اس وقت کسی کا دل نہ کرے تو۔ لیکن اگر کوئی مجیب اس کے جواب میں اتوار کو عبادت نہ کرنے کے لیے دل نہ چاہنے کی بات کرے تو؟ اسی طرح سبت پر تحدید وقت کا اعتراض وارد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین ان کے طرز تحریر کو وقعت دیتے نظر نہیں آتے۔ ان کے اسلوب تحریر سے سطحیت اور بودے پن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ علمی چاشنی سے یک سر محروم پادری صاحب کی کتب دل آزاری کا شاہکار ہیں۔ ان میں علمی اعتبار سے قابل بحث امور بہت کم پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بدیسی پادری اور مناد ای ایم ویری اس نو مسیحی کے طرز تحریر کو سطحی قرار دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

پادری عمادالدین تعلیم محمدی

وکیل ہندوستان پریس، امرتسر ۱۸۸۰ء

صفحات:

تعلیم محمدی پادری عمادالدین کی دل آزار اور دشنام طراز تصنیف تواریخ محمدی کا دوسرا حصہ ہے۔ خود پادری صاحب رقم طراز ہیں؛

"اس کتاب کا پہلے حصہ میں جس کا نام تواریخ محمدی ہے اور جس سے ناظرین پر محمد صاحب کے افعال ظاہر ہو چکے ہیں کہ وہ کام خدا کے پیغمبروں کو لائق نہیں ہیں۔ اس کتاب میں جس کا نام تعلیم محمدی ہے جو تلخیص الاحادیث کا دوسرا حصہ ہے حضرت محمد صاحب کی تعلیم کا بیان کرتا ہے"[1]۔

بعد ازاں غایت تالیف کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

" میں نے خوب معلوم کر لیا ہے کہ صرف بائبل ہی خدا کا کلام ہے اور بائبل ہی والے پیغمبر خدا کے رسول ہیں، انہی ہی کی اطاعت سے شفاعت دارین حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس کلام کا مناد ہوں۔ اور سب لوگوں کو خدا کے پاک کلام کی طرف بلانا چاہتا ہوں۔ پر اہل اسلام جو میرے قدیمی بھائی ہیں محمد صاحب کو خدا کا نبی اور اس کی تعلیم کو الٰہی تعلیم بغیر فکر جان کئے بیٹھے ہیں۔ اس لئے واجب ہے کہ انہیں خبر دار کیا جائے یہ تعلیم محمدی اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور ہم جو اسے اللہ کی طرف سے نہیں جانتے اس کا سبب کیا ہے۔ پس یہ سب تالیف اور تصنیف میری محض خیر خواہی اور

---

1 عمادالدین، لاہز، تعلیم محمدی، وکیل ہندوستان پریس، امرتسر ۱۸۸۰ء، ۱۔۲ (دیباچہ)

دوستی ومحبت کے لیے ہے "[1]۔

پادری صاحب کی یہ تصنیف مذکورہ بالا اخذ شدہ نتائج کے حصول کے لیے لکھی گئی ہے جس میں بعض احادیث کو ان کے تناظر سے ہٹا کر پیش کرتے ہوئے تعلیمات محمدی کی تنقیص کی گئی ہے۔ پادری صاحب نے کمال ہوشیاری سے سیاق سے ہٹ کر بات پیش کرنے کا فقید المثال مظاہرہ کیا ہے حالانکہ وہ ان کے صحیح تناظر کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ قدیمی بھائی ہونے کے ناطے اہل اسلام کی جس خیر خواہی کے وہ مدعی ہیں، قطعاً مفقود نظر آتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ پادری صاحب کے اعتراضات کی کوئی علمی حیثیت ہے بلکہ ان میں بے جا ہٹ دھرمی اور کرختگی پائی جاتی ہے۔ اس کرختگی اور دل آزاری نے سنجیدہ طبائع کے لیے پیغام بائبل پر غور وفکر کی راہیں مسدود کر دیں کہ جس کلام کے مناد کی اخلاقی پستی کا یہ حال ہے تو عام آدمی کس درجہ میں ہوگا۔ بحیثیت مجموعی یہ تالیف بھی بے جا جوش وخروش کا اظہار ہے۔ پادری صاحب یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کی اس خیر خواہی اور دوستی ومحبت سے کسی سعید روح نے فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ برصغیر میں مسلم علماء کی طرف سے سب سے زیادہ پادری صاحب کی تحریروں کے جواب میں قلم اٹھایا گیا ہے۔

پادری عمادالدین تنقید القرآن

مشن پریس امرتسر، ۱۸۹۵ء

صفحات: ۱۸۲

مسیحی مترجم قرآن پادری عمادالدین کی قرآنیات پر یہ دوسری تصنیف ہے۔ اشاریہ نما اس مجموعہ کو تنقید القرآن سے موسوم کیا گیا ہے۔ بترتیب حروف تہجی یہ مجموعہ چار کالموں، لفظ بیان، نام سورۃ اور نمبر آیت، پر مشتمل ہے۔ پہلے کالم میں قرآنی کلمات درج ہیں، جن کے سامنے دوسرے کالم میں مرتب کے کشید کردہ معنی پر مبنی موضوعات ہیں جن میں وہ کلمہ وارد ہوا ہے۔ جب کہ تیسرا اور چوتھا کالم اس سورۃ اور آیت نمبر کی نشاندہی کرتا ہے۔ آخری دو صفحات اغلاط نامہ پر مشتمل ہیں۔

آغاز میں کلمہ ابراہیم کے تحت قرآن کے ۲۹ مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں ابراہیم کا ذکر ہے۔ پھر آخر میں رقم طراز ہیں کہ

" یہ باتیں جو ابراہیم کی نسبت قرآن میں مرقوم ہیں سب کی سب ابراہیم وموسیٰ کے صحائف میں مرقوم نہیں ہیں اب

---

1 عمادالدین، لاہز، تعلیم محمدی، ص ۲

ہم کس دلیل سے قبول کریں کہ قرآن کا بیان ابراہیم کی نسبت درست ہے بلکہ بعض باتیں صحائف ابراہیم کے خلاف ہیں اور جب بیان خلاف ہے تو نتیجہ بھی خلاف ہے اور اگر کوئی کہے کہ محمد صاحب کے الہام کے بھروسہ پر قبول کر لو تو قرآن ہی سے چاہیے کہ محمد صاحب نبی ثابت ہو جائیں حالانکہ وہ قرآن سے نبی ثابت نہیں ہیں پھر ان کا الہام کیونکر صحیح مانا جائے"

اس قول کی رکاکت اہل علم سے مخفی نہیں۔ پادری صاحب کے نزدیک معیار نبوت کیا ہے جس پر دعویٰ نبوت کو پرکھا جاسکے، وہ ظاہر نہیں ہوتا۔

لفظ قرآن کے تحت مختلف ۹۲ مقامات سے قرآن کے متعلقہ بیانات کا انتخاب کیا گیا جن پر عنوان اپنے الفاظ میں باندھا گیا ہے۔ قرآن کا تعارف ان الفاظ میں کروایا ہے۔

" لفظ قرء بمعنی جمع سے قرآن ہے۔ یعنی محمد صاحب کے الہامات کا مجموعہ ۲۰ یا ۲۳ یا ۲۵ برس میں جمع ہوا۔ اس کے بعد عثمان نے مرتب کر کے جاری کیا ہے"[1]۔

گرچہ پادری صاحب سابقہ مسلمان ہونے کے ناطے قرآن کی تاریخ تدوین سے پوری طرح واقف تھے لیکن پھر بھی یہاں ابہام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

مصنف کے قائم کردہ بعض عنوانات کچھ یوں ہیں

" قرآن کے بعد کوئی حدیث قابل ایمان نہیں ہے"[2]۔

" اگر اللہ چاہے تو محمد ﷺ کا سارا الہام یعنی قرآن اٹھالے جائے"[3]۔

قرآن خیالوں کے تر وخشک گھاس کا مٹھا ہے"[4]۔

" قرآن کو نضر بن حارث نے رستم واسفندیار کے قصہ سے کم درجہ ٹھہرایا تھا"[5]۔

پادری عماد الدین اپنے ذہن رسا تخیل کے ذریعے کشید کردہ منتخب محتویات قرآنی کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے قرآن کے بارے کوئی خوشگوار تاثر نہ ابھرے اس کے لیے وہ احادیث میں مختلف فیہ آراء کو تدلیساً استعمال کرتا ہے۔ مثلاً جلاس بن سوید کے واقعہ کو جاننے کے باوجود ایسے پیش کیا گیا کہ مسلمان قرآن کے بارے میں ایسے شک میں مبتلا تھے۔

---

1 پادری عماد الدین، تنقید القرآن، (مشن پریس امرتسر، ۱۸۹۵ء)، ص ۱۱۴

2 ایضاً، ص ۱۱۶

3 ایضاً، ص ۱۱۹

4 ایضاً، ص ۱۲۰

5 ایضاً، ص ۱۲۱

پادری غلام مسیح   ہماری بائبل اور مسلم علماء

لاہور، ۱۹۲۲ء

صفحات: ۲۰۰

برصغیر کے مسیحی مسلم مناظرانہ موضوعات میں دونوں گروہوں کی طرف سے اپنے مخاطب کی مذہبی کتاب میں تحریف کا موضوع سب سے نمایاں ہے اور یہاں کے لٹریچر میں سب سے زیادہ تحریروں کا اسی موضوع پر ہی پایا جانا اس کی دلیل ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مسیحی نقطہ نظر سے زیر نظر کتاب میں تحریف بائبل کے الزامات کا رد اور جواباً قرآن کو محرف گردانا گیا ہے۔ کتاب میں زیادہ تر بائبل پر تحریف کا الزام عائد کرنے والی ان تحریروں کا رد کیا گیا ہے جو جماعت احمدیہ کے نقطہ نظر کی حامل تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلم علماء کی تحریروں کا اجمالی طور پر جواب بھی دیا گیا ہے۔

چار ابواب پر محتوی اس کتاب کے تیسرے باب کی دوسری فصل کا عنوان " بائبل اور قرآن کا رشتہ " قائم کیا گیا ہے۔ مصنف دعوٰی کرتا ہے کہ؛

> " قرآن شریف اس بات کا شاہد ہے کہ وہ اور عیسائیوں اور یہودیوں کی کتب مقدسہ واحد ہیں یا قرآن عربی عیسائیوں کی بائبل کا ہی ایک حصہ ہے اگر بائبل تحریف و تبدیل ہو گئی ہو، اگر بائبل منسوخ ہو گئی تو قرآن عربی جو اسی محرف و منسوخ کتاب کا ایک حصہ ہے کسی طرح قابل اعتبار و عمل نہیں مانا جا سکتا ہے"۔

اور اس پر بطور دلائل سورۃ حم السجدۃ، سورۃ شوریٰ، سورۃ نور سورۃ ہود، سورۃ اعراف، سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ النجم کی آیت درج کی گئی ہیں "[1]۔

یہاں پادری صاحب نے مسلم معترضین کے موجودہ بائبل میں دعوٰی تحریف کا تجزیہ یا توضیح نہیں کی بلکہ اسی معترضہ بائبل کو اصل تسلیم کرتے ہوئے سابقہ کتب و رسل کے متعلقہ قرآنی آیات کو اسی بائبل پر منطبق کیا ہے۔ اور پھر اس سے متذکرہ بالا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اسے اگر پادری صاحب کی دانستہ تلبیس نہ بھی سمجھا جائے تو تجاہل عارفانہ سے کم نہیں۔

سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے پادری صاحب نے تیسری فصل میں قرآن میں نسخ و منسوخ پر ایک بحث درج کی ہے جس میں اس موضوع پر مسلم علماء کی مختلف فیہ آراء درج ہیں جس سے مقصود اس رائے کو سامنے لانا ہے کہ

> " ہر نبی گذشتہ شرائع کا مصدق ہے اور شریعتوں میں کچھ تضاد و تخالف نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم پر دھبہ ہے "[2]۔

---

1 غلام مسیح، پادری ہماری بائبل اور مسلم علماء، (لاہور ۱۹۲۶ء)، ص ۸۳ ۔ ۸۶

2 ایضاً، ص ۹۵

مناظرانہ اسلوب کی حامل اس کتاب کی اگلی فصل میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ " احمدی اصحاب بائبل پر تحریف کا الزام دے کر قرآن عربی کو تحریف و تنسیخ کے ماتحت لائے ہیں "[1]۔

آخری باب میں مختلف مسلم علماء کی مؤید آراء اپنے حق میں مندرج کی گئی ہیں۔ اس ساری کاوش کا مقصد قرآن کو بائبل سے تصدیقی سند عطا کروانے کا ہے کہ بائبل کے جن حصوں کی تصدیق قرآن سے ہوتی ہے وہ بائبل ہی ہے۔ پادری صاحب کا طرز تحریر شستہ، انداز قدرے دھیما، لیکن منزل مقصود تکذیب قرآن کا مخصوص تبشیری ہدف ہے۔ قرآن کے اجمالی انداز میں توریت وزبور سے اقتباس لینے پر پادری صاحب یہ اعتراض سامنے لاتے ہیں؛

" ان هذالفي الصحف الاولى صحف ابراہیم و موسیٰ " کے تحت مکمل توریت یا زبور نقل ہونی چاہیے تھی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا اس لیے قرآن نے سابقہ کتب ساوی میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے"

ایک معمولی طالب علم بھی اس سے آگاہ ہے کہ کسی کتاب سے اقتباس لینے کا مقصد یا تو تائیدی استشہاد ہوتا ہے یا پھر فریق مخالف کو الزام دینے کے لیے متعلقہ حصہ نقل کیا جاتا ہے نا کہ پوری کی پوری کتاب نقل کی جاتی ہے پادری صاحب کا یہ مطالبہ نہایت معصومانہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نظیر تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ مکمل کتاب نقل کرنے کا مطالبہ نہ صرف نرالا ہے بلکہ اس سے ماخوذ نتیجہ اس سے بھی نرالا تر ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسیحی اہل قلم قرآن کو پرکھنے کے لیے نت نئے اصول وضع کرتے نظر آتے ہیں جب کہ بائبل کی استنادی حیثیت پر گفتگو کو کار لاحاصل قرار دے کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

پادری ڈبلیو گولڈ سیک اسلام میں قرآن

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور

صفحات: ۴۸

اس مختصر رسالہ کا موضوع تحریف قرآن ہے۔ مصنف تمہیداً رقم طراز ہے؛

" اس رسالہ میں ہم اس حقیقت کو بڑے بڑے مصنفین و مفسرین اسلام کے اقوال اور ان کی تحریرات سے ثابت کریں گے کہ محمد صاحب کے وقت سے لے کر قرآن کی اس قدر تحریف و تخریب اور کانٹ چھانٹ ہوتی چلی آئی ہے کہ اب اس کو بالکل صحیح وسالم اور بالکل آنحضرت کا تعلیم کردہ قرآن تسلیم کرنا امر محال ہے "[2]۔

اس تحریر کو چھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ جو بالترتیب ہفت قرآءت قرآن، تصدیق تردید ابو بکر و عثمان،

---

1 غلام مسیح، پادری ہماری بائبل اور مسلم علماء، ص ۱۰۱

2 ڈبلیو گولڈ سیک، اسلام میں قرآن، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۵۲ء بار دوم)، ص ۵

قراءت ابن مسعود، شہادت امام حسین بر قراءت ہائے مختلفہ قرآن، شہادت بیضاوی بر قراءت ہائے مختلفہ قرآن اور شہادت احادیث دربارہ قرآن ہیں۔

پادری صاحب قرآن مجید کی عمدہ اور شستہ تحریر کے تو معترف ہیں لیکن اس کے مضامین میں تضاد و تفاوت کا الزام لگاتے ہیں۔

" اس میں کلام نہیں کہ قرآن کے بعض مقامات کی عربی نہایت ہی عمدہ اور شستہ ہے اور تمام جہان کے مسلمان اسے نہایت اشتیاق سے گا گا کر پڑھتے ہیں۔۔۔ اگر متن قرآن پر بغور نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مضامین مندرجہ قرآن بہت ہی مختلف و متشتہ ہیں "[1]۔

ترتیل کے ساتھ تلاوت قرآن کی مسلم روایت کو مصنف نے گا گا کر پڑھنے سے تعبیر کیا ہے جو مصنف کی اصول تلاوت سے عدم واقفیت کا اظہار ہے۔ ایک دوسرے پادری ٹھاکر داس بائبل کے حوالے سے خدا کی تعریف میں گیت گانے کو ایک عبادت گردانتے ہیں جب کہ قرآن کی بابت یوں فرماتے ہیں؛

" قرآن میں عبادت الٰہی کا یہ ضروری اور فائدہ مند جزو ندارد ہے اور عقائد اسلام میں گانا بجانا گناہوں میں شمار کیا گیا ہے "[2]۔

مصنف نے قرآن میں متضاد اور موافق بیانات ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اسے یہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی ہے کہ قرآن ایک طرف توریت و انجیل کی تائید و تصدیق کر کے دین یہود و دین عیسوی کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور دوسری طرف ان کے دین کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ پادری صاحب کے مطابق نتیجتاً مسلمانوں نے مجبوراً اس مخالفت کا معقول سبب یہ تراشا شروع کر دیا کہ قرآن کی مخالفت پر مبنی تعلیمات کی حامل موجودہ توریت و انجیل محرف ہیں۔ وہ در عمل میں اس تحریر کے ذریعے یہی الزام قرآن پر منطبق کرنا چاہتے ہیں کہ تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ توریت و انجیل کی مخالفت در اصل قرآن میں تحریف کا نتیجہ ہے "[3]۔

مصنف جس بات کو قرآن میں تحریف کا نتیجہ گردانتے ہیں وہی بات قرآن کی حقانیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قرآن در حقیقت بائبل میں موجود الٰہی عنصر کا مؤید و مصدق ہے نا کہ انسانی خیالات کی آمیزش کا جن کا پادری صاحبان کو اقرار بھی ہے۔[4] بجائے کہ پادری صاحبان بائبل کی اس کمزوری کو رفع کریں الٹا وہ قرآن پر معترض ہو جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ نہایت حیران کن ہے کہ مصنف بائبل میں تحریف کے قرآنی اعتراض کو مسلمانوں کی تاویلات

---

1 ڈبلیو گولڈسیک، اسلام میں قرآن، ص ۳۔۴

2 ایضاً، ص ۱۴۴

3 ایضاً، ص ۴۔۵

4 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۶۴

قرار دے دیتے ہیں۔

باب اول میں مشکوۃ کی ایک روایت نقل کی گئی ہے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ہشام ابن حکیم کو مختلف قراءت میں تلاوت کرنے پر آنحضرت ﷺ کے پاس لے آئے اور آپ نے فرمایا کہ قرآن ہفت قراءت میں نازل ہوا تھا۔ اسے بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات ہی قرآن کئی متخالف قراءتوں میں پڑھا جاتا تھا۔ یہ تخالف نہایت عظیم و خطرناک تھا[1]۔

پادری صاحب جس واقعہ سے قرآن میں تحریف کا ہوا کھڑا کرنا چاہتے ہیں وہ بجائے خود حفاظت قرآن کی بین دلیل ہے اور مسلمانوں کا اس بارے حساس ہونے کا ثبوت ہے۔ ان لوگوں کے بارے یہ گمان کرنا کہ ان سے قرآن کی کوئی آیت گم ہو گئی یا کوئی جزو شامل نہیں ہو سکا الزام تراشی اور حقائق سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے

پادری صاحب دوسرے باب میں یہ باور کرواتے ہیں کہ اس تضاد و تخالف کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بدرجہ غایت جابرانہ وسائل استعمال کرتے ہوئے رفع کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی تشکیل دی ہوئی ایک کمیٹی نے اختلاف قرآءت کے حوالے سے متنازعہ مقامات کو مکی و قریشی محاورہ کے مطابق کر دیا اور اس کے علاوہ باقی تمام نسخوں کو جلا دیا گیا۔

"اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مسلمانوں کے پاس وہی خلیفہ عثمان کا من مانا نسخہ باقی ہے"[2]۔ نیز

" یہ مصحف ابو بکر کے خلاف تھا جب کہ حضرت علی نے بھی اس کے مخالف نسخہ ترتیب دیا تھا"[3]۔

قراءت کے حوالے سے معترض لوگ اس بات کو قصداً نظر انداز کر جاتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی دسترس مدون شدہ "مصحف عثمانی" تک تھی نہ کہ لوگوں کی زبانوں پر قبضہ تھا۔ نیز یہ کوئی دو اڑھائی کلومیٹر پر مبنی مذہبی جاگیر نہیں تھی جہاں کڑے احتساب کے ذریعے لوگوں کی زبان بندی ممکن ہوتی، بلکہ ۲۴ لاکھ مربع میل پر مبنی اسلامی ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت پہلے ہی ایک معیاری قراءت پر مجتمع تھی۔ اس فیصلہ کے بعد شاذ قراءت کرنے والوں نے جماعت سے برضا و رغبت موافقت اختیار کی تھی نہ کہ بجبر۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگر سیدنا علیؓ کے پاس مصحف عثمانی سے مختلف نسخہ تھا تو انہوں نے اپنے دور خلافت میں کم از کم اپنے زیر قبضہ علاقوں میں کیوں نہ رائج کر دیا؟ حضرت عثمانؓ سے سیاسی اختلاف کی بنا پر بہت سے اعتراضات کیے گئے مگر یہ الزام آپ کے ان سیاسی مخالفین نے بھی نہیں لگایا جو آپ کی جان کے درپے تھے۔ اگر اس میں کوئی معمولی سی بھی حقیقت ہوتی تو لازماً حضرت عثمانؓ

---

1 ڈبلیو گولڈ سیک، اسلام میں قرآن، ص۹

2 ایضاً، ص ۱۱

3 ایضاً

کو اس الزام کا سامنا کرنا پڑتا۔

تیسرے باب میں مصحف ابن مسعودؓ کے متعلق روایات نقل کی گئی ہیں کہ مصحف عثمانی کی مخالفت کرنے پر ابن مسعودؓ کے نسخے کو حضرت عثمانؓ نے زبردستی چھین کر جلا دیا تھا جس میں سورۃ فاتحہ، سورۃ الطلاق اور سورۃ الناس ندارد تھیں[1]۔ مصحف عثمانی سے مختلف فیہ مصاحف علیؓ و ابن مسعودؓ کے متعلقہ روایت پادری صاحب کو اس دعویٰ تک پہنچا دیتی ہیں کہ:

> " جو قرآن اب تمام اسلامی و غیر اسلامی ممالک میں رائج ہے وہ حضرت ابو بکر، ابن مسعود اور حضرت علی کے جمع کردہ قرآن تینوں میں سے ایک کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتا فی الحقیقت موجودہ مروجہ قرآن میں جیسا کہ اس کتاب میں ثابت کیا جائیگا ایسی کانٹ چھانٹ اور تخریب و تحریف ہو چکی ہے کہ اب اسے قابل اعتماد اور قابل قبول جاننا اور حضرت محمد کا سکھایا ہوا کامل قرآن ماننا بالکل ناممکن ہے "[2]۔

اسی طرح چوتھے اور پانچویں باب میں حضرت حسینؓ اور امام بیضاوی کی مختلف فیہ قراءت کے نمونے بطور دلیل دعویٰ پیش کیے ہیں[3]۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ " اصلی قرآن کے بہت سے حصے مفقود ہیں اور موجودہ قرآن فی الحقیقت اس کتاب کا جو حضرت محمد نے اپنے پیروان کو سکھائی ایک تحریف شدہ اور ناقابل اعتماد حصہ ہے "[4]۔

آخری باب میں بعض احادیث و روایات کو ان کے تناظر سے الگ کرکے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ موجودہ قرآن اصلی قرآن کے قریباً دو ثلث کے برابر ہے۔[5] آخر میں صحیح قرآن کی عدم دستیابی کی صورت میں مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ " اس حالت میں اہل اسلام کے لیے نہایت مناسب اور بڑی دانائی کی بات ہے کہ وہ اہل کتاب کی ان کتب مقدسہ کی طرف رجوع لاویں جن پر ایمان و عمل کی خود حضرت محمد صاحب نے تاکید کی ہے "[6]۔

بعض جگہ بغیر حوالہ جات کے موضوع اور بے اصل روایات پیش کی گئی ہیں مثلاً ص ۴۵ پر ہے، " اگر قرآن کو آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو اس کو ہرگز نہیں جلائے گی "۔

یہ کتاب اسی مسیحی علم الکلام کا حصہ ہے جس کا مظاہرہ برصغیر کے مسیحی اہل قلم کی دیگر تحریروں میں کیا گیا

---

1 ڈبلیو گولڈ سیک، اسلام میں قرآن، ص ۲۰-۲۱

2 ایضاً، ص ۲۲

3 ایضاً، ص ۲۳-۳۶

4 ایضاً، ص ۳۶

5 ایضاً، ص ۳۸

6 ایضاً، ص ۴۶

ہے۔ مذکورہ مباحث وہ ہیں جو مسلم علماء کے مابین رائج رہی ہیں اور مسلمانوں کے لیے نئی بھی نہیں۔ جس تناظر اور پس منظر میں کوئی مسلم روایت پیش کی گئی ہے، معترضین ان روایات کو نقل کرتے ہوئے اس سے اپنے من پسند نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اور مسلم علماء کے اخذ کردہ صائب نتائج سے صرف نظر کرکے کلمة الحق یرید به الباطل کے تحت مخصوص تصویر کشی کرتے ہیں جس کا مقصد عامۃ الناس کو ذہنی تشکیک میں مبتلا کرنا ہے۔

پادری ڈبلیو گولڈ سیک ینابیع القرآن

کرسچین لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا، لدھیانہ ۱۹۰۹ء

صفحات: ۵۸

یہ برصغیر میں بطور مناد تبشیری خدمات سرانجام دینے والے پادری ڈبلیو گولڈ سیک کی معروف انگریزی تصنیف The Origins of The Quran کا اردو ترجمہ ہے جس کا مترجم مجہول الاسم ہے۔ ٹائٹل پر "بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ" مندرج ہے۔ مختصر دیباچہ کے عنوان سے یہ صراحت کی گئی ہے کہ؛

"اس کتابچہ میں کسی طرح کی نئی تحقیق اور جدت کا دعویٰ نہیں بلکہ اسکے بیانات زیادہ تر کسڈل، زویمر، میور اور عمادالدین کی تصانیف پر مبنی ہیں اور اس سے غرض یہ ہے کہ ان محققین کی تحقیقات کاملہ کے نتائج نہایت مختصر اور ارزاں صورت میں اہل ہند کے خواندہ اصحاب تک پہنچ جائیں"[1]۔

قرآن کو الہامی کی بجائے حالات وواقعات سے اخذ شدہ کہنے والے مصنف کے منہج کا اندازہ قاری کتاب کے ان ابتدائی الفاظ سے لگا سکتا ہے؛

"تمام دنیا میں اسلام من مانا مذہب کہلا سکتا ہے۔ محمد صاحب بانی اسلام نے ان تمام مختلف اور مطلب کی باتوں کو جن تک آپ کی رسائی ہوئی اسلام میں داخل کر لیا ہے"[2]۔

چار ابواب پر مشتمل اس کتاب کی محتویات یوں ہیں۔

باب اول بدوی عقائد و رسوم کا قرآن میں اندراج

باب دوم یہودی عقائد و رسوم کا قرآن میں اندراج

باب سوم مسیحی عقائد و رسوم کا قرآن کا اندراج

باب چہارم قرآن کے وہ حصے جو بر وقت حاجت وضع کیے گئے

---

1 ڈبلیو گولڈ سیک، پادری، ینابیع القرآن، (کرسچین لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا، لدھیانہ ۱۹۰۹)، ص ا

2 ایضاً، ص ۲

پہلے باب میں پادری صاحب اس بات کے مدعی ہیں کہ قرآن وحی الہی کی بجائے عرب میں رائج رسومات و روایات، سیریا اور فارس کے لوگوں میں متداول بعض مذہبی قصے کہانیوں سے اخذ شدہ ہے۔

" محمد صاحب کا سرقہ رسوم و روایات اہل عرب تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ آپ کو سیریا اور دیگر مقامات کے سفر کا اتفاق ہوا اور وہاں اہل فارس اور دیگر اقوام و مذاہب کے لوگوں سے واسطہ پڑا۔ اس سے آپ کو جنت و جہنم اور روز انصاف اور سزا و جزا کے متعلق بہت سے خیالات مل گئے جو آپ نے بعد میں کچھ ردو بدل کر کے خاص قریشی عربی میں پیش کیا اور فرمایا یہہ سب کچھ جبرائیل آسمان سے لایا ہے "[1]۔

دین ابراہیمی کی بنیادی تعلیمات پر مبنی قرآن پر پادری صاحب نے اپنے وقت کے بت پرست عربوں کی بہت سی رسوم کو درج کرنے کا الزام تو دھرا ہے لیکن اس کی کوئی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے۔ مصنف کے اپنے مذہب مروجہ مسیحیت کے دامن کا سب سے بڑا دھبہ یہی ہے کہ اس میں بت پرست مشرک اقوام کی بہت سی رسومات شامل کر لی گئی ہیں۔ مسیحی مناداوں کے لیے یہی بات مسلسل سوہان روح بنی رہی ہے کہ مسیحی مذہب میں شامل مشرک اقوام کی رسومات کی کیا وجہ جواز پیش کی جائے۔ جب کہ اسلام کا دامن ایسی بت پرستانہ رسومات سے قطعاً پاک ہے۔

دوسرے باب کا خلاصہ یہ تحریر قرار دی جاسکتی ہے،

" محمد صاحب نے اپنے ہم عصر یہودیوں کی زبانی جو کچھ سنا اسے کتب آسمانی کا جز خیال کر کے اپنے حسب منشا لکھ رکھا اور بعد میں جاہلوں کے سامنے وحی آسمانی کے نام سے پیش کر دیا"[2]۔

نیز یہ کہ " ان افسانوں کا قرآن میں پایا جانا ہی بڑا بھاری ثبوت ہے اور اس امر کی اعلیٰ دلیل ہے کہ قرآن اختراع انسانی ہے "[3]

اس دلیل کا وزن اور مرتبہ دونوں پادری صاحب کے الفاظ سے روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

مصنف اپنا ذہن کھول کر قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے جب وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے؛

"اگر محمد صاحب کو سچی مسیحیت سے سابقہ پڑتا تو غالباً دنیا میں ایک جھوٹا مذہب کم ہوتا اور ایک مسیحی مصلح زیادہ "[4]۔

مصنف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انجیل سے بے خبری کا الزام ان الفاظ میں لگاتا ہے،

" رسول عربی انجیل کی صحیح تعلیم سے بے خبر تھے اور ان کی یہہ لیاقت و قابلیت نہ تھی کہ ان بدعتی مسیحیوں کی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ لہذا کچھ تعجب نہیں کہ آپ نے ان شنیدہ افسانوں کو قرآن میں درج کیا اور وحی آسمانی کے نام کی مہر ان

---

1 گولڈ سیک، ینابیع القرآن، ص ۱۰

2 ایضاً، ص ۲۲

3 ایضاً، ص ۲۶

4 ایضاً، ص ۳۳

پر بھی لگادی اور کہا کہ یہہ الہام پہلی کتابوں کی تائید و تصدیق کرتا ہے"[1]۔

ایک اور الزام ان الفاظ میں لگایا گیا ہے،

"اس امر میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن کے بہت سے حصے حضرت محمد نے حسب ضرورت اپنی مطلب براری کے لیے وضع کر لئے تھے"[2]۔

قاری یہ ضرور جانچ سکتا ہے کہ اتفاقی تشابہت یا ایک ہی سلسلہ کی کڑی کے داعی قرآن کا تعلق دیگر ماخذوں سے جوڑنے میں پادری صاحب کو کتنے تکلف اور عرق ریزی کے مرحلہ سے گذرنا پڑا ہو گا۔

کتاب کے آخر پر مصنف مسلمان محققین سے "ان حقیقتوں" پر غور کرنے کی یوں دعوت دیتا ہے،

"مسلمان محققین سے درخواست ہے کہ ان حقیقتوں پر غور کریں اور اگر ایسا کریں تو ان پر یہہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو جائیگی کہ قرآن کا وحی آسمانی اور خدا کی طرف سے ہونا بالکل ناممکن ہے"[3]۔

پادری کلیئر ٹسڈل کی تصنیف ینابیع الاسلام مطبوعہ لاہور ۱۸۹۹ء میں قرآن کے حوالے سے یہی باتیں درج ہیں۔ جن کی بازگشت زیر تبصرہ کتاب میں بھی ہے۔

ڈبلیو ایچ ٹی گیرڈنر آیت رجم

کرسچین لٹریچر سوسائٹی، مدراس س ن

صفحات: ۲۷

برصغیر کے مسلم مسیحی مناظرانہ ادب میں سب سے زیادہ زیر بحث موضوع "تحریف" کا ہے جس پر مسلم علماء اور مسیحی اہل قلم نے اپنے اپنے موقف کے دفاع اور مخالف پر اعتراض کے حوالے سے قلم اٹھایا۔ مسیحی اہل قلم بائبل کو تحریف سے مبرّا اور الزامی طور پر قرآن کو محرف ثابت کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ زیر نظر کتابچہ اسی ضمن میں آیت رجم کے حوالے سے قلم بند کیا گیا ہے۔ چار ابواب پر مشتمل یہ رسالہ عرب ممالک میں تبشیری خدمات سرانجام دینے والے پادری گیرڈنر کی تحریر کا اردو ترجمہ ہے۔ اشاعت ہذا کی محتویات درج ذیل ہیں۔

باب اول قرآن میں آیت رجم

باب دوم آیت رجم اور کبار صحابہ

باب سوم محمد صاحب کے عہد میں آیت رجم توریت میں موجود تھی۔

---

1 گولڈ سیک، ینابیع القرآن، ص ۳۴

2 ایضاً، ص ۴۱

3 ایضاً، ص ۵۷

باب چہارم   توریت میں آیت رجم

تمہید میں غرض تالیف یوں بیان کی گئی ہے۔

" اس رسالہ کی اشاعت سے ہماری غرض سہ گانہ ہے۔ اول ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیت رجم کتاب مقدس سے نہیں بلکہ قرآن سے نکال ڈالی گئی ہے اور یوں ہمارے مسلمان دوستوں کا الزام خود ان پر ہی عائد ہوتا ہے۔ دوم یہ ثابت کرنا کہ یہ آیت توریت میں موجود ہے سوم اسی آیت کے متعلق اس واقعہ کو بیان کرنا جو محمد صاحب کے ایام میں ہوا اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ توریت جس طرح محمد صاحب کے زمانہ میں ہر طرح کی تحریف سے بری تھی اسی طرح اب بھی ہے "[1]۔

بعض آثار و روایات سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آیت رجم پہلے قرآن میں موجود تھی جسے کبار صحابہ کرام بھی جانتے تھے مگر بعد میں اسے موجودہ قرآن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں وہ بلا حوالہ ابو عبیدہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے جس میں ابیؓ بن کعب سے پوچھا گیا تھا کہ آیت رجم کیا تھی؟ انہوں نے جواب دیا، " اذا زنا الشیخ والشیخۃ فارجموھما البتۃ [2]

نیز یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ آپ کے دور میں توریت تحریری صورت میں موجود تھی اور چونکہ اس میں وہی آیت رجم موجود تھی جو موجودہ توریت میں بھی ہے اس لیے توریت غیر محرفہ ثابت ہوتی ہے اور مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ توریت محرفہ ہے اور اس سے آیت رجم نکال دی گئی ہے۔ یہ توریت کتاب استثنا باب ۲۲ آیات ۲۲ تا ۲۴ موجود ہیں۔ پھر ان کا ترجمہ یوں دیا گیا ہے۔

" اگر کوئی مرد شوہر والی عورت سے زنا کرتے پایا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔ مرد جس نے اس عورت سے صحبت کی اور عورت بھی۔ سو تو بنی اسرائیل میں سے شر کو دفع کیجیو۔ جو لڑکی کہ کنواری ہے اور وہ کسی کی منگیتر ہو اور کوئی اور شخص اسے شہر میں پاکے اس سے ہم صحبت ہو تو تم ان دونوں کو اس شہر کے دروازے پر نکال لاؤ اور تم ان پر پتھراؤ کرو کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسایہ کی جورو کو رسوا کیا سو تو شر کو اپنے درمیان سے دفع کیجیو "[3]۔

مصنف اس بات کا مدعی ہے کہ انجیل یوحنا کے مطابق یہ آیت مسیح کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انجیل یوحنا کے مطابق خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس حکم پر عمل سے اجتناب برتا۔ مصنف ان

---

1 گیرڈنر، ڈبلیو ایچ ٹی، آیت رجم، (مدراس، س۔ن)، ص ۶۔۷

2 اس روایت کو الاتقان میں جلال الدین سیوطی نے نقل کیا ہے۔ السیوطی، جلال الدین، الاتقان فی معرفۃ علوم القرآن، (مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۵۱ء) ج ۲، ص ۲۶

3 گیرڈنر، آیت رجم، ص ۲۶

کے اس فعل کا سہارا لے کر اس حکم کے لاگو کرنے کو پیشوا کے فیصلے سے مشروط کر دیتا ہے[1]۔

مصنف کے نزدیک اہل کتاب کی نسبت تحریف کے زیادہ مجرم خود اہل اسلام ہیں،

"اب اگر مسلمان ہم پر کتاب مقدس کی تحریف کا الزام صرف اس لئے لگاتے ہیں کہ کسی ایک یہودی نے سنگسار کی آیت پر اپنا ہاتھ اسے محمد صاحب کی نظر سے چھپانے کے لئے رکھ دیا تھا تو کس قدر زیادہ ہم ان پر اس آیت زیر بحث کو قرآن میں سے قصداً و عملاً خارج کر کے تحریف کا الزام عائد کر سکتے ہیں"[2]۔

اس رسالہ میں مصنف نقلی دلائل کی بنا پر مسلمانوں کو تحریف کا مجرم ثابت کرنے کا خواہاں ہے، لیکن یہ ان کی اسلامی علوم میں درک نہ ہونے کے سبب کم فہمی اور غلط تشریح کا اظہار ہے۔

پادری کینن ای سیل   جنگ بدر و جنگ احد (مترجم: پروفیسر محمد اسمٰعیل)

مطبوعہ مشن پریس الہ آباد، ۱۹۱۹ء

صفحات: ۸۰

بغیر ابواب بندی دو حصوں پر مشتمل اس کتاب میں جنگ کے بارے کلیسیائی نقطہ نظر سے دو اسلامی غزوات کو جانچا گیا ہے۔ اور ان کے متعلقہ آیات قرآنی سے خاص طور پر یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن الہامی کتاب نہیں بلکہ حالات و واقعات کے نتیجہ میں ذہن محمدی کی پیداوار ہے۔

جنگ احد کے بارے نازل شدہ آیات کے متعلق فرماتے ہیں؛

"اب وحی آسمانی کے پیغام بکثرت آنے لگے اور اس بات کی تفہیم ہونے لگی کہ شکست آنحضرت کے پیروان کی وفاداری کو آزمانے اور ان کی نافرمانبرداری کے نتائج کو ظاہر کرنے کی غرض سے تھی۔ اب بھی فتح بدر خدا کی خوشنودی کا خاص نشان بیان کی جاتی تھی کیا اب شکست ایسی نہ تھی کہ جس طرح فتح بدر عنایت الٰہی قرار دیں اس نازک حالت میں سورۃ عمران کی بہت سی آیات اسی شکست کی تفہیم سے مخصوص ہیں۔ قرآن کی تواریخی تکمیل کی یہ نہایت عمدہ مثال ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت کے واقعات زندگی کی تبدیلیوں کے مطابق وحی آسمانی بھی تبدیل ہوتا رہتا تھا"[3]۔

اس پوری کاوش میں پادری صاحب کے ذہن رسا نے تخیل کے زور پر اپنے اعتراض کے تانے بانے بنے ہیں۔ جنہیں کلیساء کی چاردیواری میں تو پذیرائی مل سکتی ہے لیکن سیرت نبوی اور مسلم تاریخ پر نظر رکھنے والا ایک عام قاری بھی ان خلاف حقیقت باتوں کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حقائق سے صرف نظر کرتے

---

1 گیرڈنر، ڈبلیو ایچ ٹی، آیت رجم، ص ۲۷

2 ایضاً، ص ۱۷

3 کینن سیل، ڈاکٹر، جنگ بدر و جنگ احد، (مترجم: پروفیسر محمد اسمٰعیل)، (مشن پریس، الہ آباد ۱۹۱۹ء)، ص ۷۱

ہوئے پہلے سے طے شدہ نتیجہ ثابت کرنے کی غرض سے یہ تحریری کوشش کی گئی ہے تاکہ مسلمانوں کو آغاز سے ہی لوٹ مار اور امن وآشتی کو برباد کرنے والا گروہ دکھلایا جائے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس دور میں اسلام کے خلاف زیادہ سے زیادہ ہرزہ سرائی کرنے والے کو بڑی علمی شخصیت متصور کیا جاتا تھا۔اس تحریر سے یہ مقام حاصل کرنے کی غرض وغایت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر کینن سیل　　　القرآن

کرسچین لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا، پنجاب لودھیانہ ۱۹۱۹ء

صفحات : ۳۱

نقد قرآن، خصوصاً ماخذ قرآن، پر قلم اٹھاتے ہوئے مؤلف،بدون فہرستِ مضامین، ابتداء میں معتزلہ کا نظریہ ازلیت قرآن بیان کرتے ہیں، اور سید امیر علی اور مولوی چراغ علی کے نظریات کو معتزلی بازگشت گردانا گیا ہے[1]۔

معترضین قرآن کے مرغوب موضوع "ماخذ القرآن " کے حوالے سے رقم طراز ہے۔

" ماہران (کذا) علوم مشرق نے ینابع القرآن کی خوب تحقیق کی ہے اب بالاتفاق بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت نے اپنے ملک اور اپنے زمانے کے بہت سے افسانوں مثلاً یہودیوں کی احادیث وروایات اور عرب وسیریا کے مسیحیوں کے رائج افسانوں اور داستانوں کو قرآن میں داخل کر لیا ہے"[2]۔

اس ضمن میں آنحضرتؐ کا قرآنی قصہ اصحاب کہف،بدعتی مسیحیوں سے سن کر بیان کرنے کو سریع الاعتقاد مسیحیوں سے زیادہ خطاوار نہیں گردانا جنھوں نے اسے امر واقع مان رکھا تھا[3]۔ بعد ازاں زرتشتی مذہب سے متشابہ قرار دے کر قرآن میں مذکور" آنحضرت ﷺ کا معراج، اسلامی بہشت وحوران بہشت،نور محمدی اور الصراط"کو زرتشتی تعلیمات سے ماخوذ قرار دیا ہے[4]۔

قرآن میں اہل کتاب اور ان سے متعلقہ مباحث کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ " جو کچھ آپ نے یہودی اور مسیحی دین کے بارے میں لکھا ہے وہ سب کا سب زیادہ تر جعلی اناجیل اور یہودی احادیث سے لیا گیا ہے"[5]۔ نیز

1　کینن سیل،ڈاکٹر،القرآن،(کرسچین لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا،پنجاب لودھیانہ ۱۹۱۹ء)،ص ۵

2　ایضاً،ص ۴

3　ایضاً،ص ۹

4　ایضاً،ص ۶

5　ایضاً،ص ۹

"مریم طاہرہ کی تواریخ بھی قریباً سب کی سب جعلی اور غیر معتبر اناجیل سے لی گئی ہے"[1]۔

اسی طرح واقعہ آدم و ابلیس، قابیل و ہابیل، و ہاروت و ماروت کو سنی سنائی یہودی روایات سے ماخوذ گردانا ہے۔ کیونکہ مصنف کے نزدیک؛

"قرآن کے جو حصے یہودی تواریخ سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان کی بنیاد آنحضرت کے عہد عتیق کے علم پر نہیں بلکہ سنی سنائی حکایات و داستانوں پر ہے جو آپ یہودیوں سے سنا کرتے تھے"[2]۔

مؤلف نے تعلیمات قرآن کے حوالے سے تبصرہ کیا ہے کہ "قرآن کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ وہ متناقض و متبائن تعلیمات سے بالکل خالی ہے صحیح نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ اگر قرآن کی تعلیمات متناقض و متبائن نہ ہوتیں تو محمد ﷺ کی حکمت ہمیشہ متغیر و متبدل نہ ہوتیں"[3]۔

۳۱ صفحات کے اس کتابچہ میں معروضی اعتبار سے کوئی نئی نقد و جرح نہیں کی گئی بلکہ قبل ازیں مستشرقین کے دہرائے گئے روایتی سطحی الزامات کو ہی اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ جس میں امام بیضاوی، سید امیر علی اور مولوی چراغ علی کی شاذ آراء سے استشہاد کیا گیا ہے۔ علماء اور مسلم شارحین کی آراء کو اصل بنا کر قرآن پر معترض ہونے کا مستشرقین کا مخصوص حربہ اختیار کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جن مقامات قرآنیہ کو بعض مفسرین سمجھنے سے قاصر رہے اُن کی کردہ تشریح مستشرقین کے گروہ کو اپنے مقاصد کے لیے بہت مرغوب ہوتی ہے۔ وہ شاذ آراء کو بڑی خوبی سے اپنے حق میں استعمال کرنے کا گر جانتے ہیں۔ مؤلف کا قوی مقصد صرف فریق مخالف کو فکری طور پر الجھاؤ کا شکار کرنے کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

ہلاسی رام بابو　　تحریف قرآن یا بائبل

حسن بلڈنگز، بیڈن روڈ، لاہور ۱۹۲۹ء

صفحات: ۶۸

تحریف کے حوالے سے قرآن اور بائبل کے تقابل پر مبنی یہ کتاب دو حصوں پر مبنی ہے۔

پہلا حصہ　　صحت بائبل مقدس یعنی ابطال دعویٰ تحریف بائبل

دوسرا حصہ　　تحریف قرآن

1　کینن سیل، القرآن، ص۹

2　ایضاً، ۱۳

3　ایضاً،

۳۹ صفحات پر مشتمل پہلے حصے میں عدم تحریف بائبل پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس میں مکمل بائبل کی بجائے صرف اناجیل کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور عہد نامہ قدیم کے بارے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ نیز مسلم علماء کے تحریف بائبل کے بارے داخلی اعتراضات پر کوئی گفتگو نہیں بلکہ صرف تاریخ و تدوین اناجیل پر خارجی اعتراضات کا روایتی جواب دیا گیا ہے۔ اسفار متروکہ اور جعلی اناجیل کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

بائبل میں اختلاف قراءت کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

" گیارھویں صدی میں مدرسہ تبریاس کے منصرم ہارون بن اشر اور مدرسہ بابل کا مہتمم یعقوب بن نفتالی نے ملکر مغربی اور مشرقی یہودیوں کے نسخوں کی جانچ کی اور آٹھ سو چونسٹھ سے زیادہ مختلف قراءتیں جو ایک کے سوا باقی کل اہل عرب کی تھیں دریافت کین۔ قرآن شریف کا جھگڑا ابھی قرآءتوں پر ہی رہا ہے۔ کیونکہ یہ کتاب خاص عرب میں حضرت محمد صاحب سے منسوب کی گئی ہے جس میں اور بھی عیاں ہے کہ قرآءتیں صرف عرب کی ایجاد ہیں"[1]۔

اسی اعتراض کے ضمن میں مزید لکھتے ہیں؛

" ڈاکٹر مل نے عہد جدید کے نسخے ملائے تو تیس ہزار اختلاف عبارت کے نشان دیئے اور اگریساخ نے ڈیڑھ لاکھ بتائے"[2]۔

اس بحث کے اختتام پر بہائی مذہب کی کتاب "مستطاب ایقان" اور احمدیہ انجمن کے نمائندہ آرگن "پیغام صلح" زیر ادارت مولوی محمد علی سے عدم تحریف بائبل کی تائید میں تحریر پیش کی گئی ہے[3]۔

ص ۴۰ سے شروع ہونے والی دوسری بحث بعنوان تحریف قرآن تین ابواب پر مشتمل ہے۔ تحریف اور نسخ کی وضاحت کرنے کے بعد باب اول "نقصان قرآن و تحریف قرآن" کے عنوان سے ہے۔ مسلم روایات عن نسخ فی التلاوۃ سے موجودہ مصحف میں بعض آیات کے مفقود ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ مثلاً آیت رجم، آیت رضاعت، آیات سورۃ فاضحہ (سورۃ توبہ)، سورۃ حفد و خلع کے متعلقہ روایات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سورۃ نورین درج کی گئی ہے[4]۔

پادری صاحب اس باب میں کوئی نیا علمی اعتراض نہیں اٹھاتے بلکہ تحقیق الایمان از پادری عمادالدین اور تاویل القرآن از پادری اکبر مسیح کے بیانات دہرانے پر اکتفا کرتے ہیں۔

باب دوم کا عنوان " موجودہ قرآن میں زیادتی" ہے۔ تفسیر الدر المنثور و اتقان فی علوم القرآن از السیوطی، تفسیر کبیر از فخر الدین الرازی، معالم التنزیل للبغوی، اور جامع الصحیح للبخاری میں واردہ شاذ قراءت کی روایات کا حوالہ

---

1 بابو، ہلاسی رام، تحریف قرآن یا بائبل، (حسن بلڈنگز، بیڈن روڈ، لاہور ۱۹۲۹ء بار اول)، ص ۱۸

2 ایضاً، ص ۱۸

3 ایضاً، ص ۳۱، ۳۶

4 ایضاً، ص ۴۶۔ ۵۲

دے کر قرآن میں زائد الفاظ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ بحث بھی نئی نہیں ہے بلکہ تحریف قرآن از ماسٹر رام چندر سے ماخوذ ہے۔

آخری باب میں جمع و تدوین قرآن پر نقد ہے۔ اس میں تدوین و تاریخ مصحف عثمانی کے علاوہ مصحف ابن مسعود، مصحف ابن کعب کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس باب کا تانا بانا زیادہ تر تاویل القرآن از اکبر مسیح اور تحقیق الایمان از پادری عماد الدین سے مواد کشید کر کے بنا گیا ہے۔ ایک غیر معروف شیعہ تحریر "انوار القرآن" کی بنیاد پر مسلم نقطہ نظر کے برعکس غیر مقبول بیانات سے استشہاد کیا گیا ہے۔

اہل اسلام کو ایک دلچسپ و عجیب مشورہ سے نوازا گیا ہے۔

> " اگر (ان گم شدہ) مصحف کی تلاش پرانی سے پرانی عمارتوں اور قبروں میں اہل اسلام کریں تو ممکن ہے کہ اصلی مصحف یاب ہو جاوے۔ کیونکہ تواریخ اور موجودہ زمانہ کے دریافت کنندگان نے قبروں اور پرانی سے پرانی عمارتوں میں بائبل مقدس کے حصے اور قلمی نسخے وغیرہ حاصل کر لیے ہیں اور اسی طرح ممکن ہے کہ اصلی قرآن بھی مل سکے۔ مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ اہل اسلام ہرگز یہ کوشش نہ کریں گے بلکہ پرانی عمارتوں اور قبروں کی حفاظت اس لیے بھی اور زیادہ کریں گے تا کہ حضرت محمد صاحب کی وہ تعلیم جو دراصل انہوں نے اہل عرب کو دی تھی دنیا میں مثل سورج چمک نہ پڑے "[1]۔

پادری صاحب معصومانہ انداز میں تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ جن اصولوں پر موجودہ قرآن کو محرف شدہ گردان کر اہل اسلام کو "اصلی قرآن" ڈھونڈھ کر اپنانے کا مشورہ دیا جا رہا ہے، کیا انہیں اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے مسیحی دنیا حال ہی میں بازیافت ہونے والی انجیل بمطابق یہوداسکریوتی (یہ انجیل ۱۹۸۰ میں دریافت ہوئی اور اکیسویں صدی کے آغاز میں قبطی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی) کو مروجہ اناجیل کے شرعی متن میں شامل کرنے پر آمادہ ہوگی جب کہ وہ ہر قسم کی تحریف کی آلائش سے بھی پاک ہے؟

مجموعی طور پر اس کاوش کو سابقہ مسیحی تحریرات کی نئی مشق قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس سے پیشتر لکھی جانے والی بعض کتب کی تلخیص یکجا مل سکتی ہے۔

مصنف مجہول الاسم　　　منار الحق

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور

صفحات: ۲۲۴

زیر نظر کتاب میں قرآنی بنیاد پر مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان متنازع فیہ چھ مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ پہلا باب مسلمانوں کا قرآن کو معجزہ کہنے کی نفی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی

---

1 بلاسی رام، تحریف بائبل یا قرآن، ص ۵۶

معجزہ عطا نہیں ہوا تھا اور اس پر چھ آیات قرآنیہ پیش کی گئی ہیں۔

دوسرے باب میں پندرہ آیات قرآنیہ اس دعویٰ کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ محمد (ﷺ) کو اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ جبر کرے اور لوگوں کو زبردستی سے اپنے مذہب میں شامل کرے۔

تیسرا باب قرآن کی ناسخ و منسوخ آیات کی بحث پر مشتمل ہے۔

چوتھا باب قرآن پاک سے استشہاد کرتے ہوئے عدم تحریف بائبل کی بحث پر محتوی ہے۔ اس میں بائبل اور تورات کے عمومی ذکر پر مشتمل چودہ آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں سات آیات قرآنیہ سے یہ کشید کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نبوت والہام صرف بنی اسرائیل کو دیا گیا ہے۔ (لیکن جائے حیرت یہ ہے کہ عہد نامہ جدید میں یہی الہام غیر از بنی اسرائیل قبول کرلیا ہے اور نہ صرف کتب قبول کر لی گئی ہیں بلکہ عقائد تک۔ غیر بنی اسرائیل لوقا اور مرقس انجیل نویس ہیں جن کے بغیر حضرت عیسی علیہ السلام کا صعود آسمان کا عقیدہ ممکن نہیں)

اور چھٹے باب میں بزعم خویش الوہیت کو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کرنے والی پانچ آیات پیش کی گئی ہیں۔

ان ابواب کے بالترتیب علمی تجزیہ سے عیاں ہوتا ہے کہ مصنف زیادہ تر تاویل باطلہ سے کام لیتے ہوئے اپنا دعویٰ پیش کرتا ہے۔

پہلے باب میں اعجاز قرآنی کی نفی اور آپ کو کوئی معجزہ نہ دئے جانے کے دعویٰ میں جن آیات قرآنیہ سے استدلال کی گیا ہے وہ مصنف کی ذہن رسا سوچ کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دیگر آیات کی موجودگی میں ان آیات کا سیاق سباق اور پس منظر مصنف کے دعویٰ کی نفی کرتی ہیں۔

دوسرے باب میں مصنف نے بڑی ہوشیاری سے ایک دعویٰ مسلمانوں کی طرف منسوب کرکے اس کی نفی کی ہے۔ اسلام نے کبھی بھی جبر سے کسی کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ اسلام کا دعوتی مزاج یہ ہے کہ مخاطب کو احسن طریقے سے اسلامی تعلیم سے روشناس کروایا جائے اور اسے خداداد عقل سے پرکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا جائے۔ ارشاد باری تعالی ہے، إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا [1]

پیغمبر کا مقام ایک مبلغ کا مقام ہے نہ کہ وہ کوڑا ہاتھ میں لیے ایک داروغہ کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔

تیسرے باب میں مصنف ناسخ و منسوخ آیات قرآنی پر بحث کرتا ہے۔ مسلم نقطہ نظر کے مطابق حالات و واقعات کے تناظر میں احکامات میں تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ بات مدنظر رہے کہ ناسخ و منسوخ احکام میں ہے نہ کہ عقائد میں۔ لیکن مصنف مثبت انداز میں اس مسئلہ کو سمجھنے کی بجائے مسیحی ذہن سے یہ رائے زنی کرتا ہے؛

---

1 الدھر ۷۶: ۳

"کیا یہ کہنا خدا کی توہین کرنا کہ وہ ایک بات کرتا ہے پھر اس کو منسوخ کرکے اس کے برخلاف حکم کرتا ہے"[1]۔

مصنف اسے اختلاف قرآن اور تضاد بیانی پر محمول کرتے ہوئے سوال کرتا ہے کہ؛

"کیا ناسخ آیتیں منسوخ آیتوں کے خلاف نہیں اور منسوخ ناسخ کی ضد نہیں۔ اے مسلمان تو کس لیے ان کو متبائن اور متضاد نہیں کہتا۔ کیا تو نے اس باب میں کئی ایک آیتیں نہیں دیکھیں جو باہم مختلف اور متضاد ہیں جن سے ثابت ہوتا کہ قرآن میں اختلاف کثیر ہے"[2]۔

اگر ناسخ و منسوخ کو باہم متضاد مان بھی لیا جائے جیسا کہ مصنف باور کروانا چاہتا ہے تو پھر بھی یہ چند مخصوص احکام میں ہی ہوگا جن کی تاویل ممکن ہے ۔جب کہ بائبل تو تناقضات و تضادات سے اس قدر مملو ہے جن کی کوئی تاویل و توجیہہ بھی نہیں کی جا سکتی۔

برصغیر کے مسلم مسیحی مکالمہ میں سب سے زیادہ زیر بحث رہنے والا موضوع تحریف بائبل ہے۔ مصنف چوتھے باب میں اس پر قلم اٹھاتے ہوئے بائبل کے بارے عمومی قرآنی آیات یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ چونکہ قرآن بائبل کی تصدیق کرتا ہے اس لیے موجودہ بائبل تحریف سے پاک ہے۔

یہاں مصنف قرآن کی متذکرہ بائبل پر مروجہ انجیل و بائبل کو منطبق کرتا ہے حالانکہ قرآن حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل شدہ وحی کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ صدیوں بعد محض یادداشت سے احاطہ تحریر میں لائے گئے ترجمہ شدہ عہد نامہ قدیم اور متی لوقا، متی اور یوحنا کی طرف منسوب باتوں کی۔ مصنف کا قصداً تدلیس سے کام لیتے ہوئے صداقت بائبل پر آیات قرآنی کی شہادت خلاف واقعہ ہے۔

پانچویں باب میں نبوت والہام کو بنی اسرائیل میں حصر کرنا مصنف کی بہت بڑی جسارت ہے۔ کیونکہ نبی اکرم کے بنی اسماعیل کے پس منظر میں قرآن سے یہ دعویٰ کشید کرنا سراسر یحرفون الکلمة عن مواضعه تحریف معنوی کی واضح مثال ہے۔ الہام کو بنی اسرائیل میں حصر کرنے کا مسیحی دعویٰ کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ (مسیحی عقیدہ کے) خدا کے ایک اقنوم کو بنی اسرائیل میں جسمانی طور پر ظاہر ہونا پڑا جس پر الہام کیا جائے۔ نیز کیا یہ خود خدا ہی خدا کو الہام کر رہا تھا۔

بہانگ دہل خدا کی ذات کی وحدانیت کا اعلان کرنے والی کتاب الٰہی قرآن کریم میں نفی تثلیث اور عیسیٰؑ کو ابن مریم کہنے والی آیات کی موجودگی میں حضرت مسیح کی الوہیت پر آیات سے استشہاد کرنا بھی مصنف کے ذہن رسا کا خاصہ ہے۔

---

1 منار الحق، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور)، ص ۸۰

2 ایضاً، ص ۹۴

تتمہ کو ساتویں باب کا نام دیا گیا ہے جس میں مذکورہ چھ مسائل پر نتیجہ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔

۲۲۴ صفحات پر مشتمل اس کاوش میں دلائل و استنباط کی علمی حیثیت سے قطع نظر اسلوب بیان غیر شائستہ نہیں اور نہ ہی کوئی رکیک زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ "کلمة الحق یرید به الباطل" کی نادر نمونہ بھی ٹھہرتی ہے۔ جس میں مفہوم مخالف، قیاس مع الفارق اور عموم کو خصوص سے کام لیتے ہوئے استنباط کیا گیا ہے۔ نیز مسلم مفسرین کی شاذ آراء سے استشہاد کیا گیا ہے جو خود مسلمانوں کے ہاں قابل قبول نہیں۔

مسیحی قرآنی لٹریچر پر عمومی تبصرہ

باعتبار مصنفین برصغیر کے مسیحی لٹریچر کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ وہ تحریریں جن کے مصنفین بدیسی ہیں۔

(الف) ان منادین کی تحریریں جو استعماری عہد میں خود تبشیری سرگرمیوں کے سلسلہ میں خود برصغیر پہنچے۔ مثلاً پادری سی جی فانڈر، پادری ای ایم ویری، ایڈورڈ سیل، وغیرہ

(ب) مغرب میں مطالعہ اسلام کے حوالے سے سرگرم بعض مسیحی افراد کی تحریریں جن کا تعلق تبشیر سے تھا خواہ انہوں نے تبشیر کے سلسلہ میں برصغیر کے علاوہ کسی اور خطہ میں خدمات سرانجام دی ہوں، لیکن ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا گیا۔ مثلاً سموئیل زویمر،، گیرڈنر وغیرہ۔

۲۔ مقامی اہل قلم جن کا پس منظر مسلم تھا یعنی وہ اسلام سے ارتداد کرتے ہوئے دائرہ مسیحیت میں شامل ہوئے۔ جیسے پادری عمادالدین، پادری احمد شاہ، پادری جے علی بخش، پادری سلطان محمد پال وغیرہ۔ ان کی تحریروں کی خصوصی تشہیر کرتے ہوئے انہیں بہت اہمیت دی گئی۔

۳۔ وہ دیسی مصنفین جن کا پس منظر غیر از اسلام تھا اور وہ نسلی اعتبار سے ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جیسے ماسٹر رام چندر، ٹھاکر داس (برہمن نژاد پادری نے مشنری یتیم خانہ میں پرورش پائی)

تینوں گروہوں کی تحریروں کا معیار، اسلوب اور زبان ایک سی نہیں تھی۔ اول الذکر گروہ پرجوش مبشر اور استشراقی کارپرداز تھے۔ جن کے ذہنوں میں مذہب کے ساتھ ساتھ تاریخی سیاسی مخالفت بھی پنہاں تھی۔ علمی لحاظ سے براہ راست اسلامی مصادر سے مراجعت کی اہلیت کم تھی لیکن مغرب میں استشراقی روایت، عقلیت پسندی اور تنقیدی تحاریک کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے رویہ کی وجہ سے معقولی جائزہ اور گہرائی پر مشتمل تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ دوسرا گروہ مسلم پس منظر کی وجہ سے اسلامی علوم میں درک رکھتا تھا۔ اپنے نئے مذہب کے لیے "شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری" کا اظہار ان کی مجبوری تھی۔ جس کے لیے انہوں نے سطحی اور رکیک تحریروں کے نمونے پیش کیے۔ انہوں نے خود نقد قرآن پر کوئی نئی جہتیں متعارف نہ کروائیں بلکہ یہ مغرب سے درآمدہ تنقیدی خیالات کو ہی دیسی انداز میں پیش کر سکے۔ اسی لیے ہمیں یہاں پر کوئی دیسی نولڈکے، مارگولیتھ، راڈویل، منگانا، آربری یا آرتھر جیفرے دکھائی نہیں دیتا۔ جب کہ تیسرا گروہ نہ تو اول الذکر کی طرح معقولی رویہ کا حامل تھا اور نہ ہی گروہ ثانی کی مانند اسلامی علوم میں درک رکھتا تھا۔ سطحی معلومات کے ساتھ اس گروہ کی طرف سے سابقہ حریف، جو ان کے نئے مذہب میں بھی زیادہ بڑا حریف تھا، کے لیے سوقیانہ اور غلیظ طرز تحریر پیش کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی گئی۔

قرآن نے اہل کتاب کو " تعالوا الی کلمة سوا بیننا و بینکم " کی دعوت دی تھی۔ لیکن ان مسیحی مصنفین کی طرف سے اس قرآنی دعوت کے جواب میں دونوں مذاہب کے درمیان الہامی مشترکہ قدروں کو پروان چڑھانے کی بجائے قرآن کے بارے معاندانہ رویہ پر مشتمل تنقیص و تکذیب اور تردید و تشکیک کا حامل لٹریچر ہی سامنے آیا۔ سیاسی سرپرستی میں لکھے گئے عہد متذکرہ کے اس لٹریچر میں تین پہلو نمایاں تھے۔

۱۔ کلیسیائی ضرورت

۲ استشراقی اثرات

۳۔ مسلم جوابی لٹریچر کا ردعمل

مسیحی مصنفین کے قرآن پر معترضانہ قلم اٹھانے کا ایک پس منظر یہ ہے کہ قرآن کے مخاطبین میں دیگر گروہوں کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار "مسیحی" بھی شامل ہیں۔ قرآن ان پر تعلیمات مسیح کے بگاڑنے کا جرم عائد کرنے کے ساتھ ساتھ غلط مسیحی عقائد کے مصلح ناقد کے طور پر سامنے آیا۔ اس پس منظر میں مسیحی معترضین کا خصوصاً اسے ہدف نقد بنانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

اس ضمن میں قرآن کے بارے قلم اٹھاتے ہوئے لاشعوری طور پر اسے بائبل کا مقابل متصور کر لیا جاتا ہے۔ کتب سماوی کے دعویدار بائبل اور قرآن میں یہ بنیادی فرق موجود ہے کہ بائبل خصوصاً عہد نامہ جدید حضرت عیسیٰؑ نے خود قلم بند کروایا نہ اس کا مشاہدہ کیا، نہ ہی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ نیز اسے قوم کے سپرد کرنے کی نوبت آئی نہ ہی اس کے بارے میں کوئی ہدایت فرمائی۔ بلکہ یہ آپ کے کئی سال بعد غیر ملہم لوگوں کی تحریریں ہیں جو خود بھی ملہم ہونے کے مدعی نہیں[1]۔ مگر ان تحریروں کے متعلق ان کے جامعین، نہ کہ مصنفین، کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ "روح القدس کی ہدایت" سے معرض وجود میں آئیں[2]۔ اس لیے وحی و تنزیل کا مسیحی تصور انسانی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ اس دعویٰ کے علاوہ کوئی ایسا طریق کار موجود نہیں جس کو بنیاد بنا کر عہد نامہ جدید پر ایمان لایا جائے۔ ایمان بالرسالت کوئی حسی فعل نہیں بلکہ ادراکی عمل ہے یعنی بصیرت خداداد کے ساتھ نبی کی پیش کردہ تعلیمات کو صاحب وحی کے قول و فعل سے پرکھتے ہوئے قبول کرنا۔

اہل کلیسیا عامۃ الناس کے سامنے وحی کی وہ شکل پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کا تصور اسلام نے دیا ہے۔

---

۱ ڈاکٹر پیٹرسن سمائتھ نے بصراحت لکھا ہے، "کیا مسیح یا حواری یا کوئی مصنف اس قسم کی تحریر چھوڑ گیا ہے کہ اسے خاص الہام کے ذریعے حکم ملا ہو کہ باقیوں کے سہو و خطاء سے مبرا ہونے کی گواہی دے۔ یقیناً کوئی اس قسم کا بیان دکھایا نہیں جا سکتا"۔
[پیٹرسن سمائتھ، ڈاکٹر، بیئبل کا الہام، (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۰۵ء)، ص ۱۳۴]

۲ ٹھاکر داس، پادری، انجیل یا قرآن، ص ۸

مسلم نقطہ نگاہ سے قرآن کریم اللہ تعالی کی طرف سے نبی اکرم ﷺ پر بالواسطہ / بلاواسطہ نازل شدہ وحی پر مبنی ہے۔ آپ کی زیر ہدایت ان الہامی الفاظ کو بعینہ ضبط تحریر میں لایا گیا۔ آپ کی حین حیات ہی میں قرآن کے تحریری شکل میں موجود ہونے پر شواہد تاریخ کا حصہ ہیں۔ نیز آپ ﷺ نے امت کو اس سے ملتزم رہنے کے بارے خصوصی وصیت بھی فرمائی[1]۔ اس تناظر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ اسلام میں جو نظریہ وحی پایا جاتا ہے وہ مسیحی نقطہ نظر سے بہت مختلف اور بالاتر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خود مسیحی حلقہ سے یہ آواز سامنے آئی،

"عیسائیت بائبل کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام قرآن کے بغیر قطعی طور پر زندہ نہیں رہ سکتا"[2]

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں شعوری یا لاشعوری طور پر مسیحی اہل قلم کی قرآن پر تحریروں میں بین السطور احساس کمتری کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے

اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قرآنی تراجم و تفاسیر میں قرآن کے تمام تر الہامی ہونے کی بناء پر عقیدت کا پہلو نمایاں رہا ہے۔ مگر یہ چیز اہل کتاب کے ہاں عموماً مفقود ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں الفاظ متن کے بارے قطعی الہامی ہونے کا تیقّن نہیں۔ مسیحی اہل قلم کی کاوش کا زیادہ تر مقصد یہی ہوتا ہے کہ مسلم قاری قرآنی مضامین کے مطالعہ کے وقت اس عقیدت کو بالائے طاق رکھیں جو قرآن کریم کو کلام الٰہی سمجھنے کے پس منظر میں ہوتی ہے۔ اگرچہ تنقیدی مطالعہ کے اپنے فوائد ہیں لیکن بالایمان مطالعہ کا نتیجہ اور ہوتا ہے جب کہ فقط بلا ایمان تنقیدی مطالعہ کا نتیجہ اور ہوتا ہے۔ اول الذکر عمل کی طرف راغب کرتا ہے جب کہ ثانی الذکر رجحان فقط نکتہ چینی، تکذیب اور منافرت کی طرف مائل کرتا ہے۔

مسیحی اہل قلم کے پیش کردہ قرآنی لٹریچر کا غالب حصہ نقد قرآن پر مشتمل ہے۔ وحی اور طریق تنزیل کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت از حد جانبداری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ غیر الہامی ثابت کرنے کے لیے قرآن کے ماخذ کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ زیادہ تر دعویٰ یہ کیا گیا کہ قرآن بائبل کا چربہ یا اہل کتاب کی متروکہ روایات کا اسیر ہے۔ اسی طرح ثقاہت قرآن میں تشکیک کے لیے ناسخ و منسوخ، اختلاف قراءت اور جمع و تدوین قرآن پر قلم اٹھایا گیا۔ جس میں عموماً مسلم نقطہ نظر سے کمزور اور ناقابل قبول ماخذ کو بنیاد بنایا جاتا ہے یا پھر معتبر ماخذ سے غلط استدلال کے ذریعے

---

1 ترکت فیکم امرین لن تضلوا ک بھما، کتاب اللہ وسنۃ رسولہ (مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، رقم الحدیث ۱۸۶)

2 Arther Jafarry , Quran as Scripture,(New York, 1952), Preface

کام لیا جاتا ہے۔ اور اپنے ظن و تخمین کے بل بوتے پر حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک اگر کوئی حیثیت قابل قبول ہے تو فقط یہ کہ قرآن بائبل کا مصدق ہے۔

اہل کلیسیا کا عمومی رویہ یہ سامنے آتا ہے کہ اگر کبھی سماوی کتب کو پرکھنے کا موقع آئے تو گفتگو کا محور صرف قرآن ہی رہے اور بائبل کی مستند حیثیت مسلم رہے۔ اگر مسلمان اہل کلیسیا کی اسفار متروکہ سے استدلال کریں تو مسیحی مناد اسے کتب جعلی (Apocryphal Books) کہہ کر پرکاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن خود قرآن پر معترض ہوتے وقت کمزور، شاذ، ضعیف حتی کہ موضوع روایات سے فائدہ اٹھانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ادب حدیث میں سے اپنی من پسند روایات کا چناؤ کرتے ہوئے اعتراضات کا سامان چن لیا۔ ان کے تبصروں اور آراء سے تعصب کا دامن چھوٹتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس حوالے سے مسیحی اصحاب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انجیل میں مندرج فرمان مدنظر رکھنا چاہیے۔

"اور اس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے کیوں دیکھتا ہے اور اس شہتیر کا خیال نہیں کرتا جو تیری اپنی آنکھ میں ہے"[1]۔

اہل اسلام کے ہاں جو تعلق قرآن اور صاحب قرآن میں ہے وہ مروجہ مسیحیت میں حضرت عیسیٰ اور متداول انجیل میں نہیں دکھلایا جا سکتا۔ مسیحیت کی اس بنیادی کمزوری کو چھپانے اور اعتراض سے بچنے کے لیے مسیحی اہل قلم اس کا کوئی جواز پیش کرنے کی بجائے قرآن اور پیغمبر اسلام کے زمانی اور فعلی تعلق پر معترض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مسلم علماء نے کبھی بھی مسیحیت کی اس کمی پر انگشت نمائی نہیں کی۔ جو خوبی کسی متلاشی حق کو اسلام کے سمجھنے میں سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے اسی کو عیب ٹھہرا کر حکم لگا دینا مسیحی اہل قلم کی اخلاقی کمزوری کی دلیل ہے نہ کہ ان کے مؤقف کی قوت کا باعث۔

برصغیر میں مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں سب سے زیادہ اہم موضوع "تحریف" رہا ہے۔ تصور وحی میں انسانی عنصر کی آمیزش نے ہمیشہ مسیحی اہل قلم کو کچھ بندشوں کا شکار کیے رکھا اور ان کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہمیشہ یہی ٹھہری کہ اگر بائبل کو اس بلند مرتبہ پر لے جانا ممکن ہے، جو قرآنی وحی کو حاصل ہے، تو کم از کم قرآن کو اس کے مقام سے کھینچ تان کر نیچے لایا جائے۔ اگر بائبل پر محرف ہونے کا الزام ہے تو قرآن بھی اس الزام سے محفوظ نہ رہے۔ اس مقصد وحید کے لیے انہوں نے طرح طرح کی تاویلات پیش کیں اور نت نئے اصول وضع کیے۔ جن کا تعلق خاص قرآن سے ہے۔ بائبل پر یہ اصول کبھی منطبق نہیں کیے جاتے۔ Biblical Criticism کے پس منظر میں زیادہ تر مسیحی اہل قلم نے اس زعم میں قلم اٹھایا ہے کہ مسلمانوں کو مائل کیا جائے کہ وہ قرآن کو تنقیدی معیاروں پر پرکھیں۔ ایک مسلم قاری کو اس میں کوئی باک نہیں کہ اس گروہ کی طرف سے پیش کیے گئے اصولوں کے

---

1 متی ۷: ۳؛ لوقا ۶: ۴۱

مطابق مطالعہ قرآن کرے مگر مسلم تصورِ وحی اور مسیحی تصورِ وحی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآنی اور دیگر کتب سماوی کے متن کے مابین لفظاً وحی ہونے یا نہ ہونے کا بنیادی فرق ہے مگر یہ حقیقت مسیحی اہل قلم کے رشحات سے ہمیشہ عنقا رہی ہے چاہے اس کے پس پردہ سوچ کچھ بھی ہو۔

اہل کتاب کے ہاں زیادہ تر بدون متن صرف مترجم بائبل ہی رائج رہی ہے جب کہ مسلم معاشرے میں ترجمہ قرآن کریم متن کے ساتھ پیش کرنے کی روایت ہے اور معرّیٰ ترجمہ کی اشاعت کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہ اس لیے کہ ترجمہ صرف ترجمہ ہی رہے اور وہ اصل نہ قرار پائے نیز مترجم کی غلطیاں مستور ہو کر متن کا حصہ نہ قرار پائیں[1]۔ لیکن اس کے برعکس عہد نامہ قدیم وجدید کا متن مفقود ہے اور ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے گذرنے کے بعد ان کے متن و معنی میں عدم تفاوت کا پیدا ہونا قدرتی عمل ہے۔ یہ کوئی ظن و تخمین نہیں بلکہ مشاہداتی امر واقعہ ہے۔ بایں وجوہ موجودہ عہد نامہ قدیم وجدید کو یقین قطعی کے ساتھ الہامی متن کا قائم مقام نہیں قرار دیا جاسکتا۔

مسیحی اہل قلم نے قرآن پر معترض ہونے کے لئے کئی حربے استعمال کیے۔ جن میں سب سے بڑا حربہ دوہرا معیار تھا۔ جس معیار پر وہ قرآن کو پرکھنا چاہتے تھے بائبل کو اس معیار پر پرکھنے کو تیار نہیں۔ ہر شخص چاہتا کہ قرآن اس کے بنائے ہوئے معیارات پر ہی پورا اترے اور وہ الزام قبول کرلے جو اس پر تعصب، جہالت یا عدم واقفیت کی بناء پر لگایا جاتا تھا۔ اس کے لیے چاہے انہیں متضاد معیار، حقائق کو توڑنا مروڑنا یا کوئی بھی غیر تحقیقی رویہ اپنانا پڑے، اپنے مقصد کے حصول کے لیے سب جائز ٹھہرتا ہے۔ قرآن کو چربہ بائبل یا غیر الہامی انسانی کاوش ثابت کرنا خصوصی طور پر مدِ نظر رکھا گیا۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ اگر کسی طور الہامی ماننا پڑے تو قرآن کو اس کے مقام دعویٰ سے فروتر بنا کر بائبل کے مساوی تسلیم کروایا جائے۔ مسیحی پیشواؤں کا یہ عجیب طرز استدلال ہے کہ قرآن اگر بائبل کے کسی بیان کی تائید کرے تو چربہ اور اگر متفق نہ ہو تو لامحالہ قرآن غلط ہے[2]۔ چنانچہ ہر دو صورت میں نتیجہ عدم ضرورت قرآن نکلتا ہے۔ تحقیقی رویہ اس بات کا مقتضی ہے کہ طرفین کے بیانات عقلی و نقلی حوالے سے تاریخی

---

1 مسلم روایت یہ ہے کہ قرآن کے غلط ترجمہ پر فوراً گرفت کی گئی ہے۔ مثلاً برصغیر میں ڈپٹی نذیر احمد، سرسید احمد خاں اور مولانا احمد رضا خاں کے کردہ تراجم پر مختلف علماء کی جانب سے گرفت ہوئی۔ نیز کبھی بھی تراجم نے متن کی حیثیت اختیار نہیں کی اس کے برعکس کلیسیا کا رویہ یہ ہے کہ ۳۸۵ء میں تاریخ کلیسیا کی محترم شخصیت مقدس جیرم نے جب نیا ترجمہ کیا عیسائی دنیا میں شور مچا کہ کیا اسے بھی الہام ہوتا ہے اور اسے ایمان کو تہہ و بالا کرنے والا اور ملحدانہ ترجمہ قرار دیا گیا مگر ٹرنیٹ کی کونسل نے اسے مستند مان لیا گیا اور اسے ہی متن کی حیثیت حاصل ہو گئی (بحوالہ: اسلام اور عیسائیت از ابو محمود ہدایت اللہ سوہدروی، جمیعت اہل حدیث مغربی پاکستان، گوجرانوالہ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۴)

2 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۷۸ ۔ ۷۹

حقائق و مسلمات کی روشنی میں پرکھنے کے بعد کسی کتاب کو غلط قرار دینا چاہیے نا کہ صرف خلاف بائبل ہونے کی بناء پر۔ یہ تو بائبل کو بغیر پرکھے مستند قرار دینا ہوا حالانکہ اس کی یہی حیثیت سب سے زیادہ معرض بحث ہے۔

مزید بر آں مسیحی اہل قلم مسلم مفسرین کی لفظی و اعتقادی غلطیوں کو بنیاد بنانے سے نہیں چوکتے۔ سب سے اہم بات یہ کہ کسی مفسر کی رائے کو اصل قرار دے کر قرآن پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس رائے کا جواب دہ صاحب تفسیر ہے نہ کہ خود قرآن۔ اگرچہ انہیں یہ حق ہے کہ وہ قرآن کو تعلیمات کے لحاظ سے پرکھیں یا کتب سماوی کی روشنی میں اس کی تفسیر کریں مگر انھوں نے اپنا یہ حق بہت کم استعمال کیا ہے بلکہ ایک آدھ شاذ مثال کے سوا کوئی نظیر نہیں ملتی۔ مسیحی قرآنی لٹریچر علمی حوالے سے بہت کم جبکہ معترضانہ نقطہ نظر سے بہت زیادہ ہے۔

مسیحی اہل قلم کی جانب سے معدودے چند تحریریں قرآن اور بائبل کی مشترک یا موافق تعلیمات پر ہیں جن کے پیچھے قرآن کو بائبل کا چربہ ثابت کرنے کی ذہنیت کار فرما ہے۔ مسیحی تحریریں نقد و تکذیب قرآن و صاحب قرآن پر ہی مرتکز رہیں جن کا غالب حصہ ہمیشہ مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث بنا۔ وہ اس دل آزاری کو اپنا حق تصور کرتے تھے اور اپنے تکلیف دہ رویے پر نظر ثانی کرنے کی بجائے اس رد عمل کو جو دراصل ان کے اپنے غیر اخلاقی رویہ کا نتیجہ تھا اسے ٹھکرانے میں انہیں ذرہ بھر تامل نہ ہوتا۔ گویا سیاسی برتری کی بنا پر دل آزاری ان کا آئینی استحقاق تھا جسے چیلنج کر کے مسلمان کسی جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔ اگرچہ جدید تہذیب کے داعی انگریز متانت و سنجیدگی کے علمبردار خیال کیے جاتے ہیں لیکن ان کی طرف سے مذہبی تعصب میں سب اقدار و اخلاقیات کو پس پشت ڈالنے کا مظاہرہ بھی سامنے آتا ہے۔ برصغیر میں عہد جدید کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کو ترویج دینے والے ولیم کیری نے

An Address to Mussulmans with an Appendix Containing Some Account of Mahomet

نامی ایک رسالہ لکھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دشنام طرازی کی گئی تھی۔ اس کے خلاف مسلمانوں کے سخت رد عمل پر وہ جھنجھلا کر انہیں "بد ہضمی" کا طعنہ دیتا ہے کہ ان کی طرف سے ہندوؤں کے خلاف کئی ایک رسائل لکھے گئے جس پر وہ خاموش رہے اور مسلمان محض ایک" رسالہ ہضم نہ کر سکے"[1]۔ اس رویے کی تقلید بعد میں دیسی پادریوں نے بھی کی جس میں پادری ٹھاکر داس، پادری رام چندر، پادری احمد شاہ اور پادری عماد الدین کا نام یقیناً سر فہرست ہے۔

مسیحی مبشرین کی قرآن پر حملہ آور ہونے کی ایک عمومی ضرورت ہر جگہ نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ جن اقوام نے اس سے قبل مسیحیت کی آغوش میں پناہ لی تھی ان میں سے چند ایک کے پاس اگرچہ اپنا تہذیبی ورثہ موجود تھا مگر وحی کی روشنی سے محروم تھا۔ اس لئے وہ بآسانی مسیحیت میں جذب ہو گئے (اصل بات یہ ہے کہ یونانی تہذیب و فلسفہ

---

1 Powell, Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India, p. 82-83

نے مسیحیت کو اصل مرکز سے ہٹا کر نئی نہج پر ڈال دیا تھااور ان کے مشرکانہ تہذیبی ورثے نے مسیحیت پر ہمہ گیر مستقل اثرات چھوڑے جنہیں بعد میں مستقل مذہبی استناد حاصل ہو گیا۔) مگر برصغیر میں معاملہ یکسر مختلف تھا۔ تاریخ میں "اکال الامم" سے ملقب ہندوستان میں ہندومت اپنے مقابلہ پر آنے والے ہر نظریہ کو نگل جانے کی تاریخ رکھتا تھا۔ اگرچہ رام اور رحیم کو ایک جاننے جیسی کئی تحریکوں سے اسے رام کرنے کی کوشش کی گئی تاہم اسلام ایک ہزار سالہ تک اپنی سخت جانی ثابت کر چکا تھا۔ اس پس منظر میں برصغیر میں مسلمان قوم مسیحی مبشرین کے لیے بھی پتھریلا میدان ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ علمی دلائل میں ان کا ہر لحاظ سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسی ضرورت نے مسیحی منادوں کا رخ ٹھوس علمی و عقلی دلائل سے موڑ کر سوقیانہ اور رکیک حملوں کی طرف کر دیا۔ اثرات کے اعتبار سے یہ رویہ کسی صورت بھی قابل ستائش نتیجہ کا حامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات استعماری دور کے خاتمے کے باوجود اب تک دیکھنے میں آتے ہیں۔ استعماری عہد میں لکھا جانے والا متذکرہ لٹریچر دراصل سامراجی مفاد کا تقاضا تھا جسے انہوں نے بخوبی نبھانے کی کوشش کی۔

مسیحی اہل قلم کے مدنظر مثبت پہلو ہو نہ ہو لیکن اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں عقیدت کی دنیا سے نکل کر حقائق پر مبنی معقولی مطالعہ کا رجحان پیدا ہوا۔ مسیحی اہل قلم نے تراجم و تفاسیر کے ساتھ ساتھ علوم القرآن مثلاً اعجاز القرآن، مصدق کتب سماوی، اور روایات کی جمع و تدوین میں سقم وغیرہ پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان اہل قلم کی اکثریت عربی زبان میں مہارت نہیں رکھتی تھی بلکہ واجبی واقفیت ہونے کے باوجود فنی مباحث پر قلم اٹھایا جن کے لیے عربی زبان میں درک ہونا اس مضمون کا اہم ترین تقاضا ہے۔ مجموعی طور پر مسیحی قرآنی لٹریچر سطحی معلومات، غیر تحقیقی انداز، معاندانہ اسلوب کی بناء پر قبولیت حاصل نہ کر سکا اور مسلمانوں کے ایمان بالقرآن میں ریب و تشکیک پیدا نہ ہو سکا تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تفسیری رویوں میں کلامی اور معقولی رجحان در آیا۔

باب سوم

قرآنیات پر مسیحی انتقادی ادب

کا

منہجی و تجزیاتی جائزہ

فصل اول

قرآن پر بعض اعتراضات
کا
جائزہ

فصل اول

قرآن پر بعض اعتراضات کا جائزہ

پچھلے باب میں برصغیر کے مسیحی تبشیری لٹریچر کے جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کو دعوتی فریق سے زیادہ ایک مدمقابل حریف و مخاصم کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ مسلمان سیاسی مخالف فریق کے ساتھ ساتھ مذہبی مخالف فریق کے طور پر لیے گئے، جس کے براہ راست مسلم مسیحی مناظرانہ لٹریچر پر دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ اس دور میں فریقین میں مذہبی کشیدگی اور جذبات میں حدت اس کا پتا دیتی ہے۔ مسیحی لٹریچر سے علمی تنقید کی بجائے تردید اور مخالفت برائے مخالفت کے رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو سچا رسول اور قرآن کریم کو الہامی ماننے کے مسلم دعویٰ کو علمی و عقلی لحاظ سے پرکھنے کی بجائے مختلف جہتوں سے ان کی تردید کا التزام کیا گیا۔ مسیحی تحریروں میں پس پردہ کارفرما سوچ قرآن کو غیر الہامی ثابت کرنا ہے تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت غلط قرار پائے۔ آپ کے سچا نبی قرار نہ پانے کا لازمی نتیجہ قرآن کا غیر الہامی ہونا ہے۔ یا بالفاظ دیگر قرآن کو غیر الہامی ثابت کرنے سے رسول اللہ کی نبوت مشکوک ٹھہر جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مسیحی لٹریچر میں وحی اسلام کی تعلیمات کو پرکھنے کی بجائے مختلف اعتراضات کے تحت اسے خود ساختہ قرار دینے کی سعی کی گئی ہے۔ مسلم علماء نے گرچہ ان اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیا لیکن مسیحی تحریروں میں اکثر و بیشتر تبدیلی الفاظ کے ساتھ ان کا تکرار جاری رہا۔

فصل ہذا میں مسیحی لٹریچر کا منہج واضح کرتے ہوئے اس میں سے چنیدہ اعتراضات کا تحلیلی تجزیہ کیا گیا ہے اور انہیں بائبل، خصوصاً عہد نامہ جدید پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسا الزامی طور پر نہیں کیا گیا بلکہ وقتاً فوقتاً سامنے آنے والے ان اعتراضات کو مسیحی کتب مقدسہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی سعی تھی کہ بائبل کی روشنی میں ان کی حیثیت و وقعت کس قدر ہے؟ ان مسیحی اعتراضات کا برصغیر کے مسلم علماء کی طرف سے کئی پہلوؤں سے جواب دیا گیا ہے۔ یہاں ان اعتراضات کے تجزیہ میں سابقہ مسلم جوابات کو نقل کرنے کی بجائے کلیسیائی رویہ کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱ اصلیت قرآن

مسیحی لٹریچر میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن الہامی نہیں بلکہ کلام محمد ﷺ ہے۔ اصلیت قرآن کے تناظر میں ان دعاوی کا لب لباب، خواہ الفاظ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، یہ ہے کہ

- قرآن نہایت ہوشیاری کے ساتھ حالات کے زیر اثر وحی کے نام پر پیش کردہ وضعی کلام ہے جس میں فہمائش اور ردعمل کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔
- قرآن زیادہ تر بائبلی ادب کا سرقہ شدہ چربہ ہے اور اس میں بھی غالب حصہ اسفار متروکہ (جعلی اناجیل) یا سنی سنائی روایات پر مبنی ہے۔

الف حالات کے زیر اثر زمانہ سازی کرتے ہوئے اختراع وحی کا الزام

قرآن کے ساتھ وابستگی، ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے اور وہ معاشرتی راہنمائی کے ساتھ ساتھ اس سے روحانی قوت حاصل کرتا ہے۔ اس کی زندگی کے ہر گوشے پر قرآن کی موجودگی کا احساس، خواہ وہ عمل میں کوتاہی کا ہی مرتکب کیوں نہ ہو، بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین اسلام کا قرآن کو ہدف تنقید بنانا قدرتی عمل تھا۔ جس کے پیچھے شاید یہ سوچ کارفرما تھی کہ ایک مرتبہ قرآن کو انسانی عمل دخل پر مبنی ایک اختراعی دستاویز کے طور پر زیر بحث لا کر تشکیک پیدا کر دی گئی تو کثیر جہتی مقاصد بآسانی حاصل کیے جا سکیں گے۔ برصغیر کے مسیحی انتقادی ادب میں بھی اسی زاویہ سے قرآن پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ مثلاً

پادری ای ایم ویری قرآن کو رسول اللہ کی زمانہ سازی پر مبنی کاروائیوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

> "وحی قرآن کا یہ ایک خاصہ نظر آتا ہے کہ وہ آنحضرت کی ضروریات اور تمام کاروائیوں کے حسب حال خوب ہی زمانہ سازی کرتا ہے۔ قرآنی الہامات اور آنحضرت کی کاروائیوں میں ایک نہایت گہرا تعلق ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے آنحضرت کے سوانح عمری اور حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہونا از حد ضروری ہے"[1]۔

وحی کے بارے بلادلیل و تجزیہ کے یہ اتہام و الزام پادری ویری صاحب کی علمی شخصیت سے میل نہیں کھاتا، اگر قرآن کو سمجھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری اور حالات زندگی سے واقفیت کو ضروری قرار دیا ہے تو یہ خود قرآن کا اپنا قائم کردہ اصول ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ اور جس کی تفتیش کے لیے مسلمان ہر علمی تحقیق کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ نبوی کردار پر موقع پرستی کے اس اتہام

---

1 ویری، دین اسلام، ص ۱۱۔۱۲

کاڈاکٹر عبد القادر جیلانی نے بڑا عمدہ تجزیہ کیا ہے؛

"خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قوم نے کیا کیا۔ تیرہ سال کی طویل مدت شدید صبر آزمائی، کشمکش، بے چارگی تنگی و عسرت کا دور ہے۔ اس میں اپنے بھی بیگانے ہوگئے۔ معاشرہ دشمن ہو گیا، اپنا شہر (ہی) دیار غیر بن گیا، راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے، گھر پر پتھر آتے، اوباش اوباشی پر داد تحسین پاتے، کلمہ حق کے جواب میں سنگ و خشت برستے کیا یہ سب کچھ موقع پرستی تھی؟ کیا کسی موقع پرست سے، حق کے لیے، کبھی ایسی استقامت کا بھی اظہار ہوا ہے؟ حقائق سے چشم پوشی اور بہتان تراشی صرف ان لوگوں کا ہی شیوہ ہو سکتی ہے جو یا تو اصلی کوائف سے ناواقف ہوں یا پھر واقعات کو عمداً مسخ کرنا چاہتے ہوں۔۔۔ غور طلب امر یہ ہے کہ داعی اسلام کے اصحاب ہمہ وقت ان کے گردو پیش موجود تھے ان کی تعلیمات سے آگاہ اور ان پر صدق دل سے عمل پیرا تھے۔ انہیں اللہ کا رسول تسلیم کرتے تھے ان کے ہر لفظ کو سرچشمہ ہدایت سمجھتے تھے، ان کے ہر عمل کو صراط مستقیم کی حیثیت حاصل تھی، اس حالت میں کوئی سہو یا لغزش جو مقام نبوت سے مناسبت نہ رکھتی ہو، اصحاب کو دل برداشتہ کرنے کے کافی ہوتی۔ آخر وقت تک اصحاب کی گرویدگی اور وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شدت جذبات سے ان کی وارفتگی اس امر کا ثبوت ہے کہ اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی کمزوری سے منزہ تھا[1]"۔

اس حقیقت سے اغماض نہیں برتا جا سکتا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام ایک غلام معاشرے میں مبعوث ہوئے تھے۔ وہ نہ تو انقلابی معاشرتی قوانین پر مبنی کوئی پیغام لائے اور نہ ہی انہیں الٰہی احکامات کے اطلاق کے لیے نئے معاشرے کے قیام کے لیے کاروائیاں کرنی پڑیں کہ جن پر کوئی کور چشم زمانہ سازی کا ٹھپہ لگاتا۔ ان کا مشن صرف معاشرے میں رائج ریاکاری اور غلط رویوں کی اصلاح تک ہی محدود رہا۔ اپنے حالات میں اگر انہوں نے " جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو"[2] کی حکمت عملی اپنائی تو انہیں خوشامدی یا چاپلوس نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے مقابل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صدیوں سے قبائلی روایات کے اسیر معاشرے کو تیئس سالہ دور نبوت میں سے دس سالہ مدنی عہد میں شرعیتی اصولوں کے تحت منظم ہیئت میں لائے اور اس اسلامی انقلاب کے دوران بد خواہوں کی مجرمانہ سازشوں اور کاروائیوں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اپنے دور میں جس معاشرتی اصلاح کی ذمہ داری کا مشن سونپا گیا تھا، ان میں کوئی مماثلت سرے سے موجود ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خیر کی راہ میں حائل مزاحم قوتوں کو رعایت دینا اور ان کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان کے آگے سر خم کر دینا نہ صرف فرائض سے اغماض برتنا ہے بلکہ حقیقت سے فرار بھی ہے۔ اگر بدی کی قوتوں کو بے لگام چھوڑ

---

1 جیلانی، اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر، ص ۲۷۸۔۲۷۹

2 متی ۲۲ : ۲۱

دیا جائے تو معاشرے میں یقیناً مثبت انقلاب برپا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات طے ہے کہ اگر حضور اکرم ﷺ کی کارروائیوں کے منفی نتائج معاشرے پر مرتب ہوئے ہوں یا انہوں نے خیر کے نام پر بدی کو نافذ کیا ہو تو یقیناً یہ بات قابل مذمت ہوتی۔ لیکن مسیحی لٹریچر میں یک طرفہ طور پر حکم تو لگا دیا گیا مگر اس بات کو سامنے نہیں لایا گیا کہ

۱ حضور اکرم ﷺ نے خیر کا نام لے کر شر کی کس قوت کا ساتھ دیا۔

۲ محمد ﷺ کی کارروائیوں سے معاشرے پر کون سے منفی اثرات مرتب ہوئے۔

ان دو امور کی تنقیح کیے بغیر اس الزام کی حیثیت اتہام سے زیادہ نہیں ہے۔ قابل تجزیہ امر تو یہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک وحشی معاشرہ میں جو انقلاب برپا کیا اس کے نتائج انسانیت کے حق میں بہتر ثابت ہوئے یا مضر؟ اگر مضر ثابت ہوئے تو کس طرح؟ نیز یہ انقلاب کس قیمت پر کامیاب ہوا۔ سیاق وسباق سے ہٹ کر یک طرفہ طور پر نبوی کارروائیوں کو نشانہ بنانا اور حالات کو انتہاء تک لے جانے کے ذمہ دار دوسرے فریق کا بڑی احتیاط سے ذکر تک سامنے نہ آنے دینا، تحقیق کی بجائے تلبیس اور مخصوص ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

صدیوں سے بگاڑ کے شکار یہودی معاشرہ کی اصلاح کے لیے قریباً تین سال پر محیط مختصر دور مسیح انتہائی ناکافی تھا۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مزید موقع ملتا تو وہ خود کس حکمت عملی اور راہ عمل کو اپناتے، اس کا اندازہ مروجہ اناجیل میں آپ کے بعض احکامات میں تغیر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مثلاً ایک طرف تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان پیش کیا جاتا ہے؛

"میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اگر کوئی عدالت میں تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے"[1]۔

دوسری طرف رومی سپاہیوں سے ٹکراؤ کے پیش نظر شاگردوں کو دی گئی یہ ہدایت ملتی ہے؛

"جب میں نے تمہیں بٹوے اور جھولی اور جوتوں کے بغیر بھیجا تھا کیا تمہیں کسی چیز کی کمی رہی تھی انہوں نے کہا کہ کسی چیز کی نہیں۔ اس نے ان سے کہا، مگر اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی، جس کے پاس تلوار نہ ہو وہ اپنا چوغہ بیچ کر خریدے"[2]۔

پھر حالات کی مناسبت سے یہ حکم یوں تبدیل ہو جاتا ہے:

"اپنی تلوار کو اس کی جگہ میں رکھ کیونکہ وہ سب جو تلوار کھینچتے ہیں، تلوار ہی سے ہلاک ہوں گے"[3]۔

---

1 متی ۵ : ۳۹

2 لوقا ۲۲ : ۳۵

3 متی ۲۶ : ۵۲

ان انجیلی بیانات کی روشنی میں اگر کوئی مسیحی معترضین کے اصولوں کے تحت حضرت عیسی علیہ السلام پر الزام تراشی کرے کہ

"انجیل آپ کی ضروریات اور تمام کاروائیوں کے حسب حال خوب زمانہ سازی کرتی ہے"

تو اصولاً انہیں اپنے قائم کردہ معیارات کے تحت اس اعتراض پر غور کرنے پر تیار ہونا چاہیے۔ مسلم نقطہ نظر سے اس قسم کے اعتراض قطعاً قابل قبول نہیں کیونکہ وہ ایسی مذموم فکر کو ایک نبی کی شان سے بعید سمجھتے ہیں۔ اگر حقائق کو پس پشت ڈال کر محض الزام تراشی کو تحقیق معیار ٹھہرالیا جائے تو پھر دنیا کا کوئی بھی دفاع یا جواز کارگر نہیں ہو سکتا۔

قرآن پر حالات کو دیکھ کر زمانہ سازی کرنے کا الزام تو محتاج ثبوت ہے، لیکن مسیحی پیروکاروں کی طرف سے بعد میں ان کے نام پر لکھے گئے مذہبی ادب، جسے الہامی کہہ کر پیش کیا گیا، میں زمانہ سازی کی جھلک بدرجہ اتم جھلکتی ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی میں تو غیر بنی اسرائیل کو دعوت دینے کے بارے کہا تھا کہ؛

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا"[1]۔

نیز یہ کہ

"پاک چیز (کلام) کتوں (غیر اقوام) کو مت دو اور اپنے موتی (پاک شریعت) سوروں (غیر قوم) کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں پامال کریں"[2]۔

لیکن قیامت المسیح کے بعد وقت کے حالات کے تقاضوں کے تحت عہد نامہ جدید میں یسوع سے یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں؛

"تم سب قوموں کو جا کر شاگرد بناؤ۔ اور باپ بیٹے روح القدس کے نام سے انہیں بپتسمہ دو"[3]۔

جب کہ مرقس کے الفاظ میں صرف دعوت ہی نہیں بلکہ نجات بھی عام کر دی گئی؛

"تم تمام دنیا میں جا کر ساری خلقت کو انجیل کی منادی کرو۔ جو ایمان لاتا اور بپتسمہ پاتا ہے وہ نجات حاصل کرتا ہے"[4]۔

حالانکہ نجات کے بارے حضرت عیسیٰؑ اپنی حین حیات یہ حکم دے چکے تھے کہ "نجات یہودیوں میں سے ہے"[5]۔

زمانہ سازی کا رویہ سامنے لانے والے یہ الفاظ انجیل نویسوں کی اختراع ہو سکتے ہیں کیونکہ، مسلم نقطہ نظر سے، یہ فعل شنیعہ نبی کی شان کے منافی ہے۔ یسوع نے تو اپنی پوری تبشیری زندگی میں غیر اقوام کو منادی نہیں کی۔ لیکن

---

1 متی ۱۵ : ۲۴

2 متی ۷ : ۶

3 متی ۲۸ : ۱۹

4 مرقس ۱۶ : ۱۵

5 یوحنا ۴ : ۲۲

بعد میں جب ان کے شاگردوں کو یہود کے سخت رویہ کے پیش نظر ان کے حکم کے برعکس غیر اقوام میں منادی کی تو انجیل نویسوں نے اسے صحیح ثابت کرنے کی ضرورت کے پیش نظر یہ زمانہ سازی کرلی۔ اس کا مظاہرہ صرف عہد نامہ جدید کے لکھاریوں نے ہی نہیں کیا بلکہ مجالس منعقد کرنے والے آبائے کلیسیا بھی اس صف میں شامل ہیں۔ مثلاً خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دیگر شاگردوں کی طرح شریعت موسوی کے مطابق مختون تھے۔ لیکن جب تبشیری مہم کے دوران غیر اقوام کو رام کرنے کے لیے ضرورت پڑی تو حالات کے تقاضوں کے پیش نظر محض ایک مجلس منتظمہ کے فیصلے کے تحت، صدیوں سے رائج، اس حکم خداوندی سے صَرفِ نظر کر لیا گیا۔ انجیلی بیان کے مطابق کلیسیا کی پہلی مجلس عام ختنے کے سوال پر ہی منعقد ہوئی[1]۔ جس میں یعقوب برادر مسیح علیہ السلام (جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ایمان بھی نہیں لائے تھے[2]) نے غیر قوم کے لیے ختنے کے معاملہ پر یہ کہہ کر آسانی پیدا کر دی کہ

"میری رائے یہ ہے کہ جو غیر قوموں میں سے خدا کی طرف رجوع لاتے ہیں انہیں (یہ) تکلیف نہ دینی چاہیے"[3]۔

ختنے کے اس سوال کے محرک مقدس پولوس نے کونسل کے فیصلے کے بعد ایک تبشیری سفر میں تیموتاؤس نامی شخص کا محض یہودیوں کی خوشنودی کی خاطر "زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے" خود ختنہ کیا تھا۔

"پولوس نے چاہا کہ اسے (تیموتاؤس) اپنے ساتھ لے چلے تب اسے لیا اور یہودیوں کے سبب جو ان جگہوں میں تھے اس کا ختنہ کر دیا کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ اس کا باپ غیر قوم میں سے ہے"[4]۔

آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی اور قرآن کا باہمی تعلق دین اسلام کی ایک ایسی خوبی ہے جو اس کی تفہیم میں کسی متلاشی حق کو سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے قرآن اور پیغمبر اسلام کے باہمی تعلق کو الگ نہیں کیا جا سکتا، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور موجودہ انجیل میں کوئی باہمی تعلق نہیں دکھلایا جا سکتا حقیقت یہ ہے کہ مسیحی مذہب کی یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جسے مُستتر رکھنے کے لیے مسیحی لٹریچر میں اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا جاتا۔ اس خامی کی نہ تو کوئی تاویل اور نہ ہی اس پردہ پوشی کا کوئی جواز سامنے آتا ہے۔ شاید اس الزام سے بچنے کی خاطر پیشگی اقدام کے طور پر قرآن اور صاحب قرآن کے زمانی و فعلی تعلق کو مسیحی لٹریچر میں ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ تحقیق حق میں جذباتی اظہار کوئی مثبت تاثر قائم کرنے کی صلاحیت سے ہمیشہ عاری ہوتا ہے۔ مسیحی لٹریچر

---

1 اعمال: باب ۱۵

2 یوحنا ۷: ۵

3 اعمال باب ۱۵: ۱۹ مجلس کی کارروائی کی تفصیل تقریباً باب ۱۵ پر محیط ہے

4 اعمال ۱۶: ۳

میں قاری کے جذبات کو برانگیختہ کر کے معقولیت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش یقیناً مستحسن نہیں۔اس سے تعصب اور معاشرتی بُعد تو پیدا ہو سکتا ہے مگر کسی علمی نکتہ کی تنقیح ہرگز ہویدا نہیں ہو گی۔ایسا طریق طلب حق کی جستجو کے حامل قاری کو قطعاً صحیح راہنمائی فراہم نہیں کرتا۔شاید ایک عام مسیحی کو تو ایسے بے سروپا الزام ایک جذباتی اظہار کے طور بھائیں، لیکن ایک باشعور اور حقیقت بین انسان کے لیے انہیں حقائق کی روشنی میں قبول کرنا ممکن نہیں۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلم علماء نے مسیحیت کے اس بنیادی کمزور پہلو پر عموماً حرف گیری نہیں کی۔

مروجہ مسیحیت الہام میں انسانی خیالات کے عمل دخل کو تسلیم کرتی ہے۔اس پس منظر کے ساتھ مسیحی انتقادی ادب میں اسلامی وحی کو بھی انسانی ارتقا پر مبنی قرار دینے کی سعی قطعاً اچنبھے والی بات نہیں۔اختراع قرآن کے مذکورہ الزام کو ان الفاظ میں یوں دہرایا گیا ہے؛

"قرآن کے مختلف حصوں کا مختلف موقعوں پر حسب ضرورت اظہار اور استعمال کیا گیا جب کبھی نبی کو کوئی ضرورت پیش آئی اور کوئی ذاتی فائدہ ملحوظ اور مد نظر ہوا فوراً آسمانی الہام وضع کیا گیا"[1]۔

پادری ٹھاکر داس اس معرکتہ الآراء اعتراض کی مثال پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔قرآنی آیت "سیقول السفهاء من الناس ما ولهم عن قبلتهم التی کانوا علیها" نقل کرنے کے بعد وہ اس حکم کی غرض یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز اس لیے پڑھتے تھے کہ یہود آپ ﷺ سے خوش ہو کر آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں۔لیکن اس سے آپ (ﷺ) کا اصل مطلب پورا نہ ہوا یعنی یہودی ایمان نہ لائے تو آپ (ﷺ) نے یہ حکم دیا اور اس سے آپ (ﷺ) کی مقصود عربوں کی خاطر داری تھی[2]۔

ص ۱۵۳ پر پھر یہی اعتراض دہرایا گیا ہے لیکن یہاں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ یہود آپ ﷺ سے معجزوں کے طالب تھے جس میں ناکامی کی بناء پر آپ ﷺ نے تحویل قبلہ کا حکم دیا۔

مسیحی لٹریچر میں مذکور ان اعتراضات کا تجزیہ یہ حقیقت سامنے لاتا ہے کہ اس میں مطلب براری کی خاطر یک رخی تصویر کشی کر کے تشکیک ابھارنا مقصود ہوتا ہے۔ان اعتراضات کو دہراتے ہوئے معترضین ہمیشہ اس قرآنی وحی سے صرف نظر کر لیتے ہیں جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذناہ بالیمین ثم لقطعنا منه الوتین "یعنی وحی وضع کرنے پر آپ کو خدائی پکڑ کا سامنا کرنا پڑتا۔اگر آپ ﷺ سچے نبی نہ ہوتے تو خود ہی ایسے الہام کو وضع کر کے اپنے مخالفین کے سامنے پیش نہ کرتے۔اور اگر جھوٹے ہونے کے

---

1 ویری، دین اسلام، ص ۵-۶

2 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۱۳۳

باوجود یہ پیش کرتے تو اس کے مصداق خدائی پکڑ سے نہیں بچ سکتے تھے۔ صرف قرآن میں ہی خدا کے نام پر غلط باتیں منسوب کرنے کی سزا مذکور نہیں، بائبل کی کتاب استثناء میں بھی مرقوم ہے،

"اور جو نبی یہ گستاخی کرے کہ کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا دوسرے معبودوں کے نام سے نبوت کرے تو وہ نبی ضرور قتل کیا جائے اگر تو اپنے دل میں کہے کہ کیسے معلوم ہو کہ یہ بات خداوند نے نہیں کہی تو اگر وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور اس کا کلام پورا نہ ہو اور واقع نہ ہو تو وہ کلام خداوند نے اس کو نہیں فرمایا بلکہ اس نبی نے گستاخی سے وہ بات کہی ہے تم ایسے سے نہ ڈرنا "[1]۔

چونکہ خدا کی کہی باتیں لازمی پوری ہوتی ہیں پس مذکورہ بالا صورت میں اگر محمد ﷺ صادق نہ ہوتے تو ان احکام ربانی کی روشنی میں لازماً گرفت میں آجاتے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آیت مذکور کوئی آخری آیت قرآنیہ نہیں ہے بلکہ اس کے سال ہا سال بعد تک نبی اکرم ﷺ اللہ تعالی کا پیغام دیتے رہے۔ پادری صاحبان کے پورے دفتر میں اس کا شریعت موسوی کی روشنی میں نتیجہ نہ نکلنے کی کوئی تشریح و تاویل دستیاب نہیں ہوتی۔

یہ الزام کہ " آنحضرت ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز اس لیے پڑھتے تھے کہ یہود آپ ﷺ سے خوش ہو کر آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں" تاریخ سے عدم شناسائی کا مظہر ہے۔ تحویل قبلہ کا حکم ہجرت مدینہ کے سترہ ماہ بعد سن دو ہجری میں نازل ہوا۔ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا عمل مکی دور کا حصہ ہے جس کا تسلسل مدینہ کے ابتدائی ایام میں قائم رہا، اور مکہ میں یہودی آبادی ناپید تھی۔ عرب اہل مکہ کو چھوڑ کر سینکڑوں میل دور مختصر یہودی جمعیت کی خوشنودی کا الزام چہ معنی دارد؟

اگر آپ ﷺ کو عربوں کی خاطر داری کے پیش نظر قبلہ کی تبدیلی مقصود ہوتی تو مصائب و آلام سے پُر مکہ کے تیرہ سالوں میں یہ حکم سامنے آتا۔ اگر مدینہ کے عربوں کو خوش کرنا ہوتا تو بیعت عقبہ کے وفد سے یہ "معاملت" کی جاتی۔ نیز بعد از تحویل قبلہ بھی اہل مکہ نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس لیے باقی الزامات کی طرح یہ بھی بے سروپا ہی ٹھہرتا ہے۔ تدلیسی حکمت عملی کے تحت اخفائے حق کا یہی رویہ برصغیر کے مسیحی لٹریچر پر غالب ہے۔

پادری گولڈ سیک وضع قرآن کا الزام ان الفاظ میں دہراتے ہیں؛

" اس امر میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن کے بہت سے حصے محمد صاحب نے حسب ضرورت اپنی مطلب براری کے لیے وضع کر لیے تھے [2]۔

---

1 استثناء ۱۸: ۲۰۔۲۲

2 گولڈ سیک، ینابیع القرآن، ص ۴۱

سابقہ اوراق میں اگرچہ اس پر کافی گفتگو ہو چکی ہے یہاں اس اصول کے تناظر میں معترضین کے اپنے مقدس ادب کو تاریخی لحاظ سے پرکھنا نامناسب نہ ہو گا۔

سڈنی یونیورسٹی میں الہیات کی پروفیسر باربرا تھیئرنگ (Barbara Thiering) اپنی کتاب Jesus The Man کے دیباچہ میں فرماتی ہیں کہ وحی والہام کبھی بھی تاریخی تقاضوں سے مشروط نہیں ہوتا مگر (عیسائیت میں) اسے تاریخی تقاضے پورے کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے[1]۔

بائبل کے لکھاریوں پر اپنی تبشیری ضروریات پوری کرنے کے لیے بعض واقعات کے بیان میں انہیں مسخ یا پھر واقعات کو مکمل طور پر اختراع کرنے کے الزامات ہیں۔یورپ میں انیسویں اور بیسویں صدی میں بلیکل کرٹی سیزم Biblical Criticism کے نام پر لکھی جانے والی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔ نیز انجیل میں پائی جانے والی تاریخی غلطیاں، جنھیں خود یورپی ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں، ہماری اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً

(۱) متی نے تصلیب کے وقت اندھیرے کا چھاجانا، ہیکل کے پردے کا دو ٹکڑے ہونا، مقدسوں کی جماعت کا قبروں سے نکل آنا اور شہر کے لوگوں کو دکھائی دینا، زلزلہ سے چٹانیں ترخ جانا بیان کیا ہے[2]۔ تاریخی شواہد ان واقعات کی تصدیق سے قاصر ہیں۔ ۳۱ ق م میں یہودیہ کے علاقے کو ایک زبردست زلزلے نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تاریخ کے اوراق میں اس کا ذکر محفوظ ہے اور اس کے آثار اب بھی مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔ اس زلزلہ میں بحیرہ مردار کے کنارے واقع قمران کی ایسینی خانقاہ میں پڑی دراڑیں ابھی تک موجود ہیں[3]۔ لیکن انجیلی بیانات کی تصدیق نہ تو آثار کرتے ہیں اور نہ ہی تاریخ کے اوراق۔ کیا ان واقعات پر مطلب برابری کے لیے اختراعی ہونے میں کوئی شبہہ ہے؟

(۲) انجیل متی میں مذکور ہے؛

" وہ (یسوع) ناصرت نامی ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا"[4]۔

متی کے نبیوں کی معرفت کہے جانے کے دعویٰ کے برعکس عہد نامہ قدیم و جدید میں ایسی کوئی پیشین گوئی موجود نہیں۔ لیکن مطلب براری کے لیے اسے انبیائے عہد عتیق کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں اس پیشین گوئی کے عدم وجود پر نویں صدی عیسوی کے ایک راہب کی بے چینی اس کے ان الفاظ سے مترشح ہوتی ہے؛

---

1 Thiering , Barbara , Jesus :The Man ,(Corgi Book, London 1993), p.3

2 متی ۲۷: ۵۰۔۵۵

3 Allegro. J.M, Dead Sea Scrolls, (Penguin Books ltd.,Uk1957) p.85; Thiering , Jesus the man , p.57

4 متی ۲: ۲۳

"This is as fire in my heart, burning and blazing in my bones"[1].

(یہ پیشین گوئی نہ ملنے کی وجہ سے) میرے دل میں آگ کا الاؤ بھڑکا ہوا ہے، جس کی تپش میری ہڈیوں تک میں سرایت کیے ہوئے ہے)

پس ایسے الزامات کی اصلیت ادنیٰ تامل سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس تجزیہ کے بعد الہام کو مطلب براری کے لیے وضع کرنے کے الزام پر نظر ثانی کی ضرورت لازماً سامنے آتی ہے۔

"قول بما لا یرضی به قائله" کے مصداق اسی روش کا مظاہرہ پادری کینن ای سیل بھی کرتے ہیں۔ جب وہ قرآن پر واقعات کی تبدیلی کے ساتھ وحی میں تبدیلی کا الزام عائد کرتے ہیں۔

"۔۔۔ قرآن پر نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن اقوام سے اسے سابقہ پڑا ان کے حق میں کس قدر حسب ضرورت رخ بدلتا رہا ہے۔ اس کے احکام کی مناسبت اس کے عذرات اور زجر و عتاب وغیرہ پر غور کرنے سے ہم صاف نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کس نادر طور سے اسلام کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختصر الہامی فقرے نازل ہوتے رہے"[2]۔

ان کا اس الزام کو دہرانے کا ایک اسلوب یہ بھی ہے۔

"(جنگ احد کے بعد) اب وحی آسمانی کے پیغام بکثرت آنے لگے اور اس بات کی تفہیم ہونے لگی کہ شکست آنحضرت کے پیروان کی وفاداری کو آزمانے اور ان کی نافرمانبرداری کے نتائج کو ظاہر کرنے کی غرض سے تھی۔ اب بھی فتح بدر خدا کی خوشنودی کا خاص نشان بیان کی جاتی تھی کیا اب شکست ایسی نہ تھی کہ جس طرح فتح بدر عنایت الٰہی قرار دیں اس نازک حالت میں سورۃ عمران کی بہت سی آیات اسی شکست کی تفہیم سے مخصوص ہیں۔ قرآن کی تواریخی تکمیل کی یہ نہایت عمدہ مثال ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت کے واقعات زندگی کی تبدیلیوں کے مطابق وحی آسمانی بھی تبدیل ہوتا رہتا تھا"[3]

مدینہ میں وُرُود کے بعد مسلمانوں کو مکہ کے بت پرست گروہ کی جارحانہ کارروائیوں کا سامنا غزوہ بدر و احد کی شکل میں کرنا پڑا۔ اس تحریر میں مشرکین مکہ کی طرف سے ماقبل غزوات کی جانے والی کاروائیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان معرکہ ہائے حق و باطل کی منفی تصویر کشی کی گئی ہے۔ خاص طور پر معرکہ احد میں مسلمانوں کی وقتی ہزیمت پر کی جانے والی الوہی زجر و توبیخ کو وضع شدہ الہام گردانا ہے۔

یہ ایک اصول ہے کہ اگر کسی قوم کو ہزیمت اٹھانی پڑے تو وہ لازماً اس کا تجزیہ کرتی ہے۔ اپنی غلطیوں اور

---

1 Wilson, Edmund, The Dead Sea Scrolls 1947 - 1969,(William Collins Sons & Co. Glasgow1977), p 179

2 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص

3 کینن ای سیل، جنگ بدر و جنگ احد، ص ۷۱

خامیوں پر متنبہ ہوتی ہے۔ وحی آسمانی نے جہاں کم عدد ہونے کے باوجود بدر میں جذبہ ایمانی کے مظاہرہ پر نصرت الٰہی کے شامل حال ہونے کا بیان کیا، وہیں جنگ احد میں ہزیمت کا سبب اطاعت رسول سے روگردانی قرار دیا ہے۔ مسلمانوں نے اس کو بدل و جان قبول کیا جس پر بعد میں پیش آنے والے واقعات و غزوات گواہ ہیں۔ مسلم فتوحات کی تاریخ میں دشمن کی عددی برتری یا اپنی عددی کمتری کو کبھی بھی خاطر نہیں لایا گیا۔

جنگ احد میں مسلمان اس قدر بھی ہمت نہیں ہارے تھے کہ مشرکین کی فتح کا ڈھنڈورہ پیٹا جائے۔ اہل اسلام نے بہت جلد اپنی صفیں درست کرلیں اور بعد میں مشرکین مکہ کا دور تک تعاقب کیا۔ کیا ایک شکست خوردہ لشکر فاتح گروہ کا پیچھا کیا کرتا ہے؟ اس وقتی ہزیمت پر مؤمنین کی الٰہی زجر و توبیخ کو مسیحی انتقادی ادب میں قرآن کی تواریخی تکمیل کی عمدہ مثال ٹھہرایا گیا ہے۔ ایسے دقیق نکتے تک رسائی کے لیے یقیناً کلیسائی پس منظر کا حامل ذہن اور رویہ ہی درکار تھا۔ مخصوص فکری جہت کے تناظر میں معترض کا حقائق سے دانستہ اغماض کا رویہ سامنے آجاتا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں جس اعتراض کو بنیاد بنا کر قرآن پر انگشت نمائی کی گئی ہے، اس پر اگر تورات کو پرکھا جائے تو یہاں بھی "واقعات زندگی کی تبدیلیوں کے مطابق وحی آسمانی بھی تبدیل ہوتا رہتا تھا" کا منہج بعینہ نظر آتا ہے۔ بنی اسرائیل سے وعدہ خداوندی تھا؛

"میں خداوند ہوں، میں تمہیں مصریوں کے بوجھ کے نیچے سے چھڑاؤں گا۔۔۔ میں اپنے پھیلائے ہوئے بازو اور عظیم قضاؤں سے تمہیں رہائی دوں گا، اور تمہیں اپنی قوم بناؤں گا۔۔۔ میں تمہیں اس سرزمین (کنعان) میں داخل کروں گا جس کی بابت میں نے ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی کہ اسے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو دوں گا اور میں اسے تمہاری میراث کر دوں گا۔ میں خداوند ہوں۔ تب موسیٰ نے بنی اسرائیل سے یوں ہی کہا"[1]۔

"(مصر سے نکل کر کنعان کے راستے میں) لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا کہ پینے کے لیے ہم کو پانی دے۔ موسیٰ نے کہا کہ تم میرے ساتھ کیوں جھگڑتے ہو۔۔۔ (لوگ) موسیٰ پر کڑکڑائے اور کہا تو ہمیں مصر سے یہاں کیوں لایا۔ تاکہ ہم کو اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مواشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔ تب موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا؛" میں ان لوگوں سے کیا کروں۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ مجھے سنگسار کریں گے"[2]۔

تورات کی کتاب استثناء کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے اردن کے پار عرابہ میں بحیرہ قلزم کے مقابل بنی اسرائیل سے یہ باتیں کہیں؛

"۔۔۔۔ خداوند تمہاری باتوں کی آواز سن کر غصے ہوا اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ اس شریر پشت کے آدمیوں میں سے

---

1 خروج ۶ : ۶ تا ۹؛ احبار ۱۴ : ۳۳

2 خروج ۱۷ : ۲۔۴

ایک بھی اس اچھی سرزمین (کنعان) کو ہرگز نہ دیکھے گا۔ جس کے عطا کرنے کے لیے میں نے تمہارے باپ دادا سے قسم کھائی سوائے کالب بن یفنہ کے۔ وہ اس کو دیکھے گا اور وہ سرزمین جس پر اس نے قدم مارا میں اسے اس کو اور اس کے بیٹوں کو دوں گا۔ کیوں کہ اس نے خداوند کی اچھی طرح سے فرمانبرداری کی۔ اور تمہارے سبب سے خداوند مجھ پر بھی ناراض ہوا اور کہا کہ تو بھی اس میں داخل نہ ہو گا۔ مگر یوشع بن نون جو تیرے آگے کھڑا ہے۔ وہ اس میں داخل ہو گا۔ پس تو اس کی حوصلہ افزائی کر"[1]۔

مسیحی اصول کے مطابق کیا حضرت موسیٰ کے اس فرمان کو یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جب انہیں کنعان میں داخلہ میں ناکامی ہوئی تو یہ عذر تراش لیا؟ مسلم دینی ادب میں ایسے قبیح نتائج اخذ کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا گیا ہے کیونکہ خدا کی مقرب و مقدس ہستیوں، انبیا کرام کا احترام مسلم عقیدے کا حصہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلم رویہ واقعات کو ان کے حقیقی تناظر میں دیکھنے کا خوگر ہے۔

اطاعت الٰہی کا نتیجہ برکات خداوندی کے نزول جب کہ نافرمانی اس سے دوری کا سبب بنتی ہے، لیکن مسیحی لٹریچر میں اسلامی تاریخ کے ایک واقعہ کو غلط انداز میں بنیاد بنا کر اسے قرآن کے ایک عیب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح جنت و دوزخ کے قرآنی تصور کو حالات کے تقاضے کی مرہون منت قرار دیا گیا ہے۔ بمرور ایام جب آپ ﷺ کے ساتھیوں کو بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو "کشف القرآن" کے مصنف کے مطابق،

"اب محمد نے ایک نئے پیرایہ تقریر کو اختیار کیا اور انسانی طبیعت کے حیوانی و شہوانی پہلو کی طرف مائل ہوگئے۔ چنانچہ آپ نے اپنے پست ہمت اور خستہ خاطر پیروؤں کی جماعت کی ہمت بڑھانے کے لیے بہشتی خوشیوں یعنی عروسی پلنگوں مشک و کستوری اور شراب طہور کا نقشہ کھینچ دکھایا۔ اس سے محض یہی غرض نہ تھی کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمان اپنی ہمت نہ ہاریں بلکہ کفار مخالفین کو مرعوب و مغلوب کرنا بھی بدرجہ غایت ملحوظ و متصور تھا"[2]۔

تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ابتدائی اسلامی دور میں نو مسلم افراد حتیٰ کہ معاشرے کے کمزور ترین افراد غلام بھی کبھی پست ہمت نہیں رہے۔ وہ ہر ظلم کے سامنے سینہ سپر رہے حتیٰ کہ جان نچھاور کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور بدون طمع و لالچ کے ہمت و عزیمت کی بے مثال تاریخ رقم کی۔ انہیں لالچ اور حرص کے ساتھ اسلام پر چلانے کا الزام حقائق کا انکار کرتے ہوئے تاریخ سے صرفِ نظر اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔

---

1 استثناء ۱: ۳۴-۳۸ تورات اس پر شاہد ہے کہ موسیٰ کنعان میں داخل ہونے کی بجائے راستے میں موآب کے مقام پر فوت ہوئے۔ ایضاً ۳۴: ۱-۵

2 ایڈورڈ سیل، کشف القرآن، ص ۲۱-۲۲

آپ ﷺ کا جہاں پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو سعادت سمجھنے والے اصحاب رسول ﷺ کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کی حین حیات مسیحی مقدسین میں سے کسی کی بھی ان کے لیے نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ غالباً جنت و دوزخ کے قرآنی وعدوں پر معترض مؤلف نے آغاز اسلام میں ہی لبیک کہنے والی سعید ہستیوں اصحاب رسول کو ان مسیحی پیروکاروں پر قیاس کر لیا ہے جن کے ایمان باوجود معجزے دیکھنے کے پختہ نہ ہو سکے اور مسیح علیہ السلام کو کہنا پڑا تھا؛

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم مجھے اس لیے نہیں ڈھونڈتے کہ تم نے کرشمے دیکھے، بلکہ اس لیے کہ تم روٹیاں کھا کر سیر ہوئے"[1]

محض تیس روپوں کی خاطر اپنے آقا کو بیچنے والا کوئی اور نہیں بلکہ "السابقون الاولون" شاگردوں میں سے ہی ایک تھا۔ اسی طرح جب مسیح کی یہودی عدالت میں توہین کی گئی تو گرفتاری کے خوف سے مسیح پر لعنت ملامت کرتے ہوئے شناسائی سے ہی انکار کرنے والا بھی کوئی اور نہیں بلکہ عدالت کے احاطہ میں موجود "اعظم الحوارین" پطرس ہی تھا۔ لوگوں کے بار بار دریافت کرنے پر پطرس "لعنت کرکے قسم کھانے لگا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا"[2]۔

جب مسیح کو صلیب دینے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو ہجوم میں شامل ان کا ایک شاگرد، انجیل کے مطابق،

"اپنے ننگے بدن پر مہین چادر اوڑھے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیا۔ اسے لوگوں نے پکڑا مگر وہ چادر چھوڑ کر ننگا ہی بھاگ گیا"[3]۔

اس پس منظر میں معترض کا اصحاب رسول ﷺ کو لالچی اور کم ہمت ظاہر کرنا دراصل شاگردان عیسیٰؑ پر قیاس کرنے کی بناء پر ہے۔ معترض نے اپنے دعویٰ کی تائید میں ایسا کوئی نام نقل نہیں کیا جو قریش مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اسلام سے برگشتہ ہوا یا اس نے کم ہمتی کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس مسیحی تحریر میں بظاہر قرآنی وحی پر گفتگو میں اصحاب رسول ﷺ کی وفاشعاری پر حرف زنی کی گئی ہے۔ تہہ در تہہ اعتراض کی یہ حکمت عملی فریق مخالف کو الجھانے اور اشتعال دلانے کے علاوہ کوئی مثبت مسیحی دعوت کا پہلو اپنے اندر نہیں رکھتی۔

قرآن کی ایک ایک آیت کریمہ پوری طرح تاریخ کی روشنی میں ہے۔ جس سے معترضین نے اپنے مقاصد کی خاطر غلط استدلال کرکے یا غیر مقبول روایات کو بنیاد بنا کر تنقیدی اسلوب میں قلم اٹھایا ہے۔ اس کے مقابل سیدنا عیسیٰؑ کی وحی قرآنی وحی کی مانند کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئی جس سے اس کا زمانی تجزیہ ممکن ہوتا۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ مسیحی مومنین وحی کے نجماً نجماً نازل ہونے کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں[4]۔ لیکن ان کے سامنے انجیل کے نام پر پورا پورا کتابچہ مرتب کرکے رکھا گیا ہے اس لیے وہ باوجود تسلیم کرنے کے نجماً نجماً وحی قرآنی کو دلی طور پر قبول کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ قرآن پر وضعی الہام ہونے کا الزام اسی فکری ساخت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے

---

1 یوحنا ۶: ۲۶

2 متی ۲۶: ۷۴

3 مرقس ۱۴: ۵۱

4 فانڈر، میزان الحق، ص ۳۰ (دیباچہ) "ضرور ہے کہ سچا اور حقیقی الہام راہ نجات کی صاف ہدایت کرے۔ اور اس مضمون کی

مسیحیت وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وحی کے حقیقی تصور سے دور اور کلیسیائی کونسلوں کے فیصلوں کے خوگرو تابع ہوتی چلی گئی۔ وحی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی کی تھی نہ کہ متی، مرقس، لوقا، یوحنا وغیرہ کی، جن کا کلام بعد ازاں الہامی متصور ہوا۔ کلیسیائی کونسلوں کے فیصلوں میں وحی کا تصور یکسر بدل کر وسعت پذیری اختیار کرتے ہوئے آبائے کلیسیا کے نظریات اور فیصلوں کے ماتحت ہوگیا۔ اب روح القدس کی تائید نے آبائے کلیسیا کے لیے بھی دامن پھیلالیا۔ اسی تصور کے زیر اثر جب مسیحی لٹریچر میں وحی اسلام پر قلم اٹھایا گیا تو اس کا تجزیہ اسلامی دعاوی کے مطابق نہیں کیا گیا اور نہ ہی تعلیمات و اثرات کے لحاظ سے بلکہ اسی کلیسیائی آنکھ سے جو صدیوں سے وحی و الہام کو مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں میں سونپ چکی تھی۔ وحی قرآن کا جستہ جستہ نازل ہونا اسی پس منظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔ یہاں پر قرآنی احکامات و واقعات اور اسلوب کی مماثلت اگر بائبل سے دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے تو اس بنا پر نہیں کہ قرآن کو اپنی سند کے لیے بائبل کی ضرورت ہے اور نہ ہی الزامی طور سے بلکہ محض اس لیے کہ وحی والہام کے مسیحی تصور میں انسانی آمیزش کے اثرات کے نتائج کو دکھلایا جائے اور ان کے اصول استنباط میں اصولی غلطی کی طرف اشارہ کیا جائے۔

(ب) (ا) چربہ اور سنی سنائی روایات کا اتہام

مسیحی استفادی لٹریچر کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ قرآن کو وضعی الہام کے ساتھ ساتھ سابقہ کتب مقدسہ کا چربہ قرار دیا جائے۔ اس ضمن میں قرآن پر یہودی تالمودی و مسیحی روایات اور اسفار متروکہ سے ماخوذ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

> "اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنحضرت نے کبھی بائبل کا مطالعہ کیا۔ آنحضرت کے بیانات بائبل شریف سے تو کچھ مطابقت نہیں رکھتے پر یہودیوں کے ربیوں کے قصہ کہانیوں اور تذکرۃ الاولیاء سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرور آپ کی چند یہودیوں سے آشنائی اور دوستی تھی جن سے آپ نے وہ تمام سرمایہ مضامین جمع کیا جس کا آپ نے بعد میں قرآنی وحی والہام کے پیرایہ میں ذکر کیا ہے"[1]۔

رسول اللہ ﷺ کی بائبل سے عدم واقفیت کے اقرار کے بعد اس مسیحی تحریر میں قرآن کا تعلق یہود میں رائج

تعلیم میں ہرگز ہرگز اختلاف معنوی پیدا نہ ہو۔ "یہ ممکن ہے کہ ایسا الہام تھوڑا تھوڑا کر کے زمانہ دراز میں تکمیل و اتمام تک پہنچے"۔

1 کینن سیل، القرآن، ص ۶۳۔ ۶۴

قصص سے جوڑنے کی سعی کی گئی ہے۔ جس کے لیے یہود سے معاصرت کو خلاف واقعہ دوستی میں بدل کر پیش کیا گیا ہے کیونکہ یہود نے آغاز اسلام سے ہی معاندانہ روش کا مظاہرہ کیا۔ ان سے " قصوں اور کہانیوں کے سرمایہ مضامین" کا حصول خالصتاً ذہنی اختراع ہے۔ یہ کہنا کہ آنحضرت ﷺ کے بیانات بائبل شریف سے کچھ مطابقت نہیں رکھتے دراصل بائبل کو معتبر ٹھہرا کر قرآن کی وقعت کو کم کرنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ قرآن اور بائبل کے کسی بیان میں عدم مطابقت کی صورت میں دو احتمال ممکن ہیں۔

۱ بائبل کا بیان درست اور قرآنی بیان غلط

۲ قرآن کا بیان درست اور بائبل کا بیان غلط

دلائل کی عدم موجودگی میں کسی ایک کے بیان کو صرف اس لیے غلط نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ دوسرے کے مخالف ہے۔ کسی بیان کی تغلیط کے لیے ٹھوس شواہد و نظائر کی بنا پر اسے غیر حقیقی ثابت کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال بائبل اور قرآن کے بیانات کا ایک جزوی تقابلی جائزہ "بائبل قرآن اور سائنس" از موریس بوکائیے ہے۔ اس میں دونوں کے بیانات کو جدید سائنسی حقائق کی روشنی میں پرکھنے کے بعد فرانسیسی مصنف اس نتیجہ پر پہنچا؛

> " (مجھے) قرآن میں ایک بھی بیان ایسا نہیں ملا جس پر جدید سائنس کے نقطہ نظر سے حرف گیری کی جا سکے۔ اسی معیار کو میں نے عہد نامہ قدیم اور اناجیل کے لیے آزمایا۔ اور ہمیشہ وہی معروضی نقطہ نظر قائم رکھا۔ اول الذکر میں مجھے پہلی ہی کتاب آفرینش سے آگے نہیں جانا پڑا۔ اور ایسے بیانات مل گئے جو جدید سائنس کے مسلمہ حقائق سے کلی طور پر عدم مطابقت رکھتے تھے"[1]۔

اسی طرح فریقین کے دعاوی سے ہٹ کر، قرآن اور بائبل کے عدم مطابقت والے تاریخی قصے اور کہانیوں کی اصلیت جاننے کے لیے انہیں غیر جانب دارانہ طریق سے پرکھا جا سکتا ہے۔ جیسے فرعون و موسیٰؑ کے تاریخی واقعہ کے بائبلی تذکرہ میں فرعون کی لاش کو محفوظ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں۔ جب کہ ۱۸۹۸ء میں تبیسہ (مصر) سے دریافت ہونے والی لاش کو ماہرین آثار قدیمہ نے پرکھ کر اسے حضرت موسیٰؑ کا پیچھا کرتے ہوئے بحیرہ قلزم میں ڈوبنے والے فرعون کی لاش کے طور پر شناخت کر لیا۔ یوں قرآنی دعویٰ "فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ ءَايَةً (یونس: ۹۲) کی جدید علوم کے ماہرین نے تصدیق کر دی۔

اسی طرح قرآن نے بائبل میں مفقود الذکر اقوام عاد و ثمود کا تذکرہ کیا ہے جس پر شدید معاند قریش بھی معترض نہ ہوئے جب کہ ماضی قریب تک مسیحی ناقدین انہیں افسانوی اقوام قرار دیتے رہے ہیں[2]۔ لیکن دمشق سے

---

1 بوکائیے، بائبل، قرآن اور سائنس، ص ۱۱

2 جرمن مستشرق ولہاسن نے " انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں عاد کے قرآنی بیان کو غلط فہمی پر مبنی اساطیری تشریح قرار دیا۔

"AD was a common noun (The ancient time Adj - Adi very ancient) and that the mythical nation

چالیس کلو میٹر دور حلب کے جنوب مغرب میں تل مردیخ کے مقام پر ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۷ء میں دریافت ہونے والے وادی عبلہ / ایبلا کے آثار سے ان کے وجود پر تاریخی شواہد دستیاب ہوگئے[1]۔

قرآن کے مزعومہ مصادر و منابع کی کھوج لگانے کی سب سے معروف سعی گولڈ سیک کی "ینابیع القرآن" ہے۔اس کتاب میں کیے گئے اعتراضات گویا مسیحی علم الکلام کی معراج ہیں۔وہ کہتے ہیں،

"محمد صاحب نے اپنے ہم عصر یہودیوں کی زبانی جو کچھ سنا اسے کتب آسمانی کا جز خیال کرکے اپنے حسب منشا لکھ رکھا اور بعد میں جاہلوں کے سامنے وحی آسمانی کے نام سے پیش کر دیا"[2]۔

رسول اللہ ﷺ کا اپنے ہم عصر یہودیوں سے زبانی سن کر اسے کتب آسمانی تصور کر لینا اور اس میں اپنی حسب منشاء بعض چیزیں شامل کرکے اسے ناواقف لوگوں کے سامنے وحی کے نام پر پیش کر دینا، ایک بلا دلیل و ثبوت اتہام ہے۔اگر اس اتہام کے کچھ ذرائع خبر مہیا ہوتے تو ان کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔

دو مختلف مقامات میں بیان شدہ کسی تاریخی امر میں جزوی یا اتفاقی مشابہت فی نفسہ باہم نقل ہونے کی دلیل نہیں۔نہ ہی اس مماثلت کو دلیل ٹھہرا کر ایسے نتائج کشید کیے جاسکتے ہیں۔ مخصوص نتائج کے لیے کردہ تجزیہ، جو الزام تراشی کے زمرے میں آئے، کوئی مستحسن فعل نہیں۔ مسیحی تحریر میں یہود سے موافقت و موانست کے عمومی مذکرہ سے تاثر پیش کرنے کی سبھی مساعی تاریخی لحاظ سے خلاف حقیقت ہیں۔کیونکہ قرآن واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے ؛لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ ٱلنَّاسِ عَدَٰوَةً لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱلۡيَهُودَ وَٱلَّذِينَ أَشۡرَكُواْ (المائدۃ: ۸۲) (آپ لوگوں میں ایمان والوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والوں میں یہود اور مشرکین کو پاؤ گے)

آنحضرت ﷺ یہود سے دو امور اخذ کر سکتے تھے۔

- خاندانی تاریخی روایات
- عقائد و شریعت

عرب و یہود دونوں ابراہیم علیہ السلام کی ذریت اور ان کے پیروکار تھے۔ اور از روئے بائبل وہ خدا اور ابراہیم کے درمیان ہونے والے اس میثاق میں شامل تھے جس میں بنی اسرائیل کی نسل بڑھانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔بلکہ اس

---

arose from a misinterpretation of that of that word.(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تحت مادہ عاد)

1 Chaim Bermant & Michel Weitzman, Ebla, London 1979. p.12-13 , 191

2 گولڈ سیک، ینابیع القرآن، ص ۲۲

میثاق کے وقت تو اسحاق پیدا ہی نہیں ہوئے تھے [1]۔

بنو اسماعیل کی روایات حضرت ابراہیم سے لے کر عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم تک محیط ہے۔ جب کہ بنی اسرائیل کی روایات کو دو ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

- حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰ تک
- حضرت موسیٰؑ سے لے کر عہد عیسوی تک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، مسیحی دعویٰ کے مطابق، کون سے عہد کی روایات یہود سے اخذ کی تھیں؟ اگر پہلا دور ہے تو اس میں یکساں عقائد اور شریعت میں چند ایک جزوی اختلافات اور مقامی خاندانی روایات کے مختلف فیہ ہونے کے سوا فریقین میں کوئی خاص بُعد نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور موسیٰ کے مابین چند صدیوں پر محیط عرصہ کی ان روایات کے لیے عرب یہود کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ اس حقیقت کو نظرانداز کرکے اس عرصہ کی روایات کے لیے انہیں یہود کا مرہون منت بتلانا، لاعلمی یا تلبیس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سورۃ یوسف مکی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اہل مکہ میں سے کسی نے حضرت یوسفؑ سے ناآشنائی کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس بنا پر اعتراض کیا کہ یہ تو ہماری روایت نہیں بلکہ یہود سے سن کر بیان کر دی گئی ہے۔

مسیحی مصنفین کا یہ عمومی زعم باطل ہے کہ تنہا یہود ہی دین ابراہیم کی روایات کے امین تھے۔ خاندانی روایات کے حوالے سے یہود کے ساتھ ساتھ عرب بھی حضرت اسماعیلؑ کے نسب سے ہونے کی وجہ سے ابراہیمی روایات کے امین تھے۔ جن روایات مثلاً حضرت یوسفؑ یا حضرت سلیمانؑ کا قصہ وغیرہ کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہود سے لیے گئے ہیں دراصل عرب کے اسلاف کی بھی روایات ہیں جو ان کے ہاں بھی متداول تھی۔ بلکہ ان کی آپس میں رشتہ داریوں کی خبر بھی بائبل دیتی ہے جیسے حضرت داؤدؑ کی بہن ابی جاسیل کے خاوند یاتر کے متعلق بائبل

---

1 "خدا نے ابراہیم سے ہم کلام ہو کر کہا،" دیکھ میں اپنا عہد تیرے ساتھ باندھتا ہوں۔ اور تو قوام کے انبوہ کا والد ہو گا۔۔۔ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا اور قومیں تیری نسل سے ہوں گی۔۔۔ میں اپنے اور تیرے مابین اور تیرے بعد تیری نسل مابین ان کی پشت در پشت کے لیے اپنا عہد جو دائمی ہے باندھوں گا۔ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں گا۔۔۔ پھر خدا نے ابراہیم سے کہا،" اس سب سے تو اور تیرے بعد تیری نسل اپنی پشتوں میں میرے عہد کو مانیں اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے مابین اور تیرے بعد تیری نسل کے مابین ہے جسے تم قائم رکھو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک مرد کا ختنہ کیا جائے۔ اور یہ اس عہد کا نشان ہو گا۔۔۔ اور ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل اور سب خانہ زادوں اور سب زر خریدوں یعنی اپنے گھر کے لوگوں میں سے جتنے مرد تھے سب کو لیا اور اسی روز ان کا ختنہ کیا"۔ (پیدائش: ۱۷)

بتلاتی ہے کہ وہ اسماعیل سے تھے[1]۔ جس کا بیٹا عماسا اسماعیلی ہونے کے باوجود داؤدؑ کی فوج کا سپہ سالار تھا[2]۔ نیز یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں ہے؛

" عرب کی بابت نبوت، اے ددانیوں کے قافلو! تم جو بیابان میں خیمہ زن ہو پانی لے کر پیاسوں کو ملنے آؤ۔ اے (حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے) تیما کی سرزمین کے باشندو![3]۔

عرب کے جد اعلیٰ قیدار کا ذکر تورات میں کئی بار آیا ہے[4]۔ ان خاندانی روایات کی موجودگی میں عرب کا یہود سے اخذ کرنے کا اعتراض مغالطہ آفرینی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

رہی بات احکام و شرائع کو یہود سے سن کر پیش کرنے کی تو یہ بھی اتہام ہے۔ مثلاً عرب کے لوگ اس وقت بھی حج کی رسم ادا کر رہے تھے۔ جب بنی اسرائیل مصر میں غلام تھے یا دشت تیہ میں خدا کی نافرمانی کے سبب بھٹک رہے تھے۔ وہ کون سے امور تھے جنھیں سن سنا کر پیش کیا گیا ان کی نشان دہی مفقود ہے۔ بعض آفاقی سچائیوں اور تاریخی واقعات کے اشتراک کو بنیاد بنا کر محض ظن و تخمین سے اعتراضات کی عمارت کھڑی کرنا مسیحی لٹریچر کا خاصہ ہے

اگر رسول اللہ ﷺ یہودی روایات کو قرآن بنا کر پیش کر رہے ہوتے تو ہدایت کے متلاشی اور ان روایات سے باخبر بعض مخلص صحابہ مثلاً حضرت ابیؓ بن کعب ، حضرت عبد اللہؓ بن سلام ، حضرت زیدؓ بن ثابت کو اس ماخذ قرآن سے آگاہی پر ترک اسلام میں کیا چیز مانع تھی۔ مسیحی لٹریچر میں صحابہ کرام کو جاہل خیال کرنا کہیں انہیں مسیح کے مخاطب گلیلی مچھیروں کے مقام پر کھڑا کرنے کی شعوری کاوش تو نہیں؟

مسیحی تنقیدی ادب کے اسلوب و معیار تحقیق کا اندازہ ذیل کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

"اگرچہ قرآن کے مطالعہ سے یہ بات نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے کہ محمد نے اپنے وقت کے بت پرست عربوں کی بہت سی رسوم کو قرآن میں درج کر لیا اور مسیحی دین کی بہت سی باتوں کو لیکر ان پر قریشی عربی میں جبرائیلی پیغام کا حاشیہ چڑھا لیا تاہم قرآن کی اصلیت و ماہیت پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ اسلام بحیثیت مجموعی طالمودی یہودیت اور رسالت محمدیہ کا مجموعہ ہے"[5]۔

---

1 ا۔ تواریخ ۲ : ۱۷

2 قاموس الکتاب، ص ۶۶۳

3 اشعیا ۲۱ : ۱۳

4 اشعیا ۲۱ : ۱۶؛ زبور ۱۲۰ : ۵ ؛ اشعیا ۶۰ : ۷ ؛ یرمیاہ ۴۹ : ۲۸ وغیرہ

5 گولڈ سیک، ینابیع القرآن، ص ۱۷

بت پرستی سے بیزاری کا اعلان کرنے والے قرآن کریم پر اپنے وقت کے بت پرست عربوں کی بہت سی رسوم درج کرنے کا الزام دھرا گیا ہے لیکن اس کی کوئی ایک مثال پیش نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے دین ابراہیمی کی پیروی کرنے والے عرب معاشرے میں دین ابراہیم سے متصادم رسومات کو ختم، قابل اصلاح کی درستگی، اوراس کے موافق کو برقرار رکھا۔

عرب اپنے جد امجد سیدنا ابراہیمؑ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ذبیحہ اسماعیل کی یاد میں حج کے موقع پر قربانی کرتے تھے۔ تاہم بمرورایام مشرک اقوام کے ساتھ میل جول کے نتیجہ میں بت پرستی ان میں راہ پاگئی اور وہ بتوں کے نام پر بھی قربانیاں کرنے لگے تھے۔ اسلام نے بتوں کے نام پر ہر قسم کی قربانی حرام قرار دے دی، اور حج کے موقع پر حضرت اسماعیل کی یاد میں کی جانے والی اصل قربانی بحال کی۔ اسی طرح دیگر مواقع پر صرف اللہ کے نام پر ذبیحہ کو جائز قرار دیا اور ننگے ہو کر طواف کرنا یا دوران طواف تالیاں پیٹنے جیسی غیر مہذب رسومات ختم کر دیں جب کہ اصل رکن طواف کعبہ کو بحال رکھا۔ یہ سنت انبیاء کے خلاف نہیں کیونکہ وہ ان تمام کاموں کو سرے سے ختم کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں جو منشاء الٰہی کے مخالف ہو۔ جیسے حضرت عیسیٰؑ کا اپنی مخاطب یہودی قوم میں رائج شریعت موسوی کی روح کے خلاف رسومات اور غلط رویوں کی اصلاح کرنا ہے۔ جس میں سرفہرست ہیکل میں خرید و فروخت کرنے سے منع کر کے اس کے تقدس کو بحال کرنا تھا[1]۔

اسلام کا دامن کسی بھی قسم کی بت پرستانہ رسومات سے قطعاً پاک ہے جب کہ مروجہ مسیحیت کے دامن کا سب سے بڑا دھبہ یہی ہے کہ اس میں عیسوی تعلیمات کے برعکس آبائے کلیسیا کے فیصلوں کے نتیجہ میں بت پرست مشرک اقوام کی بہت سی رسومات در آئی ہیں۔ پادری سی جی فانڈر شہنشاہ قسطنطین کے ۳۱۴ء میں دین مسیحی کو قبول کرنے کے نتیجہ میں در آنے والی مشرکانہ رسومات کی بابت لکھتے ہیں؛

> "اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہت سے (لوگ) حقیقی دلی تبدیلی اور مناسب تعلیم کے بغیر کلیسا میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے اپنے ساتھ بت پرستوں اور بے دینوں کے خیالات وعقائد کو لیتے آئے۔ اور اس سے بتدریج دین میں بدعتیں پھیل گئیں"[2]۔

یوں برصغیر کے منادین کے سرخیل پادری فانڈر بھی اس حقیقت کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے، گو بہت محتاط الفاظ

---

1 متی ۲۱ : ۱۲ "اور یسوع نے ہیکل میں داخل ہو کر ان سب کو جو ہیکل میں خرید و فروخت کر رہے تھے نکال دیا اور صرافوں کے تختے اور کبوتر فروشوں کی تختیاں الٹ دیں۔ اور ان سے کہا یہ لکھا ہے کہ "میرا گھر دعا کا گھر کہلائے گا مگر تم اسے ڈاکوؤں کی کھوہ بناتے ہو" ؛ مرقس ۱۱ : ۱۵ ؛ لوقا ۱۹ : ۴۵

2 میزان الحق، ص ۲۷۵

استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح پادری برکت اللہ کے الفاظ میں؛

نسطورین نے عین وقت پر اور انجیلی روسے بجا طور پر اپنی صدائے احتجاج بلند کی کیونکہ چوتھی صدی عیسوی میں مشرکانہ مذاہب کے زیر اثر کلیسانے مریم بی بی کو "مادر خدا" کہنا شروع کر دیا تھا۔[1]

مسیحی مناروں کے لیے یہ بات مسلسل سوہان روح بنی رہی ہے کہ مسیحی مذہب میں شامل مشرک اقوام کی رسومات کی کیا توجیہ کی جائے۔ یوم السبت کی بجائے اتوار کے دن کا تعین یسوعؑ کا نہیں بلکہ قسطنطین کے دور میں نیقیہ کی کونسل کا کردہ ہے۔ جس کے پیچھے محض مشرک اقوام کی سورج پرستی کے جذبہ کو تسکین بخشنا تھا[2]۔

رسول اللہ ﷺ پر "مسیحی دین کی بہت سی باتوں کو لے کر ان پر جبرائیلی پیغام کا حاشیہ چڑھا" کر قرآن بنانے کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن قرآن میں موجود جبرائیلی حاشیہ والی ان مسیحی دینی باتوں کی نشان دہی نہیں کی گئی کہ اُن کے تجزیہ سے یہ دعویٰ پرکھا جائے۔ قاری یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہو گا کہ قرآن میں " تثلیث، ابنیت، تجسیم ازلی گناہ، کفارہ، شریعت کو لعنت ٹھہرانا، رہبانیت، پاپائیت، معافی نامے، مذہبی احتساب یا تطہیر عقائد "میں سے کس پر جبرائیلی حاشیہ چڑھایا گیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی نبی کے پاس باسمہ نبوت کا تحریری تقرر نامہ (Appointment Letter) نہیں ہوتا بلکہ اس کے دعویٰ نبوت کی پرکھ اس کی دعوت، تعلیم اور کاموں سے ہوتی ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام قوم کے مطالبہ پر اپنی نبوت کی دلیل ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ لیکن باپ جو مجھ میں رہتا ہے وہی اپنے کام انجام دیتا ہے۔ میرا یقین کرو کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے۔ نہیں تو کاموں ہی کے سبب سے یقین کرو"[3]۔

بعینہ رسول اللہ ﷺ نے آغاز دعوت میں اپنا کردار قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور کردار کو معیار بنانے کی یہ پرکھ آخر تک قائم رہی جس میں آپ کا ہر عمل " لیلها کنهارها " لوگوں کے سامنے تھا۔

نبوی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اگر کوئی اسے بدنیتی گردانے تو یہ حقیقت بینی سے فرار کے سوا کچھ نہیں۔

---

1 برکت اللہ، صلیب کے ہر اول، ص ۸۱

2 "(عیسائیت میں) ہمیشہ عبادت کا دن ہفتہ ہی مقرر رہا خود یسوع اور اس کے جملہ رسولوں نے بھی ہفتہ ہی کو مقرر رکھا مگر قسطنطین چونکہ سورج پرست تھا اور سورج پرستوں کی عبادت بجائے ہفتہ کے اتوار کو ہوتی تھی اس لیے قیصر نے عبادت کا دن اپنا ہی رکھا" (اسلام اور عیسائیت از ابو محمود ہدایت اللہ سوہدروی، ص ۳۸ مزید تفصیلات کتاب ہذا کے ص ۳۲ تا ۴۱ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔)

3 یوحنا ۱۴: ۱۰۔ ۱۲

مسیحی دعوٰی کے برعکس قرآن میں مسیحی دینی باتوں کا تذکرہ ان کی تغلیط و تصحیح کی خاطر ہے نہ کہ انہیں "سرقہ" کر کے ان پر ایمانیات کی بنیاد رکھنا مقصود تھا۔ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ و حضرت مریم علیہا السلام کی شخصیت اور ان سے منسوب عقائد کی اصلاح کی ہے۔ غلط بیان کی تصحیح، موعظت و عبرت کا حصول یا تائیدی استشہاد کا استنباط کبھی چربہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

کلیسیا اور اسلام کا ایمانیات اور نظامِ عبادت میں تشبہ و اختلاف کے لحاظ سے تقابلی مطالعہ اس الزام کی نفی کرتا ہے کہ اسلام میں مسیحی دین کی باتوں پر وحی کا حاشیہ چڑھایا گیا ہے۔ چربہ ہونے کی وجہ سے اسلام میں مسیحیت کا عکس (Mirror Copy) جھلکتا نظر آنا چاہیے تھا نہ کہ وہ اس کا زبردست ناقد ہوتا۔ ایک طرف تو قرآن کی بنیاد مسیحی روایات پر مبنی قرار دی جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ قرآن بڑی بڑی باتوں میں انجیل کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر مسیحی روایات پر جبرائیلی حاشیہ ہوتا تو یہ بڑے بڑے اختلافات موجود نہ ہوتے بلکہ بقدرِ ضرورت ترمیم کر کے انہیں اپنا لیا جاتا۔ مثلاً یہ عین ممکن تھا کہ تثلیث کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کسی ایک اقنوم کو اسلامی کردار کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا۔

قرآن کا مسیحی و یہودی روایات سے ماخوذ ہونے کا جائزہ ڈاکٹر عبد القادر جیلانی نے ان الفاظ میں لیا ہے؛

"عربی کالٹریچر قبل از اسلام کیا تھا؟ سبع معلقات کے سوا کسی اور تحریر کا ذکر تک تاریخ میں نہیں پایا جاتا سوائے شعراء کے اشعار کے۔ جن میں جنگ و جدل، حمیت جاہلیہ، فخر و مباہات، تشبیب، غزل، ہجر و وصال کے علاوہ اور کچھ نہیں پایا جاتا تھا۔ اور یہ کوئی سرمایہ ادب نہ تھا۔۔۔ کہتے ہیں کہ عرب میں یہود موجود تھے اور ان کے پاس تورات اور زبور موجود تھی، انہی سے تعلیم حاصل کی ہو گی۔ مگر یہ کبھی نہیں کہتے کہ یہود اپنی مذہبی تعلیم کی غیر یہودی کو دینا گناہ تصور کرتے تھے۔ پھر یہودی تعلیم اور حرمت عیسیٰؑ دو متضاد باتیں ہیں۔۔۔ عرب کے ماحول میں دنیا کی عظیم ترین کتاب کی تصنیف ناممکن تھی پھر آخر قرآن کیسے ظہور پذیر ہوا۔ یہ مسئلہ اس وقت تک حل طلب ہی رہے گا جب تک وحی الٰہی کو ذریعہ علم تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اور جونہی وحی کو اس کا ذریعہ تسلیم کر لیا جائے تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں کہ تمام صحف کا تعلق ایک ہی سرچشمہ ہدایت سے ہے جس کے باعث ان میں مماثلت پائی جاتی ہے"[1]۔

اس بدیسی سوچ کا مشاہدہ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مقامی مسیحی تحریروں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

" عرب میں یہودی مذہب اور اس کی قدیم روایتوں اور مسیح کی انتظاری کا ایسا چرچا تھا اور ایسی رونق تھی جن کے درمیان محمد صاحب پیدا ہوئے اور بڑھے اور وہ سبق سیکھے جو قرآن کی تقریروں میں پیش کیے

---

1 جیلانی، اسلام پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر، ص ۲۴۹

گئے ہیں"[1]۔

قرآن کو یہودی و مسیحی روایات کا نتیجہ ظاہر کرنے کے لیے قاری کے ذہن میں دو باتیں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے

۱ یہود اس وقت ایک نجات دہندہ مسیح کے منتظر تھے۔ آپ ﷺ نے حالات سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اپنے آپ کو اس نجات دہندہ کو طور پر پیش کر دیا۔

۲ قرآن اس دور کے انسانی خیالات کی تاثیر سے پاک نہیں، نتیجہ یہ ہو گا کہ قرآن کلام الٰہی نہیں ہے۔

یہ دعویٰ غلط بیانی اور الزام تراشی کی واضح مثال ہے۔ یہاں التباس سے کام لیتے ہوئے یہود کے نئے نبی کے انتظار کو مسیح پر چسپاں کر دیا گیا اور رسول اللہ کو موقع پرست گردانا گیا ہے۔ یہود یقیناً ایک نئے نبی کے منتظر تھے لیکن آپ ﷺ کی دعوتِ اسلام کے جواب میں معاند یہود نے بھی نہیں کہا ہم تو ایک مسیح کے منتظر ہیں اور آپ مسیح ہونے کے مدعی ہی نہیں۔ حجاز کے پڑوس میں مسیحیت کی موجودگی کی وجہ سے اہل عرب مسیحی اقوام سے واقف تھے اور تجارتی تعامل کی بنا پر انہیں مسیح ناصری کی چھ صدیاں قبل آمد کا حال بھی معلوم تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مسیح ہونے کا نہ خود دعویٰ کیا اور نہ ہی ان کے پیروکاروں نے انہیں مسیح کے مرتبہ پر فائز کیا ہے۔ خیالی تصویر کشی کے ذریعے مسیحی روایتوں سے سبق سیکھنے کی یہ داستان تاریخ عرب میں مفقود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہی سبق عرب کی فضا میں محمد ﷺ سے قبل کسی اور نے کیوں نہ پڑھ لیے۔ حیرت اس پر ہے کہ ان مزعومہ اسباق کے اصل خالق مسیحی خود تو عرب میں مغلوب ہو جائیں اور ان کے خوشہ چیں انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے میں کامیاب رہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ہم عصر مسیحیوں اور یہود کی طرف سے یہ الزام سامنے نہیں آیا حالانکہ قرآن کے اپنی صداقت کے مختلف دعوؤں کی موجودگی میں ان کی طرف سے یہ الزام فوراً سامنے آجانا چاہیے تھا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر آپ ﷺ مسیح ہونے کا دعویٰ کرتے تو عرب کے مسیحی فوراً انہیں جھٹلا دیتے کہ وہ نبی تو ناصریہ میں آ چکا ہے۔

اسی طرح یہ بات باعث حیرت ہے کہ انسانی خیالات کی آمیزش والی بائبل تو مسیحی مومنین کے نزدیک الہام الٰہی قرار پائے اور قرآن کریم میں بفرض محال انسانی خیال پائے جائیں تو انہیں کے نزدیک یہ غیر الہامی۔

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۱۵

۴ اسفار متروکہ

مسیحی لٹریچر میں بتکرار قرآن کو بائبل کا چربہ ہونے کے ساتھ ساتھ جعلی بدعتی اناجیل (اسفار متروکہ) سے ماخوذ گردانا گیا ہے۔

"رسول عربی انجیل کی صحیح تعلیم سے بے خبر تھے اور ان کی یہہ لیاقت و قابلیت نہ تھی کہ ان بدعتی مسیحیوں کی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ لہذا کچھ تعجب نہیں کہ آپ نے ان (جعلی اناجیل کے) شنیدہ افسانوں کو قرآن میں درج کیا اور وحی آسمانی کے نام کی مہر اُن پر بھی لگادی اور کہا کہ یہہ الہام پہلی کتابوں کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔"

نیز یہ کہ "ان (جعلی اناجیل کے) افسانوں کا قرآن میں پایا جانا ہی بڑا بھاری ثبوت ہے اور اس امر کی اعلی دلیل ہے کہ قرآن اختراع انسانی ہے"[1]۔

ان افسانوں میں حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے متعلقہ واقعات بھی شامل ہیں۔ ان کے متعلق دعوٰی کیا ہے کہ یہ جعلی انجیلوں سے لیے گئے ہیں[2]۔

پادری کینن سیل کے بقول "مریم طاہرہ کی تواریخ بھی قریباً سب کی سب جعلی اور غیر معتبر اناجیل سے لی گئی ہے"[3]۔

قرآن پر ان مسیحی اعتراض کے تجزیہ سے حقائق کی تہہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ پادری صاحبان کا مؤقف یہ ہے کہ قرآن میں جعلی بدعتی اناجیلی بیانات سے اخذ شدہ واقعات ہیں۔ یہ اصل تورات و انجیل سے متضاد و متبائن ہیں۔ اور مروجہ بائبل کی مخالفت کی بنا پر یہ وحی الٰہی نہیں ٹھہرتا۔

مسیحی تنقیدی ادب کے منہجی تجزیہ کے لیے یہ دیکھنا لازم ہے کہ

۱ متروکہ اناجیل کو کن بنیادوں پر جعلی و بدعتی کہہ کر رد کیا جاتا ہے۔

۲ مروجہ اناجیل کو کس بنیاد پر مستند و مقبول ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کی استنادی حیثیت کیا ہے۔

۳ کیا حضرت عیسیٰؑ کے مکمل و معتبر احوال صرف انہیں مروجہ اناجیل میں محصر ہیں کہ جن کے سوا تمام روایات کو رد کردیا جائے گا۔

---

1 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۲۶

2 ایضاً، ص ۱۶

3 کینن سیل، القرآن، ص

۴ کہیں ایسا تو نہیں کہ کلیسیا نے اپنے مخصوص نظریات کی ترویج کے لیے مسیح کے مخصوص حالات پر مشتمل اناجیل کا چناؤ کیا اور دیگر کو قصداً نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان سوالات کا مختصر اُجائزہ حقائق تک پہنچنے میں مدد معاون ثابت ہو گا۔

(۱) تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ جعلی اور غیر معتبر ٹھہرائے جانے والے اسفار متروکہ کے لکھاری بھی مسیحی ہی تھے، جو مروجہ اناجیل کے مؤلفین کے ہم عصر اور ان کا دور تالیف بھی قریب قریب ایک ہی ہے۔ بلکہ دلچسپ امر یہ ہے کہ مروجہ اناجیل اربعہ کے مصنفین کی مقبول اناجیل کے علاوہ ان کی اناجیل کے ہی نام پر دوسری تحریریں بھی اس متروکہ فہرست میں شامل ہیں[1]۔ یہ سبھی موجودہ اناجیل کی سطح پر ہی قلم بند ہوئی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ مروجہ اناجیل کو تو الہامی حیثیت سے لکھا گیا ہو اور دوسری ان کے مقابل محض جعل سازی سے منظر عام پر آئی ہوں۔ پہلی اور دوسری صدی میں لکھی جانے والی یہ سب اناجیل یکساں حیثیت سے انجیل کے نام پر معرض وجود میں آئیں اور مختلف فرقوں میں مروج بھی رہیں۔

"(مروجہ چار اناجیل سمیت) ۷۶ اناجیل ۳۲۵ء کی نیسیہ کانفرنس سے پہلے سبھی مستند سمجھی جاتی تھیں اور ہر پادری کو گرجا میں رکھنی ہی پڑتی تھیں"[2]۔

بعد ازاں انہیں کلیسیائی ضرورت کے تحت رد کیا گیا نہ کہ غیر الہامی ہونے کی بنا پر۔ کیونکہ ان میں سے اناجیل کے نام پر موجود تمام کتب کے ڈھیر میں سے چار کا چناؤ کیا گیا تھا اور بقیہ کو جعلی و بدعتی ٹھہرانے کے پیچھے محض ان چار اناجیل کو مستند ٹھہرانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ بھی تاریخ کلیسیا سے ناواقف مخاطبین کے لیے۔

(۲) منتخب اناجیل کی استنادی حیثیت کے متعلق سابقہ اوراق میں مختصراً اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے لکھاریوں کے ملہم ہونے اور عینی شاہد ہونے کا دعویٰ محل نظر ہے، بلکہ وہ خود سن سنا کر لکھنے کا اقرار کرتے ہیں[3]۔ نیز جن مقدسین کی طرف ان کی نسبت ٹھہرائی جاتی ہے وہ بھی حتمی نہیں۔

"Infect the Gospels and Acts were published anonymously; the present titles came from the second century[4].

---

1 مثلاً انجیل طفولیت جو متی نے لکھی؛ انجیل یوحنا دوم؛ انجیل مرقس جو مصریوں کی کہلاتی ہے۔ سرسید، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام، (غازی پور ۱۸۶۲ء)، ص ۵۰۔۵۱ بحوالہ:

Horne's Introduction to the critical Study of the Scriptures (London 1825) p.642

2 سوہدروی، اسلام اور عیسائیت، ص ۴۵

3 لوقا ۱:۱

4 Encyclopedia Britannica, vol. 13, p32-33

(دراصل اناجیل اور اعمال کی کتاب گمنام طور پر (مصنفین کے ناموں کے بغیر) شائع ہوئیں۔ اور ان کے موجودہ عناوین (انجیل متی، انجیل مرقس وغیرہ اور انتساب) دوسری صدی میں رائج ہوئے)

انجیل یا نئے عہد نامہ میں ۲۷ کتابیں ہیں جنہیں ۱۶۰۰ سال پیشتر کلیسیائے جامع نے مستند قرار دیا تھا۔ نئے عہد نامہ کی کتب کو موجودہ شکل میں ان کے تحریر کیے جانے کے فوراً بعد جمع نہیں کیا گیا تھا۔ یہ انجیلیں ۶۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔ شروع شروع میں انجیلیں جن حلقوں کے لیے لکھی گئیں، مقامی طور انہیں کے پاس موجود تھیں"[1]۔ مثلاً انجیل متی شام کے علاقہ، لو قا یونان میں، اور مرقس روم میں رواج پا گئیں[2]۔ ہر علاقہ کے کلیسا میں عبادت و مواعظ کی کوئی خاص انجیل یا دوسری مذہبی کتاب استعمال ہوتی۔ رفتہ رفتہ ارباب کلیسیا نے ان کتب کی مجموعی فہرستیں مرتب کرنا شروع کیں۔ جن میں سب سے اہم فہرست سکندریہ کے بشپ اثناسیس Athanasius کی ۳۶۷ء میں جاری کردہ تھی[3]۔ قاموس الکتاب کے مطابق؛

" ان پہلی کتابوں میں جنہیں الہامی قرار دیا گیا اناجیل اربعہ بھی شامل تھیں۔ کلیسیاؤں میں بڑھتے ہوئے اختلاف اور بدعت اور بت پرستوں کے اعتراضات نے اناجیل کی فہرست مسلمہ میں ان کی دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیا۔ ۱۷۰ء تک ان چاروں اناجیل کو مکمل طور پر مستند مانا جانے لگا۔ یوسی بس (۳۵۰ء) اور اس کے بعد کے بزرگوں نے دیگر تمام انجیلوں کو فہرست مسلمہ سے خارج کر دیا اور صرف ان چاروں کو مسیح کی زندگی اور کاموں کے بارے علم حاصل کرنے کے لیے مستند قرار دیا"

سوال یہ سامنے آتا ہے کہ الہامی قرار پانے والی اناجیل میں ان چاروں کے علاوہ بھی کتب موجود تھیں جنہیں چوتھی صدی میں محض پسند یا ناپسند کی بنا پر فہرست مسلمہ سے خارج کر دیا گیا۔ اسی وجہ سے ہربرٹ ملر نے کہا تھا

The New Testament was the product of the early Church, not their basis[4].

کلیسا کی پہلی کونسلیں جنہوں نے عہد نامہ جدید کی کتابوں کو مستند ٹھہرانے کی توثیق کی وہ لیوڈیسیا اور کارتھیج میں بالترتیب ۳۶۳ء اور ۳۹۷ء میں منعقد ہوئیں[5]۔

ان کتب کے چناؤ اور ان کی استنادی حیثیت کے بارے تھامس پین کی رائے یہ ہے؛

"These books ... are, we are told , the word of God. It is therefore proper for us to

---

1 قاموس الکتاب، ص ۱۲۳

2 Daniel – Rop : Life of Jesus, p.28

3 Encyclopedia Britannica, p578

4 Muller, Hurburt , P.149 بحوالہ: ساجد میر، عیسائیت، ص ۲۷۴

5 سوہدروی، اسلام اور عیسائیت، ص ۴۵

know who told us so, that we may know what credit to give to the report. The answer to this question is, that no body can tell except that we tell one another so. The case, how our, historically appears to be as follows: When the Church mythologists established the system, they collected all the writings they could find.. They decided by vote which of books out of the collection they had made should be the word of God, and which should not. They rejected several, they voted others to be doubtful, such as the books called the Apocrypha; and those books, which had a majority of votes, were voted to be the word of God. Had they voted otherwise, all the people since calling themselves Christians, had believed otherwise: For the belief of the one comes from the vote of other. Who the people were that did all this, we know nothing of: they called themselves by the general names of the Church and this as all we know of the matter[1].

(ہمیں بتایا جاتا ہے کہ (بائبل کی) یہ کتابیں کلام الٰہی ہیں۔ ہمارے لیے یہ جاننا نہایت مناسب ہو گا کہ کس نے ہمیں یہ بات بتلائی۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہ بات ہمارے لیے کتنی قابل اعتبار ہے۔ اس سوال کا جواب فقط یہ ہے کہ کوئی نہیں بتا سکتا (کہ کس کے کہنے سے ہم انہیں کلام الٰہی مانتے ہیں) سوائے اس کے کہ ہم خود ہی ایک دوسرے کو یہ باور کروائیں (کہ یہ کلام الٰہی ہے)۔ تاہم تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے: جب کلیسیا کے ماہرین اساطیر نے ایک نظام قائم کر لیا تو انہوں نے وہ تمام تحریریں اکٹھی کر لیں جو انہیں دستیاب ہو سکیں۔ انہوں نے استصواب رائے سے فیصلہ کیا کہ اس مجموعہ میں شامل کون سی کتابیں کلام الٰہی ہونی چاہیے اور کون سی نہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابوں کو مسترد کر دیا، بعض کو مشکوک ٹھہرایا جو اسفار متروکہ کہلائیں۔ اور وہ کتابیں جنہیں کثرت سے ووٹ مل گئے، انہیں کلام الٰہی قرار دے دیا۔ وہ کوئی اور فیصلہ کرتے تو موجودہ وقت کے مسیحیوں کا ایمان کچھ اور ہوتا۔ کیوں کہ بعض (عوام) کا ایمان بعض (ارباب کلیسیا) کے ووٹ کے تابع ہے۔ جنہوں نے یہ سب کچھ کیا، کون تھے، ہمیں قطعاً معلوم نہیں۔ انہوں نے اپنے لیے کلیسیا کا عمومی نام اختیار کیا اور ہم بس اتنا ہی جانتے ہیں۔)

(۳) تیسرا امر یہ کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکمل و معتبر احوال صرف انہیں مروجہ اناجیل میں محصور ہیں کہ جن کے سوا تمام روایات کو رد کر دیا جائے گا۔ انجیل یوحنا اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ

"اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے۔ اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں گمان کرتا ہوں کہ کتابیں جو لکھی جاتیں دنیا میں سمانہ سکتیں"[2]

---

1 Pain , The age of reason , p10-11

2 یوحنا ۲۱: ۲۵

اردو کیتھولک بائبل میں عہد نامہ جدید کے تعارف میں مرقوم ہے؛

"انجیل نویسوں نے ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی کتاب تصنیف کی۔ اس لئے انہوں نے خداوند یسوعؑ کی زندگی کے صرف ان واقعات کو چن لیا جو اس مقصد کے لیے موزوں تھے یعنی ان کا ارادہ ہر گز یہ نہ تھا کہ وہ خداوند یسوع مسیح کی مکمل زندگی بیان کریں"[1]۔

جب کہ پروٹسنٹ قاموس الکتاب میں لکھا ہے۔

"اناجیل ایک نئی قسم کی قدر کا تعارف کراتی ہیں۔ گو اس کی ساخت تواریخی ہے لیکن خالص تاریخ نہیں ہے کیونکہ ہم عصر واقعات کا ذکر اتفاقی ہے اور اناجیل انہیں آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ان میں سوانح عمری کے متعلق مواد تو ملتا ہے لیکن انہیں اس لفظ کے معنوں میں سوانح حیات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ یسوع مسیح کی زندگی کا مکمل خلاصہ بیان نہیں کرتیں"[2]۔

یسوعؑ اور حضرت مریمؑ کا حقیقی شجرہ نسب، جو یہودی روایات کے مطابق لازم تھا، فراہم کرنے سے جو اناجیل قاصر ہوں، جو یہ تک نہ بتا سکیں کہ مسیحؑ کی صلیب کس نے اٹھائی تھی؟ جہاں سے یہ پتہ نہ چل سکے کہ صلیب پر ان کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟ جو اناجیل قاری پر یہ واضح کرنے سے قاصر رہیں کہ کون سا واقعہ یسوعؑ کی زندگی میں پیش آیا تھا اور کون سا ان کے جی اٹھنے کے بعد، جن میں یسوعؑ کے حقیقی شاگردوں کی صحیح فہرست تک موجود نہ ہو، جن میں نہ مریم کے خاندان کا اتا پتہ ملے نہ انجام کا، جن سے یہ بھی نہ واضح ہو سکے کہ صعود مسیحؑ کب ہوا تھا، ان کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ مسیحؑ کے مستند حالات صرف انہیں اناجیل سے معلوم ہو سکتے ہیں، حد درجہ مضحکہ خیز ہے اور ان اناجیل کی مخالفت کی بنا پر قرآن پر یہ الزام عائد کرنا کہ یہ الہامی کتاب نہیں محض بے جا عناد اور تعصب ہے۔ اس کے مقابل قرآن نہ تو کسی ملہم شخص کی تاریخی روئیداد ہے اور نہ ہی کوئی تاریخ کی کتاب، وہ تو محض حالات و واقعات سے اخذ شدہ غلط استدلالات کی بیخ کنی کرتا ہے۔ مثلاً مسیحؑ کے معجزوں کی بنا پر انہیں خدا کا اقنوم قرار دیا جاتا تھا مگر قرآن نے اور بھی معجزات کا تذکرہ کر کے اس ابہام کو دور کر دیا۔ واقعہ صلیب سے اخذ شدہ نتیجہ کو بنیاد بنا کر کفارہ کا عقیدہ تراش لیا گیا تھا، قرآن نے اس کی نفی کی۔ اب بجائے دونوں تعلیمات کا تقابل کرنے کے یا تاریخی لحاظ سے واقعات کی جانچ پڑتال کرنے کے محض مروجہ بائبل کی مخالفت کا الزام عائد کر کے قرآنی بیانات پر معترض ہونا نہ تو علمی طریق ہے اور نہ ہی ایمانیات کا تقاضا۔

قرآن نے اگر مسیحؑ کے کچھ دیگر معجزات کا تذکرہ کیا ہے تو وہ صرف اس بنا پر رد نہیں ہو سکتا کہ موجودہ اناجیل

---

1 کلام مقدس، (سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸ء)، عہد جدید کا تعارفی صفحہ (بدون نمبر شماری)

2 قاموس الکتاب، ص ۹۱

میں ان کا تذکرہ موجود نہیں۔ یہ تو خود ببانگ دہل اعلان کرتی ہیں کہ یسوعؑ کے سارے کام ان میں درج نہیں ہیں اور لوگوں سے دریافت شدہ ہیں۔

قرآنی قصص کو جعلی اناجیل اور بدعتی کتب سے ماخوذ بتلایا گیا ہے جسے آنحضرت ﷺ نے وحی کے طور پر پیش کیا۔ اس طرح مؤلف نے حتمی حکم لگا دیا ہے مگر اسفار متروکہ تک آپ ﷺ کی رسائی اور استفادے کی معتبر شہادت دینے سے دیگر مسیحی معترضین کی طرح ناکام رہا ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عرب و شام کے مسیحیوں میں رائج افسانوں اور داستانوں کو قرآن بنا کر پیش کرنے کا الزام بہت شد و مد سے لگایا جاتا ہے۔ لیکن معترض یہ بات بھول جاتے ہیں کہ عرب اور اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کے سفر شام سے قبل اور بعد بھی تجارتی قافلوں کے ساتھ اکثر و بیشتر شام جاتے رہتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی ذی شعور اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر آپ ﷺ کا ان مروجہ مسیحی داستانوں کا شام کے مسیحیوں سے اخذ کرنے کا کوئی احتمال ہے تو دیگر اہل عرب ان سے کس طرح ناواقف رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ﷺ نے ایک سفر میں یہ سب کچھ بدعتی مسیحیوں سے اخذ کر لیا تو وقتاً فوقتاً شام جانے والے دیگر لوگ کیوں کر اس سے بے خبر ہو سکتے۔ اور اس سے بڑھ کر کیا نادانی ہوگی کہ ان داستانوں سے واقف اپنے شدید مخالف معاشرہ کے سامنے انہیں باتوں کو خود پر نازل شدہ آسمانی وحی کے نام سے پیش کیا جائے۔ ایسی فاش غلطی کا ارتکاب تو کوئی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی نہیں کر سکتا کجا کہ ایک نبی۔ بلا دلیل قرآن پر الزامات و اعتراضات کے پس پردہ دیگر وجوہات پر غور کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مروجہ مسیحیت کے مخالف نقطہ نظر کی حامل اور عرصہ دراز تک متداول رہنے والی تحریروں کو جعلی قرار دینا مسیحی مصنفین کی مذہبی مجبوری ہے۔ کیونکہ تاریخ کلیسیا اس پر شاہد ہے کہ جعلی قرار دی جانے والی اناجیل کو تین چار صدیاں متداول رہنے کے بعد اگر کلیسیائی کونسلوں میں رد کرنے کی بجائے منتخب کر لیا جاتا تو، بجائے ان کے، موجودہ اناجیل جعلی کے درجہ میں ہوتیں۔

علامہ ساجد میر صاحب کا بائبل کے استناد و قبول کے حوالے سے یہ جامع تبصرہ قابل ملاحظہ ہے؛

"اندریں حالات ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کسی کتاب کا محض اتفاقات سے کسی علاقہ میں رواج پا جانا اور ہیکل یا کسی اہم کلیسیا کا اسے قبول کر لینا، یہ دو بڑی وجوہات تھیں جنہوں نے عہد نامہ قدیم و جدید میں شامل بائبل کی کتابوں کو درجہ استناد بخشا۔ ورنہ جس طرح ان کتابوں کی تالیف میں الہام کو دخل نہیں تھا (یا الہام میں انسانی کاوش کی آمیزش ہو چکی تھی) اسی طرح ان کی قبولیت و رواج بھی الہام نہیں بلکہ انسانی فیصلوں پر مبنی تھا۔ اور اگر ان فیصلوں کو خدائی رہنمائی نصیب ہوتی تو مختلف مقدس کتابوں کو درجہ قبول دینے یا نہ دینے کے مسئلہ پر مختلف کلیسیا و ارباب کلیسیا

اتنے زیادہ اختلافات کا شکار نہ ہوتے"[1]۔

خود حضرت مریم علیہا السلام کے بارے قرآنی اور اسفار متروکہ کے بیانات کے تقابلی جائزہ سے اس الزام کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں باہمی اتفاق کم اور اختلاف زیادہ ہے۔

قرآن	اسفار متروکہ
(۱) إِذْ قَالَتِ ٱمْرَأَتُ عِمْرَٰنَ رَبِّ إِنِّى نَذَرْتُ لَكَ مَا فِى بَطْنِى مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىٓ (آل عمران ۳:۳۵) " اور جب عمران کی بیوی (ام مریم) نے کہا اے میرے پروردگار میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے کہ اس (بچہ) کو جو میرے پیٹ میں ہے (صرف تیرے کاموں کے لیے) آزاد رکھا جائے گا۔ پس تو مجھ سے یہ قبول کر۔	(۱) مریم کے والدین نے نذر مانی کہ اگر خداوند انہیں اولاد سے نوازے گا تو وہ اسے خداوند کی خدمات کے لیے وقف کر دیں گے۔ (انجیل طفولیت مریم، باب ۱)
(۲) فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّى وَضَعْتُهَآ أُنثَىٰ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ ٱلذَّكَرُ كَٱلْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّى سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّىٓ أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ ٱلشَّيْطَٰنِ ٱلرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران ۳:۳۷) پس جب اس نے (مریم کو) جنا تو بولی اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی اور اللہ خوب جانتا جو اس نے جنا اور لڑکا نہیں لڑکی جیسا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اور پھر اس کے پروردگار نے اس (مریم) کو بوجہ احسن قبول کر لیا اور اس کو اچھا نشوونما دیا۔	(۲) [فرشتے نے یہویاقیم (مریم کے والد) سے کہا] پس تیری بیوی تیرے لیے ایک بیٹی جنے گی اور تو اس کا نام مریم رکھنا (انجیل طفولیت مریم، باب ۳) فرشتے نے حنہ سے کہا،۔۔۔ میں تیری طرف بھیجا گیا ہوں تا کہ تجھے مطلع کروں کہ تیرے ہاں بیٹی جنم لے گی جسے مریم نام سے پکارا جائے گا۔ (انجیل طفولیت مریم، باب ۶)
(۳) وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَٰمَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (آل عمران: ۴۴) آپ تو اس وقت ان لوگوں کے پاس نہیں تھے جب وہ (قرعہ اندازی کے لیے) اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ کون ان میں سے	(۳) سردار کاہن نے عام اعلان کر دیا کہ جو کنواریاں ہیکل میں (عام قوانین کے تحت) رہائش پذیر ہیں اور عمر کے (پختہ) حصے کو پہنچ چکی ہیں۔ انہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹنا ہو گا اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا ہو گا۔ قومی قوانین اور عمر کی پختگی کے پیش نظر دوسری لڑکیاں فوراً تعمیل حکم پر آمادہ ہو

1 ساجد میر، عیسائیت، تجزیہ و مطالعہ، ص ۲۷۶

مریم کی سرپرستی کرے گا۔ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (آل عمران ۳:۳۷) اور زکریا نے اس کی سرپرستی کی۔	گئیں۔ لیکن اکیلی مریم نے جواب دیا کہ وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے۔۔۔ اور جب یہ معاملہ درپیش ہوا تو انہوں (کاہنوں) نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں خدائی مرضی معلوم کرلی جائے۔ داؤد کے گھرانے سے تعلق رکھنے والے وہ تمام غیر شادی شدہ لوگوں کو، جو شادی کی عمر کو پہنچ چکے ہیں، اپنے اپنے عصا قربان گاہ میں لانے چاہیے اور یہاں لائے جانے کے بعد جس کے عصا پر پھول آ جائیں اور خداوند کی روح کبوتر کی صورت عصا پر آ بیٹھے تو وہی شخص ہو گا جس پر مریم کو بھروسہ کرنا ہو گا اور اس سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا پڑے گا۔
(۴) وَٱذۡكُرۡ فِى ٱلۡكِتَـٰبِ مَرۡيَمَ إِذِ ٱنتَبَذَتۡ مِنۡ أَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ﴿١٦﴾ فَٱتَّخَذَتۡ مِن دُونِهِمۡ حِجَابًا فَأَرۡسَلۡنَآ إِلَيۡهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتۡ إِنِّىٓ أَعُوذُ بِٱلرَّحۡمَـٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَـٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتۡ أَنَّىٰ يَكُونُ لِى غُلَـٰمٌ وَلَمۡ يَمۡسَسۡنِى بَشَرٌ وَلَمۡ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذَٲلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَلِنَجۡعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمۡرًا مَّقۡضِيًّا (مریم:۱۶-۲۱) اور اس کتاب میں مریم کا ذکر کیجئے جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر ایک شرقی مکان میں گئی۔ پھر ان لوگوں کے سامنے سے اس نے پردہ کر لیا پھر ہم نے اس کے پاس اپنے فرشتہ خاص کو بھیجا وہ اس کے سامنے بھلا چنگا انسان بن کر ظاہر ہوا۔ وہ بولی میں تجھ سے (خدائے) رحمن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خداترس ہے۔ (فرشتہ نے) کہا میں تو بس تمہارے پروردگار کا ایک ایلچی ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ وہ بولی میرے لڑکا کیسے ہو گا درآنحالیکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا ہے اور نہ ہی میں بدچلن ہوں۔ (فرشتہ نے) کہا یہ یوں ہی ہو گا تمہارے رب نے کہا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے اور یہ اس لئے بھی تاکہ ہم اسے	(۴) اور دوسرے دن جب چشمے پر مریم اپنا گھڑا پانی سے بھر رہی تھی خداوند کا فرشتہ اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا؛ "مریم تم پر خدا کی برکت ہو۔ کیونکہ تجھے ماں کے رحم سے خداوند کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ کیونکہ آسمان سے نور چمکے گا اور تجھ میں بھر جائے گا اور تیرے وسیلے سے پوری دنیا کو منور کرے گا"۔ تیسرے دن جب وہ ارغوانی رنگ کی ایک پوشاک اپنے ہاتھ سے کاڑھ رہی تھی ایک غیر معمولی حسن کا حامل جوان وہاں داخل ہوا جب مریم نے اسے دیکھا تو وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی اور اس پر کپکپی طاری ہو گئی اور وہ اس سے کہنے لگا؛ "پُر فضل مریم تم پر سلامتی ہو خداوند تمہارے ساتھ ہے تو تمام عورتوں میں سے مبارک کی گئی ہے اور تیرے رحم کا پھل بھی مبارک ہے۔ جب اس نے یہ الفاظ سنے تو کانپنے لگی اور بے حد خوفزدہ ہو گئی۔ تب خداوند کے فرشتے نے مزید کہا؛ "مریم ڈرو مت! کیونکہ تجھے خدا کی قربت نصیب ہوئی ہے۔ دیکھ تو حاملہ ہو گی اور ایک بادشاہ جنے گی جس کی بادشاہت نہ صرف دنیا کے کناروں تک ہو گی بلکہ آسمان تک بھی اور جس کے تخت کا سرانہ ہو گا (انجیل طفولیت مریم، باب ۹)

لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دیں اور اپنی طرف سے سبب رحمت اور یہ ایک بات طے شدہ ہے۔

(ب) إِذْ قَالَتِ ٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ يَـٰمَرْيَمُ إِنَّ ٱللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ٱسْمُهُ ٱلْمَسِيحُ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ وَمِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ ٱلنَّاسَ فِى ٱلْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ ٱلصَّـٰلِحِينَ (آل عمران ۳ : ۴۵۔۴۶)

(وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! اللہ آپ کو خوش خبری دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمۃ کی، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ دنیا و آخرت دونوں میں معزز اور مقربوں میں سے اور وہ لوگوں سے گفتگو کریں گے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے۔

(ب) خداوند کا فرشتہ جبرئیل اس کی طرف بھیجا گیا۔۔۔ اس کے آتے ہی وہ جگہ نور سے بھر گئی۔۔۔ وہ کہنے لگا؛ "خدا کی قربت پانے والی مریم! تجھے مبارک ہو۔ اے پُر فضل کنواری خداوند تمہارے ساتھ ہے تو اب تک پیدا ہونے والے تمام مردوں اور عورتوں میں برگزیدہ کی گئی ہے۔ اور کنواری جو پہلے ہی فرشتگان سے خوب واقف تھی اور جس کی نگاہوں سے آسمانی نور پوشیدہ نہ تھا نہ ہی فرشتے کو دیکھ کر خوف زدہ ہوئی۔ اور نہ ہی نور کی کثرت سے حیران ہوئی لیکن اس کے الفاظ سے متوحش ضرور ہوئی۔

(۵) فَحَمَلَتْهُ فَٱنتَبَذَتْ بِهِۦ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَأَجَآءَهَا ٱلْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ ٱلنَّخْلَةِ قَالَتْ يَـٰلَيْتَنِى مِتُّ قَبْلَ هَـٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا ۝ (مریم: ۲۲۔۲۳)

پھر اس کے حمل قرار پا گیا پھر وہ اسے لئے ہوئے کہیں ایک دور جگہ چلی گئی۔ سواے دردزہ ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا (اور) وہ بولی کاش میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی اور بھولی بسری ہو گئی ہوتی۔

(۵) جب پیدائش کا وقت نزدیک آن پہنچا تو اس (یوسف نجار) نے مبارک مریم کو سواری کے جانور سے نیچے اترنے کا کہا۔ اور ہدایت کی کہ وہ اس غار میں چلی جائے جہاں کبھی بھی روشنی کا گذر نہیں تھا۔ بلکہ ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا تھا کیونکہ وہاں دن کی روشنی پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اور جب مریم اس میں داخل ہوئی تو اس قدر روشنی ہو گئی کہ اس پر دن کے (دوپہر کے) چھٹے گھنٹے کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ اس نے وہاں ایک بیٹے کو جنم دیا اور دوران پیدائش فرشتے اس کو گھیرے رہے۔ جونہی وہ پیدا ہوا وہ اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور فرشتے نے اس کی بڑائی یہ کہتے ہوئے کی کہ عالم بالا پر خدا کا جلال ہو اور زمین پر راست بازوں کے لیے راحت و چین آئے۔

جب آقا کی پیدائش قریب تھی تو یوسف کہیں سے دایہ کو بلانے کے لئے گیا۔ جب اس نے دایہ کو ڈھونڈ لیا تو واپس غار کی طرف لوٹا۔ اس نے مریم کے پاس ایک بچے کو پایا۔ یوسف نے مبارک مریم سے کہا: "میں تیرے لیے دو دایہ کا بندوبست کر کے لایا ہوں جن کے نام زلومی اور سلومی ہیں اور وہ غار کے دروازے پر اندر داخل ہونے کے لیے تیار کھڑی ہیں مگر نور کی

بہتات کی بنا پر اندر آنے کی ہمت نہیں پا رہیں۔ اور جب مقدسہ مریم نے یہ سنا تو وہ مسکرائی اور یوسف اس سے مخاطب ہوا؛ " مسکراؤ مت اور انہیں اجازت دو کہ وہ تمہیں دیکھیں کیونکہ اس معاملے میں تمہیں رو بصحت ہونے کے لیے ان کی ضرورت ہے"۔ تب اس نے دونوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ اور زلومی اندر پہنچی جب کہ سلومی باہر دروازے پر کھڑی رہی۔ زلومی نے مریم سے کہا مجھے اجازت بخشو کہ میں تمہیں چھولوں۔ اور جب اس نے اسے معائنے کی اجازت دے دی تو دایہ بڑی اونچی آواز سے چلائی اور بولی؛" خداوند! خداوند، اے قادر مطلق خداوند! ہم پر رحم کر۔ ایسا کبھی دیکھا نہ سنا گیا کہ بچے کی ماں کی چھاتیاں دودھ سے بھری ہوئی ہیں اور بچے کی پیدائش اس کی ماں کو ابھی کنواری ثابت کرتی ہے۔ اس کی پیدائش میں خون نہیں بہا اور نہ ہی دردزہ ہوا۔ یہ الفاظ سن کر سلومی مریم سے بولی؛" مجھے اجازت دو کہ میں تمہیں سنبھالوں اور دیکھوں کہ کیا زلومی سچ کہتی ہے؟" مقدسہ مریم نے اسے اجازت دے دی اور جب اس نے اسے چھونے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ سوکھ گیا اور درد سے بری طرح چلائی۔ وہ بہت دکھ میں تھی اور چلا کر کہنے لگی؛" اے خداوند! تو جانتا ہے کہ میں نے ہمیشہ تیرا خوف اپنے دل میں رکھا ہے۔ اور بغیر کسی تفریق کے غربا کا بھی علاج کیا ہے۔ میں نے کبھی بیوہ اور یتیم سے کچھ وصول نہیں کیا۔ اور ضرورت مندوں کو کبھی اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔

(٦) فَنَادَىٰهَا مِن تَحْتِهَآ أَلَّا تَحْزَنِى قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّىٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ ٱلنَّخْلَةِ تُسَٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِى وَٱشْرَبِى وَقَرِّى عَيْنًا ۖ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ ٱلْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِىٓ إِنِّى نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ ٱلْيَوْمَ إِنسِيًّا ﴿٢٦﴾ (مریم:۲۴۔۲۶)

پھر (فرشتہ نے) اسے پائیں سے پکارا کہ رنج مت کرو تمہارے

(٦) اور جب ان کے سفر کے تیسرے دن کا اختتام قریب تھا تو مقدسہ مریم صحرا میں سورج کی تمازت سے تھک گئی۔ اور ایک کھجور کا درخت دیکھنے لگی۔ اس نے یوسف سے کہا کہ مجھے اس درخت کے نیچے تھوڑی دیر آرام کرنے دو۔ یوسف جلدی سے اسے درخت کے سائے میں لے آیا اور وہاں لٹا دیا۔ وہ کھجور کی ڈالی کو دیکھنے لگی۔ اور اس نے اسے پھل سے بھرا پایا۔ وہ یوسف سے بولی میں چاہتی ہوں کہ کیا ہی اچھا ہو تا کہ میں اس ڈالی سے

پروردگار نے تو تمہارے پائیں ہی میں ایک نہر بنادی ہے۔ اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ اس سے تم پر تروتازہ خرمے گریں گے۔ اور کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اگر کسی بشر کو دیکھنا تو کہہ دینا کہ میں نے تو خدائے رحمٰن کے لیے روزہ کی نذر مان رکھی ہے سو میں تو آج کسی انسان سے بولوں گی نہیں۔

کچھ کھا سکتی۔ یوسف نے اس سے کہا کہ مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ یہ بات تم نے کہی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ کھجور کا درخت کس قدر اونچا ہے پھر بھی کھجور کھانے کی بات کر رہی ہو۔ مجھے ان کی نسبت پانی کی ضرورت زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ کیونکہ مشکیں خالی ہو چکی ہیں اور ہمارے پاس خود کو اور چارپایوں کو تروتازہ کرنے کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ننھے یسوع نے ماں کی گود میں مسرت سے کلکاری بھری۔ اور کھجور کے درخت سے مخاطب ہوا؛ "اے درخت تو اپنی شاخیں جھکا دے اور میری ماں کو اپنے پھل سے شاد کام کر۔ اور فوراً ہی ان کے الفاظ کے ساتھ ہی درخت نے اپنی شاخیں مقدسہ مریم کے پاؤں میں جھکا دیں۔ پس انہوں نے ان شاخوں سے پھل توڑ لیا جس سے وہ تمام لوگ تازہ دم ہو گئے۔ یہ شاخیں ننھے یسوع کے حکم میں جھکی رہیں جس نے انہیں جھکا رہنے کا حکم دیا تھا۔ تب یسوع نے اس درخت سے کہا؛" اب اوپر اٹھ جاؤ اور پہلے کی طرح مضبوط ہو جاؤ اور میرے ان درختوں کے ساتھی بن جاؤ جو میرے باپ کے پاس جنت میں ہیں۔ اور اپنی جڑوں سے زمین میں چھپے پانی کو بہنے دو تاکہ ہم تجھ سے سکھ پائیں اور یہ درخت فوراً اوپر کھڑا ہو گیا اور اس کی جڑوں سے تازہ اور شیریں پانی اچھل کر باہر بہنے لگا۔ تب انہوں نے نہایت مسرت سے اس سے لطف اٹھایا اور اس سے تسکین۔ انہوں نے ان کے مویشیوں اور ان کے سواری کے جانوروں نے۔ تب انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

(۷) (الف) وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴿١٥٦﴾ (النساء ۴:۱۵۶)

(اللہ نے ان یہودیوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے)۔۔۔ اور (بہ سبب) ان کے کفر اور مریم پر بہتان عظیم رکھنے کے۔

(ب) فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ

(۷) اور انہوں نے مریم کو طلب کیا اور اس سے کہا: " تمہارے پاس اس (بدکاری) کا کیا عذر ہے؟ یا تیرے رحم میں اس (بدکاری کا) اس سے بڑا اور کیا نشان ظاہر ہو گا کہ جس نے تجھے گھیر لیا؟ یہی وجہ ہے کہ ہم تجھ سے چاہتے ہیں کہ چونکہ یوسف تمہاری نسبت سے پاک دامنی ثابت کر چکا ہے اس لیے تمہیں اپنے گناہ کا اقرار کر کے بتا دینا چاہیے کہ تو کس سے گناہ آلودہ ہوئی؟ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ جس گناہ نے تجھے گھیر

اَمْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ (مریم:۲۷۔۲۸)

پھر وہ (مریمؑ) اس (عیسیٰؑ) کو (گود میں) اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی۔ وہ لوگ بولے اے مریم! تو نے بڑے غضب کی حرکت کی ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تمہارے والد بُرے آدمی تھے اور نہ تمہاری ماں ہی بد چلن تھی۔

رکھا ہے، کا اقرار کرلے بہ نسبت اس کے کہ خداوند کے غضب کا نشان تیرے چہرے سے ظاہر ہو جائے۔ اور تو لوگوں کے درمیان اپنا راز گناہ کھلنے کے سبب رسوا ہو جائے۔ تب مریم بغیر کسی خوف سے عزیمت سے بولی؛" اے خدا جو تمام دنیا پر بادشاہت کرتا ہے اور جو تمام پوشیدہ رازوں سے آگاہ ہے۔ اگر مجھ میں گناہ کا شمہ بھی ہے یا میں نے کوئی برائی کی ہے یا عصمت کو دھبہ لگایا ہے تو مجھے تمام لوگوں میں راز آشکار کرکے رسوا کر دے اور سزا دے کر دیگر تمام لوگوں کے لیے نمونہ عبرت بنا دے۔ یہ الفاظ کہتے کہتے وہ بہادری کے ساتھ قربان گاہ کی طرف چل پڑی۔ اور غیرت کا نشان والا پانی پی لیا اور قربان گاہ کے گرد پھیرے لگائے۔ اور اس میں گناہ کا کوئی بھی نشان ظاہر نہ ہوا۔ اور اس سے تمام لوگ حیران و پریشان رہ گئے کہ بچہ اس کے پیٹ میں ہے اور لعنت کا کوئی نشان اس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا۔ تب ان میں متضاد بیانات سے ایک جھگڑا برپا ہو گیا۔ کچھ کہتے تھے کہ یہ لڑکی مقدس اور پاک و مطہر ہے جب کہ دوسروں کا خیال تھا کہ یہ لڑکی گناہ گار اور شریر ہے۔ تب مریم یہ دیکھ کر کہ وہ ابھی تک لوگوں کی نگاہوں میں مجرم ہے اور ان کے بیانات سے لگ رہا ہے کہ وہ ابھی تک خود کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکی تو اس نے سب کو سنا کر اونچی آواز میں کہا؛" اودنائی زندہ لوگوں کے خداوند، رب الافواج! جس کے سامنے میں اس وقت کھڑی ہوں۔ میں مرد سے ناواقف ہوں لیکن مجھ میں خداوند کی روح ہے جس کے لئے میں روز اول سے وقف ہوں اور یہ قسم میں نے اپنے بچپن سے کھا رکھی تھی کہ میں اس کے سامنے ہمیشہ کنواری رہوں گی جس نے مجھے پیدا کیا اور مجھے بھروسہ ہے کہ میں اکیلی اس کے سامنے ایسے ہی رہوں گی اور اکیلی جان ہی اس کی خدمت بجا لاؤں گی جب تک میں زندہ ہوں میں مرد سے ناواقف ہی رہوں گی۔ تب وہ تمام لوگ اس کے پاؤں کو بوسہ دینے لگے اور اس کے آگے یہ کہہ کر گھٹنوں کے بل جھکنے لگے کہ ہمیں معاف کر دے اس گناہ کے عوض جو

ہم نے شک کر کے شرارت سے کیا۔

(۸) فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾

(مریم:۲۹۔۳۳)

اس پر مریم نے اس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا وہ بولے ہم اس سے کیسے بات چیت کریں جو ابھی گہوارہ میں پڑا بچہ ہی ہے۔ وہ (بچہ) بول اٹھا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ اور مجھے (اسی نے) بابرکت بنایا میں جہاں کہیں بھی ہوں اور مجھے نماز اور زکوۃ کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور مجھے میری والدہ سے نیکی کرنے والا بنایا اور مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا اور میرے اوپر سلام جس دن میں پیدا ہوا اور جس روز میں مروں گا اور جس روز میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

(۸) یسوع کے ایام میں کاہن یوسف نے اپنی کتاب میں جو لکھا ہمیں ملتا ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ کاٗفا تھا، اس نے لکھا ہے کہ یسوع نے واقعتاً جب گہوارے میں تھا تو کلام کیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا، "میں خدا کا بیٹا یسوع ہوں اس کا کلمہ جو تمہارے ذریعے دنیا میں آیا جیسا کہ جبرئیل نے تم پر ظاہر کیا تھا اور مجھے میرے باپ نے دنیا کو نجات بخشنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔

(۹) إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١١٠﴾

(المائدۃ ۵ : ۱۱۰)

(۹) جب آقا مسیح سات برس کے ہوئے تو ایک دن وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ چکنی مٹی سے کھیل رہے تھے جس سے وہ گدھوں، بیلوں، پرندوں اور دوسرے جانوروں کی مورتیاں بنا رہے تھے۔ ہر ایک اپنی مہارت بڑھا کر دکھلا رہا تھا اور اپنے کام کی تعریف کرتا۔ پھر آقا یسوع نے لڑکوں سے کہا: "جو مورتیاں میں نے بنائی ہیں میں انہیں چلنے کے لیے کہوں گا"۔ تب لڑکوں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ خدا جس نے ہر چیز کو خلق کیا اس کا بیٹا ہے؟ اور آقا یسوع نے ان مورتیوں کو چلنے کا حکم دیا۔ وہ فوراً چلنے لگیں اور جب اس نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ ساکت رہ گئیں۔ اور اس نے پرندوں اور چڑیوں کی شبیہیں بنائیں اور جب اس نے انہیں اڑنے کے

(وہ وقت یاد رکھو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ میرا انعام یاد کرو اپنے اوپر اور اپنی ماں کے اوپر جب میں نے تمہاری تائید روح القدس سے کی تھی۔ تم لوگوں سے کلام گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب کہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دی اور جب تم مٹی سے پرندہ جیسی ایک شکل میرے حکم سے بناتے تھے پھر تم اس کے اندر پھونک مارتے تھے تو میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور جب تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روک رکھا جب تم ان کے پاس روشن (نشانیاں) لے کر آئے تھے پھر ان میں سے جو کفر اختیار کیے رہے وہ بولے یہ تو اور کچھ نہیں سوائے ایک کھلا ہوا جادو ہے۔	لیے کہا تو وہ اڑنے لگیں۔ اور جب اس نے انہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا تو وہ کھڑی رہ گئیں۔ اور جب اس نے کھلایا تو کھانے لگیں اور جب اس نے انہیں پلایا تو پینے لگیں۔

یہ تقابل قرآن اور اسفار متروکہ کے بیانات میں فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر قرآن ان سے ماخوذ ہوتا تو اتنا اختلاف نہ ہوتا۔

اگر قرآن چربہ ہے تو پھر اس میں بائبل کی خاص اصطلاحات مفقود کیوں ہیں۔ عقائد کی تشریح و توضیح میں انہیں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی۔ مثلاً غلو پر مبنی "بیٹے" کی اصطلاح قرآنی توحید سے متصادم تھی، ترک کے پیش نظر اسے استعمال نہ کرنا تو قرین قیاس ہے لیکن اس کے مقابل انجیل میں بارہا مستعمل "خدا کی بادشاہت" جیسی اصطلاح قرآن نے کیوں استعمال نہیں کی۔ جب کہ اس میں کوئی غلو یا تعلی بھی نہ تھی۔ اسی طرح بائبل کی "رب الافواج" کی اصطلاح بھی اخذ نہ کی گئی جو کہ اللہ تعالیٰ کے اظہار قدرت کے لیے عہد نامہ قدیم میں عام استعمال ہوئی ہے۔

اس سے عیاں ہوتا ہے کہ قرآن کو بائبل کا چربہ قرار دینا خلاف حقیقت ہے اور اس پر زور دینا حقائق سے نظریں چرانے کے مترادف ہے۔

اصلیت قرآن کے بارے مسیحی آراء کے منہجی تجزیہ سے عیاں ہوتا ہے کہ

- وحی والہام کے مسیحی اور مسلم نظریہ میں بہت تفاوت ہے[1]
- نقد قرآن میں اپنی مذہبی کتب کے دفاع کی خاطر مسلم دعاوی کا حقیقت پسندی سے جائزہ نہیں لیا گیا۔
- تحقیق کے نام پر غیر تحقیقی معیارات پر الزامات و اتہامات کو پیش کیا گیا ہے۔

---

1 مسیحی نظریہ میں خدا کے فرستادہ کے ساتھ ساتھ دیگر لوگ بھی ملہم قرار دیئے جاسکتے ہیں اور خدا کا نبی اپنے رسول مقرر کر سکتا ہے جب کہ مسلم نظریہ میں صرف نبی پر ہی وحی کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی رسول مقرر کرتا ہے

جمع وتدوین قرآن

برصغیر کے مسلم مسیحی کلامی مباحث میں سب سے زیادہ قابل بحث موضوع "تحریف بائبل" رہا۔ مسلم نقطہ نظر کے مطابق غیر مستند و غیر معتبر روایات اور غیر تسلی بخش طریق کار کی موجودگی میں جمع و تدوین میں روا رکھی جانے والی کوتاہیوں کی بنا پر بائبل ناقابل اعتماد ہے۔ یہ دراصل مسیحی احباب کی طرف سے قرآن پر خارجی نقد کا رد عمل تھا۔ جس میں قرآن کے جمع و تدوین کے بارے مختلف اعتراضات سامنے لائے جاتے۔ عہد نامہ جدید کو ارباب کلیسیا کی طرف سے شرعی سند جواز عطا کرنے کے طریق اور جمع و تدوین قرآن کو ایک سطح پر رکھ کر مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی۔ عہد رسالت کے فوراً بعد تدوین قرآن کے مختصر زمانی تاخر سے استشہاد کرتے ہوئے اناجیل کے بارے تاثر دیا جاتا کہ یہ بھی بعینہ اسی طرح لکھی گئیں۔ پادری فانڈر صاحب جمع قرآن کے بارے لکھتے ہیں:

" اگر مسیح کے صعود کے بعد اناجیل کا لکھا جانا قابل اعتراض ہے تو یہی اعتراض قرآن شریف کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن بھی تو جیسا مشکوۃ المصابیح اور دیگر مستند کتب اسلامیہ میں مرقوم ہے، حضرت محمد کی وفات کے بعد جمع کیا گیا تھا[1]"۔ پادری صاحب اس کے ساتھ ساتھ چاروں اناجیل کا روح القدس کی ہدایت کے مطابق قلم بند کیے جانے کے مدعی ہیں اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ چاروں کا پیغام بالکل ایک ہی تھا"[2]۔

اس دعوی میں جمع قرآن و اناجیل بارے بعد از رحلت انبیاء کی جزوی مشابہت کو بنیاد بنا کر مسیحی کتب مقدسہ کا دفاع کیا گیا ہے۔ محض اس ایک امر کے سوا دونوں میں کچھ بھی مشترک نہیں پایا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے الفاظ وحی کو اپنی زیر نگرانی قلم بند کروایا جو کہ منتشر اجزاء پر محفوظ تھا۔ اس قلم بند وحی کو رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد ایک مصحف کی شکل میں جمع کیا گیا۔ جب کہ اناجیل کو حضرت عیسی علیہ السلام کی بجائے آپ کے کئی دہائیوں بعد ان افراد نے لکھا جن کا شاگرد مسیح ہونا بھی محل نظر ہے۔ یہ انجیل نویس روح القدس کی ہدایت سے انہیں قلم بند کرنے کے بھی مدعی نہیں ہیں۔ بلکہ "لوگوں سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے[3] " لکھنے کے مدعی ہیں۔ مسیحی لٹریچر میں جمع قرآن اور اناجیل کے ضبط تحریر کے اس فرق کو ملحوظ خاطر نہ رکھتے ہوئے انہیں ایک ہی سطح پر پرکھنا استدلال کی بنیادی غلطی ہے، جس کی وجہ سے اخذ کردہ نتیجہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۱۰۴

2 ایضاً، ص ۱۰۵

3 لوقا ۱: ۳

جمع و تدوین کے لحاظ سے قرآن اور اناجیل کا باہمی موازنہ درج ذیل حقائق سامنے لاتا ہے۔

انجیل	قرآن
(الف) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل کے لکھوانے کا کوئی اہتمام نہیں کروایا اور نہ ہی کسی کو لکھنے پر متعین کیا اور نہ ہی کسی نے ان کے حین حیات کچھ لکھا۔	(الف) رسول اللہ ﷺ نے وحی کی کتابت کا اہتمام کروایا اور اس کے لیے بعض صحابہ کرام کو ذمہ داری تفویض کی[1]۔
(ب) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ایسے کسی عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔	(ب) آپ ﷺ نے وحی کے ضبط تحریر میں لانے کی خود نگرانی کی اور محررہ وحی کا سماع کر کے کتابت میں اگر کوئی فروگذاشت ہو گئی تو اس کی اصلاح کی[2]۔
(ج) یہاں یہ صورت مفقود ہے۔	(ج) کلام الٰہی کو ضبط تحریر میں لانے والے کاتبین وحی حافظ قرآن تھے۔
(د) کتب مقدسہ میں انسانی خیالات کی آمیزش ہے۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے" کتب مقدسہ میں انسانی و الٰہی دونوں اجزاء پائے جاتے ہیں"[4]۔	(د) قرآن میں الفاظ تو کجا انسانی خیالات کی بھی آمیزش نہیں ہو سکتی۔
(ر) انجیل نویس خیالات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کے لیے انتخاب الفاظ اور ان میں حک و حذف کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب میں بھی آزاد نظر آتے ہیں۔	(ر) کاتبین وحی کو متن قرآن میں حک و حذف کا ادنیٰ اختیار بھی نہیں تھا۔ نہ ہی کتابت انتخاب و ترتیب الفاظ میں ان کی مرضی دخیل تھی۔
(س) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۳۰۔۷۰ سال بعد آپ کے احوال و آثار و اقوال کو انجیل نویس اپنے اپنے الفاظ، جن میں ان کی توضیحات و تفسیر بھی شامل تھی، میں ضبط تحریر میں لائے، جنہیں اناجیل سے موسوم کیا گیا۔ نیز یسوع مسیح کے فرمودات بھی بعینہ ان کے الفاظ میں نقل نہیں کیے گئے بلکہ روایت بالمعنی اور اخبار کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس	(س) وحی قرآنی کے الفاظ کو بعینہ نقل کرنے کا خصوصی اہتمام تھا۔ بالمعنی کلام الٰہی کو روایت و نقل کرنا روا نہیں رکھا گیا۔ نیز جب رسول اکرم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو پورے کا پورا قرآن مختلف اجزاء کی صورت میں تحریری شکل میں موجود تھا[3]۔

---

1 ابن حجر، فتح الباری شرح البخاری، ج۹، ص ۲۲

2 حضرت زید فرماتے ہیں:" فاذا فرغت قال اقرء فاقرء ہ فان کان فیہ سقط اقامہ"(میں جب وحی لکھ چکتا تو آپ فرماتے اسے سناؤ میں پڑھتا، اگر اس میں غلطی ہوتی تو آپ اس کی اصلاح فرما دیتے")(ھیثمی، مجمع الزوائد، ج۱، ص ۱۵۷)

3 "قال ابن عباس و محمد بن الحنفیۃ ما ترک النبی ﷺ الا ما بین الدفتین" (آنحضرت نے اپنی رحلت کے وقت پورا قرآن دو چوبی دفتین کے درمیان (یعنی مجلد) چھوڑا۔ (بخاری، الجامع الصحیح، ج۲، ص ۷۵۱)

4 فانڈر، میزان الحق، ص ۶۳: بلکہ یہ انسانی عنصر لوگوں کے خیال سے کہیں زیادہ ہے۔:" ہمیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ

انجیل	قرآن
کام کو مسلمانوں نے جمع حدیث میں روایت بالمعنی کے نام سے الگ سے کیا ہے۔ چنانچہ اناجیل کو زیادہ سے زیادہ وہ مقام دیا جاسکتا ہے جو مسلمانوں کے ہاں روایت بالمعنی احادیث کا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات مد نظر رہنی چاہیے کہ احادیث کو باقاعدہ اصول وضوابط کے تحت کسوٹی پر پرکھ کر قبول کیا جاتا ہے۔ غیر ثقہ، غیر معتبر اور غیر مستند روایات کو رد کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اناجیل کے لیے ایسا کوئی معیار نہیں اپنایا گیا اگر مسلم روایات کے مطابق اناجیل کو پرکھا جائے تو شاید موضوع یا ضعیف روایات کے ہم پلہ ٹھہریں[2]۔	
(ص) کتب مقدسہ کے استناد کا مسئلہ مختلف مذہبی کونسلوں میں زیر بحث رہا۔ ۳۹۷ء میں قرطاجنہ کی تیسری کلیسائی کونسل میں موجودہ اناجیل اربعہ پر مشتمل نئے عہد نامہ کی تشکیل کا مسئلہ حتمی طور پر طے پایا[3]۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر موجودہ اناجیل کی بجائے کوئی دوسری رائج اناجیل کا انتخاب عمل میں آجاتا تو انہیں کلام الٰہی کے نام سے پیش کر دیا جاتا۔ یوں موجودہ کتب میں مذکور کلام الٰہی رد ہو جاتا اور اس کی جگہ موجودہ مردود کلام کو کلام الٰہی کی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ اپنے انتخاب کے بعد بھی یہ کتب کمی بیشی اور تصرف سے محفوظ رہیں یا نہیں۔	(ص) صحابہ کرام نبی علیہ السلام سے براہ راست قرآن کا شرف سماع رکھتے تھے اور اسے آپ پر پیش بھی کرتے تھے۔[1] اور اس اولین امت مسلمہ یعنی صحابہ نے مصحف عثمانی (موجودہ قرآن مجید) کو بحیثیت غیر محرف کلام الٰہی اجماع کے ساتھ قبول کر لیا۔ اس اجماع کے بعد اس میں کسی کمی بیشی کے تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
(ط) اناجیل کے قدیم ترین نسخے بھی تراجم ہیں نہ کہ اصل زبان میں تحریر کردہ نسخے۔	(ط) مصحف عثمانی کی شکل میں اصل زبان میں نازل شدہ قرآن کا قدیم ترین نسخہ موجود ہے۔

بائبل میں انسانی عنصر کی موجودگی پر خاص طور پر زور دیا جائے۔ یہ پہلو اس وقت تک اکثر مذہبی لوگ فراموش کر دیتے ہیں۔۔۔ گذشتہ صدی کے مطالعہ بائبل سے یہ امر بھی زیادہ واضح ہوتا رہا ہے کہ یہ انسانی عنصر بائبل میں لوگوں کے خیال کی نسبت کہیں زیادہ پایا جاتا ہے"۔ (ڈاکٹر پیٹرسن سمائتھ، بائبل کا الہام، ص ۱۲۹)

1 قسطلانی، شرح الجامع للبخاری، ج ۷، ص ۴۴۹

2 " اسلام کی اگر کسی چیز کا مقابلہ اناجیل سے کیا جاسکتا ہے تو وہ کچھ حدیثیں ہیں۔ وہ حضرت محمد ﷺ کے جمع شدہ اقوال اور آپ کے افعال کے تذکرے ہیں" بائبل، قرآن اور سائنس، از موریس بوکائیے ص ۱۲

3 خواجہ، موازنہ بائبل و قرآن، ص ۹۴

مسیحی اہل قلم جس عمیق نظری سے قرآن کریم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی بائبل کے لیے صرف نہیں کرتے۔ جمع قرآن و اناجیل میں مغالطہ آفرینی کرتے وقت ان لازمی عناصر کو یک سر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

- عہد نامہ جدید نے مسیح اور ان کے شاگردوں کے بعد موجودہ شکل میں لکھے جانے اور پھر قبولیت پانے میں کتنا وقت لیا اور بعد از وفات النبی ﷺ تدوین قرآن میں کتنا عرصہ صرف ہوا؟
- عہد نامہ جدید اور قرآن کے معیار قبولیت میں کیا فرق ہے؟ سند قبولیت بخشنے والے افراد کون ہیں اور ان کی اس بارے ترجیحات کیا ہیں۔
- مقبول شدہ مقدس متن وحی کے مصدق اس کو پرکھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ یعنی اصحاب رسولؐ اور نیقیہ کونسل کے شرکاء پادریوں کا کیا مقام ہے؟

مسیحی لٹریچر میں " تحریف قرآن" ثابت کرنے کے لیے ایک اور اہم دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جمع قرآن کے دوران مصلحت کے تحت کچھ سورتیں قرآن سے خارج کر دیں۔ یوں یہ مصحف عثمانی ناقص ہے۔ پادری فانڈر لکھتے ہیں؛"

" یہ ایک مشہور حقیقت ہے کہ ابی (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) نے اپنے قرآن میں چھوٹی دو اور سورتیں تھیں جو سورۃ الخلد اور سورۃ الحفد کہلاتی تھیں کیونکہ وہ کہتا تھا کہ یہ سورتیں اصلی قرآن میں تھیں لیکن حضرت عثمان نے انہیں خارج کروادیا۔" علاوہ بریں بعض کہتے ہیں کہ ایک پوری سورت یعنی سورت نورین دیدہ دانستہ قرآن سے خارج کر دی گئیں"[1]۔

قرآن کی وضعی سورتوں کے مصحف عثمانی میں درج نہ کرنے کے بارے میں پادری صاحب اکیلے ہی نہیں بلکہ پادری عمادالدین نے بھی اپنی کتاب تحقیق الایمان میں وضعی سورت نورین اس الزام کے ساتھ نقل کی ہے کہ حضرت عثمان نے قرآن میں درج نہیں کی[2]۔

دفاع بائبل کے لیے واردہ اس اعتراض میں " تحریف قرآن" کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ موجودہ مصحف عثمانی میں تین سورتین درج نہیں ہیں یوں یہ قرآن ناقص ہے۔

(۱) سورۃ الخلد (۲) سورۃ الحفد (۳) سورۃ نورین

اس مسیحی دعویٰ میں مذکور سورۃ الخلد اور سورۃ الحفد کا تعین ایک مسیحی مستشرق کی تحریر سے ہوتا ہے۔

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۳۲۶

2 عمادالدین، تحقیق الایمان، ص ۹ تا ۱۲

"Ubai's Codex was known to contain two Suras not found in our Uthmanic text, though there is some dispute as to their position in his codex..."

SURAT Al-KHAL سورۃ الخلع

"اللھم انا نستعینک و نستغفرک و نثنی علیک ولا نکفرک و نخلع و نترک من یفجرک"

SURAT Al-HAFD سورۃ الحفد

اللھم ایاک نعبد ولک نصلی و نسجد الیک و نسعی و نحفد نرجو رحمتک و نخشی عذابک ان عذابک بالکفار ملحق"[1]

حقیت یہ ہے کہ یہ مصحف عثمانی سے خارج کردہ متن نہیں ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے غیر معروف، جو اسے قرآنی سورتیں کی بجائے نماز وتر کی دعا قنوت کے طور پر جانتے ہیں جیسا کہ "السنن الکبریٰ" للبیہقی میں منقول ہے[2]۔ چنانچہ حضرت ابیؓ کے مصحف میں شامل ان دعائیہ کلمات کو متن قرآن کہنا خلاف حقیقت ہے کیونکہ یہ ان کا ذاتی فعل تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی مصحف میں متن قرآن کے ساتھ تشریحی دعائیہ کلمات کو بھی نقل کیا ہوا تھا۔ نیز روایات میں منقول ہے کہ یہ دعائیہ کلمات حضرت ابیؓ بن کعب کے مصحف میں اختتامی سورتوں کے بعد لکھے ہوئے تھے۔ امام محمد بن نصر المروزی اپنی کتاب" قیام اللیل " میں یہ روایت نقل کرتے ہیں؛

" قال ابن اسحاق وقد قرات فی مصحف ابی بن کعب بالکتاب الاول العتیق بسم اللہ الرحمن الرحیم قل ھو اللہ احد الی اخرھا بسم اللہ الرحمن الرحیم قل اعوذ برب الفلق الی اخرھا بسم اللہ الرحمن الرحیم قل اعوذ برب اللناس الی اخرھا بسم اللہ الرحمن الرحیم اللھم انا نستعینک و نستغفرک و نثنی علیک الخیر ولا نکفرک و نخنع و نترک من یفجرک بسم اللہ ارحمن الرحیم اللھم ایاک نعبد و لک نصلی و نسجد و لیک نسعی و نحفد نخشی عذابک و نرجو رحمتک ان عذابک بالکفار ملحق بسم اللہ الرحمن الرحیم اللھم لا ینزع ما تعطی ولا ینفع ذاالاجد منک الجد سبحانک و غفرانک و حنانیک الہ الحق"[3]

مصحف ابیؓ بن کعب میں ان دعائیہ کلمات کے بارے ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب لکھتے ہیں؛

"اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ حضرت ابیؓ بن کعب کے ایک الگ مصحف میں چند دعائیہ کلمات موجود تھے تو اس سے یہ

---

1 Jeffery, Arthur, Materials for the history of the text of the Quran, (E. J. Brill, Leiden 1937) p.180-181

2 البیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین بن علی، سنن کبری، (دار الفکر، بیروت) ج ۲، ص ۲۱۱

3 المروزی، محمد بن نصر، مختصر قیام اللیل و قیام رمضان و کتاب الوتر، (المکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل ۱۹۶۹ء)، ص ۲۳۲

بات کیوں کر ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ اسے قرآن سمجھتے تھے۔ صحابی کرامؓ کے پاس ذاتی نسخوں کی حیثیت محض ذاتی یادگار اور محض ڈائری کی ہوتی تھی۔ متعلقہ صحابی کو ہی علم ہوتا تھا کہ کون سا متن قرآن ہے اور کون سا لفظ محض تشریح کی خاطر لکھا ہے[1]"۔

نیز یہ بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے "مصحف عثمانی" کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی میں خود حضرت ابیؓ بن کعب بھی شامل تھے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ؛

"عن محمد . یر . : . عثمان ل صر اثنی عشر رجلاً من المہاجرین والانصار، منهم اُبَ بن کعب وزید بن ثابت[2]"۔

اگر آپؓ اس دعا کو قرآن کا حصہ خیال کرتے تو قرآن کمیٹی کے ممبر ہونے کے ناطے لازماً اسے مصحف عثمانی میں شامل کرواتے۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ حضرت ابیؓ بن کعب نماز میں قراءت کے طور پر مصحف عثمانی کے علاوہ کچھ اور پڑھنے پر نماز (درست نہ ہونے کی بنا پر اسے) لوٹانے کے قائل تھے۔ جیسا کہ "کتاب المصاحف" لابن ابی داؤد میں ہے؛

"لا نری ان نقرا القرآن الا لمصحف عثمان الذی اجتمع علیہ اصحاب النبی ﷺ فان قرا انسان بخالفه فی الصلاۃ امرته بالاعادۃ[3]"۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں عن الربیع، عن حضرت ابیؓ . ک سے یہ روایت متصلاً ہے[4]۔

اگر حضرت ابیؓ اس دعا کو قرآن کا حصہ سمجھتے تو نماز میں تلاوت کے لیے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔

مسیحی دعویٰ کے مطابق مصحف عثمانی میں غیر موجود تیسری سورت "نورین" ہے۔ ایک کشمیری مصنف محسن فانی کی کتاب "دبستان مذاہب" کے حوالے سے منقول اس وضعی سورت کو قرآن کا حصہ تسلیم کرنا اجماع و تواترامت کے خلاف اور اسے بلا دلیل قرآن کا متروک شدہ حصہ قرار دینا تحقیق کے منافی ہے۔ امت مسلمہ میں سے کوئی بھی اسے نہ جزو قرآن گردانتا ہے نہ نماز میں اس کی تلاوت کرنا روا سمجھتا ہے۔ مصحف عثمانی سے مختلف فیہ کوئی قرآن سامنے نہیں آیا ہے جس میں یہ سورت موجود ہو۔ ترتیب سور میں بھی اس کے مقام کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ ایک ایسی شاذ اور مردود دلیل پر مبنی ہے

---

1 حافظ محمود اختر، تدوین قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا محققانہ جائزہ، (پی ایچ ڈی مقالہ، غیر مطبوعہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ص ۳۹۹

2 ابن داؤد، ابو بکر عبد اللہ بن سلیمان السجستانی، کتاب المصاحف، (تحقیق: د. محب الدین عبد السبحان واعظ) (دار البشائر الاسلامیہ، بیروت، طبع ثانیہ ۲۰۰۲م) ص ۲۱۴

3 ابن داؤد، کتاب المصاحف، ص ۲۹۲

4 ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد العبسی، المصنف، (دار تاج، بیروت ۱۴۰۹ھ) ج ۳، ص ۸۸

جس کی حیثیت الہامی حیثیت سے کلیسیا میں کئی دہائیوں تک رائج رہنے والے اسفار متروکہ کے بھی ہم پلہ نہیں۔ کیوں کہ سورت نورین کبھی بھی الہامی مقام نہ پاسکی۔ ظاہری مشابہت کے باوجود اس سورت کا متن معنوی اور صوتی اعتبار سے قرآنی اسلوب سے مختلف ہے۔ "تحقیق ایمان" از پادری عمادالدین سے اس کا ابتدائی حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم *

یا ایها الذین آمنوا آمنوا بالنورین انزلنا هما یتلوان علیکم آیاتی و یحذرانکم عذاب یوم عظیم * نوران بعضهما من بعض و انا السمیع العلیم * ان الذین یوفون بعهد اللّٰه و رسوله فی آیات لهم جنات نعیم والذین کفروا من بعد ما آمنوا بنقضهم میثاقهم و ما عاهدهم الرسول علیه یقذفون فی الجحیم ظلموا انفسهم و عصوا الوصی الرسول اولئک یسقون من حمیم * ان اللّٰه الذی نور السموات و الارض بما شاء واصطفی من الملائکة والرسل و جعل من المومنین اولئک فی خلقه یفعل اللّٰه ما یشاء لا اله الا هو الرحمٰن الرحیم قد مکر الذین من قبلهم برسلهم فاخذتهم بمکرهم ان اخذی شدید الیم * ان اللّٰه قد اهلک عادا و ثمود بما کسبوا و جعلهم لکم تذکرة فلا تتقون * و فرعون بما طغی علی موسی و اخیه هرون اغرقته و من تبعه اجمعین * لیکون لکم آیة و ان اکثرکم فاسقون * ان یجمعهم فی یوم الحشر

قرآنی الفاظ سے مرتب کردہ سورت نورین میں جس طرح شخصی مناقب بیان کیے گئے ہیں قرآن میں کہیں بھی ایسا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا۔

ترتیب قرآن کریم

مسلم نقطہ نظر کے مطابق قرآن کریم کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین کردہ ہے جس میں کسی انسانی کاوش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن مجید کا طریق نزول اور انداز تخاطب ایک بادشاہ کی طرف سے جاری ہونے والے احکام و فرامین کا سا ہے۔ جو مسئلہ در پیش ہوا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مناسبت سے احکام جاری ہوگئے۔ زمانی حالات میں مسائل کی کوئی ترتیب نہیں ہوتی، اسی طرح نازل ہونے والے احکام کی بھی کوئی ترتیب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ترتیب نزولی کو قائم رکھنا نہ مشیت الٰہی تھی اور نہ ہی اسے محفوظ کرنے کا کوئی حکم جاری ہوا۔

ترتیب قرآن پر مسلم عقیدہ کے برعکس یوں خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے۔

"جب نبی نے انتقال کیا تو وحی آنا موقوف ہوا اور کُل قرآن کی کوئی درست نقل اس وقت موجود نہ تھی جس سے معلوم ہوتا کہ فلاں احکام زیادہ لحاظ کے قابل ہیں اور فلاں احکام کم لحاظ کے قابل ہیں۔ اور یہ کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا کہ نبی نے کسی حصے کی کوئی خاص احتیاط کی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ترتیب نہ تھی جس پر بوقت جمع کرنے قرآن کے اس کی سورتیں ترتیب دی جاتیں۔ کیونکہ قرآن جیسا کہ اب موجود ہے تاریخی یا عبارتی ترتیب سے بالکل معرّا ہے"[1]۔

اس مسیحی دعویٰ کے مطابق رحلت نبوی کے وقت

۱ قرآن کی کوئی درست نقل موجود نہ تھی۔

۲ احکامات الٰہیہ کے درجات میں تفاوت ہے۔

۳ نبی اکرم ﷺ نے ترتیب قرآن میں کوئی احتیاط نہیں کی۔

۴ تدوین کے وقت قرآن کریم کوئی متعین ترتیب دستیاب نہ تھی۔

اس مسیحی تحریر پر معمولی تامل سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان کے مطابق یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ معترض علوم القرآن کی فنی مباحث اور تاریخی حقائق سے نابلد نظر آتا ہے کیونکہ

(۱) جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں اور سابقہ اوراق میں بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ رحلت نبوی کے وقت آپ ﷺ کی طرف سے تصدیق شدہ نقول دستیاب تھیں، جن کے بارے کئی روایات موجود ہیں۔ مثلاً

"قال ابن عباس و محمد بن الحنیفة ما ترك النبی ﷺ الا ما بین الدفتین"[2]

---

1 ایڈورڈ سیل، عقائد اسلامیہ، ص ۱۱۰

2 بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، ج ۲، ص ۷۵۱

(۲) مسلم نقطہ نظر سے قرآن کا ایک ایک لفظ یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ ان احکامات الہیہ کے درمیان فرق روا رکھنا درست نہیں کیونکہ سب کے سب ایک ہی ذات باری تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔ انجیل نویسوں میں درجاتی تفاوت کو مد نظر رکھ کر کاتبین وحی کے درجات کے لحاظ سے احکامات قرآنی کا کم تر یا فروتر مقام متعین کرنا جائز نہیں۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت ابو بکر کے نقل کردہ حکم قرآنی کا مقام حضرت زید کے نقل کردہ حکم قرآنی سے بالاتر ہے، تو یہ سراسر غلط ہوگا۔

(۳) یہ بات خلاف واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے نزول وحی کے وقت اس کی ترتیب کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ آپ ﷺ نے خود اپنی مرضی سے اس کی ترتیب نہیں کی بلکہ وحی کے ساتھ ساتھ اس کی ترتیب بھی منزل من اللہ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کو نازل ہونے والی ہر آیت یا آیات کا مقام بتا دیتے تھے[1]۔ جس کے مطابق آپ ﷺ کاتبین وحی کو اس کی ترتیب کا حکم دیتے۔

"کان النبی ﷺ مما تتنزل علیه الایات فیدعوا بعض من یکتب له ویقول له ضع هذه الایة فی السورة التی یذکر فیها کذا و کذا[2]۔

" آپ ﷺ پر جب آیات نازل ہوتیں تو کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو"۔

اس الٰہی متعینہ ترتیب کو "ترتیب توقیفی" سے ملقب کیا جاتا ہے۔ مسلمان آج اسی مقصود ترتیب توقیفی کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں نہ کہ ترتیب نزولی کے اعتبار سے۔

(۴) تدوین کے وقت جامعین قرآن نے اس کی وہی ترتیب مد نظر رکھی جس پر رسول اللہ ﷺ نے حکم الٰہی کے مطابق مطلع کیا تھا۔ اور اسی پر اجماع صحابہ ہوا تھا۔ اس لیے یہ کہنا تاریخی اعتبار سے سراسر جھوٹ اور حقائق سے بے خبری ہوگی کہ تدوین کے وقت قرآن کی کوئی ترتیب نہ تھی۔ صحیح بخاری کی روایت ہے؛

"یعرض القرآن علی النبی ﷺ کل عام مرة فعرض علیه مرتین فی العام الذی قبض"[3]

(ہر سال رسول اللہ ﷺ پر ایک بار قرآن سنایا جاتا اور وفات کے سال دو بار سنایا گیا)

---

1 بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کاتب النبی، حدیث نمبر ۴۹۹۰

2 ابو داؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، "السنن" مع عون المعبود ۱ / ۲۸۶ اس پر بہت سی روایات شاہد ہیں۔ مثلاً جب "واتقوا یوماً ترجعون فیه الی الله" نازل ہوئی تو ابن عباس کہتے ہیں کہ، جبرائیلؑ نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اس آیت کو سورۃ بقرۃ کی دو سو اسی آیت کے بعد لکھوایئے گا" (تفسیر خازن ۱ / ۱۹)

3 بخاری، الجامع الصحیح، ج ۲، ص ۷۴۸

مصحف عثمانی کے متعلق ہے 'ان الذی جمع علیہ عثمان الناس یوافق العرضۃ الاخیرۃ'[1]

(حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جس پر جمع کیا وہ اس کے مطابق تھا جو آپ ﷺ پر آخری بار پیش کیا گیا)

پہلی روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے جبرائیلؑ کے ساتھ یہ دَور کسی خاص ترتیب کو ملحوظ رکھ کر ہی کیا تھا۔ اور دوسری روایت کے مطابق مصحف عثمانی کی ترتیب بھی وہی ہے جس کے مطابق آپ نے آخری سال دَور کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ خود اور صحابہ کرام نمازوں میں قرآن پاک کی تلاوت ایک ترتیب سے ہی کرتے تھے۔

معتبر ذرائع، مستند شواہد اور تاریخی حقائق کی حامل ترتیب توقیفی کے برعکس مسیحی حلقہ کی طرف سے ظن و تخمین کی بنیاد پر قرآن کریم کو زمانی ترتیب سے مرتب کرنے کی کئی کوششیں کی گئی ہیں۔ برصغیر میں پادری جے علی بخش کی ترتیب نزول کے اعتبار مکی سورتوں کی " تفسیر قرآن" معروف ہے۔ اسی طرح مستشرقین میں سے جرمن نژاد تھیوڈر نولڈیکے کی Geschichte Des Qorans (1860) کو مغرب میں مطالعہ قرآن میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے نزدیک سورتوں کی ترتیب ان کی طوالت کے بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ لیکن وہ اس بات کا بھی اقراری ہے کہ ہماری تحقیقات حتمی نہیں محض ظن و تخمین کی بنیاد پر ہے اور ظن و قیاس کی بنیاد پر کیا جانے والا فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے[2]۔

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود اختر صاحب لکھتے ہیں؛" ان (مستشرقین) کے نزدیک قرآن محض سورتوں کی طوالت اور آیت کی تعداد کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ جب ہم طوالت اور تعداد آیات کے اعتبار سے قرآن کی تیسری منزل کا جائزہ لیتے ہیں تو درج ذیل صورت حال سامنے آتی ہے۔

سورۃ بنی اسرائیل کی آیات کی تعداد	۱۱۱
سورۃ الکہف کی آیات کی تعداد	۱۱۰
سورۃ مریم کی آیات کی تعداد	۹۸
سورۃ طٰہٰ کی آیات کی تعداد	۱۳۵
سورۃ الانبیاء کی آیات کی تعداد	۱۱۲
سورۃ الحج کی آیات کی تعداد	۷۸
سورۃ المؤمنون کی آیات کی تعداد	۱۱۸
سورۃ النور کی آیات کی تعداد	۶۴
سورۃ الفرقان کی آیات کی تعداد	۷۷

1 ابن حجر، فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۹، ص ۴۴

2 بحوالہ حافظ محمود اختر، تدوین قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا محققانہ جائزہ، ص ۲۰۱

اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب کوئی میکانکی عمل نہیں کیونکہ آیات کی تعداد کم و بیش ہو رہی ہے [1]۔

قرآن کی ترتیب کو زمانی اعتبار سے مرتب کرنے کے خواش مند مسیحی حلقہ کے لیے اگر عہد نامہ جدید کو زمانی ترتیب دی جائے تو صورت حال کچھ یوں ہو گی۔

موجودہ ترتیب	مجوزہ ترتیب بلحاظ کیتھولک	مجوزہ ترتیب بلحاظ پروٹسٹنٹ
انجیل متی	خطوط پولوس (۵۲ء۔۶۶ء)	خطوط عام (پہلا دور)
انجیل مرقس	رومیوں کے نام	یعقوب کا خط
انجیل لوقا	۱۔ کرنتھیوں کے نام	خطوط پولوس (پہلا دور)
انجیل یوحنا	۲۔ کرنتھیوں کے نام	غلاطیوں کے نام
اعمال الرسل	غلاطیوں کے نام	۱۔ تھسلنیکیوں کے نام
خطوط پولوس	افسیوں کے نام	۲۔ تھسلنیکیوں کے نام
رومیوں کے نام	فلپیوں کے نام	۱۔ کرنتھیوں کے نام
۱۔ کرنتھیوں کے نام	کلسیوں کے نام	۲۔ کرنتھیوں کے نام
۲۔ کرنتھیوں کے نام	۱۔ تھسلنیکیوں کے نام	رومیوں کے نام
غلاطیوں کے نام	۲۔ تھسلنیکیوں کے نام	افسیوں کے نام
افسیوں کے نام	۱۔ تیموتاؤس	فلپیوں کے نام
فلپیوں کے نام	۲۔ تیموتاؤس	کلسیوں کے نام
کلسیوں کے نام	طیطس کے نام	فلیمون کے نام
۱۔ تھسلنیکیوں کے نام	فلیمون کے نام	خطوط عام (دوسرا دور)
۲۔ تھسلنیکیوں کے نام	عبرانیوں کے نام	۱۔ از پطرس
۱۔ تیموتاؤس	خطوط عام	۲۔ از پطرس
۲۔ تیموتاؤس	از یعقوب (۶۰ء۔۶۱ء)	خطوط پولوس (دوسرا دور)
طیطس کے نام	۱۔ از پطرس (۶۲ء۔۶۳ء)	۱۔ تیموتاؤس

1 "القلم" (ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ج ۱۰، ش ۱۰، ۲۰۰۶ء) حافظ، پروفیسر ڈاکٹر محمود اختر، ترتیب قرآن مجید اور مستشرقین، ص ۸۴

فلیمون کے نام	۲۔از پطرس (۶۲ء۔۶۳ء)	۲۔تیموتاؤس
عبرانیوں کے نام	اعمال الرسل (۶۲ء۔۶۳ء)	طیطس کے نام
خطوط عام	انجیل مرقس (۶۵ء۔۷۰ء)	انجیل مرقس
از یعقوب	انجیل متی (۸۰ء۔۹۰ء)	انجیل لوقا
۱۔از پطرس	مکاشفہ (۸۱ء۔۹۱)	اعمال الرسل
۲۔از پطرس	انجیل لوقا (۸۵ء۔۹۵ء)	خطوط پولوس (تیسرا دور)
۱۔از یوحنا	انجیل یوحنا (۹۰ء۔۱۰۰ء)	عبرانیوں کے نام
۲۔از یوحنا	خطوط عام	خطوط عام (تیسرا دور)
۳۔از یوحنا	۱۔از یوحنا	از یہودہ
از یہودہ	۲۔از یوحنا	۱۔از یوحنا
مکاشفہ	۳۔از یوحنا	۲۔از یوحنا
	از یہودہ	۳۔از یوحنا
		انجیل متی
		انجیل یوحنا
		مکاشفہ

ارباب کلیسیا مذکورہ زمانی ترتیب کے بارے اس تاثر کی کیا توجیہہ پیش کریں گے کہ زمانی سبقت کے حامل خطوط پولس کے ذریعے مسیحی عقائد کی تشکیل نو کی گئی اور اناجیل اربعہ خصوصی طور پر ان پولسی تعلیمات کو شرعی جواز بخشنے کے لیے مدون کی گئیں اور انہیں دانستہ عہد نامہ جدید کے آغاز میں جگہ دی گئی تا کہ پولوس کی تعلیمات کو حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے روپ میں پیش کیا جا سکے۔ مسیحیت کے پس منظر سے ناواقف مبتدی قاری اس حقیقت سے لاعلم رہتا ہے، اور پولسی افکار کو ہی حضرت عیسیٰ کی تعلیمات خیال کرتا ہے۔

ناسخ و منسوخ

علوم القرآن میں "مَا نَنسَخۡ مِنۡ ءَايَةٍ أَوۡ نُنسِهَا نَأۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ أَوۡ مِثۡلِهَآ" (البقرۃ ۲: ۱۰۶) کے حکم الٰہی کے تحت ایک اہم بحث "ناسخ و منسوخ" ہے۔ جس میں "دلیل شرعی کے ساتھ کسی شرعی حکم کے رفع ہونے کا پتا چلایا جاتا ہے[1]۔

فہم قرآن میں اس کی اہمیت کا اندازہ حضرت علیؓ کے بارے ایک روایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپؓ نے ایک بار تفسیر قرآن کرنے والے ایک شخص سے پوچھا: "أتعرف الناسخ و المنسوخ. قال لا قال هلكت و اهلكت "[2] (کیا تم ناسخ اور منسوخ کے متعلق جانتے ہو؟ اس نے کہا نہیں تو حضرت علیؓ نے فرمایا؛ "تو خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کو بھی ہلاک کر دیا)۔ ناسخ و منسوخ میں احکام و شرائع پر بحث ہوتی ہے، عقائد پر نہیں۔

نسخ کا عمل صرف قرآن سے ہی خاص نہیں بلکہ یہ تصور سابقہ شرائع میں مروج رہا ہے۔ سابقہ شریعتوں میں نسخ کی دو صورتیں تھیں،

۱۔ کسی نبی کی شریعت میں اس سے پہلے نبی کی شریعت کے حکم کا منسوخ ہونا۔

۲۔ ایک ہی نبی کی شریعت میں دیا جانے والا حکم دوسرے حکم سے منسوخ ہو جانا

اس کی مثال ہمیں بائبل سے ملتی ہے۔ حضرت آدمؑ کے عہد میں سگے بھائی اور بہن میں شادی روا تھی۔

حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ جو ان کی علاتی بہن تھی، کے متعلق درج ہے۔

"درحقیقت وہ میری بہن ہے میرے باپ کی بیٹی۔ پر میری ماں کی بیٹی نہیں، سو میں نے اسے بیوی بنایا[3]"۔

لیکن تورات کی ہی کتاب احبار میں ہے؛

"تو اپنی بہن کے بدن کو، چاہے وہ تیرے باپ کی بیٹی ہو، چاہے تیری ماں کی اور خواہ وہ گھر میں پیدا ہوئی ہو، خواہ کہیں اور، تو اسے بے پردہ نہ کرنا[4] "

---

1 زرقانی، عبد العظیم، مناہل العرفان فی علوم القرآن، (داراحیاء الکتب العربیہ، بیروت) ج ۲، ص ۹۲ " رفع الحکم الشرعی بدلیل الشرعی)

2 السیوطی، جلال الدین عبد الرحمن، الاتقان فی علوم القرآن، (شرکۃ مکتبۃ و مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۵۱ء)، ج ۲، ص ۵۲؛ ابن جوزی، ابو الفرج جمال الدین عبد الرحمن، نواسخ القرآن، (المکتبۃ العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۵)، ص ۲۹

3 پیدائش ۲۰: ۱۲

4 احبار ۱۸: ۹

اسی طرح حضرت نوحؑ کی شریعت میں ہر چلتا پھرتا جاندار حلال تھا[1]، لیکن حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بہت سے جانور حرام قرار دے دیئے گئے[2]۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں عام طلاق کی اجازت تھی[3]، لیکن حضرت عیسیٰؑ نے عورت کے زناکار ہونے کے سوا اسے طلاق دینے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی[4]۔ موسوی شریعت میں سبت کی تعظیم کا حکم دائمی تھا۔ اس روز معمولی کام کرنا بھی منع تھا اس کی اہمیت کا اندازہ اس حکم کے بار بار دینے سے ہوتا ہے

"چھ دن تو اپنا کام کاج کر، ساتواں دن تمہارے لئے مقدس ہوگا، خداوند کے لئے آرام کا سبت جو کوئی اس میں کچھ کام کرے گا قتل کیا جائے گا۔ تم اپنے سب مکانوں میں سبت کے دن آگ مت جلاؤ[5]۔

لیکن حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں کے ہاں سبت کے بارے اس ابدی عہد کی تنسیخ نظر آتی ہے۔ خود مسیحیت کے اندر حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے پیروکاروں نے کئی احکام کو خود منسوخ کر دیا[6] جیسا ختنہ، وغیرہ۔

خود انجیل الہامی تعلیمات میں ناسخ و منسوخ کی مؤید ہے[7]۔ پولوس رسول کہتے ہیں؛

" جب کہانت بدل گئی تو شریعت کا بدلنا بھی ضروری ہے[8]"۔

برصغیر کے مسیحی قرآنی لٹریچر میں ناسخ و منسوخ وہ موضوع ہے جس پر معدودے چند تحریریں ہی سامنے آئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں صرف ایک کتاب بعنوان الناسخ والمنسوخ از ریورنڈ انوار الحق[9] خاص اس موضوع پر ملتی ہے۔ دیگر مسیحی تحریروں کے برعکس یہ تحریر نقد و اعتراضات سے خالی ہے۔ ابتدائی تمہید کے بعد تمام کتاب ناسخ و منسوخ آیات کی ایک اشاراتی فہرست پر مشتمل ہے۔ اس اشاراتی فہرست کے علاوہ مرتب کی طرف سے کوئی کام نہیں، اور نہ ہی مسلم یا مسیحی نقطہ نظر سے کوئی رائے زنی نہیں کی گئی ہے۔ شاید مؤلف صرف فہرست ہی مسیحی ناقدین

---

1 پیدائش ۹ : ۳

2 احبار ۱۱ : ۷

3 استثناء ۲۴ : ۱۔۲

4 متی ۱۹ : ۹

5 خروج ۳۵ : ۲؛ ۳۱ : ۱۵

6 گلتیوں ۵ : ۶ (دیکھو میں پولوس تم سے کہتا ہوں) ۔۔۔ مسیح یسوع میں نہ تو ختنہ کچھ فائدہ دیتا ہے نہ نامختونی۔

7 پولوس رسول کہتے ہیں کہ، " پہلے حکم کی تو کمزور اور بے فائدہ ہونے کے سبب سے تنسیخ ہوتی ہے، (عبرانیوں ۷ : ۱۸) نیز رومیوں ۱ : ۸؛ فسیوں کے نام خط ۲ : ۱۵؛ حاشیہ کیتھولک بائبل اعمال الرسل ص ۷۵۱؛ میزان الحق از پادری سی جی فانڈر دیباچہ ص ۳۰

8 عبرانیوں کے نام ۷ : ۱۲

9 انوار الحق، الناسخ والمنسوخ، صفحات ۷۷

قرآن کے لیے مرتب کرنے کا خواہاں ہو، لیکن ایک دوسری تحریر کی جزوی بحث میں قرآن کے ناسخ تورات و انجیل ہونے پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

پادری ٹھاکر داس "براہین احمدیہ پر ریویو" میں اس بات کے مدعی ہیں کہ قرآن اگلی کتابوں تورات و انجیل کا ناسخ نہیں ہو سکتا کیونکہ

۱ قرآن اپنے ثبوت صداقت میں اگلی کتابوں کا مصدق ہونے داعی ہے۔ یوں وہ ناسخ نہیں بلکہ اپنی تصدیق کے لیے ان کا محتاج ٹھہرتا ہے۔

۲ قرآن کہتا ہے کہ میری باتیں اگلی کتابوں کے موافق ہیں پھر یہ ان کا ناسخ کیونکر ہو سکتا ہے۔

۳ مسلمانوں کو توریت، انجیل اور قرآن یکساں ماننے کا حکم ہے جو کوئی ان میں سے کسی کو ناقص جانے وہ جہنمی ہے۔ (منسوخ جاننے سے اگلی کتابیں ناقص ٹھہریں گیں)

۴ قرآن اگلی کتابوں کی تعمیل اپنے پیروکاروں پر ثابت کرتا ہے۔ اگر انہیں منسوخ کرنا تھا تو ان کی "تبعیت" قائم نہ رکھتا۔

۵ قرآن دراصل اگلی کتابوں کی تنسیخ کے لیے نہیں بلکہ عبرانی اور یونانی زبان میں ان پہلی کتابوں کو اہل عرب کے لیے عربی زبان میں پیش کرنے کی غرض سے ان کے مثل کے طور پر نازل ہوا ہے۔

اس مسیحی دعویٰ کے مطابق قرآن کتب سابقہ کا مصدق، موافق تعلیمات نیز ان پر عمل کرنے کا حکم دینے کی بنا پر ناسخ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تو عبرانی و یونانی زبان کی کتب سابقہ کا عربی ایڈیشن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت محمدیہ انسانی راہنمائی کے الہامی سلسلہ کی آخری کڑی ہے اور انہی عقائد کو پیش کرتی ہے جن کی تعلیم پہلے انبیاء نے دی۔ مسلم تشریح کے مطابق نسخ شریعت سے مراد عقائد کی تنسیخ نہیں بلکہ سابقہ انبیاء کی نبوت کو ان کے عہد تک تحدید کرنا اور ان کے احوال و ظروف کے مطابق عبادات و مسائل کی راہنمائی پر مبنی تعلیمات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے نئے حالات کی متقاضی نئی شریعت کا مدعی ہونا ہے۔ یعنی نسخ ہمیشہ احکام میں ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ پادری صاحب کے یہ تمام دعاوی نسخ کے مسلم نکتہ نظر سے عدم واقفیت کی بنا پر ہیں۔ مسیحی دعاوی کا ترتیب وار جائزہ یوں ہو گا۔

(ا) اس مسیحی تحریر میں قرآن کو کتب سابقہ کے مصدق ہونے پر ان کے ناسخ نہ ہونے کا غلط استدلال کیا گیا ہے۔ اہل کتاب کو دعوت دیتے ہوتے اپنی صداقت کے لیے تائیدی استشہاد کے طور پر قرآن اپنے آپ کو سابقہ کتب کا مصدق ہونے کا داعی ہے کہ یہ اسی الہامی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اس سے یہ اخذ کرنا کہ قرآن اپنی صداقت کے لیے سابقہ کتب کا محتاج ہے قطعاً غلط ہے۔ نیز قرآن ان کتب میں پیش کردہ عقائد کی تو تنسیخ نہیں کرتا بلکہ احکام کی تنسیخ کا

مدعی ہے۔ اس لیے قرآن کے عدم ناسخ ہونے کا یہ مسیحی استدلال باطل ہے۔ قرآن کے مخاطبین میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں فریق شامل ہیں۔ قرآن کی صداقت کو سابقہ کتب پر منحصر کرنے کی دلیل اس کے دوسرے مخاطب، غیر اہل کتاب، فریق کے لیے عبث ہے کیوں وہ ان کتابوں کے پیروکار نہیں۔ اور قرآن ان کے سامنے اپنی صداقت کے لیے اہل کتاب کی گواہی پیش نہیں کرتا۔

(۲) قرآن کا اگلی کتابوں کی موافقت کا دعویٰ غیر حقیقی نہیں۔ یہ تورات میں توحید، رسالت، کتب، ملائکہ، آخرت کے عقائد کی موافقت کرتا ہے۔ اب موافقت کو احکام پر منطبق کرنا مغالطہ آفرینی ہے۔ دوسری طرف مسیحی نقطہ نظر کو دیکھا جائے تو حضرت عیسیٰؑ باوجود یہ فرمانے کے کہ "یہ نہ سمجھو میں تورات کو منسوخ کرنے آیا ہوں میں اسے پورا کرنے آیا ہوں" کئی احکام تبدیل کردیتے ہیں۔ مثلاً طلاق، قصاص، احکام سبت، رجم وغیرہ۔ قرآن بھی انہی معنوں میں ناسخ ہے نہ کہ پادری صاحب کے کردہ تصور کے مطابق۔

(۳) بے شک مسلمانوں کو سابقہ کتب پر ایمان لانے کا حکم ہے مگر اس سے یہ دلیل پکڑنا کہ منسوخ ٹھہرنے پر وہ ناقص ٹھہریں گی، غلط قیاس ہے۔ کیا پولوس رسول کے قول سے استدلال کرتے ہوئے عہد نامہ قدیم کو ناقص ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ وہ عہد قدیم اور عہد جدید کے حوالے سے کہتے ہیں؛

"جب اس نے نیا کہا تو پہلے کو پرانا ٹھہرایا۔ پس جو چیز پرانی اور پارینہ ہو جاتی ہے وہ مٹنے کے قریب ہوتی ہے"[1]۔

قرآن جب کتب سابقہ کی تصدیق کرتا ہے تو انہیں ناقص کیسے گردان سکتا ہے۔

(۴) سابقہ کتب کی "تبعیت" کا جو تاثر مسیحی تحریر میں دیا گیا ہے وہ قرآنی تعلیمات کی صحیح عکاسی نہیں ہے۔ قرآن ان کتب کی متابعت عقائد میں کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان عقائد میں در آنے والی خرابیوں کو نہ تو تسلیم کیا ہے نہ انہیں برقرار رکھا، بلکہ ان کی تغلیط اور اصلاح کی۔ جن عقائد کی تغلیط کی ہے وہ تورات میں مفقود تھے جب کہ مسیحیت میں متداول ہیں مثلاً تثلیث، کفارہ، ابنیت، تجسیم وغیرہ۔ قرآن ان کے منسوخ ہونے کی بات نہیں کرتا بلکہ وہ انہیں الٰہی احکام قرار دینے کا روادار نہیں۔ اس لیے وہ سرے سے ان کی مذمت، تغلیط اور تردید کرتا ہے۔ رہی تنسیخ کی بات تو احوال و ظروف کے مطابق سابقہ شریعت کے جن احکامات کی افادیت اس دور تک ہی محدود تھی، قرآن ان کو منسوخ کرنے کا بھی داعی ہے۔

(۵) قرآن کریم کو عبرانی اور یونانی زبان میں سابقہ کتب (عہد نامہ قدیم وجدید) کا عربی ایڈیشن قرار دینے کا مسیحی دعویٰ غلط ہے۔ اگر یہ سابقہ کتب کا ہی عربی ایڈیشن ہے تو ان کتب کے پیروکاروں کی طرف سے نقد و تنقیص قرآن

---

1 عبرانیوں کے نام ۸: ۱۳

پر مبنی ضخیم لٹریچر چہ معنی دارد؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تورات اور انجیل کا مصدق ہے۔ تورات میں جو عقائد و شرائع موسیٰ کو عطا ہوئے قرآن ان کی مثل ہے جیسے احکام عشرہ۔ لیکن ترجمہ شدہ یونانی انجیل میں انسانی عنصر کی بنا پر در آنے والے غیر الہامی عقائد کی بنا پر اس کا مثل نہیں ہو سکتا۔ مسیح کی زبان آرامی تھی (خواہ اسے عبرانی کا لہجہ قرار دیا جائے لیکن یہ ایک مستقل زبان تھی) اگر آرامی زبان میں اصل انجیل موجود ہوتی تو قرآن کی وہی مماثلت نظر آتی جو اس کی تورات کے ساتھ ہے۔

علاوہ ازیں، (جیسا کہ دوسرے باب میں گذرا ہے)، پادری ای ایم ویری صاحب نے مسئلہ ناسخ و منسوخ کو ضرورت دعویٰ نبوت کی اختراع قرار دیا ہے۔ اسے مصنف کی انجیل سے کم آشنائی اور اغماض حقیقت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سابقہ اوراق میں قرآن کو حالات و واقعات کی اختراع قرار دیئے گئے اعتراض کا جائزہ لیا گیا تھا، اس کی روشنی میں اس کو پرکھا جا سکتا ہے۔ مزید کچھ کہنا تکرار کے سوا کچھ نہیں۔

مقام قرآن

مسیحی لٹریچر میں جہاں قرآن کی الہامی حیثیت تسلیم کرنے کی بجائے اسے حالات کے زیر اثر پیغمبر اسلام کا وضع کلام اور بائبل اور اسفار متروکہ کا چربہ قرار دیا گیا ہے، وہیں اسے بائبل کا مصدق اور اس کی تفصیل بھی گردانا گیا ہے مسیحی لٹریچر میں بتکرار حقانیت بائبل کے لیے "وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ" (آل عمران ۳:۵) کی روشنی میں قرآن کو مصدق بائبل کی حیثیت دی گئی ہے۔

> "آنحضرت نے قرآن کو بائبل کا مصدق اور اس کی تفصیل قرار دیا (یونس: ۳۸؛ طہ ع ۸؛ شعراء ع ۱۱؛ بقرہ ع ۲۶؛ حدید ع ۱۱؛ یوسف ع ۱۲؛ بقرہ ع ۱۲؛ انعام ع ۱۱، ۱۹؛ مائدہ ع ۷، ۹، ۱۰؛ نساء ع ۷؛ بقرہ ع ۵، ۱۱؛ مومن ع ۶) اور آنحضرت نے کفار کو کہا کہ تمہارے دلوں میں یہود و نصاریٰ کی کتب کا وقار ہے پس قرآن کو مان لو کیونکہ یہ قرآن اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں موجود ہے کیا اہل مکہ کے لیے (اس کی صداقت کی دلیل) یہ کافی نہیں کہ اس قرآن (کے مضامین) سے علماء بنی اسرائیل واقف ہیں"[1]۔

قرآن بہت سے مقام پر اس بات کا مدعی ہے کہ وہ تورات و انجیل کا مصدق ہے۔ مسیحی لٹریچر میں اسے تورات و انجیل کی بجائے مروجہ بائبل کا مصدق گردانا گیا۔ مسلم نقطہ نظر کے مطابق قرآن میں مذکور تورات و انجیل تو کلام الٰہی ہیں، لیکن

۔ کیا اہل کتاب کے پاس موجود بائبل واقعی وہی تورات و انجیل ہے جس کی قرآن تصدیق کرتا ہے؟

---

1 برکت اللہ، پادری، توضیح البیان فی اصول القرآن، ص ۶

۔ مصدق سے کیا مراد ہے؟

برصغیر کے مسلم مناظراتی ادب میں بائبل کی حیثیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مطابق بائبل کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ انسانی فیصلوں کے تحت کلیسیا نے کتب بائبل کا چناؤ کیا۔ چناؤ شدہ کتب میں وحی کا امتزاج تو ممکن ہے لیکن یہ ساری کی ساری وحی نہیں۔ اسی طرح متروک کتب میں وحی کے امتزاج کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن وحی کے مصدق و مہیمن ہونے کا داعی ہے، کلیسیا کی مقبول و مردود میں منقسم کتب کی تصدیق کا نہیں۔ مخصوص نظریات کے تحت گروپوں میں کتب کی تقسیم سے وحی ایک ہی گروپ میں محصر نہیں ہو سکتی۔ قرآن حقیقی وحی کا مصدق ہے نہ کہ مخصوص نظریات کے پرچار کے لیے منتخب کی جانے والی کتب کا۔ یعنی قرآن سابقہ وحی کا مصدق ہے وحی کے نام پر اکٹھی کی جانے والی تحریروں کا نہیں۔

جب قرآن نے ان میں مندرج خود ساختہ نظریات کی آبیاری کی بجائے بیخ کنی کی تو قرآن باعث تنقید ٹھہرا کہ یہ اپنے دعویٰ مصدق کی مخالفت کر رہا ہے۔ اسی طرح کتب متروکہ میں اتفاقی یا واقعاتی مشابہت سے قرآن پر سرقہ کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے۔ قرآن اگر تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تو سابقہ بحث کی روشنی میں اس کی محض اس وجہ سے تردید نہیں ہو سکتی کہ یہ اناجیل کے خلاف ہے۔ البتہ یہ دعویٰ اس وقت درست ٹھہر سکتا ہے جب قرآن میں غلط تاریخی حقائق پائے جائیں۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن تب بے نظیر وحی متصور ہوتا جب وہ کوئی نئی تعلیمات سامنے لاتا۔ قرآن کا دعویٰ سابقہ آسمانی تعلیمات کے مصدق و مہیمن ہونے کا ہے تو پھر ان سے ہٹ کر نئی تعلیمات مطالبہ کیوں؟ قرآن نے تو سابقہ کتب کا مہیمن ہونے کے ناطے انہی تعلیمات کو از سر نو بحال کیا اور ان میں در آنے والی غلط تعلیمات کا رد کیا ہے جس کی وجہ سے قرآن پر مخالفت کتب سماوی کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآنی دعویٰ کا جائزہ لیا جاتا اور اس کی روشنی میں غلطیوں کی اصلاح کی جاتی یا پھر قرآنی دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے سابقہ کتب سماوی کی روشنی میں انجیلی تعلیمات کی تصدیق کی جاتی۔ کیا توریت میں تثلیث، کفارہ، ابنیت، ازلی گناہ جیسے عقائد موجود ہیں؟ نیز قرآنی تاریخی حقائق کو تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت کیا جاتا یا دلائل کے ساتھ عہد نامہ قدیم سے مختلف فیہ معاملات میں قرآن کی تغلیط کی جاتی۔

قرآن کا اگلی کتابوں کی موافقت کا دعویٰ غیر حقیقی نہیں۔ یہ تورات میں توحید، رسالت، کتب، ملائکہ، آخرت کے عقائد میں موافقت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احکامات میں سے بعض میں کلی، جبکہ بعض میں جزوی موافقت ہے۔ قرآن اور توریت معاشرتی احکامات اور حلال و حرام میں زیادہ تر متفق جب کہ بہت کم جزوی احکامات میں

مختلف فیہ ہیں[1]۔ نظم جماعت اور مساوات انسانی قائم کرنے کے معاملات میں قرآن نے نسل پر مبنی تخصیصی احکامات کو نہیں لیا اور نہ وہ لیے جا سکتے تھے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کی نسبت سے اسرائیلی تہوار بھی اسلامی معاشرے کے لیے غیر متعلقہ اور غیر موزوں تھے، اس لیے وہ بھی ختم کر دیئے گئے۔ نظم جماعت میں بنی اسرائیل کے ایک قبیلے کی مختلف شاخوں پر مبنی معاشرہ اور اس کے مقابل عالمگیر معاشرہ کی ساخت میں بعد المشرقین تھا۔ اس لیے یہ قوانین عالمگیر معاشرہ کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہونے کی بنا پر متروک ٹھہرے۔ مسیحی لٹریچر کا جائزہ لینے سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسیحی اہل قلم احکامات شرعیہ کی تبدیلی یا منسوخی پر بوجوہ قلم نہیں اٹھاتے۔ اسی طرح حلال و حرام، جو شریعت موسوی اور شریعت اسلامیہ کا خاصہ ہیں، پر بھی بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے۔

عقائد اور احکامات کے علاوہ قرآن اخبار و قصص تورات میں سے ضمنی اختلاف کے ساتھ زیادہ تر کا مصدق ہے۔ مثلاً قصہ تخلیق آدمؑ، قصہ یوسفؑ، قصہ خروج موسیٰؑ قصہ داؤدؑ وغیرہ

---

1 مثلاً اسلامی شریعت کے برعکس توریت کے مطابق اونٹ اور خرگوش حرام ہے۔ احبار ۱۱: ۴؛ اسی طرح توریت کے مطابق حائضہ سے میل جول کی ممانعت ہے کہ "جب ماہواری وقت پر عورت کے جسم سے خون بہے تو وہ سات دن تک اپنے حیض میں جدا کی جائے اور جو کوئی اسے چھوئے شام تک ناپاک رہے۔ اور سب کچھ جس پر وہ اپنے حیض میں سوئے ناپاک ہو گا۔ اور سب کچھ جس پر وہ بیٹھے ناپاک ہو گا، اور جو کوئی اس کے بستر کو چھوئے اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے۔ اور جو کوئی کسی ایسی چیز کو چھوئے جس پر وہ بیٹھی تھی، اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے۔۔۔ اگر کوئی مرد اس کے ساتھ ہم بستر ہو جب کہ اس کو حیض آ رہا ہے تو وہ سات دن ناپاک رہے گا۔ (احبار ۱۵: ۲۰۔۲۵)

فصل دوم

مسیحی ناقدین کے ماخذ و مصادر

(مغرب میں مطالعہ قرآن کے حوالے سے)

فصل دوم

مسیحی ناقدین کے ماخذ و مصادر (مغرب میں مطالعہ قرآن کے حوالے سے)

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں قرآن کریم کے حوالے سے پیش کردہ اعتراضات کم و بیش ان مستشرقین کی تحریروں پر مشتمل ہے جو یا تو خود برصغیر آئے یا ان کی تحریروں کا ترجمہ پیش کیا گیا۔ مقامی مسیحی اہل قلم زیادہ تر انہی کے خوشہ چین رہے اور خود کوئی قابل ذکر طبع زاد نقد سامنے نہیں لا سکے۔ بدیسی اور مقامی مسیحی لٹریچر میں معیار اور اسلوب ہر دو لحاظ سے فرق ہے، جیسا کہ دوسرے باب میں مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں قرآن پر نقد کا ماخذ و مصدر مستشرقین یورپ کی طرف سے پیش کیا جانے والا قرآنی لٹریچر ہی ہے۔ مستشرقین کی طرف سے قرآن کو ہدف نقد بنانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ

> "عیسائیت بائبل کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام قرآن کے بغیر قطعی طور پر زندہ نہیں رہ سکتا[1]"۔

مستشرقین کے مطالعہ قرآن کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یورپ میں نقد بائبل کے ضمن میں عہد نامہ قدیم و جدید پر سوالات اٹھائے گئے کہ کیا ان کا مصدر و منبع ایک ہی ہے یا متوازی اور مختلف فیہ زبانی روایات Oral Tradition کی پیداوار ہیں۔ متن بائبل پر نقد اور تراجم میں ابہام و تضادات کا نتیجہ "History of Bible" کی صورت میں نکلا۔ اس ذہنی پس منظر کے ساتھ مستشرقین نے قرآن کریم کو بھی Biblical Criticism کے اصولوں پر جانچنا چاہا۔ اس صف میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو علوم اسلامیہ میں درک نہ رکھنے کی وجہ سے اسے پرکھنے کی حقیقی صلاحیت سے بہرہ ور نہ تھے۔ ان کی تحقیق کا سارا انحصار اپنے ہم مشرب افراد کی مخصوص نقطہ نظر کے تحت پیش کردہ تحریروں پر مبنی ہے۔ یہ استشراقی تحریروں کے سطحی معیار اور استدلال کی بنیادی خامی ہے۔

یورپ کی سرزمین باقاعدہ اسلام سے اس وقت متعارف ہوئی جب موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں ۳۰ اپریل ۷۱۱ء کو طارق بن زیاد نے اندلس کے ساحل جبل طارق پر اپنی کشتیاں جلا کر ایک مظلوم مسیحی آواز پر لبیک کہا تھا۔ (اگرچہ اس سے قبل جزیرہ سسلی اور قبرص پر دور عثمانی میں مسلم قدم پہنچ چکے تھے) بعد ازاں اندلس میں آٹھویں صدی عیسوی میں باقاعدہ مسلم حکومت کی بنیاد پڑی جس نے مستقبل میں تہذیب و تمدن اور علمی سیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ موجودہ یورپی اقوام میں "تاریکی کے دور" سے نکلنے اور تہذیب و علم کے راہرو بننے کے لیے روشنی اسی

---

1 Jeffrey, Arthur, Quran as Scripture, p1

چراغ سے مستعار لی گئی ہے۔ یورپ کے دیگر حصوں سے یہیں زانوئے تلمذ تہہ کرنے والوں نے واپس جا کر اپنے علاقوں کو علمی اور تہذیبی ترقی سے آشنا کیا۔ اسلامی ریاست بننے کے تقریباً تین سو سال بعد تک مسیحی یورپ کے غالب حصوں اٹلی، انگلستان، فرانس، جرمن وغیرہ میں اس کی طرف سے قرآن کی کوئی دعوت نہیں پہنچی۔ بلکہ مغرب کے اس حصہ میں صلیبی جنگوں (Crusades) سے قبل قرآن کا عمومی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صلیبی جنگوں (۱۰۹۶ء۔ ۱۲۷۰ء) کا ایک نتیجہ یورپ کا مسلمانوں کے ساتھ براہ راست تعامل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور یورپ مسلمانوں، اسلام اور قرآن سے آشنا ہوا کیونکہ صلیبی جنگوں سے قبل معدودے چند ہی یورپی لوگ اندلس جا کر عربی علوم سیکھنے والے تھے، عوام الناس قرآن اور اسلام کے بارے ناآشنا ہی تھے۔

یورپ کی اپنے سیاسی اور مذہبی حریف اسلام اور مسلمانوں سے مخالفت کا اظہار صلیبی جنگوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ بات ہرگز نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اسلامی تعلیمات کی مخالفت مذہبی بنیادوں پر کم اور سیاسی عناد کی بنا پر زیادہ تھی۔ اس مخالفت کو پاپائیت کی طرف سے مذہبی جاگیر چھن جانے کے خوف سے زیادہ مہمیز ملی[1]۔ بیت المقدس کی آزادی کے لئے "مقدس صلیبی جہاد" سے واپس لوٹنے والے پُرجوش صلیبی جنگجوؤں کی زبانی اسلام اور اہل اسلام کے متعلق یک طرفہ، ناقص اور بہت کم معلومات یورپ میں پہنچیں۔ ارباب کلیسیا کے لیے اسلام کا معمولی سا تذکرہ بھی ناقابل برداشت تھا۔[2] چنانچہ عوام الناس کے اذہان کو مسلمانوں کے مثبت تصور سے "مسموم" ہونے کے خدشہ کے پیش نظر صنعت کذب و افتراء کا سہارا لے کر ایسے ایسے افسانے تراشے گئے جن کے مخفی

---

1 جرمن مستشرق بیکر نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے: "عیسائیت کو اسلام سے اس لیے عداوت ہے کہ قرون وسطیٰ میں اشاعت اسلام نے عیسائیت کی راہ روک دی۔ پھر اسلام ان علاقوں میں پھیل گیا جہاں کلیسا کا اثر و اقتدار تھا"
[اسلام اور مستشرقین (مرتب: ضیاء الدین اصلاحی)، (دار المصنفین، اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء) ج۶، ص۱۷۷]

2 ڈاکٹر عبد القادر جیلانی لکھتے ہیں: "کلیسا کی تمام توانائیاں صرف اسلام کے خلاف وقف ہو گئیں۔ اس نے اسلام اور بانی اسلامؐ کے خلاف شعوری طور پر نفرت پیدا کی، مذہب کے نام پر پیدا کی گئی نفرت رفتہ رفتہ جزو فطرت بن گئی۔ باہر سے عالم اسلام کا شدید دباؤ اور اندر سے کلیسا کی نفرت انگیزی ایسے عناصر تھے جنہوں نے مغرب کو اسلام کے حقیقی خدوخال سے واقف ہی نہیں ہونے دیا۔ اول تو انہیں مسلم فاتحین سے دشمنی کے باعث اسلام سے دشمنی رہی۔ ثانیاً اسلام کی تعلیمات اور عیسائیت کی تعلیمات میں اس قدر تضاد تھا کہ تجاہل ہی میں مصلحت تھی۔ مغرب نے سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر عمداً اسلام کا ایک فرضی ہیولا ترتیب دیا ان کی تحریروں کے اغراض و مقاصد تھے۔ انہی اغراض و مقاصد کے تحت حقائق کو مسخ کیا گیا اور صرف نفرت کو ہوا دینے کے لیے بے بنیاد الزامات و اتہامات عائد کیے گئے۔ بیڈے کی اناجیلی تاویلات ہوں، کہ عامیوں کی غیر ذمہ دارانہ اشتعال انگیز اور گمراہ کن تحریریں، صلیبی وقائع نگاروں کی تعلّی ہو کہ مقدس پادریوں کے رشحات قلم، مؤرخین کی دقیق نظری ہو کہ شعراء کی پرواز خیال۔ ہر فکر افراط و تفریط میں ملوث، مسخ عمد کا شکار، خود ساختہ مفروضوں پر مبنی اور حقائق سے

اثرات صدیوں بعد بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس دور کی مغربی نہج فکر کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے؛

"آندریو بوردے Andrew Borde نے اپنی کتاب Introduction to Knowledge میں اپنے ناظرین کے لیے ایک حیرت انگیز کہانی پیش کی ہے، جس میں لکھا ہے؛" اس نبی نے اس مقصد کے لیے ایک اونٹ پالا تھا۔ اس اونٹ کی گردن سے ایک کتاب باندھی گئی اور اسے ایک نواحی جنگل میں پہنچا دیا گیا۔ جب لوگ ایک بڑے معجزے کی توقع میں جمع ہو گئے تو اس اونٹ کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ اونٹ سیدھا اس نبی کے پاس پہنچا اور دوزانو ہو گیا۔ اس نبی نے اونٹ کی گردن سے کتاب کھولی، چند اسباق پڑھے اور پھر استعجاب کے ساتھ کہا؛ یہ اونٹ تو ہمارے لیے ہمارا قانون (شریعت) لایا ہے تا کہ ہم اس پر کاربند ہوں"

اسی ڈرامے کو ہلدے برت (طورس کے اسقف اعظم م ۱۱۳۴ء) نے بھی دہرایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں ہر کارہ اونٹ کی جگہ بیل ہے ایک تیسری کہانی میں اونٹ اور بیل کا کردار گدھے سے ادا کرایا گیا ہے[1]۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ بارہویں صدی عیسوی تک یورپی کلیسیا نے رسول اللہ ﷺ کو نبی اور نئے دین کے علمبردار کی بجائے ایک نسطوری قسیس گردانا تھا، جس نے روگردانی کرتے ہوئے ایک نئے بدعتی مسیحی فرقے کی بنیاد رکھی، جو بعد ازاں نئے مذہب کی شکل میں عیسائیت کا رقیب بن گیا۔

Satan gave success to the error and sent the monk Sergius , a follower of the heretical Nestorians how had been expelled from the church, across to those regions of Arabia, and joined the heretical monk with the pseudo_ prophet and so Sergius, joined with Mohammad , filled in what was lacking to him, and explaining to him also the sacred scriptures, both the Old Testament and the New, (in part) according to the thinking of his master Nestorius, how denied that our Saviour was God, (and) in part according to his own interpretation, and likewise completely infecting him with the fables of the apocryphal writings, he made him a Nestorian Christian.[2]"

(شیطان نے گمراہی کو عروج بخشا اور راہب "سرجیئس" کو بھیجا یہ شخص بدعتی عقائد کے حامل نسطوریس کا پیروکار تھا جسے کلیسیا نے عرب علاقوں کی طرف جلا وطن کر دیا تھا۔ اور یہ بدعتی راہب " فرضی پیغمبر" کے ساتھ جا ملا۔ اور "سرجی ایس" نے محمد میں پائی جانے والی کمیوں کو پورا کر دیا اور ان کے سامنے قدیم و جدید عہد نامہ کے مقدس

مبرا ہے، لطف یہ ہے کہ کذب بیانی کے اس میدان کے تمام ترشہسوار ارکان کلیسا ہیں" (جیلانی، عبدالقادر، ڈاکٹر، اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر (بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۵۶

1 ایضاً، ص ۱۸۹ بحوالہ: Henry Stubb, Rise and Progress of Mohometanism , p228

2 Kritzeck, James , Peter the venerable and Islam , (Princeton University Press , N Y) p 129

نوشتوں کی اس کے سامنے وضاحت کی۔ یہ کام اس نے اپنے آقا نسطوریس کے افکار کی روشنی میں سرانجام دیا۔ جو ہمارے منجی کو خدا ماننے کا منکر تھا اور ضمناً اپنی توضیحات بھی پیش کیں۔ اور یوں مکمل طور پر اسے اسفار متروکہ کی تحریروں کے سراب میں گم کر دیا۔ اس نے محمد کو ایک مکمل نسطوری مسیحی بنا ڈالا۔)

ہندوستانی مسیحیوں کے ذہنوں میں یہی سوچ راسخ کرنے کی کوشش یورپی مناد پادری ای ایم ویری کے ان متبدل بہ الفاظ سے ملتی ہے؛

" اگر اس کے چند سال بعد خود محمد صاحب بھی مدینہ میں نہ جا رہتے تو اے بی سینا (حبشہ) میں تشریف لے جاتے اور بجائے اسلام کے کسی مسیحی بدعتی فرقہ کے بانی ہوتے"[1]۔

تیرہویں صدی کے اختتام سے قبل یورپی دنیا آنحضرت ﷺ کو ایک بدعتی عیسائی قسیس کا آلہ کار تصور کرتی رہی۔ اسے ایک افسانے میں یوں بتلایا گیا کہ؛

" دربار روم میں ایک نہایت ہی نامور قسیس تھا، جسے وہاں سے حقیر کر کے نکالا گیا۔ اس کی ملاقات ماہومت سے ہوئی اس نے کہا میں تمہیں تمام اقوام کا آقا اور سربراہ بنا دوں گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک کبوتر کو تربیت دینا شروع کیا۔ وہ قسیس ماہومت کے کان میں گیہوں کے دانے رکھتا اور کبوتر کو ان کے کاندھے پر بٹھاتا تاکہ کان سے دانہ چگے۔ جب پرندہ تربیت پا گیا تو اس قسیس نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ وہ اس شخص کو ان پر بادشاہ مقرر کرے گا، جس پر روح القدس کبوتر کی شکل میں نزول کرے گا۔ پھر اس نے خفیہ طور پر کبوتر کو چھوڑا جو کہ اڑتا ہوا سیدھا ماہومت کے کاندھے پر آ بیٹھا۔ لوگوں نے باور کیا کہ یہ روح القدس تھا، جو ان پر نازل ہوا"[2]۔

بعد میں اہل یورپ نے ہی خود ان اتہامات کی نفی کر کے اپنے پیش روؤں کے تعصب، حسد اور جہالت کی گواہی دی۔ فرانسیسی مستشرق کارادے فا Carrade Vaufe کہتا ہے کہ

" محمد ایک طویل عرصہ تک مغرب میں بدنام تھے چنانچہ جو بھی بے سروپا حکایت یا برائی ملتی وہ ان کی طرف بے تکلفی کے ساتھ منسوب کر دی جاتی"[3]۔

اس ذہنی پس منظر کے یورپ میں ابتدائی تراجم قرآنی پر ایک نظر ڈالنے سے ذیل کے حقائق سامنے آتے ہیں، جس میں پنہاں رویہ دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔

---

1 ویری، ای ایم، ہدایت المسترین، ص ۳۲

2 جیلانی، اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر، ص ۱۹۵، شیکسپیئر جیسا ادیب بھی اس روایت کو دہرانے سے باز نہ رہ سکا۔ مغربی ادیب اس کبوتر کی ذات اور رنگ تک سے واقف تھے۔ کبوتر بازوں نے تو کبوتروں کی ایک نسل کا نام ہی ماومت Maumet رکھ دیا تھا۔ ص ۱۹۶

3 بحوالہ اسلام اور مستشرقین، ج ۲، ص ۳

مسلم اندلس جا کر عربی علوم حاصل کرنے والا، پیٹر دی وینرایبل Peter the Venerable (1094-1156) وہ تاریخی کردار ہے، جس نے لاطینی زبان میں پہلا ترجمہ قرآن کروایا۔ اس کے مترجمین میں ایک (نامعلوم) انگریز، فرانسیسی رابرٹ آف کیٹن Robert of Ketton اور جرمن نژاد ہرمن آف ڈالمش Hermann of Dalmatia شامل تھے۔ لیکن ترجمہ کا اصل کام کیٹن کا تھا[1]۔ اس ترجمہ کے محرک پیٹر وینرایبل کے متعلق اس کی کتاب کا مترجم James Kritzeck لکھتا ہے؛

> Peter The Venerable rejected Muhammad's Prophet hood and asserted that the Koran has sources[2]"
>
> [پیٹر دی وینرایبل نے رسالت محمدی کا انکار کیا اور اس بات کا برملا اظہار کیا کہ قرآن (وحی نہیں بلکہ اس) کے ماخذ (کچھ اور) ہیں]

یہ ترجمہ ۱۱۴۳ء میں مکمل ہوا۔ لیکن چار صدیوں تک یہ ترجمہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکا یہاں تک کہ ترکوں اور یورپ میں سیاسی کشمکش کے دور میں Theodor Bibliander نے باسل Basel (جرمنی) سے ۱۱ جنوری ۱۵۴۳ء کو اسے طبع کروایا۔ باسل کونسل کی اس کی مخالفت پر پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔۱۵۴۶ء) نے اس کی اشاعت کی حمایت کرنا پڑی جس کے پیچھے اسلام کی ہمدردی یا علم دوستی نہیں تھی۔ مراد ہوف مین نے یہ معاملہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛

> ---The publication of the Quran's translation in 1543 was not undertaken out of any sympathy for Islam, rather, it was don to serve as a tool in the battle against Islam on the battle ground of central Europe, even though for Martin Luther the main villain at the time was not Islam but the Pop. In fact, he considered the Ottoman campaign against Vienna as a divine punishment for the ungodly "Papism" practiced in Rome.[3]"

---

1 Gunny Ahmad , Perceptions of Islam in European Writings, (The Islamic Foundation Leicester UK ,2004) p25

2 Kritzeck , James , Peter the Venerable and Islam, p.129

3 Hofmann , Murad Wilfried , German Translations of the Holy Quran , " Islamic Studies , Issue41, Vol.1 , (2002) p. 87

(۱۵۴۳ء میں ترجمہ قرآن کی اشاعت اسلام سے کسی ہمدردی کی بناپر نہیں تھی بلکہ اسے اس جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا جو مرکزی یورپ کے محاذ پر لڑی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ اسلام کی بجائے پوپ کو ولن گردانے والے مارٹن لوتھر نے بھی، اس نے روم میں جاری ویانا کے خلاف ترک عثمانی جنگی مہم کو پاپائیت کے خلاف خدا کی سزا گردانا تھا)

باسل کونسل کے حکم پر اس کے پبلشر Johann Herbet اور Oporinus کو حوالات کی ہوا بھی کھانا پڑی تھی۔ یہ مارٹن لوتھر ہی تھا جس نے ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے اس کی حمایت میں ۲۶ دسمبر ۱۵۴۲ء کو کونسل کو خط لکھا تھا؛

" In his opinion , Luther wrote , nothing more vexing to the Moslems could possibly be done than to publish translation of the Koran and their other books[1].

(لوتھر نے لکھا کہ اس کے خیال میں مسلمانوں کو اس سے بڑھ کر اور کسی چیز سے نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا کہ قرآن اور دیگر مسلم کتابوں کا ترجمہ کر کے شائع کیا جائے)

کونسل نے اس شرط پر اجازت دی کہ اس ترجمہ قرآن کے ایک بھی نسخہ کی شہر میں فروخت کی اجازت نہیں ہو گی۔ مستشرق منٹگمری واٹ کے الفاظ میں:

"کونسل نے اپنے اقدام کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا تھا کہ انہیں اس طرز کی کتاب کی اشاعت سے خطرہ تھا کہ اس سے مسیحیوں کے ذہن وضمیر پریشان ہوں گے"[2]۔

لوتھر نے خود اس کا مقدمہ تحریر کیا جس میں اسلام اور اس "ترک بائبل" (قرآن) کی تنقیص میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کا ایک نسخہ بیت القرآن، بحرین میں موجود ہے[3]۔ لاطینی پوپ کے اسے نذر آتش کروانے کی روایت بھی ہے[4]۔

مصر میں فرانسیسی سفارت کار Anddre De Ryer نے فرانسیسی زبان میں براہ راست عربی متن سے قرآن کا ترجمہ کیا، جو L'Alcoran De mahmet translate" d"Arabe en Francois Par Le Sieur Du Ryer Sieur De La Garde Malezair کے نام سے ۱۶۴۷ء میں پیرس سے شائع ہوا۔ اس ترجمہ کے متعلق جارج سیل کو کہنا پڑا؛

---

1 Kritzeck , James , Peter the Venerable and Islam (Princeton University , Press Princeton1964) , Preface vii

2 بحوالہ: سہ ماہی" اسلام اور مغرب" اسلام آباد (انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد) ج ۲، ش ۱، جنوری۔مارچ ۲۰۰۲ء

3 Ibid

4 السلاتی، مصطفی نصر، الاستشراق السیاسی (دار اقرا، طرابلس ۱۹۸۶) طبع اولی، ص ۸۸

" (It) is far from being a just Translation; there being mistakes in every page, besides frequent transpositions, omissions and additions, faults unpardonable in a work of this nature."[1]

(یہ مطلق ترجمہ سے (کوسوں) دور ہے اس کے ہر صفحہ میں غلطیاں ہیں، اور اکثر تبدل وحک وحذف کی ایسی خطائیں ہیں کہ اس قسم کی تصنیف میں نظر انداز نہیں ہو سکتیں)۔

جب کہ فرانسیسی مترجم قرآن سیواری کی رائے میں یہ ترجمہ

"If' says Savary, " the Koran, which is extolled throughout the East for the perfection of its style, and magnificence of its imager, seems, under the pen of Du Ryer, to be only a dull and tiresome rhapsody, the blame must be laid on his manner of translating."

(اگر قرآن جو تمام مشرقی ملکوں میں عبارت کے کمال اور قوت خیال کے مجد واجلال میں اعلیٰ مرتبہ پر ہے، ڈرائر کے ترجمہ میں ایک نثر غیر منتظم وبے رونق، جس کے پڑھنے سے طبیعت کو ماندگی آتی معلوم ہو تو یہ الزام اس طرز پر ہے کہ جس طور سے اس کو ترجمہ کیا گیا ہے)[2]۔

بعد ازاں عربی زبان سے نابلد اور انگریز الیگزنڈر روز Alexander Ross (1592ء - 1654ء) نے اسی فرانسیسی ترجمہ کو انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ انگریزی میں یہ پہلا مکمل ترجمہ قرآن تھا جو مئی ۱۶۴۹ میں شائع ہوا۔ اس کا ٹائٹل یہ تھا:

The Alcoran of Mahomet, translated out of Arabique into French, by the Sieur Du ryer, Lord of Malezair, and Resident for the King of france, at Alexandra.[3]

الیگزینڈر کے مکمل ترجمہ قرآن سے قبل عربی زبان کی سوجھ بوجھ رکھنے والے ولیم بڈول (۱۵۶۳ء۔ ۱۶۳۲ء) نے ۱۶۵۱ء میں قرآن کریم کی سورتوں کی فہرست اطالوی ترجمہ کے ساتھ شائع کی جس میں بعض کے معانی اور ان کے مقام ترتیب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر مرقوم تھا۔

---

1 Sale, George ,The Koran commonly called Alkoran of mohammed , (George Routledge & sons, London,) preface viii

2 چراغ علی، مولوی، یورپ اور قرآن، (نول کشور سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۰)، ص ۴۔۵

3 Matar, Nabil, Islam in Britain , (Cambridge University Press ,Uk 1998) p. 73

Index Assuratarum Muhammedici Alkorani, That is, A Catalogue of the Chapters of the Turkish Alkoran , as they are named in the Arabicke, and known to Musslemans .. Gathered and Digested according to their naturall order, for the benefite of Divines , such as favour thesse studies.[1]

الیگزینڈر کا ترجمہ ابھی طباعت کے مراحل میں تھا کہ کرنل انتھونی ویلڈن نامی انگریز نے اس "ترکوں کے قرآن" کی اشاعت کے خلاف کونسل آف اسٹیٹ میں ایک پٹیشن دائر کر دی۔ جس پر کونسل نے فوراً پریس کو طباعت روکنے اور ناشر کو عدالت کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۲۱ مارچ ۱۶۴۹ء کو تمام طبع شدہ کاپیاں سربمہر کر کے ناشر کو جیل بھیج دیا گیا۔ دس دن بعد ۳۱ مارچ کو عدالت نے مترجم الیگزنڈر روز کے گرفتاری کے سمن جاری کر دیئے[2]۔ الیگزنڈر روس نے فرانسیسی مترجم ڈرائر Du Ryer کی مثال دینے کے ساتھ ساتھ اس کے شروع میں تعارف قرآن پر کچھ صفحات کا اضافہ کر دیا جس میں بہت منفی انداز میں قرآن، صاحب قرآن اور اسلام کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے بارے بہت گھٹیا زبان استعمال کی گئی۔ بالآخر عدالت کی اجازت کے بعد ۷ مئی ۱۶۴۹ء کو یہ ترجمہ چھپ گیا۔ لغوی اعتبار سے یہ ترجمہ نہایت ناقص تھا۔ جارج سیل اس کے متعلق لکھتے ہیں؛

The English version is no other than a translation of Du Ryer's , and that a very bad one; for Alexander Ross, who did it , being utterly unacquainted with the Arababic , and no great master of the French , has added a number of fresh mistakes of his own to those of Du Ryer ; not to mention the meanness of his language, which would make a better book ridiculous".[3]

(یہ انگریزی نسخہ ڈرائر کے فرانسیسی ترجمہ کے سوا کچھ نہیں، جو کہ در حقیقت بہت ہی بُرا ترجمہ ہے۔ الیگزنڈر روس، جس نے یہ ترجمہ کیا، خود عربی سے مطلقاً بے بہرہ اور فرانسیسی میں بھی ماہر نہ تھا۔ اس نے ترجمہ میں ڈرائر کی کردہ غلطیوں میں مزید اپنی کئی نئی غلطیاں بھی شامل کر دیں۔ تاکہ اپنی زبان کی گراوٹ کو ظاہر نہ ہونے دے جو کہ ایک بہتر کتاب کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔)

اس سب کے باوجود اگلے پچاسی برس تک اکیلا انگریزی ترجمہ ہونے کی بنا پر اسے اہمیت حاصل رہی تاآنکہ

---

1 Matar, Nabil, Islam in Britain, p. 73

2 Ibid p.76-77

3 Sale , The Koran , p. vii

سورة فاتحة الكتاب

بسم الله الرحمن الرحيم
الحمد لله رب العالمين الرحمن الرحيم مالك
يوم الدين اياك نعبد واياك نستعين
اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت
عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين

وهي سبع آيات

سورة البقرة مائتان

بسم الله الرحمن الرحيم
الم ذلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين
الذين يؤمنون بالغيب ويقيمون الصلوة ومما
رزقناهم ينفقون والذين يؤمنون بما انزل
اليك وما انزل من قبلك وبالآخرة هم يوقنون

وثمانون وست آيات

وینس میں موجود قرآن کریم کے ابتدائی صفحات جس کے متعلق دعویٰ کہ یہ قرآن کی پہلی طبع ۱۵۱۵ء ہے

جارج سیل کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ترجمہ قرآن کو برداشت نہ کرنے کے انگریز رویہ میں دو سو سال بعد بھی تبدیلی نہ آسکی۔ برصغیر میں فورٹ ولیم کالج میں کیے گئے اردو ترجمہ قرآن کی طباعت اس وقت کی انگریز سرکار نے رکوا کر شائع شدہ تمام نسخے ضبط کر لیے تھے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ کوئی طبع شدہ نسخہ کسی کے پاس نہ رہے۔ (تفصیل باب دوم میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے) یہ تعصب کے ساتھ ساتھ مخصوص ذہنیت اور خوف پر مبنی رویے کی عکاسی بھی ہے۔

لاطینی زبان میں ایک اہم ترجمہ قرآن دسویں پوپ Pop Innocent کے مشورے سے لویجی میراشی Luigi Merraci کا ہے۔ یہ عربی متن اور لاطینی ترجمہ کے ساتھ Padua سے ۱۶۹۸ء میں شائع ہوا۔ قرآن مجید کی بدون ترجمہ معری متن کی یورپ میں پہلی بار اشاعت ۱۵۱۵ء میں الیگزنڈر پیگنینی Alexander Paganinui نے وینس سے کی۔ مولانا چراغ علی کے بقول؛

"یہ نسخہ پوپ کے حکم سے جلا دیا گیا تھا اور اب اس چھاپے کی ایک نقل بھی کسی کتب خانہ میں نہیں ہے"[1]۔

لیکن اَسّی کی دہائی میں ویٹیکن روم سے قرآن کریم کا ایک نسخہ دریافت ہوا جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ اُسی پہلی اشاعت کا نسخہ ہے۔

علاوہ ازیں رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والی آراء میں بھی قرآن کی ناقابل قبول انداز میں تصویر کشی کی گئی۔ سترہویں صدی عیسوی کے ابتدائی دہائی میں انگلستان میں کافی ہاؤسز Coffee Houses کا آغاز ہوا۔ آہستہ آہستہ ان کافی ہاؤس مجالس کو سماجی فیشن کی حیثیت حاصل ہوگئی اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے یہ سب سے مؤثر ذریعہ ثابت ہوئیں، کیونکہ معاشرتی رجحانات کو نئی جہت دینے میں ان کافی ہاؤسز کی بحثوں کو بہت دخل رہا تھا۔ ان میں الیگزنڈر روس کے ترجمہ قرآن کے حوالے سے "ترکوں کی بائبل"* کے متعلق گفتگو اور مباحث کی جانے لگیں۔ ایک غیر معروف مصنف ۱۶۶۵ء میں لکھی گئی کتاب The Character of a coffee – House میں کہتا ہے؛

When Coffee once was vended here, The Al c'oran shortly did appear (Title Page)[2]

سیاسی مخالفت کی بنا پر یورپ میں اس دور میں قرآن مسلمانوں کی الہامی کتاب کی نظر سے کم اور "ترک بائبل" کی حیثیت سے زیادہ زیر بحث رہا۔

---

1 چراغ علی، یورپ اور قرآن، ص ۲ (حاشیہ)

* قرآن کو ترکوں کی بائبل سے موسوم کیا جاتا تھا۔

2 Mater , Nabil , Islam in Britain , p 112

THE KORAN:
COMMONLY CALLED THE
ALKORAN OF MOHAMMED.
Translated into English from the Original Arabic.
WITH EXPLANATORY NOTES TAKEN FROM THE MOST APPROVED COMMENTATORS.
TO WHICH IS PREFIXED
A PRELIMINARY DISCOURSE.
BY GEORGE SALE.
With Maps and Prints.
London:
FREDERICK WARNE AND CO.
BEDFORD STREET, STRAND.

جارج سیل کے ترجمہ قرآن کا سرورق

کارلائل نے ۸ مئی ۱۸۴۰ء بروز جمعہ "The Hero As Prophet . Mahomet : Islam" کے عنوان سے دیئے گئے اپنے لیکچر میں قرآن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا؛

I must say, it is as toilsome reading as I ever undertook. A wearisome confused jumble, crude , incondite ; endless iterations , long – windedness , entanglement ; most crude, incondite; – insupportable stupidity, in short ! Nothing but a sense of duty could carry any European through the Koran.[1]

(میں ضرور کہوں گا کہ یہ (قرآن) میری زندگی کی سب سے زیادہ محنت طلب پڑھنے کی مشق ہے، ایک اکتادینے والا، پریشان، بے ترتیب مجموعہ، خام، ناپختہ، لامتناہی تکرار، طول طویل گفتگو، الجھاؤ، انتہائی خام اور غیر نفیس، ناقابل دفاع حماقت؛ مختصراً یہ کہ سوائے ادائے فرض کے احساس کے، کسی یورپین کو کوئی چیز قرآن کو پڑھنے پر آمادہ نہیں کر سکتی)

یورپ میں مطالعہ قرآن کی تاریخ جارج سیل (۱۶۹۷ء۔۱۷۳۶ء) کے ترجمہ قرآن کے ذکر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ ۱۷۳۴ء میں شائع ہونے والے اس ترجمہ نے دو صدیوں تک مغربی ذہنوں کو اپنے زیر اثر رکھا۔ اس ترجمہ قرآن کے آغاز میں مترجم کا ضخیم مقدمہ ہے جس میں یورپ کی سابقہ روش سے قدرے ہٹ کر قبل از اسلام عربوں کے حالات، سیرت نبوی اور قرآن مجید کا تعارف کروایا گیا ہے۔ اس میں قرآن کے بارے بعض مثبت آراء کے ساتھ ساتھ معاندانہ انداز میں بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے متعلق جارج سیل لکھتا ہے؛

In the name of the most Merciful God ; which form they constantly place at the beginning of all their books and writings in general, as a peculiar mark or distinguishing characteristic of their religion , it being counted a sort of impiety to omit it.... But I am apt to believe Mohammed really took this form , as he did many other things, from the Persian Magi , who used to begin their books in these words , Benam Yezdan bakhshaishgher dadar ; that is , " In the name of the most merciful , just God."[2]

(مسلمان اپنی تمام کتابوں اور تحریروں سے پہلے جو لازماً بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھتے ہیں اور یہ ان کے مذہب کی خاص

---

1 Carlyle , Thomas , (Humphrey Milford , Oxford University Press , London , p 65

2 Sale , The Koran , p. 40

خوبی اور پہچان ہے۔ اور اسے نہ لکھنا گناہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں اس بارے یقین کرنے پر حق بجانب ہوں کہ محمد نے دوسری بہت سی چیزوں کی طرح اسے بھی زرتشت سے لیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی کتابوں کو ایسی عبارت سے شروع کرتے تھے،" بنام یزداں بخشش گار دارد)

محمد ﷺ کو مصنف قرآن بتلاتے ہوئے سیل کہتا ہے؛

That Muhammad was really the author and chief contriver of the Koran is beyond dispute, though it be highly probable that he has no small assistance in his design from others, as his countrymen failed not to object to him. However they differed so much give him such assistance, that they were not able , it seems to prove the charge , Muhammad it is to be presumed , having taken his measures too well to be discovered.[1]

(اس حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن کے مصنف یا اس کو اختراع کرنے والے محمد ہی ہیں۔ اگرچہ اس بات کا غالب امکان موجود ہے کہ اس منصوبے میں ان کو دوسرے لوگوں سے جو مدد ملی وہ کم نہ تھی۔ جیسا کہ ان کے اہل وطن نے ان پر اعتراض کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔۔۔۔ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ محمد نے ان ذرائع کو چھپانے کے کے ایسے طریقے اختیار کیے ہوں گے کہ انہیں ظاہر کرنا ممکن نہیں۔)

ترتیب قرآن کے بارے لکھا گیا ہے؛

Muhammad left the chapters complete as we now have them, excepting such passages as his successor might add or correct from those who had gotten them by heart, what Abu Bakr did else being perhaps no more than to range the chapters in their present order, which he seems to have done without any regard to time, having generally placed the longest first."[2]

(محمد نے قرآن کی سورتوں کو ایسے ہی مکمل حالت میں چھوڑا تھا جیسا کہ آج ہم پاتے ہیں، سوائے ان کچھ حصوں کے جو ان کے بعد ان کے خلیفہ نے حفاظ قرآن کی مدد سے مکمل کیے یا درست کیے۔ ابو بکرؓ نے قرآنی سورتوں کی موجودہ ترتیب دینے کے سوا اور کچھ نہیں کیا وہ بھی وقت نزول کا خیال کیے بغیر طوالت کے لحاظ سے ترتیب دے دی)

فرشتوں کے وجود کے بارے جارج سیل کہتا ہے

---

1 Sale , The Koran , p 50

2 Ibid , p 51

"The existence of Angels and their purity are absolutely required to be believed in the Koran , .. The whole doctrine concerning angles Mohammad and his disciples have borrowed from the Jews, who learned the named and offices of those being from the Persians, as themselves confess[1].

(فرشتوں کے وجود اور ان کے گناہ سے پاک ہونے پر یقین رکھنا، قرآن پر ایمان کا لازمہ ہے۔ محمد اور آپ کے پیروکاروں نے فرشتوں پر ایمان کا عقیدہ یہود سے مستعار لیا ہے، جیسا کہ وہ خود اقراری ہیں، انہوں نے پارسیوں سے ان فرشتوں کے نام اور ذمہ داریاں سیکھی تھیں)

اِنہیں خیالات کا پرتو برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں جھلکتا ہے۔

تھیوڈور نولڈکے Thoedore Noldeke طبقہ مستشرقین میں ایک پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ۱۸۶۰ء میں جرمن زبان میں تاریخ القرآن Geschichate Des Qorans طبع کی، جس میں سورتوں کی ترتیب نزولی سے نص قرآن کی زمانی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ جسے نظر ثانی اور اضافوں کے بعد Freadrik Schwally نے تین جلدوں میں ۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۸ء میں طبع کیا۔ اس نے دراصل اس تحقیق میں پانچویں صدی ہجری کے مسلم عالم ابوالقاسم عمر بن محمد بن عبدالکافی کی اس موضوع پر کتاب پر انحصار کیا تھا جو کہ God Lygd 674 Warn لائبریری میں اسے استفادہ کے لیے ملی۔ اس کے ساتھ ساتھ " نظم الدرر وتناسق الآیات والسور " لابراہیم بن عمر البقاعی اور ابن ندیم کی " الفہرست " سے بھی مستفید ہوا[2]۔

یہی مشق برصغیر میں پادری جے علی بخش کی نزولی اعتبار سے مکی سورتوں کی مرتب کردہ " تفسیر قرآن " میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مستشرقین اور ان کے خوشہ چین دیسی پادریوں کی ان تحقیقات کا محرک بظاہر حصول علم تھا مگر درپردہ مصادر کی ایک ایسی تعبیر تھا جس سے خود مسلم ذہن متاثر ہو۔ قرآن کو وحی کی بجائے رسول اللہ ﷺ کے ذہن کی تخلیق قرار دیتے ہوئے اسے ترتیب نزولی کے لحاظ سے مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ ترتیب نزولی کا سبق دینے کے پیچھے قرآن کے الہامی دعویٰ کی تنقیح مقصود نہیں تھی بلکہ اس کی تنقیص، تحدید، تشکیک، تکذیب اور تردید کا داعیہ کارفرما تھا۔

مستشرقین کے نزدیک قرآنی متن مقدس مواد سے خالی ایک انسانی تصنیف ہے، انہوں نے قرآن میں تاریخی ارتقائی عمل کو بنیادی مفروضہ قرار دیتے ہوئے انسانی ذہن کی تخلیق ثابت کرنا چاہا۔ اور رسالت محمدی ﷺ کو الہامی تسلیم کرنے کی بجائے اسے حالات و واقعات کے تحت اختراعی گردانا ہے، جس میں وحی خارجی ذریعہ ہونے کی بجائے

---

1 Sale , The Koran , p 56

2 کھگہ، فیروزالدین شاہ، اختلاف قراءات اور نظریہ، تحریف قرآن (شیخ زید اسلامک سنٹر، لاہور ۲۰۰۶ء)، ص ۱۶۵

ایک داخلی و نفسیاتی معاملہ ہے۔ تغیر احوال کے ساتھ قرآنی احکامات میں تبدیلی کو انہوں نے اختراع وحی کے معنی پہنا دیئے۔ مثلاً ای ایچ پامر E. H. Palmer کے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں آر اے نکلسن R.A. Nicholson رقم طراز ہے؛

When, by force of circumstances , the prophet in him had grown into the ruler and legislator, it was a psychological necessity that he should still feel himself to be the chosen medium of the divine message.' The Child is father of the Man.[1]"

(جب حالات کے جبر کے تحت، پیغمبر ایک حکمران اور قانون ساز میں ڈھل گئے، تو بھی یہ ایک نفسیاتی ضرورت تھی کہ وہ خود کو الہامی پیغامات کا منتخب ذریعہ سمجھتے رہیں۔(یعنی کہ) "بچہ اپنا باپ بن گیا")

برصغیر میں یہ فکر پادری کینن سیل کی کتاب "کشف القرآن" کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ مستشرقین کی طرف سے سب سے زیادہ پیش کی جانے والی رائے یہ ہے کہ قرآن دراصل یہودی و مسیحی روایات سے ماخوذ ہے۔

"To see in the traditional literature some traces of that borrowing from Judaism, and Christianity with which Mohammad in the pages of the Koran has long familiarized us.[2]"

(اگر ہم مجموعہ احادیث کو دیکھیں تو اس میں یہودیت اور عیسائیت سے مستعار لیے گئے وہ آثار صاف نظر آئیں گے، جن سے محمد نے ہمیں قرآن کے اوراق میں روشناس کروایا ہے۔)

یہی دعویٰ پادری کلیئر ٹسڈل صاحب اپنی کتاب "ینابیع الاسلام" میں کرتے ہیں۔ اس کتاب کی تیسری فصل اس دعویٰ کی تحقیق میں ہے کہ

"قرآن و حدیث کی بعض تعلیمات و حکایات یہودیوں کی تفاسیر و روایات اور افسانوں کے مضامین سے ماخوذ ہیں اور اسلام کی بعض دینی رسوم صابئین کے پرانے طریقے سے نکلی ہیں"[3]

جب کہ کچھ صفحات بعد رقم طراز ہیں؛

"ان باتوں کے علاوہ جو اوپر مذکور ہو چکیں اور بہت سی باتیں ہیں جو قرآن و حدیث میں جہلا عیسائیوں کی موضوعہ کتابوں اور اہل بدعت کی جھوٹی تصانیف سے ماخوذ ہیں"[4]۔

یعنی صرف مسیحی کتب سے ہی نہیں بلکہ قرآن بدعتی مسیحی فرقوں کے نظریات سے اخذ کردہ فکر محمد ﷺ پر

---

1 Palmer, E. H. ,' The Quran '(Translation) (Oxford Universty Press , London1933) Introduction By R.A Nicholson, p.x

2 Guillaume, A. The Tradition of Islam ,(Beirut ,1924) , p.133

3 ٹسڈل کلیئر، ینابیع الاسلام، ص ۳۷

4 ایضاً، ص ۱۴۱

منی کلام ہے نہ کہ وحی الٰہی۔ مثلاً راڈویل اپنے ترجمہ قرآن میں لکھتا ہے؛

It has been supposed that Muhammad derived many of his notions concerning Christianity from Gnosticism, and that it is to the numerous Gnostic sects the Koran alludes when it reproaches the Christians with having "split up their religion into parties"[1].

(یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ محمد نے عیسائیت سے متعلقہ اپنے کئی تصورات نسطوریت سے اخذ کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی نسطوری فرقوں کی طرح، قرآن جب عیسائیوں سے مخاطب ہوتا ہے تو" ان کے مذہب کو کئی گروہوں میں منقسم کر دیتا ہے")

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں اہم مقام رکھنے والی " ینابع القران " از گولڈ سیک میں انہی ماخذِ قرآن کی کھوج لگانے کی کوشش گئی ہے۔ اس مسیحی دعوی کے نتیجہ میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کن لوگوں سے یہ چیزیں اخذ کرتے تھے۔ ان کے تعین کے بارے جارج سیل اپنے مقدمہ قرآن میں رقم طراز ہے؛

" البتہ ان کو اس قسم کی مدد مہیا کرنے والے مخصوص شخص کے تعین میں ان کے مفروضے باہم اتنے متضاد تھے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ محمد کے خلاف اس الزام کو ثابت نہ کر سکے۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ محمد نے اس معاملے کو خفیہ رکھنے کے لیے اتنے عمدہ انتظامات کیے کہ ان کی وجہ سے اس راز کا انکشاف ممکن نہ رہا۔"

یہاں ایک ناقابل توجیہہ رویہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ باوجود اس اعتراف کے کہ رسول اسلام کے خلاف یہ الزام کسی طور ثابت نہ ہو سکا، فاضل مستشرق پہلے سے طے شدہ نتیجہ پر قائم رہنے کے لیے ایک مفروضے کا سہارا لیتے ہیں۔ اس مفروضہ رائے کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر اچھالا گیا ہے اور استدلال کی بنیادی کمزوری کے باوجود یہ اتہام پورے طمطراق سے نقل در نقل کیا جاتا ہے۔

برصغیر میں مسیحی منادین کے سرخیل پادری فانڈر اس اعتراض کو بڑی شدومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جارج سیل کے برعکس وہ ان افراد کے ناموں کی بھی نشان دہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اس نے مصری لونڈی مریم (حضرت ماریہ قبطی کے نام کی مغالطہ آمیزی)، ورقہ بن نوفل، ام حبیبہ، سلمان فارسی (جنہیں پادری صاحب مسیحی گردانتے ہیں)، عبد اللہ بن سلام (قبل از اسلام یہودی ربی) یسار اور ابو تکیبتھ (دو مسیحی غلام) ادس (راہب) حضرت زید (انہیں سریانی مسیحی گردانا گیا ہے) کے نام گنوائے ہیں[2]۔ مستشرقین کی باہم متضاد آراء ان کے معیار و اسلوب تحقیق کا پتہ دیتی ہیں۔

---

1 Rodwell, J. M. THE KORAN (Translation) (J.M.Dent & Sons Ltd. London,1909) p. 9-10

2 فانڈر، میزان الحق، ۳۴۶

جمع وتدوین قرآن پر قلم اٹھاتے ہوئے ایچ اے آر گب (H. A. R .Gibb) نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تالیف قرآن کا کام حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مکمل نہیں ہوا۔ وہ لکھتا ہے،

It seems possible that the work of compilation was begun in his life time, But it was completed only some years after his death.[1]

(یہ بات ممکنات میں سے معلوم ہوتی ہے کہ تالیف قرآن کا کام آپ کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی تکمیل آپ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ہوئی۔)

گب اس باب میں اکیلا ہی یہ سوچ دینے والا نہیں بلکہ مارگولیتھ اس بات کا مدعی ہے کہ خود قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں قرآن مکتوب نہ تھا۔[2]

مستشرقین کے مذکورہ بالا نقد قرآن کے رویہ پر ذیل کے تبصرہ کو غیر حقیقت پسندانہ نہیں کہا جاسکتا؛

" قرآنی مطالعہ کا مستشرقین کا انداز نفرت، مایوسی، اور انتقام سے عبارت ہے مغرب اپنے عروج کی انتہا پر مملکت، چرچ اور ملی تفوق کی سہ گونہ طاقتوں سے لیس ہو کر مسلم ایمان پر پوری قوت سے حملہ آور ہے۔ خود پسند اور گھمنڈی، بے ڈھنگ اور غیر یکساں شخصیت کا حامل مغربی انسان، بے رحم معقولیت اور دنیا پر اپنے غلبہ کے نشہ کی سرشاری کے ساتھ اسلامی کتاب کو اس کی مضبوط بنیاد، بے میل سند اور ناقابل شکست اخلاقی برتری کے مقام سے گرانے کی کوشش میں ہے"[3]۔

قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ مستشرقین طے شدہ نتائج پر جانچنے کے باوجود قرآن کو بائبل کی سطح پر نہیں لاسکے اور نہ ہی انسانی تصنیف کے اپنے دعویٰ کو ٹھوس بنیاد فراہم کر سکے ہیں۔ وہ خارجی نقد کے ذریعے ثقاہت واستناد قرآن میں تشکیک وارتیاب پیدا کر کے تکذیب قرآن میں بھی ناکام رہے۔

---

1 Gibb, H R A, Islam : The Encyclopedia of Living Faith (Ed. By R C Rise (South Africa) , p 168
بحوالہ ثناءاللہ حسین، قرآن حکیم اور مستشرقین، ص ۱۱۴

2 Margoliouth , D S , Encyclopedia of Religion and Ethics ,(T.& T Clack , 38 George Street , Edinburgh) Vol. 10 , p 542

3 سہ ماہی "اسلام اور مغرب" اسلام آباد، ص ۱۹۔۲۰

باب چہارم

مسلم علماء کی تصنیفی و مناظرانہ کاوشیں

فصل اول

مسلم علماء کی طرف سے

توضیحی، تنقیدی، تردیدی و الزامی کتب

فصل اول

مسلم علماء کی طرف سے توضیحی، تنقیدی، تردیدی والزامی کتب

اٹھارویں صدی کے اختتام تک سوائے عہد اکبر (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کی اکا دکا تحریروں کے، برصغیر کے مسلم ادب میں مسیحیت کے حوالے سے کوئی قابل ذکر کاوش نہیں ملتی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے مسیحی منادین کی طرف سے سامنے آنے والے تبشیری لٹریچر اور اس میں اسلام و قرآن پر نقد نے مسلم علماء کی توجہ اس جانب مبذول کروائی۔ اس سے برصغیر میں مسلم مسیحی مناظراتی ادب کا دور شروع ہوتا ہے۔ باب دوم میں مسیحی کتب کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ ان میں پیش کردہ اعتراضات واشکالات کے جواب میں مسلم علماء کی طرف سے توضیحی وتردیدی کے ساتھ ساتھ الزامی اور تنقیدی کتب منظر عام پر آئیں۔ باستثنائے چند، معترضین کے رد عمل میں لکھی جانے والی یہ تحریریں زیادہ تر مناظرانہ اسلوب کی ہی حامل ہیں جن کی اکثریت مسیحی تحریروں کے تعاقب پر مبنی ہیں۔ ذیل میں تقسیم ہند سے قبل کے تمام مسلم لٹریچر کا احاطہ تو نہیں، لیکن مسلم علماء کی معروف کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سید مولانا آل حسن موہانی کتاب الاستفسار

مطبع رضوی، دہلی بار اول ۱۸۴۳ء / ۱۲۸۷ھ

صفحات: ۸۰۰

اشاعت نو: دارالمعارف، اردو بازار لاہور، ۱۴۱۲ھ *

صفحات: ۵۹۶

برصغیر میں کتب ردنصاری میں زمانی تقدم کی حامل یہ کتاب پادری اسمتھ صاحب کی تصنیف "دین حق" اور پادری فینڈر کی کتاب "میزان الحق" کے جواب میں دلائل وبرہان کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ اس میں مقدمہ کے علاوہ مولانا صاحب نے پادری صاحبان کے دلائل کے رد کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے تثلیث، صداقت وثقاہت و استناد بائبل، مسئلہ نسخ، معجزات نبوت اور شرف ملت اسلامیہ جیسے مضامین پر اٹھارہ علمی و عقلی اعتراضات وارد کیے جو کہ مسیحی مبلغین کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

---

* اشاعت نو کو زیر تبصرہ رکھا گیا ہے۔

١ تثلیث کا مسئلہ برہان عقلی سے باطل ہے۔ ص ۱۹۳ ۔ ۱۹۵

۲ تثلیث کے حق میں مسیحیوں کے پیش کردہ دلائل کمزور ہیں۔ ص ۱۹۵ ۔ ۱۹۷

۳ حضرت عیسیٰ کے ارشادات سے تثلیث غلط اور صرف توحید ثابت ہوتی ہے۔ ص ۱۹۸ ۔ ۲۱۱

۴ حضرت عیسیٰ کا خدائے مجسم ہونا اور بندوں کی نجات کے لیے ملعون ہو کر تین دن تک دوزخ میں رہنا عقلاً باطل ہے۔ ص ۲۱۱

۵ کتاب موسیٰ علیہ السلام میں کلام بشر خدا کے کلام سے مخلوط ہو گیا ہے۔ ص ۲۱۱ ۔ ۲۱۵

۶ خدائی کلام میں انسانی کلام کے ملنے سے کلام الٰہی کا اعتبار ساقط ہو جاتا ہے۔ ص ۲۱۵ ۔ ۲۱۷

۷ توریت کی بعض روایتیں پوری شریعت اسرائیلیہ کو بے اثر کر دیتی ہیں۔ ص ۲۱۷ ۔ ۲۱۸

۸ توریت کے بعض احکام ابدی قرار دیے گئے مگر شریعت عیسوی میں بدل گئے۔ ص ۲۱۹ ۔ ۲۲۲

۹ انبیائے بنی اسرائیل، حواریان عیسیٰ اور علمائے بائبل کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ بائبل میں تحریف ہوئی ہے۔ ص ۲۲۲ ۔ ۲۳۵

۱۰ تراجم بائبل میں ہمیشہ اعلام، مفردات، اور جملوں میں کمی و بیشی، تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ ص ۲۳۶ ۔ ۲۵۲

۱۱ اناجیل کی تالیف ایسی ہے جیسی ہمارے ہاں شواہد النبوت ہے جو قرآن کی طرح جمع نہیں ہوئے۔ بائبل کی روایات کی اسناد کا پتہ نہیں چلتا اور روایتوں میں بھی اختلاف بھی ہے۔ ص ۲۵۲ ۔ ۲۷۲

۱۲ بائبل کے حصوں کی کسی عالم کے پاس سند نہیں۔ مثلاً توریت کی عزرانبی کے عہد سے بطلیموس کے عہد تک اور عہد جدید کی حواریوں کے عہد سے قسطنطین اول کے زمانے تک کی سندیں کسی کے پاس نہیں ہیں۔ ص ۲۷۲ ۔ ۲۸۲

۱۳ بائبل کی پیشین گوئیوں پر وہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں جو عموماً مسیحی مبشر نبی اکرم ﷺ کے معجزات پر کرتے ہیں۔ ص ۲۸۱ ۔ ۲۸۸

۱۴ سچے مسیح اور جھوٹے مسیح اور بڑے بڑے معجزوں کے دکھلانے والے میں کیا فرق ہے۔ ص ۲۸۸ ۔ ۲۹۱

۱۵ ضابطہ عقلیہ کی رو سے سوائے نبی اکرمؐ کے کسی اور پیغمبر کے معجزات ثابت نہیں۔ ص ۲۹۱ ۔ ۳۲۳

۱۶ تحریف کے باوجود توریت اور انجیل میں حضرت نبی اکرم ﷺ کی بشارتیں جس صراحت سے ہیں توریت میں اتنی صراحت سے حضرت عیسیٰ کی خبر نہیں۔ ص ۳۲۳ ۔ ۳۹۷

۱۷ مسیحی مبشرین جو اعتراضات حضرت نبی اکرم ﷺ پر کرتے ہیں وہی حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر وارد ہوتے ہیں۔ ص ۳۹۷۔ ۵۷۹

۱۸ جو عزت نبوت کے ساتھ ملت اسلامیہ کے لیے ہے وہ کسی اور ملت کے لیے نہیں۔ ص ۵۷۹۔ ۵۹۶[1]۔

مولانا کا اسلوب دیگر کتب سے اس لحاظ سے منفرد و یکتا ہے کہ وہ استفسار کی ایسی صورت اپناتے ہیں کہ مقابل مجیب کو ان کے جواب میں اپنے اعتراضات سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

سترھویں استفسار میں پادری فینڈر کی میزان الحق کے پہلے اور تیسرے باب میں واردہ بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بارے اٹھائے گئے اعتراضات کا بھی رد کیا گیا ہے۔ مثلاً فرشتوں کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنا[2]، نساء کم حرث لکم ۔۔۔[3]، سبحان الذی اسری بعبدہ[4]۔۔۔، قطبین پر رہنے والے نماز پنجگانہ اور روزوں کے قرآنی حکم پر کیسے عمل کریں[5]، حتی اذا بلغ مغرب الشمس ۔۔۔[6]، قیامت کے دن کے بارے قرآنی بیان میں تضاد ہے۔ کسی جگہ ہزار برس کے برابر اور کہیں پچاس ہزار سال کے برابر بتلایا گیا ہے[7]۔ فاخرجناهم من جنات ۔۔۔[8]، واذ قال موسیٰ لقومہ ۔۔۔[9]، وقالت الیہود عزیر ابن اللہ ۔۔۔[10]، انکم وما تعبدون من دون اللہ ۔۔۔[11]، والذین اتیناھم

---

1 استفسارات کی لفظی عبارت یہ نہیں ہے۔ یہ طویل عبارات میں پوچھے گئے ہیں، ملاحظہ ہو: موہانی، آل حسن، سید، کتاب الاستفسار، (مطبع رضویہ، دہلی، ۱۸۴۳ء)، ص، متعلقہ استفسارات

2 موہانی، کتاب الاستفسار، (دارالمعارف، اردو بازار لاہور، ۱۴۱۲ھ) ص ۵۰۸

3 ایضاً، ص ۵۰۸

4 ایضاً، ص ۵۱۴

5 ایضاً، ص ۵۲۴۔ ۵۲۵

6 ایضاً، ص ۵۳۵

7 ایضاً، ص ۵۴۲۔ ۵۴۳

8 ایضاً، ص ۵۴۸

9 ایضاً، ص ۵۵۰

10 ایضاً، ص ۵۵۱

11 ایضاً، ص ۵۵۳

الکتاب یعلمون ۔۔۔۔[1] نیز جہاد، نسخ اور معجزات نبوی کے بارے قرآنی آیات وغیرہ پر کردہ اعتراضات کا

مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اور نقلی، عقلی، تاریخی اور الزامی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

مولانا صاحب کی اس کاوش کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں بائبل ثانی کا درجہ رکھنے والی" میزان الحق " کے مصنف کو "استفسار" میں اٹھائے گئے نکات کی بنیاد پر اس میں تبدیلیاں لانا پڑیں۔ پادری فینڈر صاحب نے اندازہ لگا لیا کہ ان کی کتاب "میزان الحق" میں کچھ بنیادی خامیاں ہیں اور انہوں نے اس کی بعض عبارتوں کو حذف کر کے آگرہ سے فارسی میں ۱۸۴۹ء میں نیا ایڈیشن شائع کیا"[2]۔

میزان الحق کی یہ ترامیم اثرات کے لحاظ سے اتنی اہم تھیں کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی صاحب کو قارئین کو باقاعدہ متنبہ کرنا پڑا کہ

> " اس کتاب(میزان الحق کا نیا ایڈیشن)میں بعض مقامات پر نقل اصل کے مطابق نہیں ہے ۔ جو شخص اس ترمیم و اضافہ سے واقف نہیں وہ یہ سمجھے گا کہ تردید اور نقل کرنے والوں نے عبارت کے نقل کرنے میں غلطی کی ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تردید کرنے والوں نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ صحیح اور درست ہیں۔ البتہ میزان الحق کے مصنف نے ان عبارتوں کو نئے ایڈیشن میں یکسر تبدیل کر دیا ہے جن کے جوابات علماء نے دے دیئے تھے۔ جب پادری فنڈر کو اپنے دلائل کے بودے پن کا احساس ہوا تو اس نے ان عبارتوں کو اس طرح حذف کیا کہ پتہ نہ چل سکے کہ کون سی عبارت کس ایڈیشن میں تھی۔ نئے ایڈیشن میں پرنٹ لائن اور سن طباعت بھی نہیں[3]"۔

مولانا کیرانوی نے میزان الحق کے سابقہ اور جدید اشاعتوں کے موازنہ پر بزبان اردو "معدل اعوجاج المیزان" نامی رسالہ مرتب کیا جو زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ مسیحی رسالہ "نور افشاں" نمبر ۳۰ جلد ۱۲ مطبوعہ ۲۴ جولائی ۱۸۸۴ء میں پادری صفدر علی کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ اس کے پاس تھا[4]۔

مولانا کیرانوی نے بھی کتاب استفسار سے بہت استفادہ کیا اور اسے اپنی تصنیف "ازالۃ الاوہام" (سید المطابع، شاہجہان آباد۔ دہلی ۱۸۵۲ء) کے حاشیہ پر شائع کروایا۔

---

1 موہانی، کتاب الاستفسار، ص ۵۵۳

2 ظفر، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے معاصرین، ص ۱۶۴

3 ایضاً، ص ۱۶۴

4 ایضاً، ص ۲۲۷۔ ۲۲۸ (مولانا امداد صابری اسے "میزان الحق" کا جواب بتلاتے ہیں۔ فرنگیوں کا جال، ص ۳۴۲؛ آثار رحمت، ص ۳۸۴)

مولانا ابراہیم سیالکوٹی   اعجاز القرآن بجواب تنویر الاذہان

اندر پریس، سیالکوٹ ۱۹۰۸ء،

صفحات: ۱۳۶

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں قرآن کریم پر قصداً کئی جہت سے نقد کرتے ہوئے اس میں تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ اس کی الہامی حیثیت کی نفی کی جائے۔ اس ضمن میں بدیسی مشنریوں کے کام کو مقامی پادریوں نے خاصے جارحانہ انداز میں آگے بڑھایا۔ (جیسے پادری عماد الدین کہ رابرٹ کلارک کے پڑھائے سبق کو اشتعال انگیز انداز میں پیش کرتے تھے۔) فکری لحاظ سے مستشرقین کی خوشہ چینی کے اندر ہی محصور ان کی کاوشوں میں انداز تخاطب متانت و شائستگی کے تقاضوں سے ہٹا ہوا تھا۔ اس بات کا خاص التزام رکھا گیا کہ مسلم فریق کو ہر لحاظ سے اشتعال دلایا جائے۔ پادری احمد شاہ، پادری عماد الدین، پادری ٹھاکر داس، ماسٹر رام چندر وغیرہ کی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت کم تحریریں ایسی بھی تھیں جو اس روش سے ہٹ کر لکھی گئیں۔ اعجاز القرآن کے موضوع پر تنقیدی تحریر "تنویر الاذہان فی فصاحت القرآن" از اکبر مسیح کو اس زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سنجیدہ مسیحی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ علمی حوالے سے قطع نظر، اس کا اسلوب، قدرے شستہ اور متانت کا آئینہ دار تھا۔ "اعجاز القرآن بجواب تنویر الاذہان" از مولانا ابراہیم سیالکوٹی اس کتاب کا جواب ہے۔ اہل حدیث مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے مولانا ابراہیم سیالکوٹی اپنے دور کے متبحر عالم اور پختہ فکر کے حامل مناظر تھے۔

کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مولانا نظریہ فصاحت قرآن پر ٹھوس علمی دلائل دیتے ہیں اور اس میں فصاحت کی لغوی بحث کے ساتھ ساتھ نقلی و عقلی لحاظ سے محاسن لغت، غرابت کلام، مفصل، بلاغت ادب، علم بدیع و علم معانی اور علم بیان پر ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے[1]۔

باب اول میں اکبر مسیح صاحب کے قائم کردہ عنوان "آیا انسان کی زبان محل اعجاز ہو سکتی ہے" پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی علمی خامیوں کو عمدہ پیرائے میں واضح کیا ہے[2]۔

دوسرا باب جو کہ ایک مختصر تحریر "کوئی کلام خدا کا کلام کس معنی میں کہا جا سکتا ہے" کے عنوان پر ہے۔ جس میں قرآن کا تقابل توریت و انجیل سے بلحاظ نزول کے ہے[3]۔

---

1 سیالکوٹی، ابراہیم، مولانا، اعجاز القرآن بجواب تنویر الاذہان، (اندر پریس، سیالکوٹ ۱۹۰۸ء)، ص ۲-۲۹

2 ایضاً، ۲۹-۷۹

3 ایضاً

باب سوم میں کلام الٰہی کے فصاحت وبلاغت کے عنوان کو زیر بحث لاتے ہوئے معترض کا تعاقب کیا گیا ہے[1]۔
مولانا مسیحی منادین کی قرآن پر حملہ آوری کی وجہ، قرآن کریم کا قیامت تک محفوظ رہنے کا دعویٰ اور اس کی مثل ہر زمانے میں لانا طاقت بشری سے خارج بتلاتے ہیں۔ مولانا کے بقول؛

"اس کے بر خلاف عیسائیوں کی کتب مذہبی کیا نئی کیا پرانی سب ان ہر دو دعووں سے ساقط اور ان کے اپنے آپ میں ثابت کرنے سے عاجز ہیں بلکہ ان کی رو سے باطل ہیں۔ پس عیسائیوں کو قرآن کے یہ دعوے ان گہرے زخموں سے ہرگز کم نہیں ہیں جو تیروں، تلواروں اور نیزوں سے لگے ہوں اور مسلمانوں کا ان کی کتابوں کو آئینہ کی طرح ان کے سامنے پیش کر کے ان کا ناقابل اعتبار اور قابل ترک ہونا ثابت کرتے رہنا اس نمک پاشی سے کم نہیں جو ننے سوجے زخموں پر کیجائے۔۔۔ اس لئے وہ اپنے اضطراب کو رفع کرنے کے لئے شب و روز اس سعی میں لگے رہتے ہیں اور اپنی ہمت کو اسی میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے پیدا ہونے کی غایت اسی میں سمجھتے ہیں کہ کسی طرح قرآن شریف کو اس کے کمال سے گرا دیکھ کر (دل میں بھڑکی) اپنی آگ کو بجھائیں[2]"

فصاحت قرآن پر قلم اٹھاتے ہوئے مسیحی معترض انسانی زبان کو خیالات کے مکمل اظہار میں ناقص گردانتے ہوئے عربی زبان پر معترض ہوئے ہیں کہ یہ کلام الٰہی کے مکمل اظہار پر قادر نہیں۔ مولانا صاحب نے بسیط بحث کرتے ہوئے اس نظریہ کی خامیوں کو اجاگر اور پھر اس کا مفصل رد کیا ہے۔ عربی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے معترض نے ایک چوٹ یہ بھی کی کہ " نہ صرف عربی زبان بلکہ سامی زبانوں میں سے کوئی ایک بھی یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ عالمگیر زبان یا انسان کے کسی بڑے طبقے کی زبان بن سکے "[3] مولانا نے اسے موصوف کا محض تعصب اور واقعات سے اعراض گردانا ہے۔ انہوں نے ہر اعتراض کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس انداز میں جواب دیا ہے کہ سلطان القلم سے ملقب معترض کی علمی استعداد پر سوالیہ نشان لگا دیا[4]۔

مولانا معترض کی ایک غلط فہمی کو یوں سامنے لائے ہیں؛

" مسٹر اکبر مسیح کو قرآن کی ایک آیت کے سمجھنے میں بہت دھوکا لگا ہے اور اس غلط فہمی سے وہ کہیں کے کہیں جا پڑے ہیں کہ کلام خالق کو کلام مخلوق بنا دیا ہے۔ چنانچہ وہ باب دوم میں فرماتے ہیں' قرآن کی تعلیم کے موافق صرف مضامین یعنی معنی الٰہی ہیں اور الفاظ وعبارت غیر اللہ کی ایجاد خواہ وہ جبرئیل ہوں یا نبی حتی کہ صاف الفاظ میں لکھ دیا، انه لقول رسول کریم وما هو بقول شاعر قلیلا ما تذکرون اس آیت میں مسٹر اکبر مسیح نے لفظ قول کو دیکھا لیکن

---

1 سیالکوٹی، اعجاز القرآن بجواب تنویر الاذہان، ۸۰۔ ۸۳
2 ایضاً، ص ۱۰۔ ۱۱
3 ایضاً، ص ۴۰
4 ایضاً، ص ۲۹۔ ۴۷

رسول کی طرف نظر و توجہ نہیں کی۔ حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء"[1]۔

اس کے بعد تقریباً دس صفحات پر محیط بحث میں قرآنی آیات اور احادیث سے استشہاد کرتے ہوئے لفظ قول، اور کلام کا جامع مفہوم بیان کیا ہے اور "قول رسول" کے معنی نہ سمجھنے پر مسیحی مصنف کی غلطی آشکار کی ہے۔اس بحث کو سمیٹے ہوئے فرماتے ہیں؛

" اگر مسٹر اکبر مسیح کے خیال کے مطابق قرآن شریف کے الفاظ کی ساخت ملکہ نبوت کے اسغا ث سے ہوتی تو وہ تو اندرونی کیفیت ہے اس کے لیے خارج سے فرشتہ کی تعلیم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔اور جب معلوم ہو گیا کہ باہر سے کوئی اور یعنی فرشتہ بحکم خدا آپ کو تعلیم کرتا ہے تو ثابت ہو گیا کہ الفاظ قرآن آنحضرت کے اپنے نہیں ہیں بلکہ حضرت جبرئیل کے واسطے سے خدا تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت پر نازل کیے گئے ہیں اور بالمشافہ تعلیم کیے گئے "[2]۔

مولانا کی تحریر پختہ، ٹھوس اور علمی اسلوب کی حامل ہے۔آپ نے تحقیقی اسلوب اختیار کرتے ہوئے اعتراضات کا جائزہ لیا اور مدلل انداز میں انہیں رفع کیا۔ آپ ایک ماہر لسانیات اور عالم لغت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔مولانا موقع محل کے عین مطابق اعتراضات کا مختلف جہتوں سے جواب دیتے ہیں اور کلام عرب سے اس پر استشہاد لاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی جاہلی اور جدید عربی ادب پر گہری نظر ہے۔سیاسی مغلوبیت کے نتیجہ میں بعض مسلم مصنفین مصلحت کوشی سے کام لیتے تھے۔لیکن مولانا نے کسی جگہ بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس کا بھرپور انداز میں یوں جواب دیا ہے کہ قاری مسیحی مصنف کی پیدا کی گئی تشکیک کے ہر پہلو سے واقفیت اور جواب سے کامل اطمینان حاصل کر لیتا ہے۔مولانا مرحوم کی یہ کاوش اپنے موضوع کے اعتبار سے محض ایک کتاب کا جواب ہی نہیں،اپنے مباحث کے لحاظ سے بذاتہ مستقل تصنیف ہے۔

سر سید احمد خاں تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام

غازی پور ۱۸۶۲ء / ۱۲۷۸ھ

صفحات: حصہ اول ۲۶۸ ، حصہ دوم ۳۶۸ ، حصہ سوم ۱۲۹

برصغیر میں مسیحی اہل قلم کی قرآن کے ترجمہ و تفسیر کی بعض کاوشیں منظر عام پر آئیں ہیں لیکن اس کے مقابل یہاں مسلم علماء نے مروجہ بائبل کی تفسیر کو عمومی طور پر درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ اس حوالے سے معدودچند کاوشیں ہی سامنے آئیں، شاید اس کا سبب مسلم دعویٰ تحریف بائبل تھا۔ مرزا موحد جالندھری نے "مکاشفات یوحنا" کی

1 سیالکوٹی، اعجاز القرآن بجواب تنویر الاذہان، ص۶۹۔۷۰

2 ایضاً، ص۷۹

تفسیر "رسالہ بر تیغ قضا" کے نام سے لکھی، جو مطبع بحر الاسلام، بنگلور میں منشور محمدی کے ساتھ ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوئی۔ نیز "مرآۃ الاناجیل" از مولوی تفضل حسین معین الواعظین انجیل متی کی ناقدانہ تفسیر ہے۔ یہ مطبع سبحانی، کلکتہ سے ۱۲۸ صفحات پر ۱۳۰۳ھ میں شائع ہوئی[1]۔ کلیسیا کے نزدیک غیر مستند انجیل برنباس کا اردو ترجمہ از محمد حلیم انصاری مسلمانوں کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث بنا[2]۔ لیکن سب سے نمایاں اور اہم کام سر سید کی زیر تبصرہ بائبل کی جزوی تفسیر ہے۔

معروف مستشرق گارساں دتاسی سر سید کی اس تفسیر پر لکھتا ہے؛

" مصنف ایک مسلمان ہے اور قرآئن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسیحی اور اسلام میں میل پیدا کرے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ غالباً اس کے ہم مذہب لوگ اس کی رواداری کی باتوں کو بری نظر سے دیکھیں گے اور دوسری جانب عیسائی لوگ غالباً کبھی اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ قرآن بھی ایک آسانی کتاب ہے۔ مسلمان کفر کے فتویٰ دیں گے اور عیسائی مصنفین سید احمد کے علمی اور صلح پسندانہ خیالات کے ساتھ اتفاق کرنے سے انکار کریں گے "[3]۔

حصہ اول ۲۶۸ صفحات + تاریخ بائبل پر ۲۷ صفحات کا پہلا تتمہ اور ۲۶ صفحات پر مشتمل دوسرا تتمہ ہے، جو ہجری اور عیسوی تقویم پر محتوی ہے۔ حصہ اول ۱۰ مقامات پر مشتمل ہے جس میں ضرورت انبیاء، وحی، الہامی کتب، تعارف بائبل، تحریف، ترجمہ اور ناسخ و منسوخ پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔

سر سید بائبل میں تحریف معنوی کے قائل ہیں۔ " مسلمانوں کے مذہب میں کتب مقدسہ کی تحریف کا کیا مسئلہ ہے " کے عنوان کے تحت تحریف، مفہوم، تحریف کی آٹھ اقسام، اور بائبل میں تحریف پر علمی بحث کی ہے۔ اس ضمن میں مسلم دعوٰی تحریف بائبل لفظی و معنوی سے اختلاف کرتے ہوئے قرآنی آیات کی توضیح اور تفسیر کبیر لرازی اور مسیحی تحریروں سے استشہاد و استدلال کیا ہے۔ اور تحریف لفظی کی بجائے تحریف معنوی کے حق میں دلائل دیے ہیں۔ تحریف لفظی کا صدور دبے لفظوں میں عام مسیحیوں اور زیادہ تر غیر مقبول مسیحی فرقوں میں گردانتے ہیں۔

" میں یہ نہیں کہتا کہ جو عیسائی اپنے مذہب پر پکے تھے انہوں نے اس قسم کی جھوٹی کتابیں بنائی تھیں بلکہ غالباً وہ کتابیں بہت سے ناستک کے فرقہ سے نکلی تھیں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو عیسائی اپنے مذہب کے پابند تھے وہ

---

1 ماہنامہ، محدث، بنارس، ج ۲۵، ش ۹۔ ۱۰، ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۰۷، (محمد مستقیم سلفی، رد عیسائیت میں علمائے ہند کی تصنیفی خدمات) ص ۵۹

2 انصاری، محمد حلیم، انجیل برنباس کا اردو ترجمہ، (لاہور ۱۹۱۶ء)، صفحات: ۳۶۹

3 سر سید احمد خاں، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام، (مکتبہ اخوت، لاہور س ن)، حرف اول

اس خطاء سے بالکل آزاد نہ تھے "[1]۔

حصہ دوم عہد عتیق کی کتاب پیدائش کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تمہید اور گیارہ ابواب پر مشتمل اس حصہ میں ایک کالم میں توریت کی عبرانی عبارت نیچے اردو ترجمہ، اکثر دوسرے کالم میں اس کے مطابقت والی قرآنی آیات متن بمعہ ترجمہ یا احادیث مبارکہ لکھتے ہیں۔ جب کہ اس کے نیچے لائین کھینچ کر یہی انگریزی میں لکھتے ہیں۔ بعد ازاں ایک کالم میں اردو، دوسرے میں بزبان انگریزی اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ جس میں یہودی مفسرین کی آراء، قرآنی بیانات اور احادیث مبارکہ سے استدلال کرتے ہیں اور اس میں توریت اور قرآنی بیانات کی تطبیق وتائید کی سوچ غالب ہے۔

حصہ سوم انجیل متی کے باب اول تا باب پنجم کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تمہیداً "مختصر تاریخ عیسائی مذہب مسلمانوں کے مذہب کے نکلنے تک" بیان کی گئی ہے۔ اس میں مختلف مسیحی فرق اور ان کے عقائد خصوصاً کلیسیا سے ان کا اختلاف واضح کیا گیا ہے، جو زیادہ تر مسئلہ تثلیث میں ہی ہے[2]۔

تفسیر میں، اگر ممکن ہو تو، پہلے عہد عتیق کے متعلقہ بیان لاتے ہیں پھر انجیل کے بیان کے متعلق اگر قرآنی آیات ہو تو نقل کرتے ہوئے ان کے مطابق تشریح کرتے ہیں۔ مثلاً متی ۱: ۱۸ (یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب اس کی (ماں) مریم یوسف سے منسوب ہوئی اس سے قبل کہ وہ ہم بستر ہو وہ روح قدس سے حاملہ پائی گئی) کی تفسیر کرتے ہیں:

> "کتاب استثناء[3] سے پایا جاتا ہے کہ یہودیوں میں رسم پائی جاتی تھی کہ پہلے منگنی کیا کرتے تھے کسی عورت بنی اسرائیل کی شادی نہ ہوتی تھی جب تک کہ چند روز پیشتر اقرار منگنی کا نہ ہو لیتا تھا اسی رسم کی موافق حضرت مریم کی منگنی یوسف سے ہوئی تھی۔ اگرچہ ہماری کتابوں میں اس منگنی کا ہونا نہ ہونا کچھ مذکور نہیں مگر یہ بات قرآن مجید میں تصریح ثابت ہے کہ جب حضرت مریم کو روح القدس سے بشارت ہوئی وہ مرد سے واقف نہ تھیں اور کسی مرد نے حضرت مریم کو چھوا نہیں تھا۔ سورۃ آل عمران قَالَتۡ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٞ وَلَمۡ يَمۡسَسۡنِي بَشَرٞ "[4]

عموماً قرآن اور انجیلی بیان کی تطبیقی سوچ کے ساتھ تفسیر کرتے ہیں لیکن اگر کسی مسیحی عقیدہ کی نفی یا اس پر کوئی نقد کرتے ہیں تو قرآنی بیان اور مسلم عقیدہ کے مطابق کرتے ہیں۔

> "عیسائیوں کے بعض فرقوں نے حضرت مریم کو بھی خدا سمجھا اور ان کی پرستش کی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس بات پر بڑا الزام دیا ہے اور بعض عیسائی فرقوں نے حضرت مریم کی کچھ بزرگی نہیں سمجھی اور کہا کہ صدف میں سے موتی نکلتا ہے مگر صدف کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔ ان دونوں فرقوں نے حضرت مریم کی نسبت افراط و تفریط کی

---

1 سرسید، تبیین الکلام، حصہ اول، ص ۹۳

2 ایضاً، حصہ سوم، ص ۲۔۱۵

3 استثناء، ۲۰ : ۷

4 سرسید، تبیین الکلام، حصہ سوم، ص ۳۷

ہے ہم مسلمان اپنے مذہب بموجب حضرت مریم کو بہت بڑا بزرگ اور مقدس اور خدا تعالیٰ کا برگزیدہ اور سارے جہان کی عورتوں سے پاک اور بڑا سمجھتے ہیں مگر خدا نہیں جانتے اور نہ ان کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خبر دی ہے کہ اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا اور پسند کیا تجھ کو سب جہانوں کی عورتوں پر۔ سورۃ آل عمران وَإِذْ قَالَتِ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰكِ وَطَهَّرَكِ وَٱصْطَفَىٰكِ عَلَىٰ نِسَآءِ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝"[1]

قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ قدماء مفسرین کی آراء، احادیث مبارکہ اور مسلم آراء سے بھی استناد کرتے ہیں۔ مثلاً متی ۱: ۲۸۔ ۳۰ (تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے یوں کہا گیا تھا کہ زنا نہ کر پر میں کہتا ہوں۔۔۔ تیرا تمام بدن جہنم میں ڈالا جائے) کی تفسیر میں تفسیر کبیر رازی، احادیث مبارکہ، غزالی کی احیائے العلوم سے تشریح کرتے ہوئے انجیلی بیان کے تائیدی شواہد پیش کیے ہیں[2]۔

تبیین الکلام کے لیے سرسید نے ایک انگریزی داں مترجم، ایک عربی داں عالم، اور سالم نام کا ایک یہودی نوکر کی خدمات حاصل کیں۔ نیز عبرانی کے لیے مولوی عنایت رسول چریا کوٹی نے معاونت کی۔ عبرانی، انگریزی، عربی اور اردو حروف کی بیک وقت ٹائپ مشکل تھی، اس کے لیے رڑکی سے کئی ہزار کا پریس منگوایا[3]۔

سرسید کا دور برصغیر میں مشنری سرگرمیوں اور مسلم بحث مباحثے کے حوالے سے مسلم مسیحی مناظراتی دور کا عہد شباب تھا۔ جس میں طرفین کی تغلیط و تکفیر ہی نظر آتی ہے۔ لیکن سرسید کے فکر و شعور کا محور یہ تھا کہ حق تمام الہامی مذاہب میں دائر ہے۔ وہ اسلام اور دیگر الہامی مذاہب بالخصوص عیسائی اور یہودیوں کے درمیان توافق و اتحاد کی تلاش و اثبات کے داعی تھے۔ انہوں نے اس تفسیر میں خصوصاً مسلم اور مسیحی عقائد کی مماثلت دکھاتے ہوئے ان کی فکری قربت اور مذہبی ہم آہنگی کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ بائبل کے بیانات کا تقابلی مطالعہ میں قرآن وحدیث کے شواہد پیش کر کے ان الہامی کتب کے فکری سوتوں کی وحدت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی[4]۔ سرسید تبیین الکلام کے بارے جان آرنلڈ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لیے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ

---

1 سرسید، تبیین الکلام، حصہ سوم، ص ۳۸

2 ایضاً، ص ۱۱۵۔ ۱۲۲

3 حالی، الطاف حسین، مولانا، حیات جاوید (بل ٹاک، لاہور ۲۰۰۷ء)، ص ۱۶۸

4 صدیقی، یسین مظہر، ڈاکٹر، سرسید اور علوم اسلامیہ، (ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۰۱ء)، ص ۱۸۰

میں کسی گروہ کے خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں، میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں"[1]۔

بقول ڈاکٹر مظہر یسین صدیقی صاحب " تبیین الکلام نے اردو میں مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ کی بنیاد ڈالی ہے"[2]

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں تبیین الکلام کے اسلوب پر کوئی تفسیر نہیں۔ پادری جے علی بخش کی جزوی تفسیر قرآن کو اس صف میں شمار کیا جاسکتا ہے جس میں قرآن کو بائبل کا چربہ دکھلانا مقصود تھا۔ مطالعہ مذاہب کے طالب علموں کے لیے مسیحی عہد جدید کی مسلم تفسیر اور قرآن کی مسیحی تفسیر دونوں یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

سرسید احمد خان الخطبات الاحمدیۃ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ

مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۱۴ء

صفحات: ۴۴۸

برصغیر کے بدیسی مسیحی اہل قلم میں ایک نمایاں نام ولیم میور (مسیحی مناد جو یہاں صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر ٹھہرے) کا ہے۔ جن کی وجہ شہرت پادری فانڈر کی فہمائش پر ان کی چار جلدوں میں لکھی گئی تصنیف Life of Mohammad ہے[3]۔ اس کتاب نے برصغیر میں بعد میں لکھے گئے سیرتی ادب پر خصوصاً، جب کہ مسلم مسیحی مناظراتی ادب پر عمومی لحاظ سے گہرے اثرات مرتب کیے۔ (برصغیر کے مسلم دینی ادب پر اس کے سلبی و ایجابی اثرات کا جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا۔ علمی حوالے سے اس کے نتائج بہت اہم ہوں گے) سیرت رسول پر استشراقی نقطہ نظر سے لکھی گئی اس کتاب میں قرآن کے بارے بعض مثبت آراء کے ساتھ ساتھ "مفہوم مخالف" اسلوب میں شکوک و شبہات اور غلط بیانی بھی شامل ہے۔

سیرت رسول ﷺ کو داغدار انداز میں پیش کرنے کی انگریز حاکم کی اس کاوش کا جواب سرسید احمد خاں نے خطبات احمدیہ کی شکل میں دیا۔ الطاف حسین حالی سرسید کا ردعمل یوں بیان کرتے ہیں؛

"جب سرولیم میور کی کتاب" لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و

---

1 حالی، حیات جاوید، ص ۱۷۳

2 صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، ص ۹

3 مطبوعہ ۱۸۶۱، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۶ جب کہ تیسرا ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔

خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔۔۔ وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو بیٹھتے تھے اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔۔۔ (سر سید) ایک خط میں لکھتے ہیں: " ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کی سیر میں، جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے "[1]۔

اس بارے وہ اتنے پرجوش تھے کہ انہوں نے قرض اٹھا کر دیار انگلستان میں بیٹھ کر یہ جواب لکھا۔ وہ اسے اپنی زندگی کا ماحاصل قرار دیتے ہیں اور اس خاطر لندن آنے کو اپنے لیے دس حج کے برابر گردانا ہے[2]۔ آپ ایک سال پانچ ماہ (اپریل ۱۸۶۹ء تا ستمبر ۱۸۷۰ء) لندن میں قیام پذیر رہے[3]۔ جس دوران چار جلد پر مشتمل ولیم میور کی کتاب کا مکمل نہیں بلکہ صرف ایک جلد کا ہی جواب لکھا گیا۔ (ابنائے اسلام پر یہ قرض ابھی فرض ہے۔)

سر سید کا یہ جواب پہلے لندن سے ۱۸۷۰ء میں A Series of Essays on the Life of Muhammad کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ضروری اضافوں کے ساتھ بزبان اردو ۱۸۸۷ء میں ہندوستان سے خود طبع کروائی۔

یہ کتاب بارہ خطبات پر مشتمل ہے۔ سر سید ہر خطبہ میں ایک موضوع کا چناؤ کر کے اس کے مالہ وماعلیہ پر یوں مبسوط بحث کرتے ہیں کہ اس موضوع کے بارے معترض کے بہت سے اشکالات کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ اور پھر بقدر ضرورت الزامات و اعتراضات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ جس میں مسیحی مؤرخین خصوصاً بتذکرۃ الاسم ولیم میور اور اسپرنگر کی تردید کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

بارہ خطبات پر مشتمل اس کتاب کے چھٹے اور ساتویں خطبہ میں ولیم میور کے قرآن کے بارے اعتراضات و شکوک و شبہات اور غلط آراء کی تصحیح و تردید کی ہے۔

چھٹا خطبہ جو کہ احادیث و روایات کی اصولی مباحث پر مبنی ہے اس کے اخیر میں سورۃ النجم کی ابتدائی آیات اور واقعہ غرانیق کے بارے روایات و آثار کی صحت و ثقاہت کا جائزہ لیا ہے اور سقیم روایات کو مردود ٹھہراتے ہوئے

---

1 حالی، حیات جاوید، ج ۲، ص ۶۸۔۶۹

2 " بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپہ کا پہلے کیا گیا تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہو گیا تھا، قریب چار ہزار کے خرچ ہوا جس میں سے کچھ کم سولہ سو روپیہ سر سید کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے بھیجا اور باقی روپیہ سر سید نے قرض لے کر ادا کیا"۔: " سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں: " اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا"۔ ایضاً، ج ۱، ص ۷۱

3 ایضاً، ج ۱ ص ۲۱۵

ولیم میور اور اسپر نگر کے ان روایات پر مبنی قرآن پاک پر اعتراضات کا رد کیا ہے[1]۔

ساتویں باب میں قرآن پاک کی تنزیل، کتابت، ناسخ و منسوخ اور جمع و تدوین کے بارے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے اور آخر میں سر ولیم میور اور دیگر مسیحی مؤرخین کی قرآن کی نسبت غلطیاں واضح کرتے ہوئے ان کا جواب لکھا ہے۔
مؤلف کے حمایت و دفاع قرآن کا اندازہ خطبہ کے ابتدائی الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے؛

"قرآن مجید جناب پیغمبر خدا پر حضرت موسیٰ کی طرح پتھر کی تختیوں پر کھدا ہوا نازل نہیں ہوا تھا۔ اور نہ اس بات کی ضرورت پڑی تھی کہ ان کے ٹوٹ جانے کے سبب اس کے ضائع ہونے کا خوف ہوا ہو۔ اور پھر آنحضرت (ﷺ) کے اصحاب کے لیے اس کی دوبارہ نقل پتھر کی تختیوں پر کھودنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اس کے نزول کی نسبت کوئی امر عجائبات سے بھرا ہوا نہ تھا کیونکہ محمد ﷺ کا دل سینا کا پہاڑ تھا اور مسلمانوں کے دل پتھر کی لوحیں تھیں"[2]۔

اس خطبہ کی ابتداء میں احادیث مبارکہ سے عہد رسالت میں کتابت قرآن اور اس کے محفوظ ہونے کے دلائل پیش کیے گئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا حفظ فی الصدور کی ترغیب اور صحابہ کرام کی اس بارے مساعی کا ذکر ہے[3]۔

بعد ازاں قرآن میں اختلاف قراءت کا عہد نامہ عتیق و جدید کی اختلاف قراءت کے ساتھ تقابل کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے؛

"اس بیان سے واضح ہو کہ کتب عہد عتیق اور عہد جدید پر عیسائی عالموں نے جن معنی کو اختلاف کا اطلاق کیا ہے اور جو اسباب اس کے بیان کیے ہیں اس سے وہی معنی قرآن مجید کے اختلاف قراءت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ اگر اختلاف قراءت کے وہی معنی قرار دیں جو عیسائی عالموں نے قرار دیے تو اس کا قرآن مجید کی نسبت استعمال صریح غلطی اور خطا ہے"[4]۔

ناسخ و منسوخ پر سیر حاصل مفصل بحث کرتے ہوئے اس کا صحیح مفہوم واضح کیا ہے اور نشان دہی کرتے ہیں کہ مسیحی اہل قلم نے ہمارے فقہاء کی استعمال کردہ اس اصطلاح کے صحیح اور اصلی مفہوم سے ناواقفیت کی بنا پر صریح مغالطہ کھایا ہے۔

"عیسائی عالموں نے الفاظ ناسخ و منسوخ کے معنی سمجھنے میں جن کا اطلاق علمائے اسلام نے بطور اصطلاح کے آیات قرآنی پر کیا ہے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا بیکار کر دیا ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ اسلام نے جو دینیات کے مسائل کے محقق ہیں ان معنوں سے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں مختلف قرار دیئے ہیں"[5]۔

---

1 سر سید، احمد خاں، الخطبات الاحمدیۃ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ (مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۱۴ء)، ص ۲۴۳۔۲۵۲

2 ایضاً، ص ۲۶۱

3 ایضاً، ص ۲۶۲۔۲۶۸

4 ایضاً، ص ۲۷۰۔۲۷۱

5 ایضاً، ص ۲۷۳۔۲۷۴

اور بطور مثال ولیم میور کی یہ رائے نقل کرتے ہیں؛

" سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ " اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے مگر مسلمان اس اجتماع ضدین کی تطبیق کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ تاہم باہم بمجبوری ان کو معترف ہونا پڑا ہے کہ قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں"[1]۔

(یہاں فاضل مستشرق کو تدریج اور تنسیخ کے فرق سے عدم واقفیت کی بنا پر مغالطہ لگا ہے کیونکہ قدیم مفسرین نے تدریج کے لیے تنسیخ کا لفظ معناً استعمال کیا ہے اصطلاحاً نہیں جیسا کہ معترض سمجھ بیٹھے ہیں۔)

سرسید احادیث مبارکہ سے تنسیخ پر کردہ اعتراضات کا رد کرتے ہیں۔

اسی خطبہ میں جمع و تدوین قرآن پر بحث و تمحیص میں معترضین کی آراء کا منقولی والزامی مدلل رد موجود ہے[2]۔

بعد ازاں یہ فکر پیش کی گئی ہے کہ طرز کلام میں کامل ہونا قرآن مجید کے الہامی ہونے کا ثبوت ہے اس مدلل گفتگو کے آخر میں مغربی مصنفین بشمول ولیم میور کی غلطیوں کی گرفت کرتے ہوئے ان کی سطحیت کو واضح کیا ہے۔

" منجملہ ان سینکڑوں بیہودہ باتوں کے جو عیسائی مصنفوں کی جملہ تحریروں میں اسلام کی نسبت پائی جاتی ہیں سر ولیم میور نے ایک معقول قاعدہ منصفی کا برتا ہے اور اپنے استدلات میں مسلمانوں کی دینیات سے کس قدر واقفیت ظاہر کی ہے۔ لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے بحث کے واسطے صرف ان روایتوں کو منتخب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف، سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ نا قابل اعتبار خیال کرتے ہیں۔ یا ان کے مطلب اور مقصد میں مختلف الرائے ہیں"[3]۔

ولیم میور کی قائم کردہ بعض اصطلاحات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اس کی محررہ اصطلاح " وحی کامل " اسلامی ادب میں نئی ہے، اس پر سرسید لکھتے ہیں؛

" شاید یہ آیات محکم کا ترجمہ ولیم میور نے وحی کامل کر لیا ہے لیکن آیات محکم کے معنی وہ نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے قائم کیے ہیں"[4]۔

اسی طرح جمع شدہ قرآن کیلئے میور نے مخصوص مفہوم کشید کرنے کے لیے ایک ترکیب "نیا مجموعہ " استعمال کی ہے۔ جس پر سرسید یوں اظہار کرتے ہیں؛

" ہم نہیں جانتے کہ سر ولیم میور نے لفظ 'نیا مجموعہ' کس بنا پر استعمال کیا ہے اور کس جگہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے"[5]

---

1 سرسید، الخطبات الاحمدیہ، ص ۲۷۹

2 ایضاً، ص ۲۸۲۔۲۸۶

3 ایضاً، ص ۲۹۲

4 ایضاً، ص ۲۹۳

5 ایضاً، ص ۲۹۵

اسی طرح متن قرآن میں اختلاف کے بارے ولیم میور کے گنوائے گئے اسباب کو صحت سے عاری قرار دیتے ہیں[1]۔
خطبہ کے اختتام پر آیت رجم کے بارے اپنے مؤقف کو دوٹوک مدلل پیش کرتے ہیں اور اس پر وارد ہ بعض سطحی اعتراضات، جو کہ خود مسیحیوں کے ہاں مردود ٹھہرائے گئے ہیں، کا جواب نہ دینے کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ "ہم کو مردے مارنے کی کچھ ضرورت نہیں"[2]۔

معترضین عموماً ضعیف اور متروک روایات کے سہارے اپنے اعتراضات پیش کرتے ہیں اس لیے خطبات احمدیہ لکھتے ہوئے سرسید کی اخذ روایات کے بارے سوچ کچھ یوں تھی۔

- جو جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقطع ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں ان کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کے ترتیب سے لکھا جاوے۔
- جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور ان کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے ان کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا جاوے
- اور محض جھوٹ اور افتراء و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور حمقاء کو دام تزویر میں پھنسانے والے لوگوں یا حق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بنائی ہوئی ہیں ان کو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جاوے اور ان ہی کے ساتھ غلط اور نامعتبر ہونے کا ثبوت اور ان کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جاویں"[3]۔

" ہم کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ عیسائی مصنفوں نے آنحضرتؐ پر صرف غلط اور بے جا اتہامات ہی نہیں لگائے ہیں بلکہ بدوں کسی وجہ کے اپنے دل میں یہ سمجھ کر خوش ہوئے ہیں کہ ہمارے پیغمبر کے نام پر انہوں نے دھبہ ثابت کیا ہے، کچھ بھی تعجب اور ملال نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ بے اصل بات کچھ بھی تعجب و ملال کے لائق نہیں ہوتی"[4]۔

اس مسکت جواب کی وقعت کا اندازہ ولیم میور کے خطبات احمدیہ پر اس تبصرہ سے ہوتا ہے؛

"میں نے سرسید کے اسلام پر اعتراض نہیں کیے، بلکہ اس اسلام پر اعتراض کیے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آتے ہیں"[5]۔

سرسید سے پہلے کسی مسلمان مصنف نے عیسائیوں کے اعتراضات کے ایسے مدلل اور محققانہ جواب پر کوئی مضمون یا کتاب خود عیسائیوں کے مرکز میں بیٹھ کر انہی کے کتب خانوں سے اخذ و انتخاب کر کے ان کی ہی زبان میں آج تک نہیں لکھی تھی۔

ایک جرمن پادری فانڈر کی لکھوائی اور ایک انگریز مستشرق William Muir کی لکھی Life of Mohammad

---

1 سرسید، الخطبات الاحمدیہ، ص ۲۹۶

2 ایضاً، ص ۳۰۵

3 ایضاً، ص ۱۵

4 ایضاً، ص ۲۴۳

5 ایضاً، ص ۲۱

ہوئی ہے۔ سرسید نے اس کا جواب دیتے وقت نہایت اعتدال اور شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ کوئی سخت لفظ انہوں نے سر ولیم میور کے خلاف استعمال نہیں کیا، نہ ان پادریوں کو برا بھلا کہا ہے جنہوں نے آنحضور ﷺ کے متعلق کذب بیانوں کا ایک طوفان عظیم کھڑا کر رکھا ہے۔ اپنے خطبات میں جو بات بھی سرسید نے بیان کی ہے بڑی متانت اور سنجیدگی سے بیان کی ہے اور کتاب میں اس دور کے مناظرانہ رنگ کو بالکل دخل نہیں دیا۔ سرسید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مؤرخین کے اعتراضات کا جواب دیتے وقت مناظرانہ، معاندانہ یا مخاصمانہ انداز اپنانے کی بجائے انتہائی شائستہ اور سنجیدہ لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔

اس کتاب کا طرز استدلال نہایت محققانہ اور عالمانہ ہے اور اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے افضل اور بہتر ہے۔ جس مسئلہ پر بھی قلم اٹھایا ہے اس پر نہایت سیر حاصل اور قابل اطمینان طور پر بحث کی ہے اور کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ جذبات کی رو میں منصف کا قلم جادہ اعتدال سے کبھی بھی باہر نہیں ہوا۔

اس قسم کی تحریروں اور کتابوں اور مقالوں میں عام طور سے خصم (مخالف) کو الزامی جواب دے کر مرعوب یا خاموش ہو جانے پر مجبور کیا جاتا ہے، مگر سرسید نے اپنی اس تالیف میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ جس مسئلہ کو بھی لیا ہے۔ اس پر تحقیق اور تنقید کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور جہاں کہیں الزامی جواب دیا بھی ہے وہاں تحقیقی جواب دینے کے بعد اس کا اظہار کیا ہے[1]۔

سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی، اور مدعانویسی سرسید کے انداز تحریر کی عام خصوصیات ہیں اور "خطبات احمدیہ" بھی ان اوصاف سے بہرہ ور ہے۔ سرسید عبارت آرائی، آرائش وزیبائش اور صنائع لفظی کی بجائے سلاست، روانی اور سادگی کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور موضوع کے مطابق اسلوب بیان کا سانچہ وضع کرتے ہیں۔ انہوں نے ایسی زبان استعمال کی ہے، جو ان کے خیالات کا مناسب ترین ذریعہ اظہار ہے اور اس میں جوش وجذبہ اور اثر پذیری کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں[2]۔

اس کتاب نے عہد متذکرہ میں مطالعہ مسیحیت میں نئے رجحانات متعارف کروائے جن سے بعد میں آنے والے خوب مستفید ہوئے۔ سرسید کی انگریزی زبان اور مغربی علوم سے براہ راست استفادہ کی استطاعت نہ ہونے کے باوجود "خطبات احمدیہ" جیسی شاہکار تصنیف، لگن، محنت، عرق ریزی، احساس وجذبہ اور حمیت کی عظیم داستان ہے جس کی اس دور کے مسلمانوں کو ضرورت تھی۔ عصر حاضر میں بھی امت مسلمہ کے حالات متقاضی ہیں کہ مسلمان ان اوصاف سے متصف ہوں تاکہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی امید بر آئے۔

---

1 سرسید، الخطبات الاحمدیہ، ص ۱۷-۱۸ (مقدمہ)

2 خالد، انور محمود، ڈاکٹر، اردو نثر میں سیرت رسول، (اقبال اکادمی، لاہور ۱۹۸۹ء، طبع اول)، ص ۴۳۰

مولوی شیخ الہ دین   بست سوال

قاسمی پریس، لودیانہ ۱۳۲۴ھ

صفحات: ۲۴

بیسویں صدی کا اوائل ہندوستان میں مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں بہت پُر جوش دور ہے۔ اپنے اپنے مذہب کی سچائی کو ثابت کرنے اور مناظرانہ انداز میں فریق مخالف کو لاجواب کرنے کا رجحان عروج پر تھا۔ عوامی مقامات پر منادی و تبلیغ، تحریری کاوشوں اور مباحثوں و جلسوں کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ اس ضمن میں ایک اہم امر فریقین کا ایک دوسرے کو سوال نامہ لکھ کر شائع کروانے کا بھی عام رواج تھا۔ سوال نامہ شائع کرنے کی روایت مسیحی اہل قلم کی طرف سے ابتدائی تبشیری سرگرمیوں سے ہی شروع ہو گئی تھی، جس میں " بحث مفید العام فی تحقیق اسلام " از پادری سمتھ معروف ہے جس کے جواب میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ازالۃ الشکوک تحریر کی۔

زیر نظر بیس سوالات پر مشتمل سوال نامہ مسلم مناظر مولانا شیخ الہ دین کی تحریر ہے، جو ان کی بائبل اور مطالعہ مسیحیت پر عبور کا اظہار ہے۔ اسے مرتب کرتے وقت فاضل مناظر کے پیش نظر ماقبل اور حاضر عہد کا مکمل نقشہ تھا۔ بعض سوالات بڑے دلچسپ پیرائے میں مرتب کیے گئے ہیں۔ مجیب کے رویہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> " اگر کوئی عیسائی۔۔۔ اپنے حریف یہود کی کتب دینیہ خصوصاً توریت سے کوئی استدلال پیش کرنا چاہے تو اس عیسائی کو لازم ہو گا کہ وہ توریت کے اور احکام ماننے میں بھی پس و پیش نہ کرے۔ افسوس عیسائیوں کی حالت پر اپنی مطلب براری کے لیے توریت کی طرف دوڑنا اور اپنے نفس امارہ کے پیرو ہو کر توریت کے احکام کو توڑنا[1]۔

مؤلف بعض سوالوں میں اپنے موقف کی وضاحت کے لیے قرآنی آیات سے استشہاد کر کے اپنا مقدمہ پیش کیا ہے۔ مثلاً مسیح" کا مردوں سے جی اٹھنے کے عقیدہ کا بطلان عہد نامہ جدید سے کرتے ہیں[2]۔ اور پھر آیت کریمہ ' وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ "[3] سے تائیدی استشہاد لاتے ہوئے کمال خوبی سے مسلم نظریہ کا اثبات کیا، اور ان بنیادوں پر ایک مضبوط سوال قائم کر کے روایتی انداز میں حریف سے جواب طلب کیا ہے۔ اسی طرح

---

1 الہ دین، شیخ، بست سوال، (قاسمی پریس، لودیانہ ۱۳۲۴ھ)، ص ۳

2 ایضاً، ص ۱۳

3 النساء ۴: ۱۵۷

مسئلہ شفاعت پر توریت اور قرآن کریم سے آٹھ آٹھ آیات نقل کر کے اپنا مؤقف واضح کیا ہے۔ مخاطب کی فکری کمزوریوں کی نشان دہی کی اور کفارہ کے مقابلہ میں مسئلہ شفاعت ثابت کر کے جواب طلب کیا ہے[1]۔

سوالات کے چناؤ میں مصنف کی عرق ریزی سامنے آتی ہے کہ مجیب کو ایک کے بعد دوسرے جواب میں عہد نامہ قدیم یا جدید کی مخالفت کرنا پڑتی ہے یا وہ باہم متناقض جواب پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔یوں منطقی اسلوب اور کلامی انداز میں کردہ سوالات کا نتیجہ رد عیسائیت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ سوالات میں عائلی احکام، تبشیر و منادی کے متعلقہ افعال اور ان میں شیطانی مداخلت، کفارہ، شفاعت، بپتسمہ، مصلوبیت مسیح ؑ اور تثلیث جیسے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں جس سے ان سوالات کی جامعیت اور ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس سوال نامہ سے اُس مناظرانہ دور کی جھلک واضح طور پر سامنے آتی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے مرتب کرتے وقت فاضل مؤلف کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ حریف محض لفاظی سے کام نہ نکلنے پائے، بلکہ صاف اور صریح الفاظ میں جواب دے۔ مسلم علماء کی خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ سوال وجواب میں معاملہ صاف ہو جائے مگر مسیحی مخاطبین نے

اول گول مول ذو معنی الفاظ میں جواب دینے میں ہی عافیت جانی یا پھر تاویلات کا انبار جمع کر دیا تا کہ اصل مسئلہ سے توجہ ہٹ جائے اور فضول گوشے ہی زیر بحث رہیں۔اس سے مسئلہ کے نفس الامر سے چھٹکارا مقصود تھا۔

دوم اگر وہ پہلے مقصد میں ناکام رہے تو الٹا ایسے سوالات کرنے شروع کر دیئے جن کے جوابات یا تو مسلم علماء کی طرف سے دیئے جا چکے تھے یا فروتر علمی حیثیت ہونے کی بناء مسلم علماء کی طرف سے قابل التفات ہی نہیں سمجھا گیا۔

اگرچہ یہ حصہ بہت ہی کم ہے کیونکہ اس دور کے غالب سیاسی پس منظر میں بعض منادین کی تحریریں دشنام طرازی واستہزاء سے مملوہوتی تھیں جن کا جواب ایک سنجیدہ فریق کی طرف سے سوائے خاموشی کے اور کیا دیا جا سکتا تھا۔ اس خاموشی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحی اہل قلم نے انہی باتوں کو اپنے علم الکلام کا نیا جامہ پہنا کر پیش کر دیا۔

---

1 الہ دین، بست سوال، ص۹

مولانا ثناء اللہ امر تسری اسلام اور مسیحیت

اشاعت نو: نعمانی کتب خانہ، لاہور س ن

صفحات: ۲۳۱

زیر نظر " اسلام اور مسیحیت " مولانا ثناء اللہ امر تسری نے پادری برکت اللہ کی درج ذیل تین کتب کے جواب میں لکھی ہے۔

(۱) توضیح البیان فی اصول القرآن (۲) مسیحیت کی عالمگیری (۳) دین فطرت اسلام یا مسیحیت

اس میں مولانا نے پادری صاحب کے ترتیب تالیف کے بالکل الٹ ترتیب اپنائی ہے۔ پادری صاحب نے پہلے دین فطرت، پھر مسیحیت کی عالمگیری اور بعد میں توضیح البیان تصنیف کی تھی۔ مولانا صاحب نے سب سے پہلے توضیح البیان، پھر مسیحیت کی عالمگیری اور آخر میں دین فطرت کا جائزہ لیا ہے۔ آپ نے تین ابواب قائم کر کے بالترتیب پہلے باب میں اسلام کی مدافعت، دوسرے میں عیسائیت پر تنقید اور تیسرے میں مدافعت کے علاوہ حسب ضرورت تنقید بھی کی ہے۔

باب اول " تشریح القرآن بجواب توضیح البیان " میں پادری صاحب کی توضیح البیان میں کردہ اعتراض کہ اسلام کے اصول میں عالمگیریت نہیں ہے، کا اصولی جواب دیا گیا ہے۔

باب دوم " مسیحیت کی عالمگیری پر ایک نظر " کے تحت پادری صاحب کا تعاقب کیا گیا ہے۔

باب سوم " دین فطرت اسلام ہے بجواب دین فطرت مسیحیت ہے " پر محتوی ہے۔

مولانا نے یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ اسلام کے حوالے سے پہلے پادری صاحب کی تنقیدی تحریر نقل کر کے اس پر مجیب کے عنوان سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے نقد فرماتے ہیں۔

کتاب سے مولانا کا تبحر علمی اور مطالعہ مسیحیت پر دسترس کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے معترض کے قائم کردہ معیارات اور اصول سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے جواب تحریر کیے ہیں۔ مثلاً پادری صاحب کی " عالمگیر مذہب " کے بارے کردہ تعریف سے ان الفاظ میں اتفاق کیا ہے، " یہ تعریف ہمیں بھی مسلّم ہے اور آئندہ بھی مسلّم رہے گی۔ "

غالباً مسلم حلقے کی طرف سے یہ پہلی کاوش ہے جس میں معترض کے قائم کردہ اصولوں اور معیارات کو تسلیم کرتے ہوئے جواب لکھا گیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں آپ کا کمال یہ ہے کہ جس اصول کے تحت پادری صاحب اسلام پر معترض ہوئے آپ نے وہی اصول مسیحیت پر لوٹا دیا۔ اور اسی کے تحت پادری صاحب کے سامنے مسیحیت کے بارے کچھ تنقیدی سوالات رکھ دیئے۔

اپنے موقف کی توثیق کے لیے بائبل خصوصاً عہد نامہ جدید سے تائیدی استشہاد لائے ہیں۔ مثلاً خدائے واحد کی پدری شفقت ثابت کرنے کے لیے پادری صاحب نے موقف اختیار کیا کہ؛

" قرآن کا اللہ ایک قادر مطلق سلطان ہے جو ایک ذمہ دار ہستی نہیں بلکہ جو چاہے حکم دے" (مائدہ آیت ۱) لہذا قربانیوں کے وسیلہ سے اس کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن مسیحیت کا خدا محبت کا خدا ہے وہ گناہگار کی موت نہیں چاہتا"۔۔۔[1]

مولانا اس کے جواب میں رقم طراز ہیں؛

مجیب: بندوں کے ساتھ خدا کی محبت کا ثبوت قرآن مجید کی آیات سے بکثرت ملتا ہے۔ مثلاً

(۱) ان اللہ بالناس لرؤف رحیم (ترجمہ) اللہ تعالیٰ لوگوں کے حال پر نہایت مہربان ہے) (۲) ان اللہ لذو فضل علی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون (ترجمہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے حال پر مہربان ہے مگر لوگ شکر نہیں کرتے) (۳) وان ربک لذوا مغفرۃ للناس علی ظلمھم (ترجمہ) تمہارا رب لوگوں کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے۔) پس آپ کا یہ فقرہ کہ اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہستی نہیں بالکل غلط ہے کیونکہ ذمہ دار ہستی اس بادشاہ کی ہوتی ہے جو عدل وانصاف کرے اور اپنی مرضی سے کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ قرآن مجید نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ وان تک حسنۃ یضاعفھا ویؤت من لدنہ اجرا عظیما (پ ۵. ع ۴) (ترجمہ) اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اگر کوئی نیکی ہو تو اس کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے

ایسا ہی آپ کا یہ فقرہ بھی غلط اور تعلیم انجیل کے سراسر خلاف ہے کہ؛ مسیحیت کا خدا محبت کا خدا ہے وہ گناہگار کی موت نہیں چاہتا۔۔۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس مسیحی ارشاد کے کیا معنی ہوں گے۔

" جو کوئی اپنے بھائی کو احمق کہے گا وہ آگ کے جہنم کا سزاوار ہو گا۔"

" جو بُری خواہش سے کسی عورت پر نظر کرے گا وہ جہنم میں ڈالا جائے گا" (انجیل متی باب ۵)

اللہ رے اتنی خفگی کہ احمق کہنا یا محض بُری نظر سے دیکھنا اتنا بڑا گناہ قرار دیا گیا کہ گناہگار تا ابد یا مدت دراز تک جہنم کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا یہ فقرہ بھی ملائے دیتا ہوں کہ " مسیحیت کا خدا چاہتا ہے کہ گناہگار اس کی طرف رجوع کرے "[2]

مولانا کا کتاب میں اسلوب یہ ہے کہ آپ پہلے قرآن کی آیت پھر بائبل سے پادری صاحب کے دعویٰ کی نفی بعد ازاں اپنا تبصرہ اور آخر میں پادری صاحب کے الفاظ انہیں پر لوٹا دیتے ہیں۔ پادری صاحب کے قرآن مجید کی آیت

---

1 امر تسری، اسلام اور مسیحیت، ص ۳۰

2 ایضاً، ص ۳۰۔۳۱

کے غلط ترجمہ یا اس سے غلط استنباط پر سخت گرفت کرتے ہیں۔ مثلاً " لا تقف ی ب ع "کا غلط مفہوم پیش کرنے پر مولانا صاحب یوں گویا ہوئے؛

" میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے آپ کے کسی حملے پر رنج نہیں ہوا جتنا اس موقع پر ہوا اس لیے نہیں کہ آپ کے اس حملہ سے اسلام کو نقصان پہنچا ہے بلکہ اس لیے کہ آپ نے ایک مسلم خاندان کی اولاد ہو کر قرآن مجید سے ناواقفیت کا اتنا ثبوت دیا ہے جتنا کہ کوئی برہمن لم بقرۃ کے بھاؤ سے بھی نہ دے گا۔۔۔ آپ کے پادری عمادالدین صاحب نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے اگر آپ اس کو ہی ملحوظ رکھتے تو بھی اعتراض نہ کرتے "[1]۔

پھر لغوی اور صرفی وضاحت سے قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے۔

اسی طرح وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم کے پادری صاحب کے کردہ ترجمہ کے حوالے سے لکھا ہے؛

" اس ترجمہ میں آپ نے کئی کمال دکھائے ہیں۔ ان کمالات میں سے سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ترجمہ میں اپنی طرف سے یہ جملہ بڑھا دیا کہ " یا اس کی نسبت سوا کرے"۔ ایسا تصرف کر کے آپ نے اپنی غرض فاسدہ کے تحت اپنی ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے ورنہ یہ جملہ آیت کے کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے "[2]۔

اس کتاب میں مولانا ثناء اللہ امرتسری منطق، کلام اور فلسفہ کے متبحر عالم کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں جو معترض کے واردہ اعتراض واشکال کو مختصر جواب میں واضح طور پر دور کر دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ انہیں اصولوں پر اس کا اشکال واپس لوٹا دیتے ہیں۔ عہد متذکرہ کے مناظرانہ دور میں آپ کی اسی مہارت کی وجہ سے برصغیر میں اسلام کے دفاع میں آپ کا مقام سب سے بالاتر شمار کیا جاتا ہے۔ آپ اسلام پر تمام ادیان کے معترضین کو بیک وقت جواب دے سکتے تھے کیونکہ مخاطب کے اساسی مذہبی کتب پر آپ کو رسوخ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم مناظرہ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔

مناظرانہ اسلوب کی حامل اس کتاب میں جواب برائے جواب کا رویہ دیکھنے کو نہیں ملتا اور نہ ہی کہیں سطحی اور رکیک انداز اپنایا گیا ہے۔ قاری انتہائے کتاب تک یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا صاحب کی گرفت کسی بھی جگہ پر کمزور نہیں ہوئی۔ جواب میں مولانا تمثیلی اسلوب میں اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہیں اور موقع کی مناسبت سے برجستہ شعر سے طویل مباحث کو سمیٹ دیتے ہیں۔ یہ مولانا کے ادبی ذوق کا عکاس ہے۔

مناظرانہ انداز تحریر کے باوجود مولانا نے مطالعہ عیسائیت کے لیے جو مواد کتاب ہذا و دیگر تحریروں میں پیش کیا ہے اتنا اہم ہے کہ اگر اسے اثباتی رنگ میں نئی شکل وصورت سے ترتیب دیا جائے تو تقابل ادیان کے طلباء کے لیے ازحد مفید ہو گا[3]۔

---

1 امرتسری، اسلام اور مسیحیت، ص ۱۸۲

2 ایضاً، ص ۱۸۳

3 ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت" اسلام آباد، مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۱۳

مولانا ثناء اللہ امر تسری　　　برہان التفاسیر لاصلاح سلطان التفاسیر

مطالعہ مسیحیت مولانا ثناء اللہ امر تسری کا مرغوب موضوع تھا، اور اس پر ان کی دسترس ان کی اس موضوع پر بے شمار تحریروں سے عیاں ہے جو کتب اور مقالات کی شکل میں انہوں نے سپرد قلم کیے۔"برہان التفاسیر" مولانا ثناء اللہ امر تسری کی پانچویں تفسیری کاوش ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے زیر تبصرہ "برہان التفاسیر" پادری ایس ایم پال کی " سلطان التفاسیر" کے جواب میں لکھی گئی ہے، جو پادری موصوف کی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالہ " المائدہ "لاہور میں بالا قساط شائع ہوئی۔ یہ صرف سورۃ البقرۃ کے ابتدائی چھ رکوع تک ہی محدود رہی جسے بعد ازاں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ پھر کچھ تعطل کے بعد ماہنامہ " نجات میں دوبارہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ مولانا ثناء اللہ اپنی زیر ادارت شائع ہونے والے ہفت روزہ " اہل حدیث "امر تسر میں قسط وار اس کا جواب لکھتے رہے۔ سورۃ بقرہ کے ابتدائی سولہ رکوع کی یہ تفسیر اکیاسی (۸۱) اقساط پر مشتمل ہے۔ جس کی پہلی قسط ۶ مئی ۱۹۳۲ء کو شائع ہوئی جب کہ ۲۴ مئی ۱۹۳۵ء کی آخری قسط طبع ہوئی۔ چونکہ سلطان التفاسیر مکمل نہ ہو سکی اس لیے برہان التفاسیر بھی اس کے تعاقب میں مکمل نہ ہو سکی۔

یہ ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی *۔

مولانا میدان مناظرہ کے شہسوار تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں مناظرانہ اسلوب ہی جھلکتا ہے جسے اس عہد کے احوال و ظروف کا تقاضا سمجھنا چاہیے۔ سلطان التفاسیر اور برہان التفاسیر اپنے اپنے مذہب کی نمائندگی کرنے والے پائے کی دو مناظر شخصیتوں کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ اور ان سے زیر بحث دور کے مسلم مسیحی مناظراتی ادب کے مزاج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مولانا کا اسلوب یہ ہے کہ وہ خود قرآنی آیات کی تفسیر تو نہیں کرتے بلکہ پادری صاحب کے تعاقب میں ان کی علمی لغزشوں کی نشان دہی کے ساتھ اس کی تصحیح فرماتے ہیں اور پھر الزامی انداز میں اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔

مسیحی دعوی کہ کوئی مسلمان قرآن کی تفسیر نہیں لکھ سکتا، کے جواب میں مولانا صاحب فرماتے ہیں؛

"ہر کلام کی تفسیر دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک متکلم کے حسب منشاء دوم مفسر کے حسب منشاء یعنی متکلم کے منشاء کو نظر انداز کر کے مفسر اپنے منشاء کے ماتحت جو چاہتا ہے تفسیر کرتا ہے عربی اصول کلام میں ایک قانون ہے ، توجیہ الکلام بما لا یرضی به قائله باطل (متکلم کے خلاف منشاء اس کے کلام کی تاویل کرنا غلط ہے)۔ پادری صاحب کی جتنی تفسیر منصۂ ظہور پر آئی ہے اسے دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی تفسیر قسم ثانی میں داخل ہونے کی وجہ سے بیشک

---

* راقم ان اقساط تک رسائی کے لیے معروف علم دوست محترم ضیاء اللہ کھوکھر صاحب آف گوجرانوالہ کے علمی تعاون کے لیے سراپا سپاس ہے، جو اس علمی میراث کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

ایسی ہے کہ " کوئی مسلمان ایسی تفسیر نہیں لکھ سکتا"۔ اس کی مثال کہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے ' مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وے خدا کے فرزند کہلائیں گے۔ " (انجیل متی ۵ درس ۹) اس قول کے حسب منشاء قائل اول یہ تفسیر ہے کہ " صلح کن اور صلح جو خدا کے مقرب بندے ہوں گے " دوسری قسم کی تفسیر " صلح جو اور صلح کن بجائے اپنے باپوں کے، خدا کے ولد بن جائیں گے پس وہ ولدیت لکھاتے ہوئے ولد اللہ لکھایا کریں۔ " لازمی بات ہے کہ تفسیر ثانی پر ہر کہ مذہبی اور اخلاقی اعتراض کرے گا دیکھو جی مسیح دنیا کے لوگوں کو تعلیم دیتا ہے کہ اپنے ماں باپ کو جواب دے دو اور خدا کے بیٹے کہلاؤ۔ مختصر یہ کہ پادری صاحب نے مفسر قرآن بن کر قرآن مجید کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو بحیثیت ایک عیسائی ہونے کے وہ کر سکتے تھے![1]

مولانا پہلے پادری صاحب کی عبارت معترضہ لکھتے ہیں پھر برہان کے عنوان سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور اکثر منقولی و معقولی بحث کے بعد الزامی جواب دیتے ہیں۔ اور اس میں سطر بہ سطر جواب کی بجائے پادری صاحب کے غلط استدلالات کا جواب دے کر اس کے اخذ کردہ نتیجہ کی تردید کرتے ہیں۔

مولانا کہیں کہیں پادری صاحب کی تفسیر پر سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ نیز بائبل میں وقتاً فوقتاً اصلاح کے نام پر کی گئی ترامیم کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ نیز مولانا کی تحریر کا ایک خاصہ اس بات کا التزام ہے کہ فریق مخالف کا بیان اپنے موقف کی موافقت میں لایا جائے اور اس سے متکلم کی مخالفت ظاہر کی جائے، مثلاً بسم اللہ کی بحث۔

مولانا صاحب کا پادری صاحب کا پینترا بدلنے اور اپنی مطلب برابری کے لیے نئے نئے اصول وضع کرنے کی روش کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں،

" آج تک تو ہر محاورے اور ہر صنعت کے ثبوت میں نظم ہی کو پیش کیا جاتا تھا کیونکہ زبان کی حفاظت نظم ہی سے ہوتی ہے مگر آج پادری صاحب نے یہ نئی ایجاد کی ہے کہ نثر کے لیے نثر سے استشہاد ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایام جاہلیت کی نثر کا مجموعہ بلکہ ایک صفحہ تک محفوظ نہیں۔ ہم پادری صاحب کی اس ایجاد پر ان کو ہدیہ تبریک میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانہ میں دستور نکلا[2]

مولانا صاحب اکثر منطقی استدلال کا اسلوب اپناتے ہیں۔ مثلاً حروف مقطعات اور تثلیث پر پادری صاحب کے تعاقب میں بڑی عمدہ بحث کی ہے جس میں پادری صاحب کے اعتراضات منطقی حوالہ سے رد کیا ہے۔ اور تثلیث کے

---

1 " اہل حدیث " امرتسر، برہان التفاسیر برائے اصلاح سلطان التفاسیر، ثناء اللہ امرتسری، ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ، ص ۳

2 ایضاً، ۱۰ جون ۱۹۳۲ء، ص ۱۱

بارے میں کئی کلامی نکات اٹھائے ہیں اور تثلیث پر بعض متضاد مسیحی تحریریں پیش کی ہیں[1]۔

ایک بہت اہم بحث اعجاز القرآن اور فصاحت القرآن پر پادری صاحب کے اعتراضات پر ہے۔ عربی کلام میں مختلف صنعتوں کے استعمال سے بلاغت و فصاحت کلام کا تعین ہوتا ہے۔ معترض نے بزعم خویش کلام قرآن کو خلاف فصاحت اور صنعتوں کے متضاد ہونے کی بنا پر اس میں پانچ عیب پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ مولانا صاحب نے کلام اللہ کو ایک ایک صنعت کے مطابق پرکھ کر اسے درست ثابت کیا ہے۔ یہ سب لغوی و فنی مباحث میں علم البلاغت اور اس کے متعلقات پر مولانا کا رسوخ مکمل عبور ان کی علمی حیثیت کو واضح کرتا ہے[2]۔

مولانا مسیحی مفسرین کے اس دوہرے معیار کو واضح کرتے ہیں کہ قرآن اگر " عقائد سابقہ سے موافقت کرے تو محل اعتراض اور ان کے خلاف کہے تو بھی قابل ملامت "۔ دراصل یہ بات مولانا صاحب نے اس بناء پر لکھی ہے کہ اگر قرآن بائبل یا انجیل کے مطابق بات کرتا ہے تو مسیحی فریق کی طرف سے اس پر بائبل کے چربہ ہونے کا الزام لگ جاتا ہے اگر قرآن کی بات بائبل میں مذکور نہ ہو تو اس وجہ سے رد کر دی جاتی ہے کہ اس کا بائبل میں ذکر نہیں ہے[3]۔

پادری صاحب کا طریق یہ ہے کہ معترض ہوتے وقت ہر مقام پر مفسرین کی غلطی کو قرآن کی غلطی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مولانا نے جواب میں ہر جگہ ایک ہی اصول اپنایا ہے کہ ہم تو قرآن مجید کے معتقد ہیں نہ کہ کسی مفسر کے

حضرت آدم و حوا کے موروثی گناہ کے مسیحی عقیدہ پر مولانا صاحب نے مختصر مگر عمدہ گرفت کی ہے۔ پادری صاحب کے نقل کردہ بائبل کے بیانات کے مطابق عورت کو جنت سے نکلوانے کی سزا یہ ملی کہ حمل میں درد سے بچے جنے گی اور مرد اپنا پسینہ بہا کر کمائی کرے گا[4]۔ اس پر مولانا صاحب لکھتے ہیں،

" اس عبارت میں صیغہ تو مخاطب مفرد کا ہے مگر عیسائی اس کی تشریح میں ساری اولاد کو شریک کرتے ہیں اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اولاد کے ناکردہ گناہ کو بھی داخل سزا کیا گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ سزا بھی ایسی ہے کہ کافر چھوٹے نہ مومن۔ کیونکہ ہر (غیر مسیحی) مرد یا کافر محنت سے کھاتا ہے اور ہر عورت کافرہ ہو یا مومنہ تکلیف سے بچے جنتی ہے۔ یہ اچھا گناہ ہے کہ کسی طرح چھوٹتا ہی نہیں۔ نہ توبہ سے نہ کفارہ مسیح سے حالانکہ بقول مسیحیان، مسیح نے کفارہ بن کر سارے

---

1 " اہل حدیث " امرتسر، برہان التفاسیر، ۱۹ صفر ۱۳۵۱ھ۔ یکم جولائی ۱۹۳۲ء

2 ایضاً، ۳۰ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ؛ ۲، ۲۳ ستمبر ۱۹۳۲ء؛ ۲۸ جمادی الاول؛ ۶، ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۵۱؛ ۲۱ اکتوبر، ۴ نومبر ۱۹۳۲ء

3 ٹھاکر داس، انجیل یا قرآن، ص ۷

4 کتاب پیدائش ۳ : ۱۹ " اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بڑھاؤں گا۔۔۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا۔۔۔ تو اپنے پسینے کی روٹی کھائے گا۔

مجرموں کے گناہ اٹھالیے مگر یہ وراثتی گناہ معاف نہ ہوا"[1]۔

اس تفسیر سے دو مختلف رویے اور سامنے آتے ہیں جس میں ایک طرف منفی سوچ کے ساتھ تدلیس و تحریف اور تعصب و اخفائے حق کا مظاہرہ ہے جب کہ دوسری طرف مثبت ذہن، کلامی مہارت، علمی تبحر، فنی مباحث میں ملکہ اور زیرک و دانائی کا اظہار ہوتا ہے۔ قاری کے سامنے مولانا کے محاسن کھل کر سامنے آتے ہیں۔انہوں نے شستہ زبان میں فریق مخاطب کی غلطیاں آشکار کرتے ہوئے اسے قبول حق کی دعوت دی ہے۔

مولانا ثناء اللہ امر تسری تقابل ثلاثہ

برقی مطبع روز بازار، امر تسر ۱۹۲۳ء

اشاعت نو: نعمانی کتب خانہ لاہور (جائزہ میں یہ اشاعت نو مد نظر ہے)

صفحات: ۳۰۳

برصغیر میں تحریک اہل حدیث کے نامور سپوت مولانا ثناء اللہ امر تسری کے متعلق علامہ رشید رضا مصری (م ۱۳۵۴ھ) نے لکھا تھا؛ مولانا ثناء اللہ برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ اور ان کی خدمات ان کے زہد و تقوی کو دیکھ کر ایک آدمی کہہ سکتا ہے کہ وہ عام آدمی نہیں بلکہ "رجل الٰہی "ہیں"[2]۔

زیر تبصرہ کتاب پادری ٹھاکر داس کی "عدم ضرورت قرآن "کا جواب ہے۔ پادری ٹھاکر داس نے جب متذکرہ کتاب لکھی تو مسیحی دنیا میں اسے ہاتھوں ہاتھوں لیا گیا اس وقت کے مخصوص ماحول میں اس کتاب کا جواب دینا مولانا ثناء اللہ نے اپنا خاص فرض سمجھا اور احسن طریق سے نبھایا۔ التماسِ مصنف کے تحت مولانا رقم طراز ہیں؛

> "مذاہب کے آئے دن کے جھگڑے اور عیسائیوں کے رسائل، عدم ضرورت قرآن، سن کر مدت سے میرا خیال تھا کہ مذاہب اربعہ (اسلام، یہودیت، عیسائیت، ہندومت) کی الہامی کتب اربعہ (قرآن، توریت، انجیل، وید) کا مقابلہ کروں کہ ان جھگڑوں کی بیخ کنی ہو۔ لیکن وید کا مستند ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے میرا ارادہ ملتوی رہا۔۔۔اس لیے میں نے کتب اربعہ کے مقابلے سے ارادہ ہٹا کر کتب ثلاثہ کی طرف ہی توجہ کی اور ان پریشان اوراق کا نام "تقابل ثلاثہ" یعنی توریت، انجیل اور قرآن کا مقابلہ رکھا"[3]۔

---

1 ہفت روزہ" اہل حدیث" امر تسر، (۲ دسمبر ۱۹۳۲ء)، ص ۱۱۔۱۲

2 مجلہ " المنار" قاہرہ، الثالث والثلاثون السنۃ، ۱۳۵۱ھ، ص ۶۳۹، بحوالہ: عراقی، عبد الرشید، تذکرۃ ابوالوفا، (ندوۃ المحدثین، گوجرانوالہ ۱۹۸۴ء) ، ص ۱۲

3 امر تسری، ثناء اللہ، تقابل ثلاثہ، (نعمانی کتب خانہ، لاہور س ن)، ص ۷۔۸

کتاب کوابواب یا فصول میں تقسیم کرنے کی بجائے موضوعات کے اعتبار سے قرآن، تورات اور انجیل کے بیانات کو بالمقابل تین کالموں میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف موضوعات کا باہمی تقابل کیا گیا ہے۔ جیسے دعویٰ الہام، دلائل ہستی صانع عالم، دعویٰ توحید، دلائل توحید، صفات خداوندی، احکام شریعت، عام اخلاق، تدبیر منزل یعنی رشتہ داروں کے احکام، قوانین دیوانی وفوجداری، احکام جنگ، قیامت اور طریق نجات وغیرہ۔

پادری صاحب نے یک رخی تصویر پیش کر کے قرآن کے بارے منفی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی مولانا صاحب نے اپنے مخصوص مناظرانہ انداز میں اس کا بھرپور جواب دیا۔پادری صاحب اس بات کے مدعی تھے کہ انجیل کی موجودگی میں قرآن کی کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔ مولانا صاحب نے بدلائل تورات، انجیل اور قرآن کا تقابل کر کے قرآن کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ثابت کیا کہ انجیلی تعلیمات زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتیں

" اگر باوجود دعویٰ الہام، الہامی کے حالات قابل اطمینان نہیں تو دعویٰ بلا دلیل ہے ممکن ہے کسی دنیادار نے ٹکا کمانے کو دعویٰ الہام کیا ہو بعد ان مراتب کے اگر وہ کتاب انسان کی حوائج فطریہ کو کافی نہیں ہے تو اس کے ماننے بلکہ اس کے آنے سے جو حاجت براری ہونی تھی وہ نہ ہو گی، اس لیے وہ کالعدم ہے"[1]۔

مولانا صاحب کا طریق تقابل یہ ہے کہ ایک عنوان قائم کرتے ہیں اس عنوان کے ذیل میں پہلے کالم میں قرآن، دوسرے میں توریت اور تیسرے میں انجیل کے بیانات کا اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ تورات اور انجیل کے اصل نصوص کی عدم دستیابی کی بنا پر صرف ترجمہ جب کہ کالم میں منقول ترجمہ کا قرآنی متن نیچے حاشیہ میں درج کر دیتے ہیں۔ اکثر مقامات پر انجیل اس موضوع پر خاموش ہے۔ وہاں انجیل سے کچھ نہ پا کر وہ کالم خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔

تقابل کے دوران مولانا اپنا کوئی تبصرہ یا توضیح عموماً نہیں دیتے شاذ ونادر ہی کسی موضوع پر توضیحاً چند کلمات بیان کرتے ہیں۔ وہ قاری کو فیصلے کا موقع دیتے ہیں نہ کہ اپنی رائے ٹھونستے نہیں ہیں۔ یوں صرف موازنہ ان کی تحقیق منہج کے اعتماد کی نشانی ہے اور آخر میں دوٹوک انداز میں اپنا موقف سامنے لاتے ہیں۔

دعویٰ الہام کے عنوان کے تحت قرآن کے اپنے بارے الہامی ہونے کے ۱۵ بیانات درج کیے ہیں جب کہ اس کے مقابل بائبل میں کوئی بیان نہیں پاتے جس میں اس کا اپنے بارے الہامی ہونے کا دعویٰ سامنے آئے۔ حاشیہ میں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں؛

" دعویٰ الہام۔ اس مضمون کی ضرورت کی طرف ہم نے تمہید میں مختصر سا اشارہ کیا ہے اگر کوئی کتاب اپنے الفاظ میں خود مدعی نہیں تو دوسروں کا اس کو الہامی ماننا " پیران نمی پرند و مریدان ہمی پرانند " کا مصداق ہے۔۔۔ افسوس کہ ہم اس پہلے اور ضروری مضمونوں سے جو مثل بنیادی پتھر کے تھا توریت انجیل کو خالی پاتے ہیں نہ صرف خالی

---

1 امرتسری، تقابل ثلاثہ، ص۹

بلکہ دعویٰ مذکور کے صریح مخالف مظہر ہیں"[1]۔

اسی طرح اگلے عنوان "دلائل ہستی صانع عالم" میں بھی قرآن میں سے ۱۱ منتخب آیات سے خالق کائنات کے بارے دلائل پیش کیے گئے ہیں جب کہ انجیل اس باب میں بالکل خاموش ہے۔ اس پر مصنف اشارہ کرتے ہیں کہ

" افسوس کہ اس دوسرے مضمون میں بھی توریت انجیل فیل شدہ ہیں۔ کسی جگہ اس ضروری مضمون کو ان دونوں کتابوں نے مدلل مباحثانہ بیان نہیں کیا۔ الہامی کتاب ہونے کا مرتبہ تو انہیں باعتبار عدم دعویٰ الہام کہاں نصیب تھا۔ عیسائیوں کا عام دعویٰ ہے کہ انجیل عرفانی اور روحانی کتاب ہے مگر افسوس کہ باوجود اس ابردست دعویٰ کے ایسے عرفان سے خالی ہے کہ خدا کی ہستی کے دلائل کو جن منکر خدا کی تسلی یا کم از کم سکوت ہو سکے چھوا تک بھی نہیں اور جو کہیں ذکر ہستی صانع عالم ہے بھی تو بطور معتقدانہ کہ بجز اپنے مریدان خاص کے کوئی شخص اس پر متوجہ نہ ہو"[2]۔

سب سے بسیط عنوان " احکام شریعت " ہے جو صفحہ ۷۰ سے ۱۷۶ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مختصر قرآنی احکامات کے مقابل توریت کے طویل احکامی بیانات نقل کئے گئے ہیں۔ قاری بخوبی محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن کے احکامات سادہ، معقولی اور مہذبانہ اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔ توریت اور قرآن کے مقابل انجیل میں احکامات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس تقابل میں اعجاز، معقولیت اور تہذیب میں قرآن توریت و انجیل سے بہت بالاتر نظر آتا ہے۔ مولانا بغیر کسی حاشیہ آرائی کے صرف آخر میں گویا ہوئے ہیں؛

" ناظرین ہم نے آپ لوگوں کے ملال خاطر کی بمقابلہ انصاف کے پرواہ نہ کر کے اتنی طویل عبارتوں کو نقل کیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو اختیار ہے کہ ان سب کو بغور ملاحظہ کر کے اچھے کو پسند کریں۔ تسلونیقیون ۵ : ۲۱[3]

قوانین دیوانی و فوجداری کے عنوان کے تحت حاشیہ میں رقم طراز ہیں؛

" قوانین دیوانی و فوجداری ۔ اس مضمون کے متعلق انجیل تو ساکت ہے توریت نے بھی جو کچھ بتلایا ہے قانونی پیشہ اصحاب کے قابل غور ہے کہ کس حد تک قتل عام کی اجازت ہے قرآن شریف نے اس مضمون کو بھی جیسا بتلایا ہے فطرت انسانی اسی کی مقتضی ہے۔"[4]

احکام جنگ میں انجیل کا ایک لفظ بھی سامنے نہیں آیا۔ مصنف احکام جنگ کا عنوان قائم کر کے حاشیہ میں عیسائیوں کے اس دعویٰ کی قلعی کھولتے ہیں کہ اسلام مسیحیت کے مقابل تلوار کا دین ہے۔ اور ساتھ یہ واضح کیا ہے

---

1 امرتسری، تقابل ثلاثہ، ص ۱۶

2 ایضاً، ص ۲۴

3 ایضاً، ص ۱۷۶

4 ایضاً، ص ۲۳۸

کہ اسلام میں کفار رعایا کے حقوق دیگر مسلمانوں کے مساوی رکھے ہیں۔ مولانا آخر میں سوال کرتے ہیں کہ

" تو پھر یہ الزام کہ اسلام ایمان بالجبر کی تعلیم دیتا ہے کہاں تک صحیح ہے۔" صلح و اسیران جنگ کے

کہتے ہیں"اس مضمون کے متعلق بھی افسوس کہ انجیل تو خالی ہے توریت میں بھی احکام متضاد اور مختلف ہیں نمبر اول (قرآن) صلح کی اجازت ہے نمبر ۲ (توریت) میں اس سے روک ہے اور خاص کر اسیران جنگ سے جو سلوک کیا گیا ہے وہ بھی مخفی نہیں"[1]۔

اختتامی مضمون" قیامت اور طریق نجات کا"عنوان قائم کر کے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں؛

" اس آخری مضمون میں بھی ہم افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ توریت میں تو ہمیں اس مضمون کا پتہ نہیں ملا طریق نجات تو کجا قیامت کا ذکر تک بھی توریت میں نظر سے نہیں گذرا ہاں اتنا لکھا ہے کہ خدا مقدس ہے تم بھی مقدس بنو مگر یہ نہیں بتایا کہ مقدس بننے سے ان کو فائدہ کیا ہے۔ انجیل میں قیامت بلکہ نجات کا ذکر بھی آتا ہے مگر ایسا کہ نہ ہوتا تو ایک افسوس تھا اور ہونے پر دو افسوس"[2]۔

یہ کاوش ہر قسم کے منطقی، الزامی یا کلامی مباحث سے یک سر خالی ہے۔ ایک سلیم الفطرت قاری یقیناً اس کا "عدم ضرورت قرآن" کے ساتھ تقابل کر کے مولانا کو بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گا کہ انہوں نے فیصلہ کرنا کس قدر آسان کر دیا ہے۔ پادری سلطان پال نے بعد میں " ہمارا قرآن" اور " بائبل، وید اور قرآنی دعاوی" نامی کتب میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

مولانا کی تحریروں پر ایک تبصرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے؛

" مطالعہ عیسائیت کے سلسلہ میں مولانا ثناء اللہ کی جملہ تحریروں پر نظر ڈالنے سے یہ امر واضح ہے کہ انہوں نے خود پہل کرتے ہوئے کوئی کتاب تالیف نہیں کی بلکہ انہوں نے مختلف کتابچوں کی تردید میں قلم اٹھایا ہے اس لیے ان کی تحریریں رد عمل کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کا زیادہ مقصود اسلامی تعلیمات کا دفاع ہے عیسائیت کا بھرپور جائزہ لینا ان کے پیش نظر نہیں رہا تاہم تقابل ثلاثہ ایک ایسی کاوش ہے جو اپنے موضوع پر از حد قابل قدر ہے"[3]۔

---

1 امر تسری، تقابل ثلاثہ، ص ۲۸۶

2 ایضاً، ص ۲۹۱

3 ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت"، مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۱۲

مولانا ثناء اللہ امر تسری رسالہ قرآن العظیم

برقی پریس، امر تسر فروری ۱۹۲۴ء

صفحات: ۲۴

مولانا ثناء اللہ امر تسری نے زیر تبصرہ رسالہ میں قرآن کے الہامی ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مختصر رسالہ بغیر ابواب بندی کے ہے، جس میں کلامی اسلوب میں قرآن عظیم کے دعاوی کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اس میں مسیحی پادریوں کے قرآن پر الہامی ہونے کے حوالے سے کیے گئے اعتراضات کا جواب موجود ہے اگرچہ مولانا ان کا نام نہیں لیتے۔ جب کہ بعض جگہ پر آریہ اعتراضات بھی مذکور ہیں۔

اس میں خدا کی ہستی، صفات خداوندی، شرک اور معبودیت پر قلم اٹھاتے ہوئے قرآنی تعلیمات کو تقابلی انداز میں الہامی ثابت کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں؛

> "قرآن مجید نے توحید کے مضمون کو ایسا بیان کیا ہے کہ میں سب کو اس جگہ بیان کروں تو مقررہ مضمون کے دوسرے پہلو رہ جاتے ہیں اس لیے میں ایسے مضامین کے شائقین کو اپنی کتاب تقابل ثلاثہ (توریت انجیل اور قرآن کا مقابلہ) کا حوالہ دیتا ہوں کہ اس سے تفصیل دیکھ لیں"[1]

بہت مختصر پیرائے کی اس تحریر میں اثبات قرآن پر قلم اٹھایا گیا ہے اور اس میں انسان کی خالق ذات کا تعارف کروا کے قرآن کو اس کا کلام ثابت کیا ہے۔ تمام تحریر معقولی انداز میں ہے جس میں معترضین کی نشان دہی کیے بغیر دفاع قرآن کا فریضہ سرانجام دیا گیا ہے جو اس دور کا لازمی تقاضا تھا۔

منشی چراغ علی تعلیقات*

مطبع منشی اصغر علی لکھنؤ، ۱۸۷۲ء

صفحات: ۷۹

زیر نظر "تعلیقات" پادری عمادالدین کی تصنیف "تاریخ محمدی" کے جائزہ پر مشتمل ہے جس میں نبوت محمدیہ کے عقلی دلائل، محاسن و اخلاق محمدی اور اس پر مخالفین کی شہادت، اناجیل کی استنادی حیثیت نیز قرآن پر مخالفین کے اعتراضات کا بدلائل رد کیا گیا ہے۔

---

1 امر تسری، ثناء اللہ، مولانا، رسالہ قرآن العظیم (برقی پریس، امر تسر ۱۹۲۴ء) ص ۱۱

* راقم اس کے لیے محترم عبدالمالک صاحب آف جھنگ کا شکریہ لازم گردانتا ہے جنھوں نے پاکستان میں اس کی عدم دستیابی پر خدا بخش لائبریری پٹنہ (انڈیا) رابطہ کر کے وہاں سے نقل حاصل کی جس سے راقم مستفید ہوا۔

مختصر مگر وقیع علمی مباحث پر محتوی اس کاوش میں عقلی و نقلی دلائل سے پادری صاحب کا تعاقب کیا گیا ہے۔ طویل جملوں، فارسی ترکیبات، عربی اصطلاحات اور مشکل بندشوں کی حامل اردو تحریر پر گمان ہوتا ہے کہ گویا محمد حسین آزاد کا قلم چل رہا ہے۔ مصنف نے فکری حوالہ سے معذرت خواہانہ اسلوب اختیار نہیں کیا (جیسا کہ اس کے معاصر سرسید کرتے ہیں) بلکہ پادری صاحب کے مؤقف کے اصولی سقم اور استدلال میں تدلیسی و تلبیسی حربوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پر گرفت کی ہے۔ آغاز میں محاسن و اخلاق نبوی ﷺ پر بعض مستشرقین کارلائل، ایڈورڈ گبن، راڈویل، اسپرنگر اور ولیم میور کی اعترافی آراء و توصیفی کلمات نقل کیے ہیں۔

تاریخ محمدی میں پادری صاحب نے کتب احادیث اور مستند سیرتی ادب اور تاریخی وقائع سے استفادہ کرنے کی بجائے زیادہ تر غیر مستند اور ضعیف روایات و آثار پر بنیاد رکھی ہے۔ مسیحی منادین کی اس روش کو یوں واضح کیا گیا ہے؛

" اس (پادری عمادالدین) کی تو تمام کتاب کو موضوع اور منشاء یہی ہے کہ وہ اپنی بدگمانیاں اور مطاعن اور تشنیعات اور جھوٹے اعتراضات اور محض باطل شبہات اکثر مضامین اور روایات کے طور پر پیش کرتا ہے ۔۔۔ ان لوگوں نے شدت حرص اور اشتداد ابطال امر محمدی میں ہر ایک ناکارہ مستند اور ضعیف الحال او حسن مستمسک کو مایہ افحام والزام تصور کر کے اسے بنائے مطاعن واعتراضات بنایا ہے۔"[1]

مصنف اپنے اس مؤقف کی بدلائل وضاحت کرتا ہے کہ فن تنقید و تخریج روایات کی روشنی میں پرکھ کر اخبار و روایات کو پیش کرنا چاہیے نہ کہ غیر ثقہ و غیر معترف و غیر مقبول روایات کی بنیاد پر اپنی رائے پیش کی جائے۔ تاریخ نویسی کے اصول و منابع کی وضاحت اور سیرت رسول، آنحضرت ﷺ کے حالات وسوانح عمری کے لیے دو ماخذ جلیل کا ذکر کیا گیا ہے۔

اول　　قرآن مجید

دوم　　اصول روایت و درایت سے ثابت شدہ روایات

قرآن مجید کو اولین مصدر سیرت نگاری ٹھہراتے ہوئے ولیم میور کا قول نقل کیا گیا ہے کہ؛

" اسلام کی ابتداء اور اس کے بانی کے مجازی احوال کی تمام تحقیقات میں قرآن ان کا مبنی اور معیار ہے"[2]۔

احادیث و روایات کے مستند ہونے اور محدثین و جامعین روایات کی صدق نیت، امانت و دیانت، محنت شاقہ اور دقت نظری کا ذکر کرتے ہوئے اصول اخذ روایات بیان کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں تقابلی طور

1　چراغ علی، مولوی، تعلیقات، (مطبع منشی اصغر علی لکھنؤ، ۱۸۷۲ء بار اول)، ص ۳-۴

2　ایضاً، ص ۱۱

پر اناجیل کے ضبط تحریر میں لائے جانے اور انجیلی روایات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے؛

"ان حالات سے ظاہر ہے کہ تاریخی واقعات اور ثبوت سمعیات مین ان کتابوں (اناجیل) کی روایتیں قطعی الصدور نہیں کیونکہ بخلاف اسنادوسقوط روایات و بلا ذکر ماخذ و بغیر ضبط قاعدہ استخراج جمع و تالیف کی گئیں ہیں"[1]

مسیحی مصنفین کے مصادرالقرآن کے ضمن میں اٹھائے گئے اعتراضات کہ آپ ﷺ نے سفر شام ویمن میں یہود اور عیسائیوں سے حاصل کردہ تعلیم نیز سرجیس(بحیرہ) راہب، سلیمان فارسی اور عیسائی غلاموں سے اخذ کردہ معلومات کو قرآن بنا کر پیش کر دیا، کا عقلاً و درایتاً رد کرتے ہوئے قرآن کلام الٰہی کے اثبات پر دس دلائل دیئے ہیں، اور معترضین کی غلط و بے اصل روایات کی تردید کی ہے۔

آخیر میں ماسٹر رام چندر کے رسالہ " اعجاز قرآن " کا بھی رد کیا گیا ہے۔ نیز ولیم میور، اسپرنگر کے تائیدی بیانات سے راڈویل اور واشنگٹن اورنگ کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

"تعلیقات" مختصر مگر جامع کتابچہ ہے۔ عربی و فارسی ملغوب تراکیب، مشکل بندشیں اور طویل جملوں پر مشتمل اس کا اسلوب تحریر بہت دقیق ہے۔ ذیل کی عبارت سے ان کا اسلوب واضح ہوتا ہے؛

"مضامین فرقانیہ (قرآن) کے اسلوب اور تنظیم اور فحوی و ترتیب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اول سے آخر تک اس کے مقاصد اور مآرب میں باہم توفیق اور منطوق و مفہوم میں باہم تطبیق ہے ۔ ذکر جلائل و نعوت الٰہیہ و بیان فضائل و محامد ربانیہ باہم متلائم اور براہین اثبات توحید و ابطال عبادت اثان باہم متماثل اور ذکر وعد و وعید و انذار و تبشیر باہم متشاکل اور حقائق و معارف ربانی اور مکارم اخلاق و نظام امور و مصالح عباد و احکام معاش باہم متماثل اور اس کے موضوع و منشاء عام ایسے باہم متقارب ہیں کہ ایک ہی صاحب رائے صائب و پختہ کار باوقار و سلیم القلب و غیر متزلزل کے رشحات قلم و نتائج فہم معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ ضروری اور بلزوم عقلی ثابت ہے کہ جس امر کی ترکیب میں اشخاص متعدد و وجوہ متکثر و اصحاب آراء متنوعہ و ارباب طبائع مختلفہ شریک ہوں گے ان کے منشات و مناظر و آراء و مدارک میں ضرور تخالف و تناقض ہو گا اور اس میں وحدت خیالات اور یگانگت منشاء نہ پائی جائے گی۔۔۔۔ (اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ) تنظیم قرآن میں کسی کی شرکت نہیں ہو سکتی اور شبہ منکرین و طعن مبطلین محض سخیف اور بالکل ضعیف ہے۔"

پادری صاحب نے جواب الجواب میں " تقلیقات التعلیقات" قلم بند کی تھی ۔

1 چراغ علی، تعلیقات، ص ۳۸

مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی   ازالۃ الاوہام (فارسی)

مطبع: سید المطابع، شاہجہان آباد(دہلی) ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء

صفحات: ۵۶۴

یہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی رد عیسائیت میں لکھی گئی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ زیر تبصرہ اشاعت کے حاشیہ پر مولانا آل حسن کی" کتاب الاستفسار" بھی چھپی ہے۔ صفحہ ۱۲۶ تا ۱۵۸ پر مشتمل باب اول فصل دوم پادری صاحبان کے قرآن کریم پر کردہ دس اعتراضات کے رد میں ہے۔ اس میں عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ الزامی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ " کید" کے عنوان سے مولانا پہلے قرآن پر کیے گئے اعتراض کو نقل کرتے ہیں پھر اس کا مدلل جواب ارقام فرماتے ہیں۔ ان اعتراضات کی تفصیل یہ ہے۔

کید اول   اعجاز و بلاغت قرآن پر اعتراض۔ ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۹

کید دوم   قرآن نفسانی خواہشات کو ابھارتا ہے۔ ص ۱۲۹

کید سوم   قرآن کریم بت پرستی کا تصور دیتا ہے۔ ص ۱۳۰ ۔ ۱۳۲

کید چہارم   نجات کفار مسیح میں نہ کہ قرآنی مذکورہ اعمال حسنہ پر۔ ص ۱۳۲ ۔ ۱۴۷

کید پنجم   اوقات صلوۃ و سوم پر اعتراض ص ۱۴۷ ۔ ۱۴۹

کید ششم   یہود کو ابن اللہ کہنے پر اعتراض ص ۱۴۹ ۔ ۱۵۰

کید ہفتم   مسئلہ طلاق ص ۱۵۰ ۔ ۱۵۱

کید ہشتم   تقدیر پر اعتراض ص ۱۵۱

کید نہم   آیات قرآنی میں تضاد کا اعتراض

کید دہم   قرآن کریم کا کتب سابقہ سے ماخوذ ہونے کا الزام

مولانا اعتراض کو عمومی الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نہ معترض کی نشان دہی کرتے ہیں نہ ہی ان کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، مثلاً

" گویند کہ قرآن خواہش ہائے روحانی رافع نمی کنند بلکہ خواہش ہائے نفسانی بخلاف انجیل کہ در آن مقتضیات روحانے[1]"

مولانا اس اعتراض کو سفید جھوٹ قرار دے کر معترض کی توجہ اس طرف دلاتے ہیں کہ قرآن میں ذات و صفات باری تعالیٰ اور اس کے علاوہ توکل و قناعت، صبر و عزیمت ایثار، جود و کرم، اور دیگر اخلاق حسنہ کا بیان موجود ہے جو ارفع روحانی صفات پیدا کرتا ہے۔ اور استفسار کرتے ہیں کہ روحانی صفات اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

---

1 کیرانوی، رحمت اللہ، محمد، ازالۃ الاوہام، (سید المطابع، شاہجہان آباد۔ دہلی) ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء)، ص ۱۲۹

بعد ازاں احکام کے اعتبار سے انجیلی کلام کا احادیث نبوی سے تقابلی ذکر کرتے ہیں کہ یہ خواہشات نفسانی کو کنٹرول کرنے والی تعلیمات ہیں۔ آخر میں الزامی اسلوب اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں؛

" قرآن مجید میں اس طرح کے احکام کہ "پاکوں کے لیے ہر چیز پاک ہے، مسیحؑ ہماری جگہ مورد لعنت بنا" اور اس طرح کے دیگر احکام جو مسیحیوں کے بزرگوار پولوس کے خطوط میں مندرج ہیں قرآن مجید میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ گمان اغلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن مجید میں اس طرح کے احکام پائیں کہ بول براز اور حالت حیض سے کوئی پرہیز نہیں کرنا چاہیے، حشرات الارض، جانور اور درندے سب چیزیں حلال ہیں، طہارت بدنی بے فائدہ ہے تو یہ لوگ یقیناً کہہ اٹھتے کہ قرآن مجید بھی کلام الٰہی ہے"[1]۔

مولانا علمی اسلوب میں ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور فریق مخالف کے اعتراض کے رد میں تاریخی وقائع اور بائبل کے بیانات سے مزین نقلی دلائل نقل کرتے ہیں جس میں بائبل سے حوالہ جات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ مثلاً ملائکہ کے سجدہ آدم کے قرآنی بیان پر اعتراض کے رد میں جہاں سجدہ کی توضیح کرتے ہیں وہیں عہد عتیق سے سترہ مقامات جہاں بغیر حکم الٰہی غیر اللہ کو سجدہ کا ذکر ہے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ حوالہ جات کی یہ کثرت مولانا کے بائبل کے گہرے مطالعہ اور رسوخ پر دلالت کا اظہار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے شاید مقابل سے زیادہ اس کی کتب میں درک رکھتے ہیں۔ بعض اوقات مختصر الفاظ میں جامع ترین جواب دیتے ہیں مثلاً یہ اعتراض کہ یہود پر حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنے کا قرآن کا فرد جرم عائد کرنا عہد عتیق کی رو سے غلط ہے، کے جواب میں مولانا مختصر جواب یہ دیتے ہیں کہ اگرچہ عہد عتیق میں حضرت عزیر کا ابن اللہ ہونا مذکور نہیں تاہم قرآن کریم اس دعویٰ کو عہد عتیق کی طرف منسوب نہیں کرتا بلکہ اس کی نسبت یہود کی طرف کی گئی ہے۔ اس وقت کے یہود مدینہ یہ عقیدہ فاسدہ رکھتے تھے۔ بلکہ یہود کا رسوم باطلہ میں مبتلا ہونا خود حضرت مسیحؑ سے بھی ثابت ہے۔ ضروری نہیں کہ جو چیز توریت میں مذکور نہ ہو۔ تو وہ یہود کا عقیدہ بھی نہ ہو۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیحؑ کی تصاویر اور مجسموں کی عبادت کا اعتقاد رکھتے ہیں، حالانکہ عہد جدید یعنی انجیل میں اس کا نشان تک نہیں ہے[2]۔

مؤلف فریق مخالف کی طرح معنی کشید نہیں کرتے بلکہ منقول عبارت سے مفہوم مخالف کی بجائے ظاہری معنی اور مفہوم ہی مراد لیتے ہیں۔ اپنی دیگر تصانیف کے برعکس اور مسیحیت پر تنقیدی ادب تک عدم رسائی کی بناء پر مولانا صرف بائبل تک ہی محدود رہتے ہیں*۔ جب کہ مخاطب کے سامنے نقد اسلام پر مبنی لٹریچر کے ساتھ ساتھ مسلم ادب بھی تھا، پھر بھی مولانا کا پلہ بھاری محسوس کیا جا سکتا ہے۔

---

1 کیرانوی، ازالۃ الاوہام، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰

2 ایضاً، ص ۱۴۴

* ڈاکٹر وزیر علی خاں سے اس وقت تک شناسائی نہ تھی جنھوں نے بعد میں مغربی کتب سے اخذ کردہ دلائل سے معاونت کی تھی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی   ازالۃ الشکوک*

جلد اول: مطبع مجیدیہ واقع آڈیہ پاڈم، گلی نمبر ۱۴، مدراس ۱۳۲۶ھ**

جلد دوم: انگپانایاک اسٹریٹ نمبر ۱۵۶، مدراس

صفحات: جلد اول ۲۰۸، جلد دوم ۵۰۸

اس کتاب کا دوسرا نام " سوالات کرانچی " بھی ہے[1]۔ کتاب ابواب بندی اور فصول کی تقسیم کے بغیر مسیحیوں کی طرف سے کردہ سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ تالیف خود مولانا کے بیان سے واضح ہوتی ہے۔

"(رحمت اللہ بن خلیل الرحمن) بھائی مسلمانوں کی خدمت مین عرض کرتا ہے کہ ۱۲۶۸ ھجری مطابق ۱۸۵۲ اٹھارہ سو باون عیسوی مین ایک قطعہ تیئس سوال کا جو دلی اور آگرہ وغیرہ مین مشتہر ہوا تھا، میری نظر سے گذرا اور پھر انہین سوالون کو ایک ہندی رسالے (بحث مفید العام فی تحقیق الاسلام) کے آخر مین مندرج پایا اور معلوم ہوا کہ مسیحیوں کی علت غائی اشتہار سے یہ ہے کہ کوئی ان کا جواب لکھے اس پر میرے دل مین آیا کہ میں لکھوں۔[2]

مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی پادریوں نے دین اسلام پر اعتراضات اور مسیحیت کی برتری پر مبنی ۲۳ اعتراضات پر مشتمل ایک سوال نامہ شائع کروایا تھا۔ بعد میں اس میں مزید چھ سوال شامل کر کے اسے مغلیہ تاجدار کے ولی عہد مرزا احمد فخر الدین کو بھیجا جس کے ذریعے اسے قبول عیسائیت کی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا نے ولی عہد کے کہنے پر ان ۲۹ سوالات کا جواب اپنی اس کتاب میں دیا ہے۔ جن میں سے قران کے متعلقہ سوالات کتاب میں مذکورہ نمبر کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں۔

سوال نمبر ۱   معجزات محمدی کس طور ثابت ہوں گے آیا قرآن شریف سے یا اور کتب سے؟ (ج ۱، ص ۵۳)

سوال نمبر ۲   ثبوت ان کا قرآن سے ضروری ہے کیونکہ معجزات انبیاء کے ان کی کتابوں سے ثابت ہیں (ج ۱، ص ۳۰۰)

سوال نمبر ۳   وہ معجزات جو قرآن میں مذکور ہیں آیا وہ معجزات ہیں یا بطریق اظہار عظمت الٰہی مرقوم ہیں۔ اگر بطریق اخیر لکھے ہیں تو ان کو پیغمبر صاحب سے کیا تعلق ہے؟ (ج ۱، ص ۵۶۱)

سوال نمبر ۷   قرآن میں لکھا ہے کہ پیغمبر کو معجزات کے اظہار کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ محض وعظ کے لیے۔ اس صورت میں باوجود بے اختیاری کے ان سے اظہار معجزات کا کیوں کر ہوا؟ (ج ۱، ص ۵۸۵)

---

* راقم محترم شاہجہان صاحب فیصل آبادی کا انتہائی مشکور ہے جن کے ذریعے اس کتاب کی دونوں جلدوں تک رسائی ہوئی۔

** ٹائٹل پر مرقوم اس طبع کے اندرونی صفحات پر احسن المطابع، مدراس لکھا ہوا ہے۔

1 ظفر، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے معاصرین، ص ۱۸۵

2 کیرانوی، ازالۃ الشکوک، ص ۴۔۵

سوال نمبر ۱۳ جامع قرآن فقط حضرت عثمان ہیں یا ان سے سابق حضرت ابو بکر بھی جامع ہوئے۔ (ج ۲، ص ۱)

سوال نمبر ۱۴ قرآن میں منسوخ آیتیں کیوں ہیں؟ (ج ۲، ص ۱۴)

سوال نمبر ۱۵ نسخ کا وعدہ کون سی آیت میں پایا جاتا ہے۔ (ج ۲، ص ۴۶)

سوال نمبر ۱۶ قرآن اگلی کتب سماوی کے مخالف کیوں ہے؟ (ج ۲، ص ۶۷)

سوال نمبر ۱۹ قرآن سے ثابت ہے کہ پیغمبر کے وقت کلام مجید سابق میں کچھ تحریف نہ ہوئی تھی۔ بعد ان کے اگر ہوئی ہو تو ثابت کرو؟ (ج ۲، ص ۴۷۷)

سوال نمبر ۲۰ کسی نے بچشم خود دیکھا کہ جبرائیل پیغمبر کے پاس وحی لاتا تھا۔ (ج ۲، ص ۴۸۰)

سوال نمبر ۲۱ کتب تاریخ کی جن کا تواتر قرآن کی طرح ثابت ہو اصلیت کو مانو گے یا نہیں؟ (ج ۲، ص ۴۸۱)

سوال نمبر ۲۲ کتب مذکورہ کی اصلیت میں شبہ کرنے سے کیا تم پر لازم نہیں آئے گا کہ قرآن کی اصلیت پر شبہ کرو؟ (ج ۲، ص ۴۸۳)

سوال نمبر ۲۳ کتب مذکورہ اور قرآن کے اختلاف میں سے کسے غلط کہو گے؟ (ج ۲، ص ۴۸۳)

سوال نمبر ۲۴ جب قرآن اور تواریخ دونوں تواتر سے ثابت ہیں تو اب بتلائے کہ دونوں میں شک کیجئے گا یا تواریخ میں یا اقرار کیجئے کہ قرآن کے مصنف حالات قدیمہ سے آگاہ ہی نہ تھے؟ (ج ۲، ص ۴۸۹)

سوال نمبر ۲۵ قرآن کو کلام اللہ تو مانے لیکن قرآن مروج کو جعلی اور محرف بتلائے کیونکہ اس میں نامعقول باتیں پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب کیا دیجئے گا؟ (ج ۲، ص ۴۹۰)

سوال نمبر ۲۶ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور ایک کتاب بنا کر کلام اللہ قرار دے اور کتب سابقہ متواترہ کو محرف کہے تو صدہا سال کے بعد اس کے معتقد کس وجہ سے تحقیق کریں گے کہ ان کے نبی والی کتاب اصلی ہے یا جعلی؟ (ج ۲، ص ۴۹۲)

ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے تحقیقی و الزامی دونوں اسلوب اختیار کیے ہیں۔ بعض سوالات کے بہت تفصیلی جوابات تحریر کیے گئے ہیں مثلاً پہلے سوال کہ معجزات محمدی کس طور ثابت ہوں گے آیا قرآن سے یا حدیث سے کے جواب میں ۲۴۷ صفحات پر محیط معجزات کے متعلق اصولی اور تفصیلی بحث ہے جس میں قرآن مجید سے بیس تفصیلی اور دس اجمالی معجزات کا ثبوت پیش کیا ہے[1]۔ یہ تفصیلی و قیع علمی بحث مولانا کے مطالعہ مسیحیت میں درک اور ان کے تبحر علمی پر دال ہے۔

---

1 کیرانوی، ازالۃ الشکوک، ص ۵۳۔۳۰۰

بعض سوالات کے مختصر جوابات ہیں مثلاً پچیسواں سوال قرآن مروجہ کو تاریخ اور عقل کے متصادم ہونے کی بناء پر جعلی گردانتے ہوئے اصلی قرآن اس کے سوا ہونے کے متعلق تھا۔ مولانا اس کے جواب میں رقم طراز ہیں:

" قرآن کے سارے مجموعہ میں اول سے آخر تک کوئی ایسی بات نہیں کہ الوہیت کے مناقص یا خدا کی صفات کمالیہ سے مخالف یا انبیاء کی نبوت کے منصب کے منافی ہو یا برہان عقلی قطعی کے برخلاف ہو۔ سو اولاً اس شخص سے ان باتوں کو جنہیں وہ نامعقول سمجھتا ہے اور تحریف کی دلیل بناتا ہے، دریافت کر کے برہان سے ثابت کیا جائے گا کہ وہ نامعقول باتیں نہیں۔ اور اے بھائی! بالکل تیرا زعم غلط ہے اور جب دلیل اس کی اٹھ گئی تو پھر ثانیاً ثابت کیا جائے گا کہ یہ قرآن لفظاً لفظاً رسول اللہ ﷺ کے عہد سے آج تک تواتر قطعی سے ثابت ہے۔ اور اس کی عبارت اعجاز اور بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر ہے۔ اس میں کلام بشری ممکن نہیں کہ مل کر کھپ جائے۔ سو جتنا یہ کلام ہے وہ سب کا سب منزل من السماء ہے اور اس کے حق میں خود خدا کا وعدہ یوں مرقوم ہے کہ " تحقیق ہم آپ اس کے البتہ نگہبان ہیں" یعنی ہر وقت میں زیادتی اور نقصان اور تبدیلی سے محفوظ ہے جیسا ان سب امروں کا بیان پہلے سوال کے جواب میں گزرا ہے۔ یہی وہ قرآن ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا تھا اور آج تک ویسا ہی بلا زیادت و نقصان اور تحریف کے پایا جاتا ہے۔ جیسا محمد ﷺ کے عہد میں تھا۔ اور قرآن کا حال ایسا نہیں جیسا عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کا ہے کہ ان میں بعض باتیں تثلیثی مفسروں کی تفسیر کے موافق الوہیت اور صفات کمالیہ کے منافی ہیں۔ اور بہت باتیں نبوت کے منصب کے مخالف ہیں جیسا کہ بعض پیغمبروں کا شراب کے نشوں میں متوالے بن کر دورات برابر اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا اور بعضے پیغمبروں کا گوسالہ پرستی کرنا اور کروانا، اور بعضے پیغمبروں کا نبوت کے بعد مرتدین بن کر بت پرستی کرنا اور بت خانے بنوانا اور بعضے پیغمبروں کا خود احکام تبلیغی اور وحی میں جھوٹ بولنا اور مانند ان کے۔ اور ان کی سند متصل نہیں، اور تواتر ینبغ سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں سے بعض کتب تو ایسی ہیں کہ خود اہل کتاب کے بڑے بڑے عالم اس کو جھوٹی کہانی بتلاتے ہیں۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کو ان کے عالم ایک ناپاک راگ اور راگ اوباشانہ واجب خراج کہتے ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں کہ چار سو برس تخمیناً تک مردود رہیں اور بعضی بعضے بڑے بڑے عالموں نے اسے ایک ملحد کی تصنیف بتلائی اور ان میں ہر قسم کی تحریف لفظی ہوئی جس کا اقرار اہل کتاب کے علماء سلفاً عن خلف کرتے چلے آتے ہیں۔ اور مخالف دوسری صدی سے چلاتے ہیں کہ عیسائیوں نے تین بار یا چار بار بلکہ اس سے بھی زائد اپنی انجیلوں کو بدلا ہے۔ اور ان میں یقیناً اختلافات معنوی اور غلطیاں بھی ہیں۔ اور خود ان کے علماء محققین کے اقرار کے موافق ہر معاملہ اور ہر گذارش ان کی الہامی بھی نہیں [1]۔

دوسری جلد کے آخر پر مصنف کے اکبر آباد میں مسیحی پادریوں سے کردہ دو مناظروں کے احوال و واقعات مندرج ہیں [2]۔

---

1 کیرانوی، ازالہ الشکوک، ص ۴۹۰۔۴۹۱

2 ایضاً، ص ۵۰۳۔۵۰۸

اس کتاب کا طرزِ تحریر پرانا ہے۔ عہد مذکورہ میں رائج معقولی اور الزامی اسلوب جھلکتا ہے۔ اسلام پر الزامات و اعتراضات کی بدلائل و شواہد مسکت نفی کی گئی ہے۔ ہر سوال کا نقلی و عقلی دلائل سے مزین جواب بائبل اور اس کے تفسیری بیانات سے استشہاد پر مبنی ہے جس میں مغرب کے ناقدین بائبل کی تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ مولانا نے بائبل اور کلیسیا کی اندرونی تاریخ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ کتاب میں پادری فینڈر کی "میزان الحق" اور اس کے رد میں لکھی گئی بعض تحریروں کا تذکرہ بھی جا بجا ملتا ہے۔ اکثر مقامات پر حواشی کا بھی التزام ہے جن سے مولانا کا نقطہ نظر قاری پوری طرح بغیر کسی دقت کے سمجھ لیتا ہے۔ مغربی شارحین بائبل کی آراء سے استدلال کیا گیا ہے۔

مولانا کی تمام تحریریں اپنی اپنی جگہ مستقل دستاویز کا مقام رکھتی ہیں لیکن راقم کی رائے میں دیگر تحریروں کی نسبت یہ زیادہ علمی اور وقیع ہے جو عام قاری کو آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ اگر ترتیب نو کے ساتھ اس کی اشاعت کی جائے تو مطالعہ مسیحیت کے طالب علموں کے لیے سرمایہ گراں مایہ ہو گا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اظہار الحق

مطبوعہ: ۱۲۸۱ھ (قسطنطینیہ)

ہندوستانی نژاد مصنف کی ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر لکھی اور شائع ہونے والی کتاب جو مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں مسلم نقطہ نظر کی نمائندگی کرنے والی معرکۃ الآراء اور نمایاں ترین تصور کی جاتی ہے وہ بزبان عربی "اظہار الحق" ہے۔ اگرچہ یہ برصغیر سے باہر لکھی اور شائع ہوئی مگر پھر بھی اسے برصغیر کی نسبت سے ہی جانا جاتا ہے اس کے بغیر برصغیر کا مطالعہ مسیحیت پر مسلم لٹریچر کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے باب ہذا میں شامل کیا جا رہا ہے۔ برصغیر کی تبشیری تاریخ میں مناظرہ آگرہ اہم موڑ تصور کیا جاتا ہے جس میں مسلمانوں نے خم ٹھونک کر اپنے مدمقابل کا سامنا کیا۔ اس مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے منادین ہند کے سرخیل پادری سی.جی فانڈر کو اس کے مؤقف کی نفی اور مسلم دعویٰ کا اقرار کروایا اس کی بازگشت سمندر پار تک مسیحی اور مسلم دنیا میں برابر سنائی دی[1]۔ جب مولانا ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء میں خلیفہ سلطان عبدالعزیز کی دعوت پر قسطنطنیہ گئے تو اس نے خواہش ظاہر کی کہ مناظرہ آگرہ الملقب بمناظرۃ الکبری کے موضوعات قلم بند کیے جائیں۔ اس پر مولانا کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً

---

1 شیخ رفاعی خولی لکھتے ہیں: "میں نے (اس) مناظرے کا حال مکہ مکرمہ میں ان بے شمار لوگوں سے سنا جو اس مناظرے کے بعد حج کے لیے آئے یہاں تک یہ بات تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی کہ پادری فنڈر اس میں مغلوب ہوا تھا"۔ (البحث الشریف علی حاشیہ اظہار الحق: ج ا ص ۵)

چھ ماہ (۱۶ رجب ۱۲۸۰ھ۔ آخیر ذی الحجۃ ۱۲۸۰ھ) کی قلیل مدت میں اسے قلم بند کیا[1]۔ یہ ایک طویل مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول — بیان و تفصیل کتب عہد و جدید

باب دوم — بیان و تفصیل اثبات تحریف انجیل

باب سوم — بیان و تفصیل اثبات نسخ انجیل

باب چہارم — بیان و تفصیل ابطال تثلیث

باب پنجم — قرآن کا معجزہ و کلام اللہ ہونا

باب ششم — اثبات نبوت محمدیہ اور پادریوں کے اعتراضات کی تردید

تحریف، تنسیخ اور تثلیث کے موضوع پر دستاویز کی حیثیت رکھنے والی اس کتاب کا پانچواں باب قرآن کریم کے کلام الہی ہونے کے اثبات میں ہے۔ یہ باب چار فصول پر محتوی ہے۔

پہلی فصل — ان امور کی تفصیلات جو قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

دوسری فصل — قرآن کریم پر پادریوں کے اعتراضات۔

تیسری فصل — احادیث کی صحت کا ثبوت۔

چوتھی فصل — احادیث پر بعض عیسائی علماء کے شبہات کا تجزیہ[2]۔

پہلی فصل میں فاضل مؤلف نے قرآن کریم کی بے شمار اعجازی وجوہات میں سے حوارین مسیح کی نسبت سے محض بارہ وجوہ ذکر کی ہیں۔ ہر ایک وجوہ کا انتخاب اور ان پر دلائل سے مولانا کے تبحر علمی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور وہ بذات خود اپنے اپنے موضوع پر مستقل تصنیف کی متقاضی ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب نے انہیں یوں بیان کیا۔

۱ قرآن حکیم بلاغت کے اس معیار پر ہے جس کی مثال انسانی کلام میں نہیں ملتی۔ اس ضمن میں مؤلف نے چھ دلائل اور بلاغت قرآنی کے کئی نمونے پیش کیے ہیں۔

۲ قرآن حکیم کا اسلوب ترکیب، آیات کا مربوط ہونا اور علم بیان کے دقائق اور عرفانی حقائق پر مشتمل ہونا۔ اس سلسلے میں مؤلف نے متعدد مثالوں سے مضمون کو واضح کیا ہے۔

---

1 "قد بدأت في تأليف هذا الكتاب سادس عشر من شهر رجب المنسلك في سنه الف ومائتين وثمانين من هجرة سيد الانبياء والمرسلين ﷺ (۱۶ ر۔ ۱۲۸۰ھ) وفرغت عنه في اخر ذى الحجة السنة فى المذكوره" بحوالہ ڈاکٹر محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی علمی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۸۱

2 ایضاً، ص ۱۹۹

۳ قرآن حکیم آنے والے واقعات کی ان پیشین گوئیوں پر مشتمل ہے جو سو فی صد درست ثابت ہوئیں۔ مؤلف نے اس ضمن میں ۲۲ (بائیس) پیشین گوئیوں کا حوالہ دیا ہے۔ نیز میزان الحق کے مؤلف کی طرف سے بعض پیشین گوئیوں پر اٹھائے گئے اعتراضات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

۴ قرآن حکیم ماضی کی خبریں پوری صداقت سے پیش کرتا ہے۔ اور جن امور میں قرآن حکیم نے دیگر کتب کی مخالفت کی ہے تو یہ مخالفت ارادی طور پر ہوئی ہے کیونکہ یہ کتب اصل شکل میں موجود نہ تھیں

۵ قرآن حکیم نے منافقین کی مخفی اور پوشیدہ باتوں کو واضح کر دیا ہے۔

۶ قرآن حکیم تمام علوم کا جامع ہے خواہ وہ اہل عرب کے یہاں رائج نہ تھے۔

۷ قرآن حکیم کے مضامین و مطالب میں اختلاف و تضاد نہیں ہے۔

۸ قرآن حکیم کا قیامت تک باقی و محفوظ رہنا مسلم ہے۔

۹ قرآن حکیم کی تلاوت سے دل اچاٹ نہیں ہوتا بلکہ تکرار سے ہر مرتبہ ایک نیا کیف محسوس ہوتا ہے

۱۰ قرآن کریم دعوے اور دلیل کا جامع ہے۔

۱۱ قرآن حکیم کا یاد اور حفظ کرنا آسان ہے اس کے مقابلہ میں انجیل کے حافظ نہ ہونے کے برابر ہوں گے

۱۲ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت جو خشیت اور ہیبت پیدا ہوتی ہے وہ اسی کا خاصہ ہے [1]۔

اس فصل کے اختتام پر تین فوائد بیان کیے ہیں۔

اول اللہ تعالی نے تمام انبیاء کو حالات کے مطابق معجزات عطا کیے ہیں۔

دوم قرآن حکیم ایک دم نازل نہ ہونے کی وجہ، حفاظت، تدریج احکام اور تقویت قلب تھا۔

سوم قرآن حکیم میں تکرار کی وجہ اس کا اعجاز اور اسلوبِ تبلیغ تھا [2]۔

دوسری فصل میں قرآن مجید پر عیسائی علماء کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اظہار الحق تالیف کرتے وقت مسلم کتب کے ساتھ ساتھ مسیحی بنیادی کتب بھی مولانا کے پیش نظر تھیں جس سے ان کی دقت نظری کا اظہار ہوتا ہے۔

۱ خمسہ موسوی کا عربی ترجمہ جس کو ولیم واٹسن (William WATSON) نے لندن سے طبع کیا مطبوعہ ۱۸۴۸ء جو نسخہ مطبوعہ روما ۱۲۶۴ھ کے بعد طبع کیا گیا۔

۲ عہد عتیق و جدید کی تمام کتب کا عربی ترجمہ جس کو ولیم واٹسن نے ۱۸۴۴ء میں طبع کیا۔

۳ عہد جدید کا ترجمہ عربی زبان میں بیروت میں ۱۸۴۴ء میں طبع ہوئی۔

---

1 ڈاکٹر محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی علمی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۹۹۔ ۲۰۰

2 ایضاً

۴ بائبل کی تفسیر جو آدم کلارک نے لکھی اور ۱۸۰۱ء میں لندن سے طبع ہوئی۔

۵ [Introduction to the critical study and knowledge of the holy bible] نامی بائبل کی تفسیر جو ہورن [T.H.Horne] نے لکھی جو ۱۸۲۲ء میں لندن میں تیسری بار طبع ہوئی۔

۶ ہنری اور اسکاٹ [Henry & Scott] کی تفسیر [A Commentry upon the Holy Bible] مطبوعہ لندن ۱۸۲۷ء (چھ جلدیں)

۷ لارڈنر [N. Londner] کی تفسیر لندن ۱۸۴۸ء جو دس جلدوں میں ہے۔

۸ ہارسلے [S.Horseley] کی ۱۸۴۰ء میں طبع شدہ تفسیر بائبل

[Biblical Criticism on the first fourceen historical books of the old testament]

۹ واٹسن [watson] کی ۱۸۴۸ء کی طبع شدہ تفسیر بائبل

[explanatory and practical to the holy bible

۱۰ ڈل آئلی رچرڈ منٹ [Doyly & Richerd Mant] کی تفسیر بائبل جو لندن میں ۱۸۴۸ء میں طبع ہوئی

۱۱ پروٹسٹنٹ فرقہ کا بائبل ترجمہ انگریزی مہر شدہ مطبوعہ ۱۸۱۹ء، ۱۸۳۰۔۱۸۳۱، ۱۸۳۶

۱۲ عہد عتیق وجدید کا ترجمہ انگریزی جو رومن کیتھولک کا کیا ہوا ہے۔ مطبوعہ ڈبلن ۱۸۴۰ء [1]

برصغیر میں مسیحی لٹریچر کی کم دستیابی کے باوجود اتنے مصادر سے اخذ و استفادہ نے کتاب کی اہمیت کو دوچند کر دیا ایورل پاؤل کے مطابق مولانا دو طرح کے طرز استدلال اپناتے ہیں ،

"The first of these was the refutation of the doctrine of the trinity on rational grounds , and the second the charge that the Christian scriptures had been altered at various times in history and therefore were not divinely inspired [2].

کتاب کے عمومی جائزہ سے سامنے آتا ہے کہ اس میں واضح اور سادہ اسلوب کے ساتھ الزامی، عقلی، تحقیقی استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ کتاب کا اصل مخاطب پروٹسٹنٹ فرقہ ہے جب کہ کیتھولک کا تذکرہ ضمناً ہے۔ طرز تخاطب میں متانت اور شائستگی نمایاں ہے۔ جواب دیتے وقت مولانا مدافعانہ موقف اختیار کرنے کی بجائے حریف کو دفاعی قدموں پر لے گئے۔ بقول سید ابوالحسن علی ندوی ؛

---

1 ڈاکٹر محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی علمی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ،، ص ۱۸۷، ۱۸۸

2 Powell, Muslims and Missionaries an Pre-Munitiny India. p

"مؤلف نے دفاعی مؤقف کی بجائے حملہ آور ہونے کا مؤقف اختیار کیا اور یہ بہت ہی کارآمد ہوتا ہے کہ حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا جائے اور اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہو اور اپنی صفائی پیش کرے، پہلے علماء نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا اور تورات و انجیل اور قرآن کو ہم پلہ سمجھ کر گفتگو کرتے تھے اس طرح ان قدیم صحیفوں کو وہ اہمیت حاصل ہو جاتی تھی جس کے وہ حقیقتاً مستحق نہ تھے ۔۔۔ شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ نے بہت مناسب قدم اٹھایا تھا کہ اپنی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح " میں جارحانہ موقف اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اہل تحقیق علماء کے نزدیک تورات و انجیل کی حیثیت دوسرے تیسرے درجہ کی احادیث و سیرت کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے اور نہ ان صحیفوں کی ثابت شدہ سند ہے ۔۔۔ مولانا نے بہت گہرائی کے ساتھ ان صحیفوں کا مطالعہ کیا اور اس کی تہہ کو پہنچ گئے"[1]۔

مصنف کے مطالعہ مسیحیت میں وسعت اور درک کا اظہار بکثرت پیش کیے جانے والے شواہد و دلائل سے ہوتا ہے؛

" مولانا نے ہر ایک مسئلہ کی دلیل اور ہر ایک سوال کا جواب اس بسط اور تفصیل سے دیا ہے کہ کہیں بیں بیں، چالیس چالیس دلیلیں اور حوالے دیکر بھی بس نہیں کی اور اچھی طرح دروغ گو کو اس کے گھر تک پہنچا دیا ہے"[2]۔

اظہار الحق کا جواب ہندوستان میں تو سامنے نہیں آیا البتہ مصر سے ۶ جلد میں " الھدایۃ "کے نام سے عربی زبان میں سامنے آیا جس پر مطبع یا مقام اشاعت درج نہیں تھا۔ اس کا جواب الجواب ایران سے دو جلدوں میں "الھدیٰ الی دین المصطفیٰ" کے نام سے لکھا گیا جو لبنان میں طبع ہوا۔ اس مسلم تحریر کا مسیحی فریق کی طرف سے قلمی جواب ایران میں مصنف کو بھیجا گیا۔ اُس قلمی تحریر کا جواب رسالہ "التوحید و التثلیث " کے نام سے دیا گیا۔ اظہار الحق پر ایک علمی ردِ عمل یہ ہوا کہ پادریوں کی ایک جماعت نے " میزان الحق فی الدیانۃ المسیحیۃ "کے نام سے جواب شائع کیا، جس کا جواب علی بن عبداللہ علی الجرانی(۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) نے لسان الصدق علی میزان الحق کے نام سے دیا۔ اسی طرح اظہار الحق کی پہلی اشاعت مطبوعہ ۱۲۸۴ھ /۱۸۶۸ء کی بعض مباحث کا جواب پادری فانڈر صاحب کے بعد میزان الحق، مطبوعہ ۱۹۶۲ء میں دیا گیا ہے[3]۔

ڈیڑھ صدی گذرنے کے باوجود اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے اور مسلم علماء متواتر اس سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔

---

1 ڈاکٹر محمد عبداللہ، ص ۲۰۳۔۲۰۴، بحوالہ: ندوی، ابوالحسن، سید، اظہار الحق اور اس کے مؤلف مولانا رحمت اللہ کیرانوی، (مترجم: عبداللہ عباس ندوی)، ذکر و فکر (دہلی)

2 کیرانوی، اظہار الحق، ج۳، ص ۳۲۴

3 ڈاکٹر محمد عبداللہ، رحمت اللہ کیرانوی اور ۔۔۔ ص ۲۱۱؛ میزان الحق، (لاہور ۱۹۶۲ء، بار دوم،) ص ۱۴۹، ۲۸۸

مولانا رحمت اللہ کیرانوی   اعجاز عیسوی الملقب بمصلقہ تحریف

مطبع منعمیہ چھیلی اینٹ محلہ اکبر آباد، آگرہ ۱۲۷۱ھ، صفحات: ۲۰۲

اشاعت نو: ادارہ اسلامیات، کراچی، ۱۴۰۴ھ

صفحات: ۷۷۶

(تبصرہ میں اشاعت نو مد نظر ہے)

دو حصوں پر مشتمل اس کتاب کا موضوع تحریف بائبل اور دفاع قرآن ہے۔

حصہ اول   مقدمہ، چار چار فصول پر محتوی تین تین مقاصد اور خاتمہ پر بنی ہے۔

حصہ دوم   پادری فینڈر کی کتاب میزان الحق کے باب اول کی تیسری فصل کا جواب

پیش لفظ میں سبب تالیف اور اہم ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ ص ۱۳۔۱۹

مقدمہ تین فصول میں منقسم ہے۔ ص ۲۰۔۷۹

مقصد اول   حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتب، ص ۸۱۔ ۱۴۵

مقصد دوم   تورات کے سوا عہد عتیق کی دوسری کتابیں، ص ۱۴۷۔۳۶۸

مقصد سوم   عہد جدید کی کتابیں، ص ۳۶۹۔۵۳۸

حصہ دوم   میزان الحق کا جواب ص ۵۳۹۔۷۴۵

خاتمہ   ص ۷۴۷۔ ۷۷۶

کتاب کا موضوع بائبل میں تحریف لفظی کا اثبات گردانا گیا ہے۔ حصہ اول تحریف بائبل پر بڑی عرق ریزی اور تحقیق سے مدلل و مسکت بحث پر مبنی ہے۔ مقدمہ کی فصل اول میں مصنفین عہد عتیق پر بحث کی گئی ہے اور فصل دوم میں عہد جدید اور اس کے مصنفین پر سیر حاصل گفتگو ہے ثقاہتِ عہد جدید پر گفتگو کرتے ہوئے کلیسیائی مجالس بھی زیر بحث لائی گئی ہیں۔ مولانا نے فصل سوم میں کتب مقدسہ میں تحریف کے نو اسباب ذکر کیے ہیں جس میں مسیحی تحریروں سے استشہاد کیا گیا ہے

مقصد اول کی پہلی فصل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب وہ کتابیں زیر بحث لائی گئی ہیں جو آج کل کتب مقدسہ کا حصہ نہیں ہیں۔ جب کہ دوسری فصل میں مروجہ توریت کی کتب خمسہ کو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ حضرت موسیٰ نے لکھیں نہ لکھوائیں، تیرہ ٹھوس دلائل پیش کیے ہیں۔ فصل سوم میں بائبل کے عبرانی، سامری

اور یونانی نسخوں میں اختلافات پر گفتگو کرتے ہوئے تیئس(۲۳) ناقابل تطبیق اختلافات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ فصل چہارم میں کتب مقدسہ کی روایات میں چودہ تاریخی اختلافات گنوائے ہیں۔

مقصد دوم کی فصل اول میں گم شدہ اور جمہور عیسائیوں کے نزدیک غیر معتبر کتب پر گفتگو کی گئی ہے۔ فصل دوم میں عہد نامہ عتیق کی بعض اہم کتب میں الحاقی متن زیر بحث لایا گیا ہے۔ فصل سوم میں اکتیس (۳۱) شواہد و نظائر کے ساتھ بائبل میں تحریف کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ فصل چہارم میں روایات کے باہمی تضاد و اختلاف کی ایک سو پینتیس (۱۳۵) مثالیں دی گئی ہیں۔ تنبیہات کے عنوان سے تاریخ بائبل پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے۔

مقصد سوم میں عہد جدید کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں دلائل تحریف، مسیحی اعترافاتِ الحاق و تحریف، تضادات و اختلافات پر شواہد و نظائر سامنے لائے گئے ہیں۔ نیز انبیاء اور حواریوں کے بارے مسیحی اقوال اور ان کی غیر الہامی تحریروں کے اعتراف اور ان کی غلطیوں کا ذکر کیا ہے۔ مسیحی دعویٰ کے رد میں سب سے اہم بحث یہ ہے کہ کرامات اور روح القدس سے مستفیض ہونا نبوت کی دلیل نہیں۔ اس پر عہد نامہ جدید سے چار اور عہد نامہ قدیم سے دو بیانات پیش کیے ہیں۔

اس کتاب کے معرکۃ الآراء حصہ دوم میں پادری فانڈر کی طرف سے " میزان الحق " کے باب اول کی تیسری فصل میں واردہ قرآن مجید پر اعتراضات واتہامات کا جواب دیا گیا ہے۔ مسیحی دعویٰ تحریف قرآن کے رد میں الزامی و تحقیقی دونوں اسلوب میں جواب دیا ہے۔

> "پادری صاحب کہتے ہیں کہ واضح ہو کہ مسیحی لوگ بطریق اولیٰ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں تحریف پائی جاتی ہے۔ اور یہ قرآن جو محمدیوں میں اب مروج ہے اصل قرآن نہیں' ہم کہتے ہیں کہ پادری صاحب نے دعویٰ تو منہ بھر کے کیا ہے مگر افسوس کہ اپنے اس دعویٰ کو ادنیٰ سے قابل التفات طریقے سے بھی نہ ثابت کر سکے چنانچہ لے دے کے اس سلسلہ میں ان کی قوت پرواز اتنی ہے کہ یوں ارشاد کیا" کیونکہ پہلے تو اسے ابو بکرؓ نے اکٹھا کیا اور مرتب کیا۔ پھر عثمانؓ نے دوبارہ ملاحظہ کرکے اصلاح دی ہے حالانکہ شیعی لوگ ان کو کافر اور بے دین جانتے ہیں"[1] ۔

معترض کی بعض شاذ آراء سے پیش کردہ شواہد کو اسی قبیل کے شواہد سے رد کیا ہے۔ اور الزامی جواب کے طور بائبل کے متعلق مسیحی فرقہ ابیونیہ، مارسیونیہ اور مانی کیز کا مختلف فیہ عقیدہ بیان کیا ہے۔ تحقیقی جواب کے حوالے سے اپنے دعویٰ کے اثبات میں ایمان صحابہ پر بارہ قرآنی نصوص پیش کیے ہیں۔ شیعہ روایات سے بھی استشہاد کیا گیا ہے[2]۔

تدوین قرآن پر پادری صاحب کے مسلم روایات سے کردہ اعتراضات کا رد جس طریق سے کیا ہے وہ مولانا کا ہی خاصہ ہے۔ مولانا نے عدم تحریف بائبل پر قرآنی استشہاد کی وضاحت کرتے ہوئے پادری صاحب کے استدلال کی

---

1 کیرانوی، رحمت اللہ، مولانا، اعجاز عیسوی الملقب بمصلحۃ تحریف، (ادارہ اسلامیات، کراچی، ۱۴۰۴ھ)، ص۵۵۹

2 کیرانوی، اعجاز عیسوی، ص۵۶۰۔۵۹۲

باحسن تغلیط کی ہے اور الزامی طور پر کتب مقدسہ کے متعلق تحریف سے محفوظ ہونے کے دعویٰ اور اس کی حقیقت کا جائزہ لیا ہے۔ متن بائبل میں نقص وزیادتی واضح کرتے ہوئے متن قرآن کے محفوظ ہونے کو ثابت کیا ہے۔

" ہاں اگر قراءت کے یہ اختلاف ایسے ہوتے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک ہی عبارت نازل ہوتی اور آنحضرتؐ نے بھی اس کو ایک ہی طرح پڑھا ہوتا اور پھر لوگ اس کو آنحضرتؐ کے بعد بدل ڈالتے اور اپنی طرف سے دوسری عبارتیں بنا کر پڑھنے لگتے نیز قرآن کی عبارت تواتر سے بھی منقول نہ ہوتی بلکہ وہ لوگوں کی عبارتوں کے ساتھ مل کر اس طرح خلط ملط ہو جاتی کہ قرآن کی عبارت اور لوگوں کی عبارت کے درمیان امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا تو البتہ اعتراض کی گنجائش ہو سکتی تھی اور پادری صاحب کا مذکورہ دعویٰ کسی حد تک درست قرار پا سکتا تھا۔ لیکن قرآن کی عبارت میں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے۔ یہ سعادت تو صرف عہد عتیق اور جدید کے حصہ میں ہی آچکی ہے۔ یعنی ان میں عبارت کے ایسے اختلافات موجود ہیں جن میں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے کون سی عبارت اصل مصنف کی ہے اور کون سی عبارت ملحدوں، کاتبوں کے ذریعے یا دیندار مسیحیوں کے طفیل نسخوں میں داخل ہوئی ہے"[1]۔

پادری فانڈر صاحب کے مولانا آل حسن کی کتاب "استفسار" پر کردہ اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تردید بھی کی گئی ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر مسیحی مذہب کی تاریخ اور بائبل کے مختلف نسخوں کا باہمی تقابل اس کی علمی وقعت دو چند کر دیتا ہے[2]۔

عہد متذکرہ کے مناظرانہ اسلوب کی حامل اس تصنیف نے مسیحی حلقوں میں کھلبلی مچا دی۔ پادری ٹھاکر داس نے دو جلدوں میں " اظہار عیسوی "(امریکن یونائیٹڈ پریسبٹیرین مشن پریس، لکھنؤ ۱۸۸۱ء) کے نام سے اس کا جواب لکھا جو مولانا کی وفات کے بعد ۱۸۸۱ء میں سامنے آیا۔ پادری عماد الدین نے " تحقیق الایمان " میں اس کے بعض مباحث کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جن کی سطحیت بجائے خود مولانا کے علمی تفوق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خان بہادر رحیم بخش ابن مریم

لاہور، س ن

صفحات: ۱۶۸

مصنف دنیاوی اعتبار سے ڈسٹرکٹ و سیشن جج اور دینی مباحث سے خاطر خواہ دلچسپی رکھنے والے تھے۔ زیر نظر رسالہ میں وہ تمام قرآنی آیات درج کی گئی ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر مذکور ہے۔ وہ اس کتاب میں ذکر کرتے ہیں کہ ان کی دوسری تصانیف بھی قرآنیات کے بارے ہیں، جس میں " قرآن اور ایک غلط فہمی کا

1 کیرانوی، اعجاز عیسوی، ص ۶۰۲

2 ایضاً، ص ۴۴۴-۴۸۰

ازالہ" اور" گلدستہ معانی" شامل ہیں[1]۔

زیر نظر کتاب میں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے درج ذیل تین اہم مگر اختلافی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

ا۔ آیا حضرت عیسی علیہ السلام بغیر باپ پیدا ہوئے؟

۲۔ کیا ان کو صلیب پر چڑھایا گیا یا آسمان کی طرف زندہ اٹھایا گیا؟

۳۔ کیا ان کی موت واقع ہو چکی ہے؟

مصنف دوران بحث جن تفسیری اصول کی متابعت کرتے ہیں انہیں آغاز ہی میں بیان کر دیتے ہیں اور سلف کی راہ سے دور نہیں ہٹتے۔ اس ضمن میں شاہ عبد العزیز کے بیان کردہ یہ تین تفسیری اصول آپ نے نقل کیے ہیں۔

اول یہ کہ (قرآن کے) ہر کلمہ کو حقیقی معنوں پر محمول کرنا چاہیے۔ یا مشہور اور متعارف مجازی معنوں پر یعنی دیکھنا کہ وہ کلمہ اس جگہ اپنے حقیقی اور اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا بطور مجاز یا محاورہ کے

دوم یہ کہ اس کلمہ کے سیاق وسباق اور کلام کے نظم کو اول سے آخر تک نگاہ میں رکھنا چاہیے۔

سوم نزول وحی کے گواہوں (صحابہ کرام) کا فہم اس تفسیر کے مخالف واقع نہ ہو۔

پھر لکھتے ہیں؛

" اگر (دوران تفسیر) ان تینوں میں سے ایک فوت ہو جائے اور دوسرے دو باقی ہیں تو اس کو تاویل کہتے ہیں اور اگر پہلی شق یعنی اصلی و مجازی معنی فوت ہو جائے لیکن دوسری اور تیسری باقی رہیں تو اس کو تاویل قریب کہتے ہیں اور اگر دوسری شق (یعنی سیاق وسباق) فوت ہو جائے اور پہلی اور تیسری باقی رہیں یا تیسری فوت ہو جائے (یعنی جو کہ رسول اللہ یا اصحاب سے مروی ہے) لیکن پہلی اور دوسری باقی رہیں تو ان دونوں صورتوں کو تاویل بعید کہتے ہیں اور اگر تینوں فوت ہو جائیں تو اس کا نام تحریف ہے[2]۔

مصنف کے مد نظر بیک وقت دو پہلو ہیں۔

ا تردید نصاریٰ

۲ اعتراضات نصاریٰ کے زیر اثر حضرت عیسیٰ کے متعلق پیدا ہونے والے مختلف فیہ نظریات خصوصاً سر سید احمد خاں اور احمدی (قادیانی اور لاہوری) گروہ کے نظریات کی تردید۔

---

1 اول الذکر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کریم شروع سے آخر تک مربوط اور مرتب ہے اور اس کی تعلیم میں تدریجی ارتقاء ہے قرآن کریم میں ترتیب الفاظ بھی معجزے سے کم نہیں اور ثانی الذکر میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر ترتیب الفاظ کو مد نظر رکھا جائے تو بعض مسائل قرآنیہ کے سمجھنے میں نہایت آسانی ہو جاتی ہے خاص کر اختلافی مسائل میں۔ خان بہادر، رحیم بخش، ابن مریم، (لاہور، س ن) ص ۲،۳

2 ایضاً، ص ۴۔۵

مؤلف نے ۱۵۰ آیات (بتکرار) اپنے دعویٰ، تائید، نظیر اور استشہاد کے طور پر نقل کیں ہیں۔

ابتداء میں بعض آیات سے معجزہ کی توضیح کی ہے جن میں لفظ "آیۃ" مذکور ہے۔ "ولادت مسیحؑ کے متعلق قرآن اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ کا نکتہ نظر" کے زیر عنوان پیدائش عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآنی اور انجیلی بیانات مع تفسیری اقوال نقل کی ہیں۔ اور ساتھ ہی سر سید اور احمدی نقطہ نظر کی تغلیط بھی کی گئی ہے[1]۔

اگلی بسیط بحث "رفع الی السماء" کے موضوع پر ہے جو صفحہ ۳۵ تا ۸۸ تک ممزوج ہے۔ اور آخری بحث "معجزات عیسیٰ" سے متعلقہ ہے۔

قرآنی بیان کی توضیح کے ساتھ ساتھ اس پر وارد اگر کوئی مسیحی اعترض ہو تو اس کے جواب میں الزامی اسلوب اپناتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیمؑ کے سامنے پرندوں کو زندہ کرنے کا قرآنی واقعہ " وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ ٱلطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ ٱجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ٱدْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَٱعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ"[2] کی بحث میں رقم طراز ہیں :

> " بعض عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ مردے دنیا میں زندہ نہیں ہوتے خود بائبل کے خلاف ہے۔ دیکھو کتاب حزقیل میں سینکڑوں مردوں کا زندہ ہونا مذکور ہے۔ اور کتاب تاریخ ۲ کے تیرھویں باب اور ۲۱ درس میں ہے کہ المسیع نبی کی قبر میں لوگوں نے ایک مردہ کو ڈال دیا اور جب وہ شخص گر گیا اور المسیع کی ہڈیوں سے لگا تو جی اٹھا"[3]۔

یہ کتاب مصنف کی تفسیر و علوم قرآن پر گہری نظر کی شاہد ہے۔ تحریر شستہ، اسلوب لایعنی تاویلات سے پاک، اور قوت استدلال و طریق استشہاد اتنا سادہ اور آسان کہ دقیق فنی مباحث سے ناآشنا قاری بھی بسہولت مستفید ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد رکن الدین　　اصول بطلان مذہب عیسوی مع ثبوت نبوت

مطبع خزینۃ الدرر، لکھنؤ ۱۸۷۵ء

صفحات: ۲۴

برصغیر میں مسلم مسیحی مناظراتی ادب کا ایک پہلو فریقین کا ایک دوسرے کی مذہبی حیثیت تسلیم کرنے کو تیار نہ ہونا ہے، جس کی ایک مثال زیر نظر کتابچہ ہے۔ اس سے عہد متذکرہ میں جاری مناظروں میں حدت کا بھی بخوبی

1　رحیم بخش، ابن مریم، ص ۲۹

2　البقرۃ ۲ : ۲۶۰

3　رحیم بخش، ابن مریم، ص ۹۶

اندازہ ہو جاتا ہے۔

مصنف تمجید و تقدیس باری تعالیٰ کے ان الفاظ میں آغاز کرتے ہیں؛

"گوناں گوں تحمید اس خدا کو لائق ہے جو تثلیث کی تہمت سے منزہ اور عیوب ترکیب و تجسیم سے مبرا ہے اور بو قلموں توصیف اور خاتم النبیین سید عالم کو زیبا ہے جسکے مبشر خدا نے انبیاء سابقین کو بنایا"[1]۔

مؤلف کے پیش نظر مسلم اور مسیحی دونوں مخاطب ہیں جیسا کہ وہ اس تحریر کے مقصد میں بیان کرتے ہیں کہ

"اول کم علم اور ناواقف اہل اسلام اس کے مطالعہ سے اپنے مذہب حق پر قائم رہیں اور پادری صاحبان کے دھوکوں سے اپنے عقائد میں متزلزل نہ ہوں اور اپنے عقائد پر ثابت قدم رہیں۔ دوسرا یہ کہ شاید کوئی عیسائی بھائی اس کے ملاحظہ سے حق و باطل میں تمیز کر کے راہ راست پر آجائے"[2]۔

ابتداء میں کسی مذہب کو پرکھنے کے لیے تین اصول بیان کیے گئے ہیں۔

امر اول ذات باری تعالیٰ کو پہچاننا

امر دوم نجات عقبیٰ کا طریقہ معلوم کرنا

امر سوم گناہ اور ثواب کو پہچان کر گناہوں سے بچنا[3]

بعد ازاں ان امور پر بائبل کے بیانات کو پرکھا گیا ہے۔ پہلے امر معرفت ذات باری تعالیٰ میں تثلیث کو پرکھتے ہوئے سوال کیا گیا ہے؛

"بھلا اگر خدا کی ذات میں تثلیث جائز ہے تو تربیع اور تخمیس اور تسدیس وغیرہ کیوں ممنوع ہیں اور اگر خدا مسیح کی عبودیت میں اپنی الوہیت ملا سکتا ہے تو رام چندر، کرشن اور اگنیش اور مہادیو وغیرہ کے اجسام میں کیوں بطور اوتار کے نہیں آسکتا"[4]۔

مذہب کو پرکھنے کے دوسرے امر طریقہ نجات کی بحث میں عقیدہ کفارہ کی تردید کی گئی ہے اور استفسار کیا گیا ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ گناہوں کا شفیع یا کفارہ انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ پاک نہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مسیح کی الوہیت کفارہ ہو کر جہنم گئی یا عبودیت۔ اگر الوہیت کہیں تو وہ صلیب پر لٹکنے، مرنے اور دوزخ کا عذاب پانے سے پاک ہے اور اگر عبودیت کہیں تو پھر مسیح کی کیا خصوصیت دوسرے انبیاء و صلحاء میں بھی ویسی عبودیت پائی جاتی

---

1 رکن الدین، محمد، اصول بطلان مذہب عیسوی مع ثبوت نبوت، (مطبع خزینۃ الدرر، لکھنؤ ۱۸۷۵ء)، ص ۲

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۳

4 ایضاً، ص ۶

ہے۔ تیسرے امر گناہ اور نیکی کی پہچان میں اس مسیحی عقیدہ کی تغلیظ کی گئی ہے کہ کوئی انسان خواہ نبی ہو خواہ ولی گناہ سے پاک نہیں اور کوئی نیکی نہیں کر سکتا[1]۔

یہ رسالہ اس دور کی الزامی اسلوب کی حامل مناظرانہ روش پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ بین السطور رد عمل پر مبنی رویہ صاف عیاں ہے۔ تحریر میں شدت جذبات کی جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن سوقیانہ اور استہزائیہ اسلوب کو قطعاً راہ نہیں دی گئی۔ فریق مخالف پر بدلائل عقلی اصولی گرفت کی گئی ہے۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری   برہان

مطبوعہ: کیلسن پرنٹنگ پریس، لاہور س ن

صفحات: ۲۴

دراصل یہ برصغیر میں مسیحیت پر قلم اٹھانے والی ایک عظیم شخصیت قاضی سلیمان منصورپوری کا ایک خط ہے جسے انہوں نے بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ایک پادری صاحب کے خط کے جواب میں ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء بمقام بٹھنڈہ تحریر کیا تھا*۔ پادری صاحب نے یہ خط پرچہ " المسلم " میں ایک تحریر پڑھ کر لکھا تھا۔ قاضی صاحب نے پادری صاحب کا مکمل خط بدون اسم نقل کیا ہے۔ پھر اس میں پوچھے گئے چار سوالات کے جواب تحریر فرمائے ہیں۔ پادری صاحب نے متانت و علمی اسلوب کی حامل تحریر میں اپنے کچھ اشکالات کے بارے استفسار کیا ہے اور مسیحی اہل قلم کی دل آزار کتب " امہات المومنین "، " تعلیم محمدی "، " تاریخ محمدی "اور اس قبیل کی دیگر کتب سے اظہار براءت کرتے ہوئے اپنے آپ کو توریت وانجیل کا پابند قرار دیا[2]۔

خط کا نمایاں مضمون، پادری صاحب کا رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اقرار ہے جس کا اظہار قاضی صاحب نے اپنے خط کے شروع میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> " خط کے شروع میں آپ نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ آنحضرت ﷺ کی نبوت کے منکر نہیں۔ آپ ﷺ کی شریعت کو بھی شریعت تسلیم کرتے ہیں۔ یہ جملہ امور جناب کی تحریر سے صاف نمایاں ہیں اور مخاطب کو راقم کی منصفانہ رویہ کا تیقن دلانے کے مؤید ہیں"[3]۔

---

1 رکن الدین، محمد، اصول بطلان مذہب عیسوی، ص ۱۲۔۱۳

* پادری صاحب کا خط یکم اگست ۱۹۱۴ کو لکھا گیا تھا لیکن قاضی صاحب اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ کاغذات میں اِدھر اُدھر ہونے کی وجہ سے وہ فوراً خط کا جواب نہ دے سکے۔ بعد ازاں دستیاب ہونے پر جواب لکھا ہے

2 منصورپوری، محمد سلیمان سلمان، قاضی، برہان، (کیلسن پرنٹنگ پریس، لاہور س ن)، ص ۳

3 ایضاً، ص ۴

پادری صاحب کے خط سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ رسول پاک ﷺ کو خاص عربوں کی طرف مبعوث خیال کرتے ہیں اور شریعت محمدیہ کو انسانی ضروریات کا نمونہ قرار دیتے ہیں۔

" محمد (ﷺ) صاحب انسانی ضروریات کا نمونہ ہے اور اس لیے اس کے خاصے نہ صرف عبادت اللہ کی بابت ہیں جیسا تہجد وغیرہ بلکہ انسانی خواہشات کی بابت بھی یعنی محمد (ﷺ) صاحب بر خلاف دین مشرکان دین انبیاء سابقہ کی طرف داعی ہیں اور اس زمانہ میں عمدہ سائیز پر کرست ہونے کا نمونہ ہیں لیکن مسیح الٰہی قدرت و صبر و کمال کا معلم ہیں۔۔۔ گویا یہی ہوا کہ شریعت موسیٰ عبرانی اور شریعت محمد عربی، دونوں ابراہیم کی نسل سے چلیں۔ لیکن فضل و کمال مسیح سے ملاتا کہ خاکی انسان الٰہی خصلت تک پہنچے"[1]۔

یوں پادری صاحب شریعت محمدیہ کو افضلیت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مشروط کرنے کے بعد تسلیم کرتے ہیں۔ مصنف نے ان کے اس نظریہ کو علمی و عقلی حوالے سے پرکھ کر افضلیت کے معیار ذکر کرتے ہوئے دونوں انبیاء کا تقابل کرتے ہوئے حقیقت واضح کی ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ کا صحیح مقام و مرتبہ پادری صاحب کے سامنے بیان کیا ہے۔ پادری صاحب کے مسئولہ استفسارات میں سے پہلا سوال قرآن پاک کے متعلق تھا، "توریت و صحف انبیاء و انجیل و قرآن شریف آپس میں کیا نسبت رکھتے ہیں؟" قاضی صاحب نے سب سے تفصیلی، اسی سوال کا جواب دیا ہے جس میں شریعت محمدیہ کے تفضّل کو ثابت کیا ہے۔ اپنے مؤقف کی تائید میں بائبل سے استدلال کے ساتھ عقلی و نقلی دلائل پیش کیے ہیں اور جواب کی خوبی یہ ہے کہ اسے الزامی نہیں کہا جا سکتا بلکہ قاضی صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق تفہیمی اسلوب اپنایا ہے۔ اناجیل کا قرآن کے ساتھ بادلائل موازنہ کرتے ہوئے ان کی حیثیت کا تعین کیا گیا ہے؛

" ہم کو بزرگ لوقا کا مشکور ہونا چاہیے کہ انہوں نے بتلایا کہ جو روایت ان تک پہنچی اسے اول بزرگ لوقا نے صحیح طور پر دریافت کیا اور پھر ترتیب دیا۔ اس بیان سے ثابت ہو گیا کہ ان انجیلوں کا درجہ ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا مسلمانوں میں کتب احادیث کا ہے۔ کیونکہ وہ بھی عالموں نے روایت سے بیان کی ہیں۔ البتہ احادیث کا درجہ اس لیے بالاتر رہے گا کہ انہوں نے روایت کے ساتھ ساتھ راویوں کا سلسلہ بھی بیان کر دیا ہے۔۔۔ اور ہر راوی کی لائف بھی بیان کی ہے اور ان اصول کو بھی بیان کر دیا ہے جن پر مصنف نے اپنی دریافت کے وقت عمل کیا تھا۔ مگر سب باتیں انجیلوں میں نہیں ہیں۔ بزرگوار لوقا کی شہادت کے بعد آپ انجیل کو اس ضروری اور بزرگ ترین صفت سے جو قرآن مجید و توریت کو حاصل ہے، خالی دیکھیں گے"[2]۔

---

1 منصورپوری، برہان، ص ۲۔۳

2 ایضاً، ص ۵۔۶

اسی طرح بہت عمدہ پیرائے میں قرآن کے مھیمن ہونے کے بارے واضح کرتے ہیں؛

" قرآن مجید کے مھیمن ہونے کا آپ کو اقرار نہ ہو گا۔ گو آپ اسے ایک شریعت مان لینے کو تیار ہیں۔ قرآن مجید کو مھیمن ثابت کرنے کے لیے مجھے دو ہی باتوں کا ثبوت دینا چاہیے۔(۱) وہ مثل توریت شریعت ہے۔(۲) وہ مثل انجیل فضل و کمال ہے جزاول کا آپ کو اقرار ہے۔ پس مہربانی سے یہ فرما دیجئے کہ جز دوم کا کیوں انکار ہے۔ کیا انجیل میں کوئی ایسی تعلیم ہے جو قرآن مجید میں نہیں"[1]۔

بعد ازاں وہ انجیل اور قرآن کے اختلافی مسائل (کفارہ، تثلیث، ابنیت والوہیت) کے متعلق فرماتے ہیں؛

" میرے نزدیک اور سب مسلمانوں کے نزدیک حضرت مسیحؑ کے الفاظ تو حجت و دلیل بن سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے کے الفاظ یہ درجہ ہرگز نہیں رکھتے۔ حضرت مسیحؑ کے الفاظ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے فہم یا عبارت یا مذہبی کونسلوں کی کسی قرارداد کو بطور دلیل کے پیش نہ فرمایئے اور جب اس احتیاط سے آپ دلیل کی تلاش کریں گے تو پھر آپ کو مجموعہ اناجیل میں کوئی نئی بات، جو قرآن مجید میں نہ ہو، نہیں ملے گی"[2]۔

مصنف پادری صاحب پر یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ ؛

" میرا مدعا خدا نخواستہ اس جگہ اناجیل اربعہ میں سے کسی انجیل کی وقعت کے خلاف کچھ کہنے کا نہیں کیونکہ یہ میرا شعار ہی نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ فی الواقعہ اناجیل اربعہ سے یہ مسائل اور یہ مطالب متخرج نہیں ہو سکتے"[3]۔

مزید براں پادری صاحب کے سامنے ایک اور پہلو رکھتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کی سب کتابیں مختلف پیراؤں اور متعدد عبارتوں میں متفق و متحد ہو کر ایک واحد مدعا بیان کر رہی ہیں لیکن عہد نامہ جدید کے آغاز سے ایک جدید دروازہ کھل جاتا ہے اور اناجیل کا مضامین میں متحد نہ ہونا واضح ہوتا ہے۔ دراصل قاضی صاحب نے بڑے حکیمانہ اسلوب میں کہا ہے کہ توریت وانجیل کا قرآن سے موازنہ کر لیا جائے تو یہ لازمی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ توریت اور قرآن مجید دونوں کتابیں بیشتر اور اکثر مقامات میں متحدہ و مطابق ہوں گی مگر انجیل کے مضامین ان متحدہ مضامین سے نہیں مل سکتے۔

"اگر آپ انجیل کو بہت زیادہ مسائل میں توریت سے مختلف پا کر بھی نہ توریت کی صحت پر شک رکھتے ہیں اور نہ انجیل کا نرالا اختلاف آپ کے یقین و ایمان کو متزلزل کر سکتا ہے تب ایسی حالت میں مسلمان نہایت ضرور سے کہیں گے کہ آپ

---

1 منصورپوری، برہان، ص ۹

2 ایضاً

3 ایضاً، ص ۹۔۱۰

خصوصیات قرآن مجید پر بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے"[1]۔

یہ مختصر تحریر بہت علمی اور وقیع نکات کی حامل ہے۔ اس تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ متانت اور سنجیدگی کا دامن تھامے، فریق مخالف کی دل آزاری سے پہلو بچا کر، ماحول کو تنفر و تعصب سے کبیدہ خاطر کیے بغیر علمی تحقیق و مکالمہ ممکن ہے۔ اگر تحقیق کا یہی معیار طرفین کی جانب سے اپنایا جاتا تو برصغیر کے مسلم مسیحی مکالمہ کا رنگ دیگر ہوتا جس کے مثبت اثرات سے دونوں مذاہب کے پیروکار مستفید ہوتے اور انسانیت کی خاطر خواہ خدمت ہوتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے مہذب دور میں باہم پڑوسی فریق اسی قسم کا رویہ اپنائیں اور ایسے رویہ کی لازماً حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ (یہ رسالہ مسعود جھنڈیر لائبریری، میلسی میں موجود ہے۔)

قاضی سلیمان منصور پوری   رحمۃ للعالمین

جلد اول و دوم: ۱۹۲۱ء، جلد سوم: ۱۹۳۳ء

صفحات: (۲۹۶ + ۳۷۶ + ۴۲۰) = ۱۰۹۲

تقابل ادیان کے اسلوب میں ضبط قلم ہونے والی تین جلدوں پر مشتمل "رحمۃ اللعالمین" کو برصغیر کے سیرتی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب اس وقت ضبط تحریر میں آئی جب جذبات کی حدت نمایاں اور سیاسی طور پر غالب فریق کے طرز تکلم میں معقولیت کے عنصر کا فقدان تھا۔ یہ سیرت صاحب قرآن پر ہندوؤں، آریہ سماج اور عیسائیوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی۔ عہد متذکرہ میں مسیحی نقد اسلام کا محور زیادہ تر قرآن اور صاحب قرآن کی ذات گرامی تھی۔ بائبل میں انسانی عنصر کی آمیزش کے مسلم اعتراض کو تسلیم کرنے کے بعد ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ قرآن کو ایک انسانی کاوش کے طور پر پیش کیا جائے تاکہ پیغمبر اسلام کو جھٹلانا ممکن ہو سکے۔ زیادہ تر بائبل سے استشہاد کرتے ہوئے اس کتاب میں معترضین کا بدلائل عقلی و نقلی یوں رد کیا گیا ہے کہ سیرت نبوی پر اڑائی گئی دھول خود بخود بیٹھ گئی۔ مصنف کے مطالعہ بائبل کے بارے میں کہا گیا ہے؛

> "قاضی سلیمان منصور پوری نے جس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے، وہ بائبل ہے۔ اس کے ثبوت میں بے شمار حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں، جو "رحمۃ للعالمین" کی تینوں جلدوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بائبل سے یہ شغف ایک تو ان کی مناظرانہ سرگرمیوں کا اقتضا تھا، جن کے وہ اوائل عمری سے ہی شائق تھے۔ اور دوسرے، آنحضرت ﷺ کی نبوت کے اثبات کے لیے انہیں اس کتاب کا ورق ورق کھنگالنا پڑا، اس لیے کہ صرف یہی کتاب عیسائی پادریوں کے لیے قابل حجت تھی"[2]۔

---

1 منصور پوری، برہان، ص ۱۳

2 خالد، اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۵۲۲

سید سلیمان ندوی کے مطابق ؛

"مصنف کے ذوق کے مطابق سوانح اور واقعات کے ساتھ غیر مذاہب کے اعتراضات کے جوابات اور دوسرے صحائف آسمانی کے ساتھ موازنہ اور خصوصیت سے یہود و نصاریٰ کے دعاوی کا ابطال بھی اس میں جا بجا موجود ہے۔ مصنف مرحوم کو توراۃ و انجیل پر کمال عبور حاصل تھا اور عیسائیوں کے مناظرانہ پہلوؤں سے اس کو پوری واقفیت۔ اسی بنا پر اس کی یہ کتاب ان معلومات کا پورا خزانہ ہے"[1]۔

"رحمۃ اللعالمین" کے حصہ سوم کا باب دوم "خصائص قرآن" کے عنوان سے اس قدر جامعیت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ بے شمار دیگر کتب کے مطالعہ سے بے نیاز کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔

فصل اول ضرورت قرآن کے عنوان سے تحریر کی گئی ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن نے دستور العمل کی ایسی راہیں متعین کی ہیں کہ تا قیامت ان کی ضرورت و افادیت نہ صرف باقی رہے گی بلکہ مسلّم رہے گی۔ اپنے اثبات دعویٰ کے لیے ۴۷ آیات نقل کر کے ان کا ترجمہ اور تشریح دیے گئے ہیں۔

فصل دوم میں " معانی عالیہ و مضامین نادرہ " کے زیر عنوان اس الہامی کلام کے خصائص وامتیازات پر قلم اٹھایا ہے۔ قرآن کے وصف گنواتے ہوئے لکھتے ہیں؛

" علم و حقیقت اور ہدایت و صداقت اس کے علمبردار ہیں قرب وانشراح، رفاہ و صلاح اس کے حاشیہ بوس ہیں، نجات اخروی، فوز روحی، رضوان الٰہی وہ خلعت ہائے شرف ہیں جو اسی بارگاہ علیا سے عطا ہوتی ہیں "[2]۔

فصل سوم میں " تاثیر قرآن " کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف کے الفاظ میں ؛

" قرآن مجید کا اصل معلوم کرنا ہو تو ان لوگوں کے واقعات پر نگاہ ڈالو جو قرآن کو سمجھ سکتے تھے جو لوگ ایک پیسہ پر قتل عمد کو معمولی کھیل سمجھتے تھے وہی دین حقہ کی محبت میں گھر بار سے قطع تعلق کرنے لگے تھے۔۔۔ جن کا کام لاوارث بچوں کا مال اڑانا، رانڈوں کو جھل دینا تھا وہی اعانت یتامیٰ اور ہمدردی ایامیٰ کا سبق پڑھایا کرتے تھے ۔۔۔ الغرض قرآن مجید کا اثر انسان کے دل و زبان، طبع و دماغ اور جملہ حواس و قویٰ پر نہایت مستحکم ہے۔ اور جو اثر اس کا ایک شخص پر ہے وہی تمام ملک پر بھی ہے"[3]۔

فصل چہارم میں " نمونہ تعلیم " دکھلایا گیا ہے۔ مصنف اس بات کے مدعی ہیں کہ کوئی شخص مسلمانوں کے اصول منزل و اصول تمدن و اصول حکومت کا مطالعہ کرے تو یہ سب نمونے قرآن کے تیار کردہ پائے گا۔ اس ضمن میں وہ کپتان ایزک ٹیلر کی ۱۲ مئی ۱۸۸۷ء کو ہمپٹن میں چرچ کانگریس کے سامنے کردہ تقریر کا اقتباس نقل کرتے ہیں؛

---

1 خالد، اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۵۲۱

2 منصور پوری، رحمۃ للعالمین، ص ۳۲۴

3 ایضاً، ص ۳۲۶۔۳۲۷

"افریقہ کے جن وحشی مقامات پر اسلام کا سایہ پڑا وہاں سے زنا، قماربازی، دختر کشی، عہد شکنی، قتل وغارت گری، وہم پرستی، شراب خوری وغیرہ وغیرہ ہمیشہ کے لیے جاتی رہیں مگر جب اسی ملک کے دوسرے حصہ پر کسی غیر اسلام مذہب (مقامی توہمات و رسومات، کہ جنھیں مذہب کا درجہ حاصل ہے، کے علاوہ افریقہ میں اسلام کے سوا صرف مسیحیت نے ہی قدم دھرے ہیں) نے قدم جمایا تو ان لوگوں کو رذائل بالا میں اور زیادہ راسخ کر دیا"[1]۔

اسی فصل میں خصوصیات قرآن مجید کے ذیلی عنوان سے دعوت وتعلیمات قرآن مجید و اناجیل کا تقابل کیا ہے۔ مثلاً قرآنی آیت "إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْءَانٌ مُّبِينٌ ۝ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ ٱلْقَوْلُ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ "[2] نقل کر کے لکھتے ہیں؛

"عربی میں 'من' ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ اس لیے من نے ہر ایک فرد کو اپنے اندر گھیر لیا ہے۔ اس کے ساتھ 'کان حیا' کی صفت لگی ہوئی ہے۔ آیت کی عمومیت اور وسعت کا خود اندازہ کر لو۔ ہر ایک وہ شخص جو ذوی العقول کی فہرست میں آسکتا ہے۔ ہر ایک وہ شخص جو زندہ کہلاتا ہے یا کہلا سکتا ہے قرآن مجید اسے یاد الٰہی دلانے، قرب سبحانی تک پہنچانے، اس کے عواقب امور سے آگاہ کرنے کا کفیل ہے۔ کیا ان الفاظ میں کسی اور کتاب نے بھی دعویٰ کیا ہے"۔

پھر اس کا تقابل انجیل کی اس تعلیم سے کیا گیا ہے؛

"بقول متی مسیح علیہ السلام نے اپنی بشارت و انجیل کو روٹی اور بنی اسرائیل کو بیٹے اور دیگر اقوام کو کتے بتلایا اور یوں فرمایا ہے، مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو پھینک دیویں۔ (متی ۱۵ باب ۲۱ تا ۲۷)[3]

فصل پنجم " قرآن مجید کا مصنف" کے عنوان سے ہے۔ اس کے تحت مصنف نے ایک اصولی بحث کی ہے کہ بعض عیسائی مصنف جو تحقیق کے پردہ میں تعصب کو چھپائے رکھتے ہیں قرآن مجید کی بہت سی خوبیوں کو تسلیم کر لینے کے بعد قرآن پاک کو کلام محمد ﷺ بتایا کرتے ہیں (مثلاً فانڈر، گولڈ سیک، ایڈورڈ سیل، ای ایم ویری، عماد الدین، ٹھاکر داس، اکبر مسیح، برکت اللہ وغیرہ)۔ مصنف قرآن کو کلام محمد ﷺ کی بجائے صرف کلام الٰہی ثابت کرنے کے لئے دلائل میں بائبل کی کتب خروج و استثناء سے استشہاد پیش کرتے ہیں۔ یہود نے احکام عشرہ کی الواح پر شک اور انکار کرتے ہوئے خود خدا سے براہ راست کلام کا مطالبہ کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام انہیں کوہ طور پر لے گئے جہاں بادل، تند و تیز ہوا، بجلی کی گرج، اور بھونچال سے ڈر کر چلا اٹھے؛

---

1 قاضی سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، ص ۳۲۶۔۳۲۷

2 یٰسین: ۶۹۔۷۰

3 منصور پوری، رحمۃ للعالمین، ص ۳۳۱

"اے موسیٰ تو ہی ہم سے بول اور ہم سنیں، لیکن خدا ہم سے نہ بولے کہیں ہم مر نہ جائیں" (کتاب خروج ۲۰: ۱۹ ؛ کتاب استثناء ۱۸: ۱۶) اس درخواست کو اللہ تعالیٰ نا منظور فرماتے ہیں اور خبر دیتے ہیں کہ خدا کا کلام ایک اور نبی کے منہ میں رکھا جائے گا وہ نبی اللہ، اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہو گا۔ وہ نبی جو کچھ خدا سے سنے گا، وہ سب لوگوں سے کہے گا۔ اور ایسا ہو گا کہ جو کوئی میری باتوں کو، جنہیں وہ نبی میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا تو اس کا حساب خدا لے گا۔" (کتاب استثناء، ۱۸ باب ۱۸، ۱۹)

یہ اقتباس پیش کرنے کے بعد مصنف استفسار فرماتے ہیں کہ؛

"اب براہ مہربانی یہودی و عیسائی ان واقعات بالا کو خیال میں رکھیں اور پھر ہم کو بتائیں ۔ سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ ﷺ کے سوا اور وہ کون سا نبی ہے جس کے منہ میں خدا کا کلام رکھا گیا۔ وہ کون سا نبی ہے جس نے یہ بتلایا ہو کہ "اس کے منہ میں خدا کا کلام ہے" ہم ان دونوں سے کہتے ہیں کہ وہ ہرگز ہرگز کسی ایسے نبی کا نام نہیں بتلا سکیں گے جس نے زبان سے اتنا فقرہ استعمال کیا ہو کہ اس منہ میں اللہ کا کلام ہے"[1]۔

قرآنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"بائبل کو دیکھو کہ یہ موسیٰ، یشوع، مصنف، قاضیوں، سموئیل، مصنف سلاطین، مصنف تواریخ، عذرا نحمیا۔ مصنف کتاب روت، مصنف کتاب آستر، ایوب، داؤد صاحب زبور، سلیمان صاحب امثال و غزل الغزلات، واعظ، یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، دانی ایل، ہوسیع، یوایل، عاموس، عبدیاہ، یونا، میکہ، نحوم، حبقوق، صفنیاہ حجی، زکریا، ملاکی کے الہامات یا تصنیفات کا مجموعہ ہے۔ علیٰ ہذا انجیلوں کو دیکھو کہ متی، مرقس، لوقا مع اعمال، یوحنا، پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا شاگردان مسیح کے علمی کارنامے ہیں۔ مگر قرآن مجید کا مبلغ اول اور معلم نخستین صرف ایک ہے ﷺ ۔ اس صحیفہ کا خود اسی کے ذریعے آغاز اور اسی کے ذریعے اختتام ہو جاتا ہے اور بایں ہمہ یہ مصحف مقدس اپنے مضامین میں مکمل، اپنی تبلیغ میں کامل، دعوت الی اللہ میں یگانہ، رشد و ہدایت اور نور و رحمت میں وحید و یکتا ہے اور اپنے موضوع و مفہوم کے اتمام میں دوسری کتاب کو احتیاج مند نہیں، حالانکہ رگ وید یجر وید، سام وید کا اور اتھر وید ان تینوں کا محتاج ہے۔ نئے عہد نامہ کی تکمیل پرانے کے بغیر نہیں ہوتی اور کتاب اعمال کے بغیر اناجیل اربعہ کے مضامین ناقص رہ جاتے ہیں۔ حواریوں کے خطوط اتنے ہی ضروری ہیں جیسا کہ خود اناجیل اس سے قرآن پاک کی برتری و فوقیت اور جامعیت اور کاملیت کا اندازہ فہم میں آ سکتا ہے"[2]

فصل ششم اور ہفتم قرآنی پیشین گوئیوں کے لیے مختص ہے۔ اور صداقت کلام الٰہی کے اثبات میں ۶۴ قرآنی پیشین گوئیاں بطور برہان ذکر کی ہیں۔ جس میں ۷ قرآن، ۷ ترویج اسلام، ۹ صحابہ کرام، ۶ اہل ایمان، ۹ اہل مکہ و

---

1 منصور پوری، رحمۃ للعالمین، ص ۳۳۹

2 ایضاً، ص ۳۳۵۔۳۳۶

عرب، ۵ منافقین، ۳ مخالفین جہاد، ۶ مجاہد صحابہ کرام و متحاربین، ۹ یہود جبکہ ۳ عیسائیوں کے متعلق ہیں[1]۔ مصنف نے مسیحی معترضین پر واضح کرنے کے لیے قرآنی پیشین گوئیوں کو قصداً بطور برہان پیش کیا ہے۔

مصنف کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی متعین اعتراض کا جواب تحریر نہیں کرتے بلکہ اس دور میں کیے جانے والے اعتراضات کے پیش نظر ایسا عمومی جواب لکھتے ہیں کہ بے شمار اعتراض خود بخود ہی پادرِ ہوا ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے شخصی ابطال کو قطعاً اہمیت نہیں دی جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت محض اس خاص عہد تک محدود نہیں رہی۔

سر سید کے بعد قاضی سلیمان منصور پوری نے سیرت نبوی پر اتہام والزامات اور اعتراضات و اشکال دور کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ مسلکی اشتراک (اہل حدیث) کے علاوہ دونوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان کا مخاطب تعلیم یافتہ وہ طبقہ ہے جو مغرب کے علمی تفوق وتقدم سے مرعوب بلکہ بعض احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ جس کے لیے مستند اسلامی مصادر کی نسبت غیر مذاہب یا مغربی مفکرین کی آراء زیادہ تاثیر رکھتی تھی۔ چنانچہ سرسید نے مستشرقین کی آراء نقل کر کے اپنا مقدمہ پیش کیا ہے۔ جب کہ قاضی صاحب نے بائبل سے عبارتیں نقل کر کے اسلام کی حقانیت کے ثبوت فراہم کیے ہیں اور بہت کم مغربی آراء پیش کی ہیں۔ بلکہ بقول کسے ان کا زمانہ سر سید کے زمانہ سے زیادہ ترقی یافتہ، ان کا ذہن سر سید کے ذہن سے زیادہ متوازن، ان کا مطالعہ سر سید کے مطالعہ سے زیادہ وسیع اور ان کی مغربی علوم سے واقفیت سر سید کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھی[2]۔

مصنف کے طرز تحریر سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ عصری تقاضوں سے نہ صرف کماحقہ واقف تھے، بلکہ انہیں بخوبی نبھانے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ مصنف کے طرز استدلال سے بائبل کے مضامین و مطالب میں گہرا فہم و ادراک ہی سامنے نہیں آتا بلکہ یہ بھی کہ اس ادراک کو مثبت انداز میں استعمال میں لانے کا کتنا ملکہ ہے۔ مصنف اپنی بات کہنے کے لیے اگرچہ الزامی طریق سے بھی کام لیتے ہیں مگر اسلوب نہ تو دل آزارانہ ہے، نہ ہی ہٹ دھرمی پر مبنی۔ مناظرانہ طریق تصنیف میں سنجیدگی اور متانت برقرار رکھنا سخت مشکل ہے، مگر جس طرح خود مصنف اس وصف میں ممتاز تھے اسی طرح ان کی تصنیف بھی اس میں یگانہ ہے۔ پوری کتاب مناظرہ اور احقاق حق کی روئیدادوں سے لبریز ہے لیکن کہیں بھی تہذیب اور مذاق سلیم کو حرف گیری کا موقع نہیں مل سکتا۔ بات اتنے سادہ لفظوں میں کہتے ہیں کہ لغوی وفنی مباحث جاننے کی ضرورت نہیں۔ سلیس اور رواں عبارت ہونے کی بنا پر مطالب نہایت عمدہ طریقہ سے دل میں اترتے جاتے ہیں۔ الجھن میں ڈالے بغیر، مصنف اپنی معروضات پر قاری کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں اور اس پر اپنی رائے ٹھونسنے کا طریق اختیار نہیں کرتے۔ یہ ان کے حقانیت دعویٰ اور قوت استدلال پر اپنے تیقن کی

---

1 منصور پوری، رحمۃ للعالمین، ص ۳۴۰۔۴۱۵

2 انور محمود، اردو نثر میں سیرت رسول، ص ۵۲۹

طرف اشارہ کرتا ہے۔

تاثیر الفاظ اتنی کہ قاری اپنے آپ کو دور نبوی میں پاتا ہے۔ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک مسلسل بر قرار رہتی ہے۔ غلو اور بے جا عقیدت کے مظاہرہ سے اگرچہ اجتناب کیا گیا ہے مگر حسن عقیدت کے چشمے ہر جا پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس کا ایک اہم پہلو مستند حوالہ جات ہیں۔ جس میں رطب و یابس یا کمزور روایات کو دخل نہیں۔ اخذ اقتباس میں اختصار کو یوں مد نظر رکھا گیا ہے کہ قاری کمی محسوس نہیں کرتا۔ لایعنی طویل مباحث سے احتراز اور دلائل کی پختگی قاری کے لیے نہ تو اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں اور نہ ہی تشنگی کا احساس ہونے دیتی ہیں۔ وسعت مطالعہ اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا ہنر دو الگ الگ وصف ہیں اور فاضل مصنف ان دونوں سے یکساں طور پر بہرہ ور ہیں۔

"رحمت للعالمین" میں قرآن اور صاحب قرآن کے باہمی تعلق کا تذکرہ بہت نمایاں ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مصنف نے اس تعلق کو نہ صرف ثابت کیا بلکہ بدلائل واضح کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر فعل عین قرآن تھا۔

بحیثیت مجموعی یہ برصغیر کے مسلم ادب کی وہ علمی میراث ہے جس پر بجا فخر کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر صادق علی البرہان علی اعجاز القرآن

مطبع چودھویں صدی، راول پنڈی ۱۳۱۴ھ

صفحات: ۷۶

یہ رسالہ راولپنڈی سے شائع ہونے والے اخبار "چودھویں صدی" کا خاص نمبر ہے۔ اس میں عقلی دلائل سے اعجاز قرآن ثابت کیا گیا ہے اور کسی خاص مصنف یا تحریر کی نشان دہی کیے بغیر مسیحی معترضین کے عمومی اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

اپنے دعویٰ کو مقدمہ کا عنوان دے کر اس پر دلائل اور معترضین کا جواب دیا گیا ہے۔

پہلے مقدمہ میں "قرآن کی مانند کلام انسان نہیں بنا سکتا" پر نقلاً و عقلاً دلائل پیش کیے گئے ہیں[1]۔

دوسرے مقدمہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جس طرح کا کلام انسان نہ بنا سکے وہ خدا کی کلام ہے بعد ازاں قرآنی تعلیمات کو واضح کیا گیا ہے کہ ؛

"اب ہم چند نظیریں قرآن کی تعلیم کی پیش کر کے اس بات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ امور مذکورہ میں قرآن سے بہتر

---

1 صادق علی، ڈاکٹر، البرہان علی اعجاز القرآن، (مطبع چودھویں صدی، راول پنڈی ۱۳۱۴ھ)، ص ۶-۲۳

تعلیم دینے والی کوئی کتاب نہیں ہے"[1]۔

اگلے مقدمہ میں کچھ سائنسی تحقیقات سے قرآنی بیانات کی تائید کی گئی ہے۔ جس میں حیاتیات اور زمینی تحقیقات کے متعلقہ مباحث ہیں[2]۔ بعد ازاں اسلامی مبادیات کا الہامی ہونا ثابت کرنے کے بعد دیگر الہامی کتب کا قرآن سے موازنہ ان الفاظ میں کروایا گیا ہے؛

" پہلی الہامی کتابیں اور ان کے ملہمین کے نقص سے یہہ مراد نہیں کہ معاذ اللہ وہ کتابیں اور وہ بزرگ طعن کے قابل ہیں بلکہ قرآن شریف اور رسول عربی کے مقابلہ میں ان کی تعلیم کامل نہیں ہے مگر اپنے اپنے زمانے میں وہ سب کتابیں اور ان کے ملہمین کامل تھے اور سب خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تھے اس لیے عام طور پر ہم کو ان میں سے کسی میں تفاوت نہیں"[3]۔

اس کے ساتھ ساتھ مسیحی اہل قلم کی طرف سے اٹھائے گئے تاریخی اور عمومی اعتراضات کا بھی جواب دیتے ہیں۔ جیسے مسیحی اہل قلم کا یہ اعتراض کہ مسلمانوں نے فتح مصر کے موقع پر اسکندری کا کتب خانہ جلا دیا تھا کا رد تاریخی حقائق سے کرتے ہیں[4]۔ اسی طرح تفصیلی بحث میں تعیین قبلہ وکعبہ کی حکمتیں بتلائی ہیں اور کعبہ کے متعلق اعتراض پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

" بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ مسلمان جو کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں یہ بھی ایک طرح کی بت پرستی ہے لیکن یہ اعتراض اس وقت درست ہو جب کوئی کعبہ کو معبود یا معبود کا نمونہ تصور کرے"[5]۔

اسلوب بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ دقیق علمی بحث سے احتراز برتا گیا۔ معترضین کے جواب میں بہت نرم الفاظ کا انتخاب سامنے آتا ہے۔ سخت اور ترش رو اسلوب اختیار نہیں کیا گیا بلکہ اپنی بات بہت سلیقہ سے سامنے رکھی گئی ہے

ابو محمد عبدالحق حقانی تعریف قرآن رد تحریف قرآن

مطبع مجتبائی، دہلی ۱۲۹۰ھ / ۱۹۳۴ء

صفحات ۶۰

مغرب میں مستشرقین نے قرآن کے بارے تشکیک پیدا کرنے کے جس سوچ کو ابھارا تھا، اسے مغربی منادین نے برصغیر میں بڑی شدومد سے پھیلایا۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی اہل قلم قرآن کریم کو ہدف تنقید بنا کر اسے محرف

1 صادق علی، البرہان علی اعجاز القرآن، ص ۲۷

2 ایضاً، ص ۳۴-۴۶

3 ایضاً، ص ۶۵

4 ایضاً، ص ۷

5 ایضاً، ص ۶۴

جھٹلانے پر کمربستہ ہوئے۔ ماسٹر رام چندر کے قلم سے "تحریف قرآن" اس ضمن میں گروہ مذکورہ کی نمائندہ تحریر ہے۔ جواباً مسلم علماء نے صیانت القرآن کے حوالے سے متعدد کتب تصنیف کیں جن میں چند ایک خاص ماسٹر صاحب کے رد میں تھیں۔ زیر نظر مختصر رسالہ مذکورہ بالا مسیحی کتاب کے جواب میں ہے جس کے مصنف مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی کا شمار رد مسیحیت میں برصغیر کے صف اول کے علماء میں ہوتا ہے۔

ابواب یا فصول کی تقسیم سے قطع نظر مولانا صاحب " قولہ "لکھ کر ماسٹر صاحب کی عبارت بمعہ صفحہ کتاب بعض اوقات بحوالہ فصل لکھتے ہیں۔ پھر "اقول " کے ساتھ اس کا رد کرتے ہیں۔ سبب تالیف یوں بیان کیا گیا ہے؛

" اس زمانہ میں بعض یہود و نصاری نے کہ سیدھے اردو زبان بھی نہیں آتی عربیت کا تو کیا ذکر فصاحت و بلاغت پہچاننا تو کجا اپنے ہم قوم و ہم پیشہ میں ممتاز ہونے کے لیے جب غوغا مچایا کہ اناپ شناپ انکل پچو بے ربط سراسر خبط کچھ روایات تفاسیر و اقوال مناکیر کے بے سمجھے بوجھے دس پانچ جز میں جمع کر چھپوایا اور کہیں اہل علم کے پاس بھجوایا۔ گو وہ رسالہ قابل جواب اور مؤلف لائق خطاب نہ تھا مگر یہ سمجھ کر کہ اگر جواب نہ دیں گے تو حضرات پوادر (پادری کی جمع) خوب اترائیں گے بازاروں میں کھڑے ہو کر غل مچاویں گے ناچار ان بے شغلوں اور مالداروں کا جو صدہا روپیہ اسی کام کے لیے انگریزوں سے پاتے ہیں جواب دندان شکن دیا"[1]۔

مصنف جب مخالف کے طرز استدلال اور اسلوب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا تجزیہ یوں کرتے ہیں؛

" تحریر کا عجب ڈھنگ ہے۔ اگر دعویٰ یہ ہے کہ زید قائم ہے تو دلیل یہ کہ بیل چلتا ہے۔ دلیل کو دعویٰ سے بالکل ربط نہیں مقدمات دلیل کو آپس میں کچھ مناسبت نہیں اول سے آخر تک تمام کتاب کو دیکھ جاؤ تو متنازعہ فیہ کا پتہ نہ لگے اس پر مستزاد یہ کہ نہ اصول اسلامیہ سے واقف نہ فرع سے خبر نہ معتبر و غیر معتبر کتاب میں تمیز اگر کسی کو میری اس بات میں شک ہو ان کی اس کتاب اور دیگر رسائل جناب کو دیکھ لے اس سے بھی اور بہت زیادہ خوبیاں موجود ہیں "[2]۔

فریق مخالف کے اسلوب تحریر نے رد عمل کے طور پر مولانا کے لہجہ کو سخت کر دیا ہے جس کا اظہار تمام رسالہ سے عیاں ہے۔ جیسے رقم طراز ہیں؛

" ماسٹر صاحب جھوٹ سے کام نہیں چلے گا۔ تمہیں اس مقام پر ضرور تھا کہ اوس قول کو نقل کرتے "[3]۔

اس رسالہ کا غالب حصہ ماسٹر صاحب کی ضعیف اور موضوع روایات سے استدلال کے رد میں ہے۔ پادری صاحب کی اپنے دعویٰ میں پیش کی گئی ضعیف روایتوں کو یہ کہہ کر رد کرتے ہیں؛

---

1 حقانی، عبدالحق، ابو محمد، تعریف قرآن رد تحریف قرآن، (مطبع مجتبائی، دہلی ۱۲۹۰ھ / ۱۹۳۴ء)، ص ۲

2 ایضاً، ص ۳

3 ایضاً، ص ۳۰

"یہ صحت کو نہیں پہنچتی اور اگر یہ صحت کو پہنچتی تو آپ کا دعویٰ بجا تھا"[1]۔

قولہ (ص ۷۷ دفعہ ۱۷۳) میں تفسیر معالم کا قول ہے۔۔۔ اقول، اس دفعہ میں ماسٹر صاحب بقیہ قصہ موضوع اور جھوٹ کو نقل کر رہے ہیں"[2]۔

روایات پر تفصیلی بحث نہیں کرتے بلکہ صرف حکم کے درجہ میں واضح کرتے ہیں کہ یہ موضوع یا ضعیف روایت ہے جیسا کہ مذکورہ بالا منقول عبارت میں ہے۔

مولانا اختتامی الفاظ میں نتیجہ یوں ظاہر کرتے ہیں۔

"اب جو کچھ ماسٹر صاحب کی زنبیل میں تھا ہو چکا رطب ویابس بے تکے بہت کچھ ہانکے مگر ایک حرف کی بھی تحریف قرآن میں ثابت نہ ہو سکے اور کسی اسلامی عقیدہ کو مخدوش نہ کر سکے مگر اب ہماری وار دیکھئے تحریف کا ثابت کرنا اس کو کہتے ہیں جو تمہاری انجیل و تورات میں ثابت کئے گئے ہیں۔ اصل مذہب پر اعتراض اس کو کہتے ہیں جو ہم اہل اسلام نے تمہاری تثلیث و کفارہ کو جڑ سے اوکھیڑ (اکھیڑا) ہے"[3]۔

منقولی اور الزامی اسلوب کے حامل اس رسالہ میں بہت کم عقلی دلائل کا سہارا لیا گیا ہے۔ مولانا علمی انداز میں مدمقابل کی اغلاط سے پردہ اٹھا کر اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ یہ تحریر اس دور کے مناظرانہ رویہ میں حدت کی بھی عکاس ہے، جو طرفین کے لب ولہجہ میں نمایاں ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ مولانا کے اس تعاقب کا فریق مخالف کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا نیز اس کے بعد سطحی اور رکیک انداز میں خاص تحریف قرآن کے عنوان سے مسیحی تحریر بہت کم سامنے آئی۔

ابو السادات عبد الرشید　　برہان اعظم بجواب دین قیم

مطبع صدیقی، لاہور ۱۸۹۷ء

صفحات: ۳۶

برصغیر کے مسیحی لٹریچر کا معتدبہ حصہ ان نو مسیحی اہل قلم کی تحریروں پر مشتمل ہے جن کا ماضی اسلام میں گذرا تھا۔ انہوں نے اپنے نئے مذہب کی تائید کرتے ہوئے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی قلم اٹھایا۔ زیر تبصرہ تحریر بھی ایک نو مسیحی ابو صالح کرسٹی کے رسالہ دین قیم کے جواب میں ہے۔

اس میں ابواب یا فصول کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ مصنف پہلے "قولہ" کہہ کر معترض کی بات نقل کرتے ہیں پھر

1　حقانی، تحریف قرآن، ص ۳۵

2　ایضاً، ص ۴۷

3　ایضاً، ص ۵۹۔۶۰

"جواب " لکھ کر ان کا تعاقب یارد کرتے ہیں۔ مصنف اپنے دعویٰ کے متعلق رقم طراز ہے؛

" (راقم) بدلائل جواب حوالہ کتب سماوی سلف و خلف مختصر رسالہ زیر قلم میں اور کٹ حجتی کرتی عیسائیوں کو خاص کر راہ دین قیمہ و بینہ پر چلانے کی بنیاد قائم کر کے لکھتا ہے۔ اور ان کے عہد جدید و عتیق سے پوری خبر لیتا ہے۔ تاکہ ناظرین بعد مطالعہ ہر دو رسالہ بنظر تحقیق غور کریں کہ فی الواقع درجہ وسیلہ شفاعت الکبری و طریق النجات کے پایہ ثبوت میں کون پہنچا"[1]۔

اس میں وسیلہ، نجات، نسخ، تحریف، پیشن گوئیاں، عقیدہ ابنیت پر گفتگو کی گئی ہے اور بائبل کے اسفار متروکہ کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ نقلی دلائل میں قرآن سے استشہاد و استدلال بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً ؛

" قولہ، قرآن میں نہیں ہے کہ بائبل منسوخ ہے۔ جواب چلے چلو ہم کچھے اتنی بیچ نہ کرو۔ بائبل کے منسوخہ مشتبہ کی شاہد ہمارا قرآن پاک کی یہ آیت ہے ,وَقَالَتِ ٱلۡيَهُودُ لَيۡسَتِ ٱلنَّصَٰرَىٰ عَلَىٰ شَيۡءٖ وَقَالَتِ ٱلنَّصَٰرَىٰ لَيۡسَتِ ٱلۡيَهُودُ عَلَىٰ شَيۡءٖ وَهُمۡ يَتۡلُونَ ٱلۡكِتَٰبَ باہم یہود و نصاری جب ایک دوسرے کے باوجود متفق ہونے یہ کیا معنی کہ مسائل میں نااتفاقی پیدا ہو جائے۔ ضرور یہ سب ناسخ ہی منسوخ ہے سوائے اس کے کوئی دوسری نظر نہیں آتی"[2]

رسالہ میں زیادہ تر الزامی جواب کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس میں مصنف انجیلی بیان باحوالہ نقل کر کے استشہاد کرتے ہیں۔ طرز تحریر مناظرانہ ہے جس میں رد عمل کے جذبات نمایاں ہیں۔

شیخ فتح حسین منبع الحسنات فی تحقیق النجات

مطبع قیومی، کان پور ۱۳۲۲ھ

صفحات: ۴۴

مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں ایک موضوع " مسئلہ نجات " بھی ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل نجات کے لیے ضروری ہے یا نجات کا واحد وسیلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کفارہ بنی نوع انسان پر ایمان لا کر ان کے گلہ میں شمولیت ہے۔ دیگر موضوعات کی نسبت اس عنوان پر مستقل کم لکھا گیا ہے، لیکن ضمناً کافی بحث کی گئی ہے۔

زیر تبصرہ کتابچہ مستقل اس عنوان پر قلم بند کیا گیا ہے جس میں بائبل اور قرآن کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ دارومدار نجات اخروی صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر ہے۔ اور فضل الٰہی کا حصول ایمان سے مشروط ہے[3]۔

---

1 ابو السادات، عبد الرشید، برہان اعظم بجواب دین قیم، (مطبع صدیقی، لاہور ۱۸۹۷ء)، ص ۳

2 ایضاً، ص ۸

3 فتح حسین، شیخ، منبع الحسنات فی تحقیق النجات، (مطبع قیومی، کان پور ۱۳۲۲ھ) ص ۴

قرآن اور بائبل کی تعلیمات کا تقابل دو کالموں میں کیا گیا ہے اور سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ذکر کے عنوان سے بائبل اور قرآن کی بعض آیات کا تقابل کیا ہے[1]۔ اس کے ساتھ ساتھ شرط ایمان کی تفصیل، بجا آوری احکام الٰہی کا ذکر، اعمال حسنہ کے ذریعے نجات کے عناوین پر دونوں مذاہب کی تعلیمات مذکور ہیں۔

زیر نظر کتاب کا ایک پہلو مسلم علماء کا مسیحی کتب کے رد میں معترض کا اسلوب اپنانا ہے۔ بائبل اور قرآن کا تقابلی اسلوب پہلے مسیحی علماء کی طرف سے اپنایا گیا تھا جس کا اثر بعد میں مسلم جوابات میں ظاہر ہونا شروع ہوا۔ اور انہوں نے بھی تقابلی انداز میں اپنا جواب پیش کیا۔

سید محمد اعلیٰ　　　تنزیہہ الفرقان

مطبع شمس پریس آگرہ، طبع اول ۱۸۷۷ء

صفحات: ۵۵۸ + ۱۲

زیر تبصرہ کتاب، پادری عماد الدین کی "ہدایت المسلمین" کے جواب میں ہے۔ مصنف آغاز میں رقم طراز ہیں

" آج کل جو شخص عیسائی ہو جاتا ہے وہ حتی المقدور کچھ تالیف و تحریر کرنا لابدی سمجھتا ہے۔ گویا اپنی دانست میں پہلے (مذہب کے) دوستوں سے ندامت رفع کرتا ہے اور ولایتی پادریوں کو اپنی لیاقت و اعتقاد کا وثوق کراتا ہے اور بعض اس پر اکتفا نہیں کرتے، بہت کچھ بے باکیاں کرتے ہیں"[2]۔

یہ الفاظ عہد متذکرہ کے نو مسیحی دیسی اہل قلم کی تحریروں کی سمت اور رویے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اس کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ مصنف نظریاتی اعتبار سے اثناء عشری ہیں مگر انہوں نے کسی مقام پر بھی مسلکی فکر کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ بلکہ عیسائیت کے مقابل ہر مسلم گروہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کسی قسم کی گروہی چھاپ کا شکار نہیں ہوئے۔

تنزیہہ الفرقان پانچ فصول پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل مفردات قرآنیہ کی فصاحت کے اثبات میں ہے۔

دوسری فصل آیات کی فصاحت کے بیان میں ہے جس میں بعض آیات قرآنیہ کے صنائع و بدائع اور لطائف و نکات بیان کیے ہیں۔ نیز قرآنی عبارت کے مقابل کردہ مسیلمہ کذاب کی تک بندی کے لغوی عیوب بیان کیے ہیں جنہیں پادری صاحب نے بڑی مبالغہ کے ساتھ بیان کیا تھا۔

تیسری فصل میں ان آیات کے معانی و تفسیر کی ہے جن کے مضامین میں تخالف و تناقض ظاہر کرنے کی کوشش

1　فتح حسین، شیخ، منبع الحسنات فی تحقیق النجات، ص۶۔۷

2　محمد اعلیٰ، سید، تنزیہہ الفرقان، (مطبع شمس پریس، آگرہ ۱۸۷۷ء، طبع اول)، ص ۳

کی گئی ہے۔

چوتھی فصل ان آیات کی تفسیر پر مبنی ہے جن کے مضامین پر پادری صاحب نے جھوٹ ہونے کا اتہام لگایا ہے۔

پانچویں فصل تحریف قرآن کے ابطال میں ہے۔ اور الزاماً انجیل کو نامکمل ثابت کرتے ہوئے محققین نصاریٰ کے اقوال سے اس میں ثبوت تحریف پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور دکھلایا گیا ہے کہ یہ تحریف عمداً کی گئی تھی نیز مسیح کے حواریوں کے احوال وظروف سے انہیں غیر معتمد اور مقدوح ٹھہرایا گیا ہے۔

مصنف " قولہ " کے تحت پہلے پادری صاحب کی عبارت نقل کرتے ہیں پھر " اقول " کہہ کر اس کا جواب دیتے ہیں جس سے ہدایت المسلمین کی عبارت بھی سامنے ہونے کی بنا پر قاری کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔

پادری صاحب نے ہدایت المسلمین میں یہ شرط عائد کی تھی کہ:

" شعراء عرب جو محمد صاحب سے پہلے تھے ان کی کلام سے سند لاکر (مسلم علماء قرآن پر اٹھائے گئے) اعتراضوں کو رفع کریں اور جنھوں نے اسی قرآن سے عربی پڑھنا سیکھا ہے ان کی گفتگو لا حاصل کو چھوڑ دیں "[1]۔

فاضل مجیب نے پادری صاحب کی اس شرط کو بخوبی نبھایا اور جواب دیتے ہوئے تائید اور استشہاد کے طور پر کئی اشعار بطور نظائر پیش کیے ہیں۔ مثلاً

" قولہ ۱۱۹ فقرہ مائدہ میں ہے لیجعل علیکم من حرج لفظ حرج بمعنی ضیق کئی جگہ محمد صاحب نے قریش کے برخلاف قیس عیلان کے محاورہ پر بولا ہے۔ اقول صراح حرج تنگ الرائے و کسر ہاے ضیق کثیر الشجر حرج بفتحتین تنگی و تنگ شدن کذافی ص وق و مجمع شاہد یہ ہے لبید شعر

فعلوت مرتقیا علی ذی ہبوۃ   حرج الی اعلامھن قتامہا

اور یہ ایسا فصیح لفظ ہے کہ ہر ایک معنی میں فصحانے بولا ہے اس سے عدد یت لفظی بھی خوب ثابت ہے۔ علقمہ شعر

حرجا اذا حاج السراب علی الصوی   واستن فی افق السماء الا غبر

اور اگر یہ لفظ خاص قیس عیلان کا ہے تو کیا قباحت ہے۔ یہ قبیلہ مضر بن نزار کی اولاد میں ہے اور حجازی اور اوسکے تحت مین اور بھی چھوٹے چھوٹے قبائل مثل عبس و سعد وغیرہ کے بہت ہیں۔ جن میں بڑے بڑے نامی گرامی شاعر مثل عنترہ، عبسی وغیرہ گذرے ہیں۔ ایسے محقق سے جو قرآن کی فصاحت پر اعتراض کرے سخت تعجب ہے کہ وہ انساب عرب اور حالات قبائل سے بھی واقف نہیں۔[2]

نیز ساتھ ہی ساتھ فریق مخالف کی علمیت کا پول بھی اس طرح کھولتے ہیں کہ پادری صاحب کا عربی زبان میں

---

1 محمد اعلیٰ، سید، تنزیہہ الفرقان، ص ۴

2 ایضاً، ص ۱۵۵

درک نہ ہونا، قرآنی مضامین سے اغماض اور انجیلی بیانات میں قلت تدبر واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ بعض جوابات میں مولانا صاحب نے الزامی اسلوب بھی اپنایا ہے۔ پادری صاحب کی کردہ تلبیسات و تدلیسات کا بڑی عرق ریزی سے تعاقب کرکے قاری کو عام فہم انداز میں حقیقت حال واضح کی ہے۔ مصنف پادری صاحب کی علمی غلطی آشکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"پادری صاحب نے نہ کسی تفسیر مبسوط کو دیکھا نہ مختصرات کو پڑھا کیونکہ اتقان کے صرف ایک صفحہ میں جس سے یہ اعتراض لفظیہ بنائے ہیں ایسی فاش غلطیاں کی ہیں کہ ادنی طالب علم بھی نہ کرے۔ چنانچہ کسی جگہ تو عبارت کا مطلب نہیں سمجھے اور نہ الفاظ صحیح پڑھے گئے۔ اور بعض الفاظ غیر قرآنیہ کو قرآن کے الفاظ لکھ دیئے اور اسم کو فعل سمجھے ہیں اور تفسیر جلالین کی عبارت کو قرآن کی دوسری عبارت اختلافی لکھتے ہیں۔ اور تفسیر کبیر کو جلال الدین کی بتاتے ہیں۔ اور ان کے سوا چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا تو ذکر بھی نہیں"[1]۔

فریق مخالف کی کذب بیانی کو دوٹوک الفاظ میں واضح کرتے ہیں؛

"قولہ اب کہاں تک بندہ راقم ان غیر فصیح جنگلی گنواری، وحشی غیر مانوس لفظوں کو لکھے تمام قرآن میں نصف کے قریب ایسے خراب محاورے بھرے ہوئے ہیں۔ اقول پادری صاحب نے جس قدر الفاظ لکھے اونکا جواب تو ایسا دندان شکن ہو چکا یقین ہے کہ اب اونکا توحش رفع ہو جاویگا لیکن یہ فقرہ عاجزانہ اور متحسرانہ جو لکھا ہے کہ اب کہاں تک بندہ راقم لکھے۔۔۔ اس فقرہ سے بڑا تعجب ہوتا ہے کیونکہ جس قدر الفاظ اتقان (لسیوطی) مین لکھے تھے وہ سب لکھدئے اور جو درمیان میں سہوا نظر سے رہ گئے تھے اونکو بھی مابعد مین علیحدہ لکھدیا ہے پھر کہاں سے لکھتے ہیں کہ جو قریب نصف قرآن کے ہوتے؟ اس کذب صریح اور دروغ بیفروغ سے کیا فائدہ ہوا۔ کمال حیف ہے کہ جو شخص روز قیامت اور جزا و سزاے آخرت کا قائل ہو وہ اس قدر جھوٹ بولے۔ ہاں اس حیرت کو اس طرح رفع کیا جاوے تو ممکن ہے کہ فرقہ عیسائیت کے نزدیک جزا و سزا اعمال پر موقوف نہیں صرف حضرت عیسی علیہ السلام پر اعتقاد لانا کافی ہے۔ اعمال بے کار ہین پس جھوٹ اور سچ برابر ہے اور انسان مختار ہے جو چاہے کرتا پھرے۔ بہر حال جب تک کہ پادری صاحب بموجب اپنے دعوی نصف قرآن کے الفاظ یا ہزار دو ہزار الفاظ نہ لکھدیں تب تک دروغ گوئی کا داغ اونسے رفع نہ ہو گا بلکہ یہ کذب تمام فرقہ کو بدنام کرے گا اور غیروں کو دین عیسوی سے نفرت پیدا کرے گا۔ اور ایسے ہی مقام پر کہا گیا ہے شعر

ترا اژدہا گر بود یار غار ازان بہ کہ جاہل بود غمگسار"[2]

مولانا فریق مخالف کے قرآن پر اتہامات اور مغالطہ آمیز اعتراضات کا کثیر الجہت جواب دیتے ہیں۔ مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم پر پادری صاحب کے اعتراضات کے جواب میں چھ عمدہ دلیلیں لائے ہیں جس میں فلسفیانہ،

---

1 محمد اعلی، سید، تنزیہہ الفرقان، ص ۵

2 ایضاً، ص ۱۸۷

نحویانہ اور منطقیانہ طریق اپنایا ہے[1]۔

نسخ قرآن کی بحث میں پادری صاحب کے اعتراضات کا رد علمی پیرائے میں کیا گیا ہے۔ جس میں فریق مخالف کی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے تورات اور انجیل سے بھی استشہاد نے مصنف کے مؤقف کو قوی تر کر دیا ہے[2]۔

پادری صاحبان کا طریق کار یہ ہے کہ بائبل کے متغایر قرآنی بیانات کو عدم تصویب بائبل کی بنا پر اور اس کے موافق قرآنی بیانات کو چربہ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ ہدایت المسلمین میں بھی پادری صاحب نے قرآن کے بعض بیانات کو عقلاً و نقلاً محال اور بائبل میں نہ ہونے کی وجہ سے مردود خیال کیا تھا۔ فاضل مصنف نے اس کا بہت عمدگی سے جواب دیا ہے کہ قاری کسی قسم کے اشتباہ کا شکار نہیں رہتا۔

کبھی کبھار مصنف بڑے لطیف پیرائے میں قلمی خوش طبعی کا مظاہرہ کرتا ہے جو فریق مخالف کے لیے ناصحانہ رنگ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ مثلاً پادری عمادالدین نے اپنی کتاب کی تیسری فصل میں قرآنی آیات کا عقلاً و نقلاً صریح باطل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کا علمی تعاقب کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں؛

> "پادری صاحب نے اس فصل میں جو عقل کو بھی کچھ دخل دیا ہے اس کا ہم شکر کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ عقل کے پابند ہوں اور پابندی عقل کا اول امتحان یہ ہے کہ ایک کو تین اور تین کو ایک نہ سمجھیں اور ہمارے جوابات کو بھی سمجھ لیں"[3]۔

کتاب کے مطالعہ سے مصنف کے علمی جوہر آشکار ہوتے ہیں کہ وہ نہ صرف عربی اردو اور فارسی پر دسترس رکھتا ہے بلکہ عہد نامہ قدیم کی اصل زبانوں عبرانی، سریانی اور یونانی کے کلمات پر لسانی اعتبار سے بحث سے ان زبانوں سے آگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مصنف نے ہدایت المسلمین جیسی دل آزار کتاب کا جواب لکھتے ہوئے کسی مقام پر جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ معقولیت متانت اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس عہد کی مسلم تحریریں عیسائیت کے مقابل بالعموم مختصر ہوا کرتی تھیں مگر یہ کتاب خاصی ضخیم ہے۔ جس میں مصنف نے کوشش کی ہے کہ زیر بحث موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ زیر تبصرہ کاوش ان کتب میں شمار ہوتی ہے جو ٹھوس علمی مواد کی بناء پر طبقہ علماء تک ہی محدود رہی اور عوام کے مستفید ہونے کے لیے اس کی بار بار اشاعت کا خاص اہتمام نہیں ہو سکا۔

---

1 محمد اعلیٰ، سید، تنزیہہ الفرقان، ص ۲۰۵۔۲۱۹

2 ایضاً، ص ۳۹۹۔۴۱۶

3 ایضاً، ص ۴۱۷

محمد عبداللہ　　انجیل و قرآن کا مقابلہ، اسلام اور عیسائیت کا مجادلہ

نظامی پریس، بدایوں ۱۹۳۰ء

صفحات: ۹۸

برصغیر میں مسلم مسیحی مباحث میں تردیدی و الزامی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف قسم کے رویے سامنے آتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان سے ہٹ کر الگ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ جس میں مسیحی مصنفین کی تحقیرانہ و تمسخرانہ انداز میں معترض ہونے کی روش کے رد عمل کا احساس ہوتا ہے۔

مصنف خود عائذ باللہ، خلیفۃ اللہ، مامور من اللہ، مہدی کلام اللہ، نائب محمد رسول اللہ، مثیل انبیاء بنی اسرائیل[1] ہونے کا دعویدار ہے۔ کتاب کے اسلوب سے مترشح ہوتا ہے کہ مسیحی اہل قلم کی غیر سنجیدگی (جو بعض اوقات تمسخرانہ حدود کو چھو لیتی) کے رد عمل میں یہ القاب اپنائے گئے ہیں کیونکہ اکثر اوقات مصنف مفہوم مخالف میں بات کرتے ہیں۔

مصنف عیسائیوں کو اپنے سوتیلے بھائی قرار دے کر ان کی اصلاح کے مدعی ہیں[2]۔ مسیحی دعویٰ الہمیں کے پس منظر میں مصنف سبب تالیف بیان کرتے ہیں کہ انہیں یہ کتاب لکھنے کی "روح القدس کے ذریعے سے تفہیم ہوئی"[3]۔

کتاب میں انجیل میں مذکور دعاؤں کا قرآنی دعاؤں سے تقابل، تعلیمات کا باہمی موازنہ نیز انجیلی تمثیلات اور پیشین گوئیوں کا علمی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنف کے مد نظر پادری ٹھاکر داس کی کتاب "انجیل یا قرآن" تھی جس کا ذکر تمہید میں کرتے ہیں۔ نیز اس کی دوسری کتاب کے متعلق کہتے ہیں،

> "اگر اہل اسلام کل کی فکر کریں تو آج ہی ہم دکھاتے ہیں" عدم ضرورت قرآن" لکھنے والے قرآن کی ضرورت محسوس کریں"[4]

پادری صاحب "انجیل یا قرآن" میں بعض قرآنی بیانات کی بزعم خویش تغلیط کرتے ہوئے ان کی مجوزہ اصلاح کرتے ہیں۔ مصنف نے اس کے مقابل زیر تبصرہ کتاب میں بعض انجیلی بیانات کی درستگی کی ہے۔ جس میں پہلے انجیلی بیان کا سقم یا غلطی کی نشان دہی اور بعد ازاں اس مضمون کو بہتر الفاظ میں واضح اور جامع مفہوم کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دراصل مصنف کی یہ تحریر پادری صاحب کے اسلوب اور طرز استدلال کو بعینہ اپناتے ہوئے الزامی رد عمل کا

1　محمد عبداللہ، انجیل و قرآن کا مقابلہ، اسلام اور عیسائیت کا مجادلہ (نظامی پریس، بدایوں ۱۹۳۰ء)، سرورق

2　ایضاً، تمہیدی فقرات بدون صفحہ شماری

3　ایضاً

4　ایضاً، ص ۳۲

اظہار ہے۔ مثلاً قرآنی دعا (سورۃ فاتحہ) اور متی ٦ : ٩ کا تقابل کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں؛

"انجیل کی دعا کی پہلی آیت ' اے ہمارے آسمانی باپ تیرے نام کی تقدیس ہو۔ تقدیس کے معنی عیبوں سے پاک ہونا پس اس دعا کے یہ معنی ہوئے کہ اے باپ تجھ میں کچھ عیب ہیں وہ دور ہو جائیں۔"

پھر مفصل بحث کرتے ہوئے انجیلی دعا کے مفہوم کو بہتر انداز میں اپنے الفاظ سے بیان کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر کہتے ہیں؛

" یہاں تک ہم نے انجیل اور قرآن کی دعا کا مقابلہ احسن طریق سے کر دکھایا ہے اور یہ اچھی طرح سے ثابت کیا ہے کہ انجیل کی دعا سے بڑھ کر اور بہتر دعا انسان بنا سکتا ہے اور بنا کر دکھایا بھی ہے مگر قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی پہلی سورت کا مقابلہ جہان بھر کے تمام علمی لیاقت رکھنے والے ہرگز کر ہی نہیں سکتے۔ اگر کرنے والا ہے تو آئے ہم سے مقابلہ کر کے دکھائے یا ہمارے پاس بھیجے پھر ہم دکھاتے ہیں کہ اس نے کس قدر غلطیاں کی ہیں یہی تو ہمارا منصب اور دعویٰ ہے[1]۔

مسیحی مصنفین صحیح مذہب کی پرکھ کے لیے اپنے معیارات و اصول پیش کرتے ہیں۔ مصنف انہیں کے اسلوب میں صحیح مذہب کی پرکھ کے لیے اصول بتاتے ہیں کہ؛

" اصل اور نقل کچے اور پکے مذہب کے پرکھنے کا یہ بھی ایک معیار ہے کہ جس مذہب کی تعلیم ہمیشہ کے لیے کارآمد ہو اور امیر اور غریب اور بادشاہ اور فقیر سب کے لیے یکساں کام دے وہ مذہب خدا کی طرف سے ہے۔ اس معیار پر انجیل کو پرکھنے کے حوالے سے کہتے ہیں،" پس اس معیار پر انجیل کے احکام کو وسیع پیمانے پر پھیلا کر دیکھ اس کے ہر حکم میں سوائے چند امور کے ضرور نقص پاؤ گے اور اس پر عمل کرنے والے نقصان اٹھائیں گے۔ مگر بظاہر محدود عقل کے پیمانے میں اس کی کم مقدار پر ہونے کی وجہ سے خوبی اور خوشنمائی نظر آتی ہے[2]۔

بعد ازاں انجیل کے چودہ احکام کا ذکر کر کے انہیں ناقابل عمل گردانتے ہیں کیونکہ معاشرہ میں ان پر عمل مشکل ہے۔ اس کے مقابل مدعی ہیں کہ قرآن پاک کی ہر تعلیم پر غریب، امیر، فقیر اور بادشاہ عمل کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں جواب دینے کا انداز اور انجیل میں اصلاح و ترامیم کا طریق تجویز کرنا مصنف کی ذہنی اختراع ہے۔ مصنف اپنی تحریر میں نظریاتی طور پر کسی مسلکی گروہ کی نمائندگی نہیں کرتے۔

" انجیل اور قرآن کی تعلیمات کا مقابلہ " کے عنوان سے مکالماتی اسلوب پر انجیل اور قرآنی تعلیمات کا موازنہ کیا گیا ہے۔ پہلے انجیل اپنی تعلیم بیان کرتی ہے جس کے جواب میں یحییٰؑ (حضرت عیسیٰؑ کے نقیب / ارہاص یحییٰؑ سے استعارہ) اس کا قرآنی تعلیم سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس میں ایک طریق عبادت، آٹھ مالی احکام، پانچ اخلاقی اور ایک

---

1 محمد عبداللہ، انجیل و قرآن کا مقابلہ، ص ١٤

2 ایضاً، ص ١٦

فوجداری حکم، کل پندرہ احکام کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس نتیجہ پر منتج ہوتا ہے کہ انجیلی احکام ناقص اور ان پر عمل لاحاصل اور بہت دشوار ہے۔ ان کے الفاظ میں؛

" میٹھے بادام اور کڑوے بادام میں جو فرق ہے وہی قرآن اور انجیل کے احکام میں ہے۔" البتہ کچھ انجیلی پند و نصائح کو قابل قدر گردانتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی سینکڑوں احادیث مبارکہ ایسی تعلیمات سے مملو ہیں۔ جب کہ انجیلی تعلیمات اس کے مقابل " آٹے میں نمک " کی طرح ہیں۔

دکھاتے ہیں تعلیم انجیل و قرآن　　مقابل میں سورج کے تارا نہیں ہے
بھئی انجیل کی نہیں تعلیم کامل　　ہے یسوع کا قول، یہ ہمارا نہیں ہے[1]

زیر نظر کتاب کا طرز بیان برصغیر میں مسیحی لٹریچر کے جواب میں لکھی جانے والی تمام کتب سے الگ اور منفرد ہے۔ مصنف کے دعاوی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان میں کتنا سنجیدہ ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ الزامی طریق طور پر انہوں نے یہ اسلوب اور طرز استدلال اختیار کیا۔ کتاب کے آخر میں وہ جماعت احمدیہ سے بھی اس بات کے متقاضی ہیں کہ وہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیں[2]۔

" حضرت یسوع علیہ السلام کی قربانی اور کفارہ ایمان " کے عنوان کے تحت نظریہ کفارہ کا بطلان کیا گیا ہے[3]۔

عقیدہ توحید و تثلیث میں سے تثلیث کو توحید کی ضد قرار دیا گیا۔

عقیدہ کفارہ کو لعنتی گردانتے ہوئے اسے سخت پشیمانی کا باعث گردانا گیا ہے اور تنبیہ کرتے ہیں؛

" توبہ کرو، خدا کو بے انصاف مت قرار دو اور یسوع کو ملعون مت کہو ہم یہ خدا کا پیغام تمہارے کانوں تک پہنچانے کے لیے آئے ہیں۔ ہمارے اس بیان پر انسان کی فطرت اور انجیل اور قرآن تینوں گواہ ہیں[4]۔

مسیحی عقیدہ کفارہ کی نسبت مسلم عقیدہ شفاعت کو بہتر قرار دیا ہے۔ آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں پر نظر ڈالی گئی ہے[5]۔

مصنف نے اگرچہ اس کتاب کو پادری صاحبان کی سطح پر اتر کر لکھا ہے مگر کمال یہ ہے کہ باوجود الزامی و کلامی طریق کے سوقیانہ اور سطحی زبان استعمال نہیں کی گئی جس کا مظاہرہ بعض مسیحی تحریروں میں کیا گیا ہے۔ اسلوب اگرچہ ظریفانہ نہیں مگر بائبل سے آشنا قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مروجہ مسلم طریق سے ہٹ کر لکھی گئی یہ

1　محمد عبداللہ، انجیل و قرآن کا مقابلہ، ص ۳۱

2　ایضاً، ص ۹۶

3　ایضاً، ص ۵۶

4　ایضاً، ص ۷۳

5　ایضاً، ص ۷۳۔ ۷۴

کتاب مذہبی حلقوں میں زیادہ پسندیدگی حاصل نہ کر پائی۔ ممکن ہے اس کی وجہ مصنف کے دعاوی ہوں اور مسلم علماء نے جواب دینے کا یہ بظاہر غیر سنجیدہ طریق قابل التفات نہ سمجھا ہو۔

مولانا محمد علی کانپوری　　　دافع التلبیسات*

نامی پریس، کانپور ۱۳۰۲ھ

صفحات: ۱۷۴

برصغیر کے مسلم مسیحی مناظراتی ادب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں ایک کتب کا جواب، پھر جواب الجواب اور رد جواب الجواب کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی قبیل سے ہے۔ "تاریخ محمدی" از پادری عمادالدین کا رد مولوی چراغ علی صاحب نے "تعلیقات" کے نام سے دیا جس کا جواب الجواب پادری موصوف نے "تقلیبات التعلیقات" کی صورت میں دیا۔ زیر تبصرہ" دافع التلبیسات" اسی "تقلیبات التعلیقات" کا جواب ہے۔

ابواب بندی یا فصول کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ مصنف کا اسلوب یہ ہے کہ پہلے تعلیق کے تحت "قولہ" کے عنوان سے اعتراض نقل کرتے ہیں پھر "اقول" کے زیر عنوان اپنا جواب تحریر فرماتے ہیں۔

اس قلمی مناقشہ کا موضوع اثبات نبوت محمدی اور مروجہ اناجیل کی سند و الہامی حیثیت ہے۔ فاضل مصنف نے اثبات نبوت محمدیہ تین طریقوں سے بدلائل ثابت کی گئی ہے۔

اول　　حالات محمدیہ

دوم　　تعلیمات محمدیہ

سوم　　معجزات محمدیہ

ابتداء میں بعض مغربی مسیحی علماء کے سیرت محمدیہ پر مثبت اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان علماء کی اکثریت اپنے مذہبی تعصب میں مشہور ہے لیکن پھر بھی حقائق کی قوت نے انہیں خواہ جزوی طور ہی سہی، آنحضرت ﷺ کی تعریف پر مجبور کر دیا، اسے سچائی کی فتح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں واشنگٹن ارونگ، طامس کارلائل، اڈورڈ گبن راڈویل، اسپرنگر، سر ولیم میور، جان ڈیون پورٹ اور گاڈفری ہیگنس کی آراء شامل ہیں[1]۔ (یہی آراء مولوی چراغ علی نے "تعلیقات" میں پیش کی ہیں)

---

* قاموس الکتب اردو میں اندراج نمبر ۸۱۷۳ صفحہ ۸۲۱ پر اسے "دفع التعلیقات" کے نام سے مندرج کیا گیا ہے یہ اندراج کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کی فہرست سے نقل کیا گیا جس کے دوران کتابت میں یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔

1　کانپوری، محمد علی، دفع التلبیسات، (نامی پریس، کانپور ۱۳۰۲ھ)، ص ۸-۱۶

جواب الجواب ہونے کی وجہ سے کتاب کا عمومی اسلوب الزامی ہے۔

بغیر عنوان قائم کیے تعلیمات نبوی کے ذیل میں قرآن مجید کے علوم بیان کیے گئے ہیں جن میں شاہ ولی اللہ کے علوم پنجگانہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پادری صاحب کے اعتراضات کا رد بھی ہے۔ مثلاً پادری صاحب ولقد نعلم انھم یقولون [1] آیت کے تحت معترض ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کسی عجمی سے سن کر قرآن بنالیا کرتے تھے اس کے جواب میں مصنف پہلے تو اس آیت کی توضیح کرتے ہیں، پھر الزامی جواب میں لکھتے ہیں؛

" اون معاندین کا محض خیالی پلاؤ تھا جس کا ذکر قرآن مجید مین آیا ہے۔ دیکھو حضرت مسیحؑ جو بھوت پلیت نکالا کرتے تھے کہ شیطان یا روح خبیث کے ذریعے سے نکالتے ہیں۔ اسکا کوئی جواب شافی انجیل مین نہین ہے۔ اسی طرح جب حواریوں پر روح القدس اترا اور مختلف زبانیں بولنے لگے تو بعض لوگوں نے ٹھٹے سے کہا کہ نئی مئے کے نشے مین ہیں (اعمال ۲ : ۱۳) اب اگر پادری صاحب کے نزدیک مخالفوں کی بدگمانی قابل اعتبار ہے تو اونھین حضرت مسیحؑ اور حواریوں کی نسبت جو کچھ مخالفون نے کہا ہے اوسے بھی ماننا پڑیگا کیونکہ حضرت مسیحؑ کے کرشمے تو مخالفون کے نزدیک خبیث روح کے ذریعے سے تھے پھر وہ کب لائق اعتبار ہو سکتے ہیں" [2]۔

اسی طرح ثقاہت قرآن کے ذیل میں سند قرآن کا بائبل کی سند سے یوں تقابل کرتے ہیں؛

"مخفی نرہے (نہ رہے) کہ قرآن مجید کی سند کتابی اور زبانی دونوں ایسی مستحکم اور صحیح ہمارے پاس ہے کہ کوئی ہمارا مخالف اپنی کتاب کی، جسے وہ کتاب اللہ جانتا ہے ہرگز نہیں لا سکتا۔ ہمارے مخاطب بڑی زبان درازیاں کرتے ہیں بھلا مجموعہ بیبل کے ایک ہی رسالہ کی ایسی سند بیان کریں ہمارا اونکا فیصلہ اسی پر ہے پھر کیا وہ اس میں معقول طور سے دم مار سکتے ہیں ہرگز نہیں، ہرگز نہیں یہ ان ہونی بات ہے۔۔۔۔ بالفرض اگر اس وقت تمام عالم سے قرآن شریف کے کل نسخے ناپید کر دیئے جائیں تو اسی وقت حفاظ کے سینے میں وہی قرآن شریف بعینہ جس مین ایک حرف یا ایک نقطہ کا فرق نہو موجود ہو سکتا ہے پھر کیا پادری صاحب اور اونکے مقتدا ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں، ہرگز نہیں" [3]۔

فاضل مصنف پادری صاحب کے اعتراضات کا علمی رد کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے مناظرانہ اسلوب کے مطابق فریق مخالف پر تنقید کا اظہار ضرور کرتے ہیں؛

" ہدایت المسلمین " میں جو کچھ انہوں نے لکھ کر اپنی ناواقفیت کو طشت ازبام کیا ہے اس کا کافی جواب مولوی سید محمد صاحب نے تنزیہہ الفرقان ۱۲۹۴ھ میں دیا ہے۔ جس کا جواب الجواب میں پادری صاحب سے کچھ نہیں ہو سکا یہ ان کی دیانت کہیے یا تلبیس کہ پھر دوسرے مرتبہ انہی اعتراضوں کو لکھ دیا ہے اور اکثر مقام پر جواب الجواب پر ایک

---

1 النحل: ۱۰۳

2 کانپوری، دافع التلبیسات، ص ۶۵

3 ایضاً، ص ۷۵، ۷۶

حرف بھی نہیں لکھ سکے"[1]۔

مولانا صاحب نے اس کتاب میں نو مسیحی پادری عمادالدین کے دنیاوی منفعت و جلب زر کی طمع میں مسیحیت قبول کرنے اور مزید "دنیاوی ترقی" پانے پر مسیحی پادریوں کی آراء قارئین کے سامنے پیش کی ہیں تاکہ صورت حال واضح ہو جائے اور دل آزار تصانیف کے مصنف کی فکری حیثیت آشکار ہو۔ مثلاً پادری رجب علی (مصنف آئینہ اسلام) کی رائے ملاحظہ ہو:

"ہمارے لاہز برادر نے جہاں کہیں تحقیقی جواب کے لیے قلم اٹھایا ہے وہاں بجائے تحقیقی جواب کے غلط جواب (بلکہ بے سر وپا) دیئے ہیں۔ جو لوگ حکیمانہ مزاج رکھتے ہیں وہ ہدایت المسلمین کے شاندار نام کو ایشیائی گپ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ (پادری رجب علی صاحب کا ریمارک) اور پادری کریون کے اہتمام سے جو شمس الاخبار نکلتا ہے اس میں پادری صاحب کی تصانیف کو صاف نفرتی لکھا ہے۔ جس میں گالیاں لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کو باہر پندرہ روپے کوئی نہ پوچھے اور مشن میں ستر روپے ماہواری (اب ڈیڑھ سو) اور کوٹھی ملے جس کے احاطہ میں چاہیں تو تیل نکالنے کا کولہو بھی بنالیں ایسے لالچیوں کو کیا کہنا چاہیے (دیکھو شمس الاخبار لکھنؤ مطبوعہ امریکن مشن پریس ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۵ء، نمبر ۱۵ جلد) ص ۷"[2]

مولانا سید محمد علی　　مرآۃ الیقین لاغلاط ہدایۃ المسلمین

مطبع رحمانیہ مونگیر، اشاعت اول ۱۳۰۰ھ، اشاعت دوم ۱۳۲۹ھ

صفحات: ۶۹

برصغیر میں انگریز استعماری عہد کے ادب کا ایک حصہ اس مسیحی لٹریچر پر مشتمل ہے جو تبلیغ عیسائیت کے ساتھ ساتھ مسلم قارئین کے لیے حد درجہ دل آزار اور پریشان کن تھا۔ مسلم علماء نے اس لمحہ فکریہ کے تقاضوں کو بخوبی سمجھا اور مقدور بھر اپنے فرائض نبھانے کی کوشش کی۔ وہ عیسائیت کے بنیادی عقائد اور ابتدائی کلیسیائی تاریخ کے مسیحی ماخذ سے کسی حد تک ناواقفیت کے باوجود میدان میں اترے اور ان کتب کا تشفی بخش جواب دیا۔ مسلمان معاشی لحاظ سے پس ماندہ تھے جب کہ مسیحی مبشرین کو ادارہ جاتی اور سیاسی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے باوجود مسلم علماء نے کمر ہمت باندھ لی اور جو کام اداروں کے کرنے کے تھے ناسماعد حالات میں انہوں نے انفرادی طور پر نبھایا۔ اس صورت حال کے پیش نظر کتاب ہذا کے ابتدائی صفحات میں "ہمدردان اسلام سے فریاد" کے عنوان سے اپیل کی گئی ہے جس میں اہل اسلام پر حالات کی سنگینی آشکار کرتے ہوئے اسلام مخالف گروہوں کی قلمی و تبلیغی میدان کام کی

1　کانپوری، دافع التلبیسات، ص ۶۲۔۶۳

2　ایضاً، ص ۱۷۱۔۱۷۲

طرف توجہ مبذول کروا کر ان سے مقابلہ کے لیے تعاون کی استدعا کی گئی ہے[1]۔

کتاب ہذا کا سبب تالیف یہ ہے کہ اعجاز عیسوی از مولنا رحمت اللہ کیرانوی کے جواب میں نو مسیحی عماد الدین نے "ہدایت المسلمین" لکھی۔ مولانا محمد علی نے "مراۃ الیقین لاغلاط ہدایۃ المسلمین" کے نام سے اس کتاب کا رد لکھا اور اس کی علمی و تاریخی اغلاط کی طشت از بام کی ہیں۔ جبکہ کتاب کے آخری حصہ میں پادری صاحب کی دوسری تحریر "تاریخ محمدی" کا علمی تعاقب کیا گیا ہے۔

تین ابواب پر مشتمل اس کتاب کے باب اول میں "ہدایت المسلمین" کے مصنف کی " دین مسیحی سے کمال ناواقفی اور جہالت" اور اسلام سے تعصب پر مبنی اکیس مقامات دکھائے ہیں۔ جب کہ دو کے بارے لکھتے ہیں کہ کتب کی عدم دستیابی کی بناء پر وہ اس کی نشان دہی نہ کر سکے[2]۔

دوسرے باب میں " پادری صاحب کی کچھ دروغ گوئی اور ان کے اغلاط کا بیان" کے عنوان سے پچیس بیانات میں کردہ کذب بیانی اور اغلاط کو آشکار کیا گیا ہے[3]۔

جب کہ باب سوم میں بقول مصنف " پادری صاحب کا جہل علوم مروجہ اہل اسلام سے ثابت کیا ہے۔ اور چند شواہد ان کی جہالت کے بیان کیے ہیں"[4]۔

پہلے باب میں پادری عماد الدین کے اعجاز عیسوی کے تعاقب میں پوچھے گئے سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ پادری صاحب بعض اوقات مخاطب کو جھٹلانے کے لیے بڑی تحدّی سے حوالہ طلب کرتا ہے۔ مگر پھر خود اسے تسلیم بھی کرلیتا ہے۔ مثلاً پادری صاحب استفسار کرتے ہیں کہ انجیل یوحنا کے باب ہفتم اور ہشتم کی متعدد آیات، جن کا مشتبہ اور محرف ہونا مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بیان کیا ہے، وہ کن کتابوں میں مذکور ہیں۔ پادری صاحب کے اصل الفاظ یہ تھے، "وہ آیتیں اور وہ اختلاف اور کتابوں کے پتے بتلاؤ ورنہ جھوٹا دعویٰ کرتے ہو" مگر آگے چل کر اس اعتراض کو صحیح بھی تسلیم کرلیتے ہیں۔ اس پر فاضل مصنف یوں بلیغ تبصرہ کرتے ہیں؛

> " ایک لطف اور سنیئے یہاں مولوی صاحب سے پتہ اور نشان پوچھا جاتا ہے اور جب وہاں پہنچے جہاں پتہ اور نشان بتایا تھا تو اعتراض کو تسلیم کرلیا گیا۔ ناظرین ہدایت المسلمین کا صفحہ ۱۰۲ ملاحظہ کرلیں وہاں مجیب عجیب کی آنکھوں میں سرسوں پھول گئی سوائے تسلیم کے کچھ نہ بن پڑا۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ پہلے ہم کیا لکھ آئے ہیں۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ مجیب

---

1 محمد علی، سید، مولانا، مرآۃ الیقین لاغلاط ہدایۃ المسلمین، (مطبع رحمانیہ مونگیر، ۱۳۳۹ھ، اشاعت دوم)، ص ا

2 ایضاً، ص ۳

3 ایضاً، ص ۲۷۔۲۸

4 ایضاً، ص ۴۷

حیران ہے کچھ بن نہیں پڑتا کہیں کچھ کہہ دیا کہیں کچھ کسی طرح پیچھا تو چھٹے، سو خاطر جمع رکھیں جب تک ملک الموت ان کی روح کو مثل عصارہ کے نہ نچوڑیں اہل اسلام بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے[1]۔

صاحب اعجاز عیسوی نے انجیل کے سلسلہ سند پر چند اعتراضات اٹھائے تھے۔ مولانا پادری صاحب کے جواب کو اپنے تبصرہ کے ساتھ یوں نقل کرتے ہیں؛

"اب اس جھوٹ کو ناظرین ملاحظہ کریں جو مجیب (پادری) صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں کہ (تفسیر بائبل) ہارن کے جلد ۲ صفحہ ۱۲ دیکھو کہ صدہا نسخوں کا ذکر اور سب کا سلسلہ متصل وہاں موجود ہے۔ الخ، سبحان اللہ! کیا سلسلہ متصل ہے کہ اٹکل پچو ہانک رہے ہیں کہ فلانی صدی کا ہے یا فلانی کا ہے خیر پادری صاحب نے اسلام کی برکت سے سلسلہ متصل کا لفظ تو سیکھ لیا اگر چہ اس کے معنی نہیں جانتے۔ اور طرہ یہ ہے کہ مجیب صاحب نے اسی جھوٹ پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس کے بعد ایک اور اُول کی ہے کہتے ہیں کہ ایسی اچھی طرح کہ قرآن کا بھی ایسا سلسلہ اتصال نہیں ملتا۔ مجیب صاحب یہ فرمایئے کہ زبانی جمع خرچ ہے یا کچھ ہو بھی سکتا ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ آپ کسی ایک ہی نسخہ کا سلسلہ متصل تفسیر ہارن سے یا کسی کتاب سے لکھ دیجئے۔ پھر ہم سے قرآن کا سلسلہ متصل طلب کیجئے۔ اس کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ کس کے پاس سلسلہ ہے اور کون جھوٹے ترنگ ہانک رہا ہے"[2]۔

" چوبیسواں دروغ کے تحت پہلے پادری صاحب کا سورۃ الشعراء کی آیت " والشعراء یتبعھم الغاوون " پر تبصرہ نقل کیا ہے کہ "یہ فقرہ گواہ ہے اس بات کا کہ محمد صاحب اپنے شاعروں کی بناوٹ سے خوب واقف تھے اور ان کی باتوں پر یقین کرنے والوں کو انہوں نے قرآن میں گمراہ بتایا ہے۔۔۔"

مولانا صاحب پادری مذکور کو اس کی دیدہ دلیری پر انہیں "شاباش" دیتے ہوئے بلا تبصرہ صرف مکمل آیت بمعہ ترجمہ نقل کر دیتے ہیں جس سے نہ صرف معترض کا نقد اور اس میں تلبیس واضح ہو جاتی ہے بلکہ فاضل مصنف کا یہ رویہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ پادری صاحب کی کتابوں کو علمی حوالہ سے کوئی اہمیت دینے کے لیے کیوں تیار نہیں۔ مولانا مزید لکھتے ہیں؛

" یہاں بھی پادری صاحب کا جھوٹ اور فریب قابل غور ہے۔ آیت میں تو صاف صاف اس وقت کے شاعروں کی دو قسمیں کی ہیں ایک کافر اور دوسرے مسلمان پہلی قسم کی مذمت کی اور دوسرے قسم کی مدح بیان کی ہے۔ پادری صاحب مسلمانوں کی مدح چھوڑ کر کافروں کی مذمت ان کے ذمے لگاتے ہیں اور اتنا خیال نہیں کرتے کہ جب کوئی پوری آیت دیکھے گا تو مجھے کیا کہے گا۔ مگر سچ ہے کہ جب انسان خوف خدا اور شرم و حیا کو طاق میں رکھ دے تو پھر جو چاہے سو کرے[3]

---

1 محمد علی، مرآۃ الیقین، ص ۱۱۔۱۲

2 ایضاً، ص ۱۷

3 ایضاً، ص ۴۵

کتاب ہذا کے صفحہ ۴۲ تک مولانا نے ہدایت المسلمین کا محاکمہ کیا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۴۲ تا ۴۷ پادری صاحب کی ہی دو دیگر تحریروں "تاریخ محمدی" اور "تعلیقات التعلیقات [1] " جائزہ لیا ہے۔

مرآۃ الیقین میں مولانا کا تجزیاتی اسلوب قابل تحسین ہے۔ تحریر کا جزئیاتی جائزہ اس انداز میں کرتے ہیں کہ مخالف اپنی تحریر سے جو مفہوم یا تاثر پیش کرنا چاہتا ہے اس کی داخلی کمزوری عیاں ہو جاتی ہے۔ پھر مصنف مؤثر ساتھ ہی حقیقت حال بھی بیان کر دیتے ہیں یوں قاری مشنری تحریروں کی تدلیس و تلبیس کا شکار نہیں ہوتا۔ مثلاً ص ۴۶ پر " پچیسواں دروغ" کے تحت پادری عماد الدین صاحب کی تعلیقات سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں کہ

منشی (چراغ علی) صاحب محمدی قرآن کو قبول کرتے ہیں جسے عثمان نے لکھا اور جس نے محمد صاحب کے زمانہ کا لکھا ہوا قرآن اور ابو بکر کا جمع کیا ہوا دوسرا قرآن اور بعض متفرق اوراق جلا دیئے اور جب قاریوں کی کثرت دفع ہونے لگی تو اس وقت قاریوں کی زبان سے اپنی رائے کے موافق انتخاب کر کے عرب کو دیا۔"

اس پر مولانا "اقول" کے تحت رقم طراز ہیں؛

" یہاں پر (عمادالدین) پانی پتی نے تین جھوٹ بولے ہیں اول ایک قرآن کو تین بتایا دوسرے یہ کہ سرور عالم اور ابو بکر کے وقت کا قرآن حضرت عثمان جلا دیا۔ تیسرے یہ کہ بعد جلانے قرآن کے حضرت عثمان نے قاریوں کی زبان سے اپنی رائے سے قرآن کو انتخاب کیا۔ ناظرین خوب یاد رکھیں کہ یہ دعوے جھوٹے ہیں۔" [2]

اس کے بعد مختصراً تدوین قرآن کے بارے شیخین اور حضرت عثمانؓ کی کاوشوں کو واضح کرتے ہوئے پادری صاحب کی تغلیط کی ہے۔ اور آخر میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ، غرضیکہ جو اہتمام کہ قرآن مجید کے شیوع اور حفظ صحت میں ہوا کسی اور الہامی کتاب کا نہیں ہوا۔ تمام عیسائی اپنی کتاب کو محض اٹکل پچو مان رہے ہیں کوئی عیسائی یہ نہیں ثابت کر سکتا کہ انجیل فلاں حواری کی لکھی ہے۔

قاموس الکتب میں مرآۃ الیقین کے بارے لکھا ہے؛

"اس میں پادری صفدر علی کی قلعی کھولی گئی ہے کہ وہ معمولی پڑھا لکھا تھا اور دولت پر ایمان نثار کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اس سے مناظرہ کرنا چاہا اس نے گریز کیا۔ اس کی کتاب نیاز نامہ کی رد میں منشور محمدی رسالہ میں مضامین مسلسل لکھے

---

1 پادری صاحب کی تاریخ محمدی کا جواب مولوی چراغ علی صاحب نے تعلیقات کے نام سے دیا تھا اس کا جواب الجواب پادری صاحب نے تعلیقات التعلیقات کے نام سے دیا

2 محمد علی، مرآۃ الیقین، ص ۴۱

گئے جس کا کتاب ہذا مجموعہ ہے"[1]۔

یہاں پر مرتبین سے سہو ہو گیا ہے یہ کتاب نیاز نامہ از پادری صفدر علی کے جواب میں نہیں ہے بلکہ یہ پادری عماد الدین کی کتاب " ہدایت المسلمین کے رد میں ہے جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے۔

فاضل مصنف کی کاوش روایتی انداز سے ہٹ کر ہے۔ اس میں مواد کی درجہ بندی اور انداز پیش کش سے ان کے تبحر علمی اور جواب دینے کی استعداد و لیاقت کا پتہ چلتا ہے۔ نیز یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ مصنف نے باوجود بے سروسامانی کے مسیحی منادین کا بطریق احسن مقابلہ کیا۔ اسلوب بیان شستہ، طریق استدلال دلچسپ اور معقول ہے۔

مولانا ابوالمنصور ناصر الدین تفسیر تبجیل التنزیل (فارسی)

مطبع نصرۃ المطابع، دہلی

صفحات: ۲۰۸ (صرف ابتدائی دو پارے، باقی غیر مطبوع ہے۔)

۱۸۵۷ء کے مابعد برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مذہبی و سیاسی حوالے سے بہت پُر آشوب اور کٹھن تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی بدون ناکتخدا منجدھار گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ سیاسی فاتح اپنے حریف مسلمانوں کے مال و دین کو لقمہ تر سمجھ کر اس پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر میں تھے۔ ایسے میں ان فاتحین کے ہم مذہب مسیحی منادین نے مفتوحہ میدان دیکھ کر اپنی تبشیری سرگرمیوں میں کافی تیزی پیدا کر لی تھی۔ ان کا خاص ہدف پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس اور قرآن مجید تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے دفاع اسلام پر کمربستہ چنیدہ علماء میں سے مولانا ابوالمنصور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دیگر خدمات کے علاوہ آپ نے تفسیر قرآن کے ذریعے دفاع قرآن کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ بعض دیگر تفاسیر مثلاً تفسیر سرسید، تفسیر المنان، تفسیر ثنائی وغیرہ میں مسیحی معترضین کا جواب دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر کلامی مباحث بھی برابر موجود ہیں۔ لیکن "تبجیل التنزیل" میں خصوصاً مسیحی منادین اور ان کے واردہ اعتراضات پر ارتکاز کرتے ہوئے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دیگر کاوشوں سے ممتاز ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا نے ایک طویل عرصہ عیسائیوں کے درمیان گذارا تھا اور مسیحی مبلغین سے مناظروں نے ان کی فکر پر عیسائیت کا ایک خاص تاثر پیدا کر دیا تھا۔ جو کہ مختلف انداز میں

1 قاموس الکتب اردو جلد اول، مرتبہ: مفتی انتظام اللہ شہابی، (انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۶۱ء) ص ۸۲۰

تسہیل التنزیل میں جھلکتا ہے۔ مولانا نے یہ تفسیر لکھتے وقت جن امور کا لحاظ رکھا ان کی وضاحت وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں؛

"سہ امر را ملحوظ داشتہ ام اول اینکہ تفسیر ہر آیۃ از حادیث صحیحہ بلکہ اکثر از صحیحین بر نگاشتہ ام دوم اینکہ آیات کتب الہامیہ سابقہ را در تائید مر مطالب قرآن درج ساختہ ام تا اہالی مذاہب دیگر را ہیچ شکے و اعتراجے و از تسلیمش ہیچگونہ اعراضے و اغماضے نباشد سوم اینکہ در تفسیر ہر آیۃ مسائل ضروریہ متعلقہ اش را از حادیث مبرہن کردہ شدہ۔ وصحت حالات تواریخی و جغرافیہ مقامات و معانی صحیحہ اسماء و لغات و اصل ہر لغت و توافق محاورات تمامی کتابہائے خدا باوجود تباین زبانہائی عربی و عبرانی و یونانی و باوصف تباعد مدتہائے دراز در اوقات نزول آن کتابہا و دیگر مضامین عدیدہ مشعر معلومات جدیدہ و مطالب مفیدہ کہ ہیچ چشمش مثلش ندیدہ از صفات مخصوصہ این تفسیر است"
(تین چیزوں کا میں نے اس تفسیر میں لحاظ رکھا ہے۔ اول یہ کہ ہر آیت کی تفسیر صحیح احادیث سے کی ہے بلکہ ان میں سے اکثر صحیحین (بخاری و مسلم) سے لی گئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ گذشتہ الہامی کتابوں کی آیات کو مطالب قرآنی کی تائید میں درج کیا ہے تاکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے کو کوئی شک اور اعتراض اور اسے تسلیم کرنے سے کسی قسم کا اعتراض واغماض نہ ہو، تیسرے یہ کہ ہر آیت کی تفسیر کے تحت رونما ہونے والے ضروری مسائل کو احادیث سے مدلل کیا ہے۔ مقامات کے جغرافیہ اور تاریخی حالات کی صحت اور نام اور زبان کا صحیح معنی اور ہر لغت کا ماخذ اور جملہ آسمانی کتابوں کے محاورات کا توافق عربی و عبرانی اور یونانی زبانوں کے اختلاف اور ان کتابون کے زمانہ نزول میں طویل مدت کے فاصلہ کے باوجود، اور دوسرے متعدد مضامین جو جدید معلومات پر نشان دہی کرتے ہیں اور ایسے مفید مطالب کہ کسی آنکھ نے ان کا مثل نہ دیکھا اس تفسیر کی مخصوص صفات میں سے ہیں)[1]۔

عربی و غیر عربی میں یہ واحد تفسیر ہے جو کتب ساوی کی روشنی میں کی گئی ہے اور جا بجا ان کے حوالے نقل کیے گئے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ قرآنی مطالب کی تائید و تشریح سابقہ کتب ساوی سے اس طرح کی جائے کہ بنیادی اسلامی اصول متاثر نہ ہوں اور اہل کتاب پر حجت بھی قائم ہو جائے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان " لا تصدقوا ولا تکذبوا[2]" کے تحت اہل کتاب کی روایات سے استفادہ کو محدود کر دیا گیا ہے اس لیے مولانا مسیحی و یہودی روایات سے تائید و استشہاد کرتے ہیں نہ کہ استدلالی و استنباطی حیثیت سے۔ اس تفسیر میں زیادہ تر اہل اسلام اور اہل کتاب کے اعتقاد و ایمان ہر دو کا تعارف و تقابلی جائزہ مقصود ہے۔

---

1 بحوالہ: قاسمی، محمد سعود عالم، ڈاکٹر، مطالعہ تفاسیر قرآن، (فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۴ء) ص ۱۴۱۔ ۱۴۲

2 بخاری، الجامع الصحیح، کتاب التوحید، حدیث نمبر ۷۵۴۲

مثال کے طور پر " وَيُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ [1] " کی تفسیر میں لکھتے ہیں؛

" اسرائیلیوں میں تین وقت کی نماز کا معمول تھا۔ایک نماز صبح جسے سحریت کہتے ہیں۔ اس نماز کی ابتداء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ اس کا وقت طلوع صبح صادق ہے۔ آدھے دن کے وقت تک ہے۔ دوسری نماز جو منحاکم کہلاتی ہے اور اس کا وقت زوال آفتاب سے لے کر شام کے وقت تک ہے۔ اس نماز کی ابتداء حضرت اسحاق علیہ السلام سے ہوئی۔ (تکوین ۲۴: ۶۳) رات کی نماز کا نام عربیت ہے جس کی ابتداء حضرت یعقوب علیہ اسلام سے ہوئی۔ (تکوین ۲۸ : ۱۰۔۱۲) اور اس کا وقت پوری رات ہے اور ہر نماز میں زبور کا پڑھنا واجب سمجھا گیا ہے۔ خاص طور پر ایک سو اڑتالیس کو"[2]

مسیحی منادین کی طرف سے قرآن کے جس مقام پر کوئی اشکال پیش کیا گیا اس اشکال کو دور کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر میں پادری عمادالدین کی طرف سے ہدایت المسلمین میں کردہ اعتراض کو نقل کر کے جواب دیا گیا ہے کہ " رحیم ادنی ہے اور رحمان اعلی اور فصحائے عرب ادنی سے اعلی کی طرف ترقی کرتے ہیں جب کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کی خلاف ورزی ہے"۔ اس پر لکھتے ہیں؛

" معترض کلام الہی کے محاورات سے باخبر نہیں۔ انجیل میں مذکور ہے کہ جو شخص اچھی طرح زمین میں بویا گیا وہ وہی ہے جو کلام الہی کو سنتا اور سمجھتا ہے اور پھل لاتا ہے، کوئی سو گنا پھلتا ہے کوئی ساٹھ گنا، کوئی تیس گنا (انجیل متی ۱۳: ۲۳) کیا یہ ترقی ادنی سے اعلی کی طرف ہے یا اعلی سے ادنی کی طرف نیز انجیل میں ہے کہ میں نے نگاہ کی تو اس تخت اور ان جانداروں اور بزرگوں کے گرداگرد بہت سے فرشتوں کی آواز سنی جن کا شمار کروڑوں اور لاکھوں تھا۔ (مکاشفات ۵: ۱۱) فصحائے عرب مدح کے مقام میں ادنیٰ سے اعلی کی طرف ترقی کرتے ہیں نہ کہ حقیقت واقعہ کے بیان میں، اور اللہ تعالی جیسا کہ وہ ہے کوئی اس کی تعریف نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اس کے اوصاف کے بیان میں مبالغہ کیا جائے۔ اس اعتبار سے پہلے دنیاوی زندگی میں اس کی رحمت و تکریم کا تذکرہ لازم ہوا بمقابلہ اس کی رحمت کے جو دنیائے آخرت میں واقع ہوگی۔ اور حال کو مستقبل پر صریح تقدم حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ رحمن خاص طور پر اللہ تعالی کی صفت ہے بخلاف رحیم کے، وہ خالق اور مخلوق دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اسم ذات کے ساتھ وہی صفت موزوں تر تھی جو باری تعالی کے ساتھ مخصوص ہے۔ تیسرے یہ کہ بسم اللہ میں اللہ تعالی کے تین ناموں کا تذکرہ ہے یعنی اللہ، رحمن، رحیم۔ اللہ اسم ذات ہے، رحمن بمنزلہ اسم ذات ہے اور رحیم اسم صفت ہے اور ہر صفت کے لیے ذات کا تقدم بدیہیات میں سے ہے اس کے ترتیبی معنی اس طرح ہوں گے، " ازل سے پرستش کے لائق ابد تک تمام مخلوقات کو روزی دینے والا اور آخرت میں نیکوکاروں کو بخشنے والا"[3]

---

1 بقرۃ ۲: ۳

2 ابوالنصور، تبجیل التنزیل، ص ۳ بحوالہ قاسمی، مطالعہ تفاسیر قرآن، ص ۱۴۸۔۱۴۹

3 ایضاً، ص ۱۵۲

مصنف زیادہ تر الزامی اسلوب میں جواب دیتے ہیں۔ حروف مقطعات کی تفسیر میں لکھتے ہیں؛

"بہت سے اہل کتاب نے ان حروف پر اعتراض کیا ہے کہ جب کسی کو ان کے صحیح معنی معلوم نہیں ہیں تو ان حروف کو قرآن میں لکھنے سے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکمت الٰہی کے راز سے نہیں ہوں مگر اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ زبور میں چند آیات کے بعد اسی شکل میں ایک لفظ آتا ہے " سلاہ" یہ لفظ زبور میں ۷۳ مرتبہ اور حضرت حبقوق کے صحیفہ میں جو کہ توریت کے مجموعہ میں شامل ہے تین مرتبہ پایا جاتا ہے، اس کا مراد اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ اس سنجیدہ بیان پر پوری طرح غور کرنے کے بعد بھی اس کا لغوی معنی تین ہزار سال گذرنے کے باوجود اب تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا[1]"۔

تفسیر میں اہل کتاب کی تاریخ، اماکن بائبل و قرآن کے جغرافیہ پر سیر حاصل بحث ہے۔ نیز قرآنی الفاظ و اصطلاحات اور اعلام کی تحقیق اور ان کے عربی، عبرانی، فارسی، سنسکرت اور یونانی وغیرہ مآخذ کی نشان وہی کا اہتمام کیا ہے۔ مثلاً لفظ آدم کے متعلق لکھتے ہیں؛

"آدم عبرانی لفظ ہے جس کے معنی سرخ مٹی کے ہیں۔ چنانچہ ادوم سرخ کو کہتے ہیں۔ توریت میں ہے کہ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا"[2]۔

اسی طرح لفظ "نصاریٰ" کے متعلق لکھتے ہیں؛

"اکثر انبیاء علیہ السلام کے نام قرآن مجید میں معرب ہیں۔ چنانچہ ابرہام کو ابراہیم، اضحاک کو اسحاق، عزرا کو عزیر، یوحنا کو یحییٰ، یسوع کو عیسیٰ، اور ساول کو طالوت کہا گیا ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ کا وطن ناصرہ تھا جو ملک کنعان میں تھا اس لحاظ سے عیسیٰ کو ناصری اور ان کی امت کو نصاریٰ اور نصرانی کہا گیا ہے"[3]۔

مصنف نے سرسید پر ان کے بعض شاذ افکار کی بنا پر تنقید بھی کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی کتب سے استفادہ کرتے ہوئے تفسیر میں حوالہ اور استناد کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بحث میں لکھتے ہیں۔

" نزول قرآن کے بعد جب اہل کتاب نے اس کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم دیکھا تو انجیل کے آغاز میں بھی بسم اللہ لکھ دیا بعض نے انہی الفاظ کے ساتھ اور بعض نے ایک دو لفظ کی تبدیلی کے ساتھ۔ چنانچہ تبیین الکلام نیچری، جو کہ توریت کی چند آیات کی تفسیر ہے، مصنف (سرسید) نے نویں مقدمہ کے صفحہ ۲۵۳ پر لکھا ہے انجیل کے عربی ترجمہ میں جو کہ قدیم قلمی نسخہ ہے، ہر انجیل کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہے اور نصرت المطابع (مولانا کا ذاتی مطبع) میں انجیل کے عربی ترجمہ کا نہایت قدیم قلمی نسخہ ہے اس میں بھی ہر انجیل کے سرے پر بسم اللہ

---

1 تجیل التنزیل، ص ۷ بحوالہ قاسمی، مطالعہ تفاسیر قرآن، ص ۱۵۳

2 ایضاً، ص ۲۰ بحوالہ قاسمی، مطالعہ تفاسیر قرآن، ص ۱۵۷

3 ایضاً، ص ۵۰۔۵۱ بحوالہ قاسمی، مطالعہ تفاسیر قرآن، ص ۱۵۹

لکھا ہے"[1]۔

تفسیر کا عمومی مزاج مناظرانہ ہے۔ مولانا نے مسیحی پادریوں سے عبرانی زبان اور بائبل سبقاً سبقاً پڑھی تھی جس سے انہیں مطالعہ مسیحیت میں بہت درک حاصل تھا، یہ تفسیر اور ان کی دیگر کتب اس پر شاہد ہیں۔ سرسید کے برعکس یہ تفسیر مطالعہ مسیحیت کے ایجابی اثرات سے پاک ہے۔

(اصل مخطوطہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے ثانوی مصادر سے معلومات دی گئی ہیں)

سید محمد ابوالمنصور بن سید محمد علی رقیمۃ الوداد

نصرت المطابع، دہلی ۱۸۷۴ء

صفحات: ۷۶

جبل پور سے تعلق رکھنے والے نو مسیحی پادری صفدر علی نے مسیحیت اختیار کرنے کے بعد کتاب "نیاز نامہ" لکھی جس میں عمومی طور پر اسلام جب کہ خصوصاً قرآن کے حوالے سے کچھ اعتراضات بیان کیے گئے تھے۔ ان اعتراضات کی سطحی حیثیت کے پیش نظر علماء اسلام نے اس کی تحریر کو ناقابل التفات ہی نہ گردانا کہ اس کا جواب دیا جائے۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں پادری موصوف نے اس بات کا اظہار کیا کہ تین سال گذرنے کے باوجود مسلم علماء کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکا[2]۔

اس پر مولانا ابوالمنصور صاحب نے فوراً "رقیمۃ الوداد" سپرد قلم کی جس میں پادری صاحب کے "نیاز نامہ" میں اسلام پر کردہ اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیا گیا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب کی خاص بات مؤلف کا پادریوں کے باہمی تضادات پر سیر حاصل گفتگو کرنا ہے۔ مثلاً پادری صفدر علی آیات قرآنی سے استشہاد کرتے ہوئے قرآن کو بائبل کا مصدق گردانتے ہیں اور اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ قرآن نے بائبل کو محرف گردانا ہے۔ مولانا صاحب اس بارے میں "ہدایت المسلمین" سے اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں پادری عمادالدین نے "فویل الذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔۔" پر بحث کرتے ہوئے اس بات کی نفی کی ہے کہ قرآن دعویٰ تحریف بائبل کرتا ہے۔ مولانا اس کے بعد صاحب "نیاز نامہ" سے سوال کرتے ہیں

"اور کیا صفدر علی صاحب پادری عمادالدین صاحب کے اس قول کو بھی جن کی خود عریضہ نیاز نامہ میں تعریف کرتے ہیں سچ نہ جانیں گے جو کہتے ہیں کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اہل کتاب نے دیدہ و دانستہ، عمداً اور ارادتاً تحریف کی ہے۔

---

1 تعجیل التنزیل، ص ۱۲۶

2 ابوالمنصور، سید محمد، رقیمۃ الوداد، (نصرت المطابع، دہلی ۱۸۷۴ء)، ص ۳۔۴

دیکھو ہدایت المسلمین مطبوعہ ۱۸۶۸ء صفحہ ۶۵ سطر ۱۱ " [1]

نیز پادری فانڈر کا ذکر یوں کرتے ہیں

" اور کیا فانڈر صاحب کا یہ قول صفدر علی صاحب کو سمجھانے کے لیے کافی نہ ہو گا کہ قرآن میں بھی مسیحیوں اور یہودیوں کی مقدس مروج کتابوں کی تحریف کا اشارہ ہوا ہے۔ انتہیٰ دیکھو میزان الحق، چھاپہ مرزاپور ۱۸۴۳ء، ص ۳۹ سطر ۹، ۱۰ " [2]

مولانا صاحب پادری عماد الدین اور پادری صفدر علی کی تحریروں کا تقابل کرتے ہوئے پادری عمادالدین کے قائم کردہ اصولوں پر پادری صفدر علی کا رد کرتے ہیں۔ مثلاً " معیار نبوت " کے متعلقہ پادری صفدر علی صاحب کا ایک اقتباس نقل کر کے مولانا لکھتے ہیں،

" خوبی یہ ہے کہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پادری صفدر علی صاحب نے ایک کتاب کا بھی صفحہ سطر سارے نیاز نامہ میں نہیں بتلایا۔ اس حالت میں کیا معلوم کہ ان کے دعویٰ کی کچھ سند کسی معتبر کلام سے ہے یا نہیں۔ اور پادری عمادالدین نے اعجاز عیسوی کے لکھے ہوئے اعتراضوں کے ثبوت میں جہاں کہیں حوالہ صفحہ سطر کتب متقدمین نہیں پایا اس اعتراض ہی کو مہمل ٹھہرا دیا اور اس کا جواب نہیں لکھا" [3]۔

بعض مقامات پر مولانا صاحب پادری موصوف کے اعتراضات کی رکاکت دکھلاتے ہوئے اس پر بائبل سے ہی استشہاد کر کے بطریق احسن گرفت کرتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۷۱ پر پادری صاحب کا اس طعنہ کے جواب میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے جس میں موصوف مسلمانوں کو رسول اکرم ﷺ کے آباء اجداد کے بت پرست ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔

مولانا نے اپنی تصنیف میں اس بات کا خاص التزام رکھا ہے کہ مخالف کے دعویٰ کے ابطال کے لیے اس کی تحریر پر ہمہ جہتی پر گرفت ہو اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ مثلاً دیگر مسیحی اہل قلم سے تقابل اور ان کا باہمی تضاد، رکاکتِ تحریر و سطحیت اعتراضات نیز انہیں کی کتب سے استشہاد سے کتاب کی وقعت دوچند ہو گئی ہے۔

کتاب کا اسلوب الزامی اور قدرے مناظرانہ ہے۔ لیکن فاضل مصنف مخالف کی سطحی اور رکیک تحریر کا علمی تعاقب کرتے ہوئے کسی مقام پر بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ دائرہ اخلاق میں رہتے ہوئے فریق مخالف کی لایعنی اور اشتعال انگیز گفتگو کا سلجھے اسلوب میں جواب دینا ایک مناظر کے لیے کڑا امتحان ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا اس امتحان میں بخوبی کامیاب ہوئے ہیں۔

---

1 ابوالمنصور، رقیمۃ الوداد، ص ۳۹

2 ایضاً، ص ۳۹۔۴۰

3 ایضاً، ص ۴۷

اس دور کے ادبی اسلوب کے مطابق تحریر پر فارسی طرز بیان غالب ہے۔ لیکن پھر بھی ایک اردو دان قاری کے لیے گنجلک اور ثقیل نہیں ہے۔ فقرات مختصر اور برجستہ ہیں۔ جن سے قاری مصنف کا مدعا بخوبی جان لیتا ہے۔

برصغیر کے مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں اس کتاب کو مواد و اسلوب کے لحاظ سے نمایاں مقام حاصل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بوجوہ یہ صرف زیب طاق ہی بن سکی اور اپنا اصل مقام حاصل نہ کرپائی۔

مولوی حافظ ولی اللہ   صیانت الانسان عن وسوسۃ الشیطان فی رد تحقیق الایمان

مطبع مصطفائی، لاہور ۱۲۸۹ھ *

صفحات: ۲۴۸ بار اول

برصغیر میں مسیحی اہل قلم کی طرف سے اسلام پر لکھی گئی تحریروں کا غالب حصہ ایسا ہے جو متانت و معقولیت کا کم حصہ دار ہے بلکہ بعض سطحی تحریروں میں تکذیب و تنقیص، اعتراضات و الزامات کا اسلوب مسلم قارئین کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ چنانچہ ایسی تحریروں کے سامنے آنے پر مسلم علماء کے جوابی قلم میں بھی تلخی آگئی، اس کی ایک مثال زیر نظر کتاب ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب تحقیق الایمان از پادری عمادالدین کے رد میں لکھی گئی ہے۔ پادری صاحب کے اسلوب و طریق پیش کش نے مصنف کتاب کے لہجہ کو غیر شعوری طور پر تلخ بنادیا ہے۔ پادری صاحب کی تحریر کا معیار اور اس کا رد عمل ذیل کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو پادری صاحب کے اختلاف قراءت پر اعتراض کے جواب میں ہے ؛

"اب آپ نے مسلمانوں کو منہ چڑانا شروع کیا ہے کہ قرآن میں دو چار لفظ "ی" سے ہیں مگر "ت" سے بھی بباعث اختلاف پڑھے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ اصلاح قراءت سے ناواقف ہیں اس لئے اہل فریبی سے عیب تحریف (انجیل) کو چھپانا چاہتے ہیں"[1]۔

ابتداء میں مصنف نے کسی مذہب کے حق یا باطل ٹھہرانے کے لیے اسے عقلی و مذہبی کتب کے معتبر نقلی حوالے سے پرکھنے کے لیے سات قواعد مقرر کیے ہیں۔ بعد ازاں پادری صاحب کے "تحقیق الایمان" میں قائم کردہ اصولوں کا جائزہ لیتے ہوئے پادری صاحب کی جانب داری، پیش بندی، دھوکہ دہی اور تضاد کو واضح کیا ہے۔ آخر میں پادری صاحب کو یوں مخاطب ہوتے ہیں ؛

"جب کہ چھ قاعدے مذکور بالا آپ کے جن پر ساری کتاب کی بنیاد رکھی گئی تھی جڑ سے اکھڑ گئے تو (تحقیق الایمان)

---

* سرورق پر تو تاریخ اشاعت نہیں دی گئی مگر کتاب کے آخر میں درج قطعہ سے یہ تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔

1 ولی اللہ، حافظ، صیانت الانسان عن وسوسۃ الشیطان فی رد تحقیق الایمان، مطبع مصطفائی، لاہور ۱۲۸۹ھ)، ص ۴۴

بطریق اولی بے اعتبار ہو گئی مگر چونکہ اجمال سے آپ کی تسلی نہ ہو گی لہذا تفصیلاً بے اعتبار کر کے دکھلاتا ہوں"[1]۔

مصنف "قولہ" کہہ کر معترض کا قول نقل کرتا ہے پھر "اقول" کے ساتھ اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس کتاب کی ایک خاص بات، جو کہ اس مناظراتی دور کے لٹریچر میں کم پائی جاتی ہے، کہ مصنف فاضل نے قرآن پر کردہ اعتراضات کو بڑی خوبی سے انجیل کی طرف موڑ دیا ہے۔ جس بنیاد پر قرآن کی تغلیط کی کوشش کی جاتی ہے مولانا الزامی حوالے سے اسی بنیاد پر انجیل کو پرکھ کر اسے غیر معتبر ٹھہرا دیتے ہیں۔

مولانا پادری صاحب کے مؤقف کی کمزوری کو بطریق احسن نمایاں کرتے ہیں اور ساتھ ہی پادری صاحب کے تلبیسی رویے کو بھی آشکار کرتے ہیں مثلاً ص ۱۴ پر پادری صاحب کا قول نقل کیا گیا ہے کہ عیسائیوں کو مسلمانوں پر ایک تفوق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اختلاف کے سبب قرآن جلا دیئے تھے جب کہ عیسائیوں نے ان لکھی ہوئی چیزوں کو برقرار رکھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں ؛

" حضرت عثمان نے جیسے کہ آنحضرت ﷺ سے ترتیب سور و آیات سنے تھے ویسا ہی مرتب کر دیا اور وہ نسخہ کہ جس کی ترتیب میں قدرے تقدیم پائی جاتی رہی ان کو موقوف بنا دیا بھلا صاحب کجا ذکر تحریف اور کجا ترتیب نسخ۔۔"[2]۔

عصمت انبیاء کے بارے پادری صاحب کے نظریہ کے جواب میں آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ سے یوں کرتے ہیں کہ بلاابہام مسلم عقیدہ عصمت انبیاء واضح ہو جاتا ہے نیز عقیدہ شفاعت کی تشریح" عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا" اور" ولسوف یعطیک ربک فترضی " کی آیات سے بطریق احسن کی ہے[3]۔

تحقیق الایمان کے باب اول میں پادری صاحب نے معجزات محمدیہ کی نفی کی تھی۔ مصنف پادری صاحب کے دعوی کے سقم اور غلط بیانی کو واضح کرتے ہوئے معجزہ فصاحت کے عنوان کے تحت قرآنی فصاحت و بلاغت کو معجزہ قرار دیا ہے۔ اور اس پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے پادری صاحب کے دعوی عدم اعجاز قرآن کا رد کیا۔

پادری صاحب نے مسیلمہ کی تک بندی کو قرآن کے مقابل پیش کر کے قرآنی تحدی کی نفی کی ہے۔

مولانا صاحب مسیلمہ کی اس تک بندی کو قطع نظر فصاحت کے قواعد نحویہ اور محاورات عربیہ کے لحاظ سے ساقط الادب ثابت کرتے ہیں۔ اور اس پر بڑی عمدہ صرفی و نحوی بحث کی ہے[4]

---

1 ولی اللہ، صیانت الانسان، ص ۲۱

2 ایضاً، ص ۴۱

3 ایضاً، ص ۷۹

4 ایضاً، ص ۱۰۲، ۱۰۳

اس سے قبل پادری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؛

"افسوس آپ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہم کس مونہہ سے ایسے مضمون کو اس کلام الٰہی کے مقابلہ میں کہ جس میں محبت الٰہی اور تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق اور ہدایت بنی آدم وغیرہ اچھی اچھی باتیں درج ہیں پیش کرتے ہیں ۔ شاید آپ نے مضمون عبارت مسیلمہ کو بعینہ مثل مضمون کتب الہامیہ اپنی پا کر سمجھ لیا کہ کلام الٰہی میں ایسے ہی مضمون ہوا کرتے ہیں"[1]۔

بعد ازاں بائبل کی بعض عبارتیں[2] پیش کی ہیں،اور پادری صاحب کے پیش کردہ مقامات حریری، موارد الکلم از فیضی اور کلام امراؤالقیس کو فصاحت قرآنی کے برابر گرداننے کو بدلائل رد کیا ہے۔[3]

فصاحت قرآن کی تفصیلی بحث کے بعد شق القمر اور معراج نبوی سمیت چار معجزات محمدیہ کے اثبات میں دلائل پیش کیے ہیں۔ بعد ازاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئیوں کو زیر قلم لایا گیا ہے جن کا تقابلی جائزہ قرآنی پیشین گوئیوں سے کیا گیا ہے[4]۔

ص ۱۵۶ پر عبرانی زبان میں عہد نامہ عتیق سے ایک آیت نقل کی گئی ہے۔ کتاب کا غالب حصہ بشارات محمدیہ از بائبل کی بحث پر محتوی ہے۔ کتاب کے آخری بحث میں پادری صاحب کے تعلیم محمدی پر اعتراضات کے جوابات اور مسیحی تعلیمات کے نقد پر مشتمل ہے[5]۔

زیر تبصرہ کتاب میں تحقیق الایمان کے رد کے ساتھ ساتھ اظہار الحق اور اعجاز عیسوی از مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور استفسار از سید آل حسن پر پادری صاحب کے نقد کا جواب دیا بھی دیا گیا ہے۔ اور اپنے دعوٰی کی تائید میں مغربی مفسرین بائبل کے بیانات پیش کیے ہیں۔ کتاب کا اسلوب الزامی اور مناظرانہ ہے۔

---

1 ولی اللہ، صیانت الانسان، ص ۱۰۱

2 یسعیاہ ۳ : ۱۷؛ ۴: ۱۔ ۳؛ ۲۳ : ۱۶۔ ۱۸

3 ولی اللہ، صیانت الانسان، ص ۱۰۵۔ ۱۰۷

4 ایضاً، ص ۱۲۹۔ ۱۴۳

5 ایضاً، ص ۲۱۵۔ ۲۳۶

ردمسیحیت میں مسلم لٹریچر۔ عمومی تبصرہ

اس مناظراتی ادب میں فریقین کا سیاسی، سماجی، معاشرتی اور علمی وفکری رویہ پوری طرح جھلکتا ہے۔ سیاسی غالب گروہ نے تنقید کے پردہ میں زیادہ تر تنقیص وتحقیر کو ہی مطمع نظر بنائے رکھا۔ تنقید بذاتہ کوئی معیوب امر نہیں بلکہ بعض صورتوں میں معاملہ فہمی اور غلو کی پڑی دھول صاف کرنے کے لیے لازم بھی ہوتی ہے۔ تنقید زیادہ تر پانچ اسلوب کی حامل ہوتی ہے۔

اول تنقید برائے اصلاح، جس میں کسی فرد، گروہ یا معاشرے کے کسی غلط یا مذموم افعال وافکار کی نشان دہی سے اصلاح مقصود ہوتی ہے۔

دوم تنقید برائے تنقیح، اس میں معاملہ فہمی کے لیے نیک نیتی سے صورت حال کو پرکھا جاتا ہے تاکہ سچائی پر رہا جائے اور غلط طریق سے اجتناب ممکن ہو۔ اس سے مثبت اثرات کا حصول مقصود ہوتا ہے۔ مخاطب کو اس کا دل دکھائے بغیر اس کی غلطی سے آگاہ کیا جاتا ہے اور مثبت نتائج اخذ کرنے میں اس کی فکری مدد کی جاتی ہے۔ اس سے معاشرہ پر دوررس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

سوم تنقید برائے تنقید، جس میں محض گروہی یا ذاتی مفادات کے پیش نظر مخالف کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسے غیر علمی انداز میں کسی فریق یا فرد کا اپنے غلط رویہ کو جواز بخشنے کی کوشش سمجھا جاسکتا ہے۔

چہارم تنقید برائے تنقیص وتکذیب، اپنے آپ کو غلط یا صحیح ہونے کے حوالے سے پرکھنے کی بجائے اس میں اول وآخر فریق مخالف کی تنقیص وتکذیب ہی مقصود ہوتی ہے۔ اس کے ہنر کو عیب اور عمدہ کاموں کو بھی مذموم دکھانا مقصود ہوتا ہے۔

پنجم ردعمل پر مبنی تنقید، (الزامی یا جوابی) اس میں حریف کی طرف سے کی گئی تنقید کو بنیاد بنا کر اس کی خامیاں آشکار کرکے اس کے موقف کی صداقت یا عدم صداقت کو پرکھا جاتا ہے۔

اول اور دوم دونوں قسم کی تنقید ہر حال میں بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ جب کہ سوم اور چہارم قسم کی تنقید فرد یا معاشرے پر مفید اثرات مرتب کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتیں۔ بلکہ الٹا نفرت اور مجادلہ کو جنم دیتی ہیں۔ اور معاشرتی دوری کا سبب بنتی ہیں۔

اگر غالب سیاسی گروہ علمی ومعقولی تحاریک کے زیر اثر اول اور دوم قسم کی تنقید سے کام لیتا تو بلا مبالغہ یہ انسانیت کی نہ صرف اعلیٰ خدمت قرار پاتی بلکہ انسانی تاریخ کا رخ آج کچھ اور ہوتا۔ نفرت پیدا کرنے کے لیے محض چند ساعات درکار ہوتی ہیں، مگر اسے ختم کرنے کے لیے شاید چند صدیاں بھی کافی نہ ہوں۔ یہ بات جنوبی برصغیر کے

حالات پر صادق آتی ہے شاید ہی دنیا کے کسی دوسرے خطہ پر اس کا اطلاق اتنی ہمہ گیری سے ہو سکتا ہو۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ یہ ارضی دنیا مذاہب، لسانیات، اور نسل کے اعتبار سے جغرافیائی وحدت رکھنے کے باوجود بے حد متنوع اور کثیر جہات میں منقسم ہے۔

یورپی اقوام کی آمد سے، سب سے پہلے، ارض ہندوستان کی رواداری کی روایت میں دراڑیں پڑ گئیں[1] باب اول میں مذکور پرتگیزی سرپرستی میں دینی پیشواؤں کے مذہبی عدم برداشت کا رویہ مسیحی اصول دین کی روشنی میں ناقابل توجیہہ ہے۔ یہاں ہمیں "دشمن سے پیار" کے یسوعی فرمان[2] پر عمل کی کہیں جھلک نظر نہیں آتی۔ اس فرمان کی جھلک تو مسیحی افراد میں شعوری مسیحی ہونے کے ناطے سے زیادہ نظر آنی چاہیے تھی۔ مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اس پر کلیسیا کی طرف سے خاموش رہنے کی کوئی قابل قبول توجیہہ ہونی چاہیے تاکہ منافرت کی بیخ کنی ہو اور باہمی خلیج پاٹی جاسکے۔

دوسری طرف مسلمان علماء کی طرف سے رد عمل میں کی گئی شائستگی، متانت اور علم و عرفان کے جوہر سے مملو جوابی تنقید سیاسی غالب گروہ کی نکتہ چینی سے بدرجہ اتم ممتاز رہی۔ سابقہ کتب سماوی کے بارے مسلم نکتہ نظر واضح اور غیر مبہم ہے جس میں دل آزاری کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ یہ قرآنی فرمان ہمیشہ مسلم علماء کے پیش نظر رہا، " وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ "

مسیحی تحریروں کے برعکس مسلم علماء نے بدلائل اپنا موقف واضح کیا نہ کہ الزام تراشیوں کا سہارا لیا۔ مقدس و مذہبی مسیحی شخصیات مسلم علماء کی جوابی تنقید کا کبھی ہدف نہیں رہیں۔ انہوں نے مروجہ بائبل کا کلام الٰہی کی حیثیت سے جائزہ لینے کے لیے ہمیشہ جاندار دلائل کا دامن تھاما۔ اس میں تعصب، تعلی اور بے جا تفاخر کو قطعاً عمل دخل نہ تھا۔ مسلم علماء کی جوابی تنقید ہمیشہ مقدس شخصیات سے بالاتر رہی۔ ان کا تنقیدی ہدف مخاطب کی تعلیمات اور اس کے

---

[1] پرتگیزی وائسرائے نے انجمن عیسوی کے مبلغین کے کہنے سننے سے یہ حکم صادر کیا تھا کہ مندروں اور مسجدوں کو مسمار کر دیا جائے اور مبلغین نے فوج اور دیگر افسران کی مدد سے عبادت کی ان جگہوں کو منہدم کر دیا تھا۔ پس غم و غصہ کی آگ ہر طرف بھڑک اٹھی اور ۱۵۸۳ء میں ہجوم نے بلوہ کر کے انجمن عیسوی کے مبلغوں کو مار ڈالا۔ (اکبر کے دربار میں مسلمانوں سے مناظرہ کرنے والا) پادری ایکواویوا بھی اسی انتقامی تحریک میں مارا گیا۔ پرتگیزوں نے اس کے بدلہ میں گاؤں کے گاؤں برباد کر دیئے اور اموال اور جائیدادوں کو ضبط کر لیا۔ ۱۸۹۳ء میں رومی کلیسیا نے ایکواویوا کا شمار مقدسوں میں کر دیا۔

برکت اللہ، سلطنت مغلیہ اور مسیحیت، ج ۴، ص ۱۷۲۔۱۷۳

[2] متی ۵: ۴۳۔۴۴ " تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا اپنے ہمسائے کو پیار کر اور اپنے دشمن سے کینہ رکھ۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا مانگو۔"

نظریات ہی رہے نہ کہ شخصی تنقیص و توہین و تحقیر۔ البتہ جذباتی رد عمل میں اپنے ہم عصر مخاطب مسیحی شخصیت کے بارے الفاظ میں سختی ضرور پائی جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ مخاطب کی ذات نہیں بلکہ ان کی دل آزار تحریریں تھیں۔ خصوصاً نو مسیحی افراد کے لیے یہ رویہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس سیاسی غالب گروہ نے ہمیشہ مقدس شخصی اہداف متعین کیے اور سیاق و سباق سے ہٹ کر مذہبی اصطلاحات کو بدنام کر کے کام نکالنا چاہا۔ اصل مقام سے ہٹا کر اسلامی تعلیمات کی اکثر و بیشتر ایسی تشریحات و توضیحات کیں جو امت مسلمہ کے ہاں کبھی بھی متداول نہ تھیں۔ اور ہمیشہ یہ خواہش دلوں میں پنپتی رہی کہ مغلوب حریف ان کی عینک سے اپنے مسلمات دیکھنے کی طرف راغب ہو۔ لیکن سیاسی مغلوبیت کے باوجود عملی طور پر مسلمانوں نے پسپائی اختیار نہیں کی۔ مسیحی مبشرین مختلف جہتوں سے اسلام پر تابڑتوڑ اعتراضات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ایک ہی الزام کو مختلف الفاظ اور نئے پیرائے میں دہرایا جاتا تھا کہ تھکا دینے کی حکمت عملی کامیاب ہو۔

مسلم علماء نے کسی بھی مسیحی تحریر میں اٹھائے گئے اشکالات و اعتراضات سے صرف نظر نہیں کیا اور ہر ایک موضوع پر مدلل جوابات تحریر کیے اور کہیں بھی فرار کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ تمام اسلوب میں قلم اٹھایا کسی پہلو کو تشنہ چھوڑے اور کسی کمزوری یا تحفظات کا شکار ہوئے بغیر مسلم علماء نے ایک ایک کتاب کے کئی کئی جوابات تحریر کیے جس میں مسلم پس منظر رکھنے والے نو مسیحی افراد کی تردید کرتے ہوئے مختلف جہات میں ان کا تعاقب کیا۔ اس کے نتیجہ میں اردو زبان میں مطالعہ مذاہب کے حوالے سے ایک ذخیرہ گراں بار معرض وجود میں آیا۔ اس دور میں منظر عام پر آنے والے مسلم ادب کے اثرات صرف برصغیر تک محدود نہیں رہے بلکہ پورا عالم اسلام ان سے مستفید ہوا۔ جیسے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی قسطنطنیہ میں شائع ہونے والی "اظہار الحق" پھر اس کے جواب میں مصر سے شائع شدہ کتاب "الھدایہ" کا جواب ایران میں "الھدی الی دین المصطفی" کے نام سے تحریر کیا گیا جو لبنان سے طبع ہوا۔

مسلم مسیحی مناظراتی لٹریچر میں سب سے زیادہ قابل بحث موضوع بائبل میں "اثبات و عدم تحریف" رہا۔ مسلم علماء نے بائبل کے داخلی تضادات و مغربی محققین کی تنقیدی آراء سے تحریف بائبل کے دعویٰ کا اثبات کیا کیونکہ اس دور میں مسلمانوں کی اصل مسیحی مصادر تک رسائی نہ ہونے کے برابر تھی، جس کی وجہ سے ان میں تنقیدی مطالعہ کا رویہ بھی مفقود نظر آتا ہے۔ مسلم مناظرین کا علم ثانوی مصادر سے ماخوذ تھا۔ اس میں وہ کتب شامل تھیں جو مغرب میں اس دور کے "کلیسا مخالف" اور سیکولر سوچ کے حامل فضلاء نے بائبل کو انتقاد عالیہ (Hi-Criticism) کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے لکھیں۔ جس سے یہاں کے ہندوستانی منادیہ کہہ کر صرف نظر کر لیتے کہ یہ تو مذہب مخالف لوگوں کا نقطہ نظر ہے۔ مسلمان توریت و انجیل کو تو الہامی تسلیم کرتے تھے لیکن مروجہ بائبل کو محرف کے درجہ میں رکھتے، جب کہ مستشرقین کے زیر اثر مسیحی تحریروں میں قرآن کو غیر معتبر گردانے کے لیے ان کا ارتکاز قرآن

کو غیر الہامی ثابت کرنے پر رہا۔ اور اس میں ان کی زیادہ تر کوشش اسے بائبل کا چربہ قرار دینے کی رہی۔ معدودے چند تحریروں میں تحریف قرآن کا بھی دعویٰ کیا گیا۔ مسلم علماء نے فوراً ان کے اتہامات واعتراضات کی تردید وتوضیح کی اور دفاع وصیانت قرآن میں قلم اٹھایا۔ مسیحی حلقہ کی طرف سے "سلطان التفاسیر" کی شکل میں تنقید قرآن کے ہدف پر مبنی ایک کاوش کی گئی۔ یہ مسیحی جریدہ "المائدہ" اور بعد ازاں "النجات" لاہور میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوئی۔ اس پر فوراً مسلم حلقہ سے مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اپنے جریدہ "اہل حدیث" امرتسر میں "برہان التفاسیر" کے عنوان سے تعاقب کرتے ہوئے اس کا اصولی جواب دیا اور پادری صاحب کی تدلیس وکذب بیانی کو آشکار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سورۃ بقرہ کے ابتدائی رکوعات کے بعد "نامعلوم وجوہات" کی بناء پر پادری صاحب کی طرف سے یہ سلسلہ سمیٹ دیا گیا۔ حالانکہ پادری صاحب کو پوری طرح اخلاقی ومادی حمایت حاصل تھی جب کہ مقابلتاً دوسری طرف مولانا صاحب تن تنہا تھے۔ یہ اس بات کی مظہر ہے کہ مسلم علماء نے راست اقدام کرتے ہوئے اسلام وقرآن پر نقد کرنے والے مسیحی مبشرین کے سامنے کہیں بھی لاپرواہی یا سستی کا مظاہرہ نہیں کیا

عجب اتفاق یہ ہے کہ جب مسیحی استعمار یہاں سیاسی فتح کے نتیجہ میں باقاعدہ حکومت تک رسائی حاصل کر رہا تھا انہی ایام میں یورپ سے مذہب بیزاری کی تحاریک سے مسیحی مذہبی پیشوائی کے اقتدار کی رخصتی ہو رہی تھی۔ یورپ کے عربوں اور پھر ترکوں سے مذہبی وسیاسی بنیاد پر تصادم کے اثرات برصغیر میں بھی مرتب ہوئے۔ اکا دکا انفرادی استثنائی واقعات سے قطع نظر مسیحی استعمار سے قبل، مسلم حکمران اور ہندو رعایا کے درمیان نظریاتی بُعد کے باوجود مذہبی رواداری کا دور دورہ رہا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندو غیر لڑاکا قوم نہیں جیسا کہ غلط فہمی سے متصور ہوتا ہے۔ ہندوستان کے راجپوت گھرانوں کی جنگی رسومات اور ان کی مہماتی طبائع سے کون واقف نہیں۔ پھر بھی مسلم عہد میں ہندوستانی تاریخ کا غالب حصہ رواداری سے مملو ہے۔ اگرچہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان متعدد بار میدان کارزار گرم ہوا لیکن سیاسی غالب گروہ مسلمانوں اور رعایا ہندوؤں کے درمیان معاشرتی طور پر وہ خلیج سامنے نہیں آئی جو بعد میں غالب سیاسی فریق عیسائیوں اور رعایا مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوئی۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ہی سہی، انگریز سے سیاسی مخاصمت اس کے مذہب کی مخالفت میں بدل گئی۔ انگریز حکمران کی مخالفت کا نتیجہ اس کے مذہب سے دُوری کی شکل میں نکلا اور عیسائی انگریز سے میل جول رکھنے والے سے بھی نفرت کا رویہ سامنے آیا۔

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں ایک شریف مسلمان مولوی نے جو میان دوآب کے کسی ضلع میں منصف یا صدر امین تھے ایک روز کسی یورپین حاکم کے بنگلہ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہو گئی مولوی صاحب کی برادری نے ان کو ذات سے خارج کر دیا انہوں نے ہرچند اپنی برادری کے سامنے آیتیں اور حدیثیں پڑھیں کسی نے التفات نہ کیا یہاں تک کہ مولوی صاحب کے مخالف اور کچھ موافق دہلی میں شاہ صاحب سے مسئلہ پوچھنے آئے۔ جب شاہ صاحب کے مدرسہ کے دروازہ تک پہنچے تو شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین اندر سے نکل رہے تھے ان لوگوں نے

پہلے ان ہی سے مسئلہ پوچھا۔ شاہ رفیع الدین نہایت صاف گو اور آزاد طبع آدمی تھے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جنہوں نے مولوی صاحب کو ذات سے خارج کیا انہوں نے جھک ماری۔ انہوں نے کوئی کام شرع کے خلاف نہیں کیا۔ مگر کسی نے ان کا کہنا نہ مانا اور بڑے (شاہ) صاحب کے پاس پہنچے۔ انہوں نے صورت حال سن کر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کفر کے پہنچ گیا ہے۔ جو لوگ مولوی کے مخالف تھے یہ سن کر خوش ہوگئے مگر اس کے طرف داروں نے پوچھا کہ حضرت وہ اب کس طرح مسلمان بھی ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا: کفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا وہ اسلام سے خارج نہیں ہوا مگر احتیاطاً اس کو پانچوں کلمے اور آمنتُ باللہ پڑھواؤ اور قدم شریف کا پانی پلواؤ اور پھر برادری میں شامل کر لو۔ اگر شاہ صاحب اس انداز پر تقریر نہ کرتے تو شاید ان کا کہنا بھی کوئی نہ مانتا اور ان مولوی صاحب کو برادری میں شامل نہ کیا جاتا"[1]۔

غالباً اس تنفر کا ایک سبب مسلم مسیحی کشمکش میں مخصوص مقاصد کے تحت مسیحی منادین کا پیش کردہ لٹریچر بھی گردانا جا سکتا ہے۔ جس کا غالب حصہ مسلم فریق کے لیے دل آزاری کا باعث تھا۔ ایسے لٹریچر کی مسلم قارئین کو فراہمی مستحسن نہیں گردانی جا سکتی تاہم نتائج کے اعتبار سے بعض مثبت پہلو بھی برآمد ہوئے۔ مجموعی طور پر اس صورتحال کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

الف اس سے قبل برصغیر میں تقلید پر مبنی منقولی علمی رجحان غالب تھا۔ مسلم علماء کو مسیحی منادوں سے مکالمہ کے دوران نئے علم الکلام کا سابقہ کرنا پڑا۔ اور انہیں عقیدت سے ہٹ کر تنقیدی زاویہ سے لکھا گیا لٹریچر پڑھنے کو ملا جس میں اگرچہ علمی مواد بہت کم تھا مگر پھر بھی عصری تقاضے نبھانے کے لیے ان مسلم علماء کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا، جن کی نگاہیں ہر بات کو عقیدت کی عینک سے دیکھنے کی خوگر تھیں۔ مسلم علماء اپنے ذاتی مفاد کے دائرہ سے نکل کر حقیقتاً خدمت دین کے جذبے سے سرشار ہوئے۔ انہوں نے مسیحی تبشیری سرگرمیوں کے سامنے جو اپنا رنگ لا رہی تھیں بہت کم عرصے میں بند باندھ دیا۔ بلکہ یہاں یورپین کے قبول اسلام کے واقعات سامنے آئے۔

ب مسلم علماء کی نظر اپنے کمزور پہلوؤں پر پڑی جس سے روایت پسندی اور تقلید کے جامد رویے سے اوپر اٹھ کر باتیں کی جانے لگیں۔ اور ان میں مسابقت اور حقیقی مدافعت کا جذبہ پیدا ہوا۔

ج سیاسی مغلوبیت کا ایک ردعمل مسیحی اعتراضات کے جواب دینے میں شدت کی شکل میں ظاہر ہوا۔

د مسلم علماء نے اسلام کی عصری تشریح کے تقاضوں کی شدت کو بخوبی سمجھا اور کئی ایک ادارے معرض وجود میں آئے۔ عوام الناس کے ساتھ ساتھ مسلم راہنماؤں میں مذہبی و لسانی علوم کی ضرورت آشکار ہوئی۔ اس ضمن میں سر سید احمد خان کے تحریک علی گڑھ کی شکل میں کردہ عملی و علمی اقدامات کا مسلم

---

[1] امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۸۰

معاشرے پر حقیقی اور دوررس اثر پڑا۔ (بعض مسلمہ نظریات میں اختلاف اور جامد رویے کی بناء پر مسلم علماء اس سے پورا فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے) اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ادارے بھی سامنے آئے جہاں مشنریز کے مقابل تصنیف و تالیف کا کام انہی کے طرز پر ہونے لگا۔ اور سوچ کے نئے زاویے اپنائے جانے لگے۔

ر مسیحی مصنفین پر اپنی کمزوریاں عیاں ہوئیں، جس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی تحریروں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی۔ مثلاً میزان الحق، کہ اس کے پہلے ایڈیشن پر کئی نقد کے نتیجہ میں اس میں ترامیم کی گئیں۔ مگر مقامی مسیحی اہل قلم نے اپنے انداز کو تبدیل نہ کیا اور انہوں نے بدیسی پادریوں کے پڑھے ہوئے سبق کی خوشہ چینی کی روش برقرار رکھی۔ تاہم عامیانہ رویہ اپنانے پر خود مسیحی حلقوں میں بھی ناپسندیدگی کا اظہار ہونے لگا، اگرچہ اس کی مثالیں شاذ ہیں۔

س جہاں رد نصاریٰ میں کتب لکھی جانے لگیں وہیں ٹھوس علمی دلائل سے مزین تفاسیر قرآن لکھنے کی کوششیں شروع ہوئیں نیز سیرت نبوی کے حقیقی گوشے پیش کیے جانے لگے۔ اور روایتی کتب کے برعکس سیرت النبی از شبلی نعمانی اور رحمت اللعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری جیسی عمدہ کاوشیں وجود میں آئیں۔ جن سے مسلمانوں کا اپنے دین پر اعتماد بڑھ گیا۔ اور وہ زیادہ بہتر طریقے سے اپنی بات مد مقابل کے سامنے رکھنے کے اہل ہو گئے۔

ص مسلمانوں میں تقابل ادیان کے مطالعہ کا رجحان بڑھا۔ جس سے اسلام کی حقانیت زیادہ نکھر کر عقلی انداز میں سامنے آئی۔ تاہم اس میدان میں زیادہ تر کام صرف حریف کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی رہی زیادہ مرکوز رہا۔ مد مقابل کے مذہبی تجربات سے فائدہ اٹھانے کا رویہ زیادہ نہ پنپ سکا۔

ط تندی و تیزی کے بعد رواداری کی اہمیت فریقین میں یکساں طور محسوس کی گئی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مسلم مسیحی تعلقات اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ چند ایک واقعات کہ جن کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس دعویٰ کو غلط نہیں ٹھہرا سکتے۔ نیز ان کے اسباب سیاسی ہو سکتے ہیں نہ کہ مسلم مسیحی کشمکش کا نتیجہ۔ ان کے علاوہ ماحول مجموعی طور پر پرسکون رہا۔ غیر ملکی قوتوں نے اس پلیٹ فارم سے مسلم مسیحی تعلقات میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش کی اور طرفین کے جذباتی اور کم فہم لوگوں کو استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر دونوں طرف سے اکا دکا واقعات، کہ جن کی گرد جلد بیٹھ گئی، کے سوا انہیں زیادہ نمایاں کامیابی نہ ملی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم تحریروں میں زیادہ تر الزامی رویہ کے ساتھ مخصوص موضوعات کے چناؤ نے جوابات میں ہمہ گیری کو عنقا کر دیا۔ مطالعہ مسیحیت کے بہت سے گوشے نہ تو زیر بحث آئے اور نہ ہی ان سے پردہ اٹھایا جا سکا۔ کونسلوں کے ذریعے عقائد کی تشکیل، کلیسیائی اقتدار اور اس کے تاریخ پر اثرات، علم و عقل پر پہرے بٹھانے کا کلیسیائی رویہ، تبدیلی مذہب کے لئے استبدادی رویے و حربے، مذہبی علوم پر مخصوص گروہ کی اجارہ داری اور عوام الناس کی ان تک عدم رسائی، مذہبی پیشوائیت کے بل بوتے پر مالی و سیاسی استحصال اور ناجائز مفادات کا حصول، مذہبی مناصب کی خرید و فروخت، کارپردازان کلیسیا کا مخرب الاخلاق رویہ جیسے موضوعات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مسلم مسیحی کشمکش کے اثرات بعد میں سامنے آنے والے تفسیری ادب پر نمایاں طور پر مرتب نظر آتے ہیں۔

فصل دوم

مسلم علماء

کی

مناظرانہ کاوشیں

فصل دوم

مسلم علماء کی مناظرانہ کاوشیں

مناظرہ

دو افراد یا فریقین کے درمیان دو چیزوں کے بارے اظہار صواب کے لیے بدلائل بحث کرنا مناظرہ کہلاتا ہے۔ اگر اظہارِ صواب مقصود نہ ہو بلکہ الزام خصم منظور ہو تو وہ مجادلہ کہلائے گا۔ جو جدل سے مشتق ہے (بمعنی جھگڑا کرنا) اسی کو مغالطہ کہتے ہیں۔ اگر اظہارِ حق و صواب مراد نہ ہو اور نہ مخالف کو الزام و ملامت کرنا منظور ہو، بلکہ اپنا علم و رعب جتلانا اور اپنی اخفائے جہالت مد نظر ہو تو وہ مکابرہ ہے۔ اگر فریقین کا رو برو بیٹھ کر اپنی بزرگی و بڑائی ظاہر کرنا ہے تو اس کا نام مقابلہ ہے[1]۔

مناظرہ مذہب کی تبلیغ کا ایک اہم ستون اور ماہرانہ فعل ہے جس میں پختگی ذہن، معاملہ فہمی اور وسعت قلبی اور سب سے اہم برجستہ گوئی، حاضر جوابی، ضروری وصف ہیں۔

ماضی کی تاریخ اور عصر حاضر کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام اور باطل افکار و نظریات کے مابین ہمیشہ زبردست کشمکش رہی اور اسلام دشمن طاقتوں نے حق کو دبانے میں ہر ممکن کوشش کی تاکہ شجر حق کبھی بھی تناور اور بارآور نہ ہو سکے اور ناحق کے سامنے سدا خم رہے۔ لیکن اہل حق نے کسی بھی میدان میں باطل کو سر نکالتے، اپنے بال و پر جھاڑتے اور صداقت کی فضا میں جب بھی اڑان بھرتے دیکھا تو انھوں نے دلائل و براہین کی قینچیوں سے طائر باطل کے بال و پر کتر کر فضا کی وسعتوں اور بلندیوں سے اسے ہمیشہ ہمیش کے لیے ناپید کرنے کی کوششوں میں اپنی تمام صلاحیوں کو استعمال کیا ہے اور اس میں ذرا بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے اس طرز عمل سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ حق کی فضا باطل کی آلودگی سے محفوظ رہی، وہیں حق پسند عوام اور صداقت نظر آنکھوں کو سرمہ بصیرت بھی حاصل ہوا جس نے ان کی بینائی میں اضافہ کر دیا[2]۔

مناظرہ کے لغوی و اصطلاحی مفہوم میں غور و فکر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے بادلائل بحث کرنا مفید مطلب گردانا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر قلب و ضمیر انانیت کی بنا پر تعصب و عصبیت کا شکار ہو جائیں تو پھر صورت حال وہی ہو جاتی جو امام ابن بطہ نے اپنے دور میں مناظروں کے ذکر میں کی ہے؛

> "ان کے یہاں مناظرہ میں غور و فکر کی جگہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ باہمی خیر خواہی کے بجائے مکر اور چال کا اظہار ہوتا ہے۔ مناظرہ کے وقت پسینہ بہنے لگتا ہے، گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں، منہ سے جھاگ نکلتی ہے، پھر نوبت لعن طعن کرنے، تھوکنے اور ڈاڑھی نوچنے تک پہنچ جاتی ہے"[3]۔

---

1 عمری، محمد مقتدی اثری، تذکرۃ المناظرین، (دارالنوادر، لاہور ۲۰۰۷ء) ص ۳۳

2 ایضاً، ص ۱۳

3 ایضاً، ص ۱۰ بحوالہ ابانۃ ۲/ ۵۴۸

مسلم مسیحی مناظرہ۔ تاریخی پس منظر

مسلم مسیحی مناظرہ کی ابتداء ۷ھ میں ۶۰ افراد پر مشتمل وفد نجران کی دربار رسالت ﷺ میں آمد سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت اسلام کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ سے پہلے کے مسلمان ہیں، رسول اللہؐ نے فرمایا؛"میں تمہارا اسلام قبول نہیں کرتا اس لیے کہ تم خدا کی اولاد مانتے ہو، صلیب کی پوجا کرتے ہو، خنزیر کھاتے ہو"۔ انہوں نے پوچھا؛ پھر فرمایئے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟ اس پر آل عمران کی یہ آیت نازل ہوئی۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ ٱللَّهِ كَمَثَلِ ءَادَمَ خَلَقَهُۥ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ[1]

اس وفد میں سے رسول اللہؐ سے بات کرنے والوں میں عبدالمسیح (اسقف اعظم)، سید ایہم (لاٹ پادری) اور حارث بن علقمہ کے نام آتے ہیں[2]۔

وفد نجران کے ساتھ اس دعوتی نقطہ نظر سے ہونے والی بحث و تمحیص پر مبنی اس مناظرہ کی انتہاء دعوت مباہلہ پر منتج ہوئی جس کا فریق ثانی نے مثبت جواب نہیں دیا[3]۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بالمشافہ مسیحی افراد کے کئے گئے اس مناظرہ سے مسلم مسیحی مناظرہ کی ابتداء ہوتی ہے جس کا تسلسل تاعصر حاضر پوری مسلم مسیحی تاریخ میں برقرار رہا۔

تاریخ میں محفوظ باقاعدہ پہلا مسلم مسیحی زبانی مناظرہ ۶۳۹ء میں فاتح مصر عمرؓ بن عاص کا پطرس یعقوب جان اول کے ساتھ قرار دیا سکتا ہے۔ جب کہ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ تیسرے بازنطینی قیصر روم لی اون کے درمیان ہونے والی خط و کتابت تحریری مناظروں کی پہلی مثال گردانی جاسکتی ہے۔ ان مکاتیب میں قرآن و رسول اللہؐ کے بارے ممکنہ حد تک اور عیسائیت و حضرت عیسیٰؑ کی کیفیت و حقیقت کے بارے بحث و مباحثہ کیا گیا[4]۔ عُرفہ (شام) کے آرتھوڈکس عالم تھیوڈورس ابو قرۃ (۷۴۰ھ۔۸۲۵ھ) نے خلیفہ مامون الرشید (۸۱۳ھ۔۸۳۴ھ) کے دربار میں مسلم علماء کے ساتھ کردہ مناظرہ میں آزادی اظہار رائے کی تعریف کی ہے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں مسلم مسیحی مناظروں کی جھلک ہمیں ہندوستان میں اکبر کے دربار میں ملتی ہے۔ عباسی دربار میں ہونے والے

---

1 آل عمران ۳: ۵۹

2 ابن کثیر ص ۷۱، ۷۲

3 انہوں نے مباہلہ تَعَالَوْا۟ نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ ٱللَّهِ عَلَى ٱلْكَـٰذِبِينَ (آل عمران ۳: ۶۱) کی یہ قرآنی دعوت قبول نہیں کی تھی۔

4 Birisik, Abdulhamit, Oryantalist Misyonerler vr Kuran, p.106

مناظروں کا بنیادی موضوع الوہیت مسیحؑ، قیامت کی آمد، تحریف بائبل، ثقاہت متن قرآن اور نبوت محمدیہ جیسے بنیادی موضوعات تھے[1]۔ جب کہ اس حوالے سے دستیاب تحریر خلیفہ مامون الرشید کے دور میں عبد المسیح بن اسحاق الکندی کا ہاشمی نامی مسلم عالم کے ساتھ مناظرہ پر مبنی " الرسالہ " ہے۔ جسے ولیم میور نے

Apology of Alkindi written at the court of Almamoon in defiance of Christianity against Islam[2]

کے نام سے ۱۸۸۱ء میں شائع کروایا تھا۔ جب کہ مسیحیت کے جواب میں لکھی گئی ابتدائی مسلم تحریروں میں عربی ادب کا معروف نام ابو عثمان جاحظ (۲۵۵ھ) کی "المختار فی الرد علی النصاری[3]" گنی جاتی ہے۔ جو اسلام کے بارے بعض مسیحیوں کے سوالات کے جواب پر مبنی ہے۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے یہ مسیحی سوالات جاحظ کو لکھ کر دیئے تھے، جس پر جاحظ نے قلم اٹھایا[4]۔ اس کے بعد مسیحیت پر قلم اٹھانے والوں میں سے امام ابن حزم، امام غزالی، ابن تیمیہ، امام ابن قیم، المسعودی، باقلانی، شہرستانی، رازی، قاضی عبد الجبار اور ابن خلدون چند معروف نام ہیں۔

ہندوستان میں مسیحیوں سے قبل مسلمانوں کے ہندوؤں سے مناظرے رہے۔ ہندو مسلم مناظروں کے خاطر خواہ نتائج ظاہر ہوئے۔ اس میں انفرادی فعل سے قطع نظر عمومی رویہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے، باوجود فاتح کی حیثیت سے، کبھی اپنا مذہب اور تمدن ہندوؤں پر نہیں ٹھونسا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجود آٹھ سو سال حکومت کرنے کے مسلمانوں کی دہلی میں آبادی ۱۶ سے ۲۰ فیصد سے زیادہ نہ تھی[5] (اس کا تقابل اندلس اور گوا میں مسیحی فتوحات کے ساتھ کیا جائے تو دونوں مذاہب کے پیروکاروں کا رویہ سامنے آسکتا ہے)۔ اگرچہ ہندوستان میں مسیحیت کے نقوش قبل از اسلام کے ہیں لیکن تاریخ میں مسلمانوں سے ان کے بحث و مباحثہ کا کوئی تذکرہ نہیں، سوائے اس مختصر اشارہ کے کہ عہد تغلق میں بعض منادین نے عدالت میں استفسارات کے دوران جوابات دیئے تھے[6]۔ پرتگیزی استعمار کے جلو میں تشدد آمیز تبشیری جذبہ سے سرشار یسوعی نامی جماعت (Juest) کے پادریوں کی آمد

---

1 Birisik , Abdulhamit , Oryantalist Misyonerler vr Kuran, p.106

2 یہ 1881ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔

3 الجاحظ، ابو عثمان عمرو بن بحر، المختار فی الرد علی النصاری، (تحقیق: ڈاکٹر محمد عبداللہ الشرقاوی)، (دار الجیل، بیروت ۱۹۹۱ء، الطبعۃ الاولی)، صفحات: ۹۳

4 خطبہ کے بعد جاحظ کی تحریر کی ابتداء یوں ہوتی ہے، اما بعد، فقد قرات کتابکم وفهمت ما ذکرتم فیه مسائل النصاری قبلکم وما دخل علی قلوب احداثکم وضعفائکم من اللبس۔۔ (ایضاً، ص ۵۳)

5 نسیم عثمانی، اردو میں تفسیری ادب، ص ۱۷

6 برکت اللہ، قرون وسطی کی ایشیائی کلیسائیں، ص ۵۰۹۔۵۱۱

برصغیر میں مسلم مسیحی مناظرہ جات کا سبب بنی۔ گوا سے باہر تبشیر کے لیے تین سرکاری وفود کے ساتھ اس جماعت سے وابستہ پادری بھی شہنشاہ اکبر کے دربار میں بالترتیب ۱۵۸۰ء، ۱۵۹۱ء اور ۱۵۹۴ء میں آئے جہاں انہوں نے مسلم علماء کے ساتھ مناظرے کیے۔ ان کی اسلام کے بارے گفتگو میں شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسیحی منادین کے سرخیل زیویئر سے اس کے مسلمان دوست نے ایک مناظرہ کے بعد کہا کہ اگرچہ تم میرے مہمان اور دوست ہو لیکن الفاظ تول کر منہ سے نکالا کرو۔ جب میں تمہاری باتیں سن رہا تھا تو میرا جی کرتا تھا کہ میں تم کو چھری سے ہلاک کر دوں[1]۔

دربار اکبر میں ان مناظروں میں تثلیث، وفات مسیحؑ، قرآن، رسالت وذات محمد ﷺ، موت اور آخرت جیسے موضوعات پر بحث کی جاتی تھی۔ ان مسیحی مناظرین میں سب سے نمایاں نام پادری جیروم زیویئر کا ہے جو مسیحی حلقہ میں بہت محترم اور قابل مثال گردانا جاتا ہے۔ اس کی معروف تصانیف میں مراۃ القدس، آئینہ حق نما نمایاں ہیں[2]۔ جہانگیر کے زمانہ میں ہونے والے ان مناظروں کا اثر بعض لوگوں کے نظریات پر پڑا۔ مغلیہ عہد کے اس دور کی خاص بات بعض شہزادوں کا مسیحی عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کرنا ہے۔ مثلاً اکبر نے مریم خاتون (میری یا مریم، ولیم نامی پرتگیزی کی بیٹی تھی جو گوا میں آباد تھا۔) یہ ایک پرجوش مبلغہ کا جذبہ رکھتی تھی اور ایک مشن کے ساتھ اکبر کے دربار میں آئی۔ اور اس نے اکبر کے ساتھ شادی کے بعد محل میں مریم زمانی کا لقب اختیار کیا۔ جب اس نے گوا خط لکھ کر اپنے شاہی خاتون بننے کی خبر دی تو وہاں دھوم مچ گئی کہ مریم شہنشاہ بیگم بن گئی ہے اب مسیحی مذہب خوب ترقی کرے گا۔ اس نے محل میں گرجا تعمیر کروایا اور ردیف نامی پادری اپنی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔ جلال الدین شیروانی لکھتے ہیں کہ پادری ردیف کے ساتھ جتنے مسیحی گوا سے آئے تھے وہ سب مسلمان ہو گئے تو ردیف یہ برداشت نہ کر سکا اور راہی عدم ہوا جب کہ مریم زمانی بھی اسی رنج و صدمہ میں راہی ملک بقا ہوئی[3]۔ اسی طرح دارا شکوہ نے مسیح النساء نامی یورپین خاتون سے شادی کی تھی۔ جس کا دارا شکوہ پر اثر یہ ہوا کہ لوگ اسے مسیحی سمجھتے تھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مسیحی ہو کر مرا[4]۔ ابتدائی ادوار مغلیہ دربار میں ہونے والے مسلم مسیحی مناظروں میں کیتھولک پادری مسیحیت کی نمائندگی کرتے تھے۔ جب کہ بعد میں پروٹسٹنٹ بھی اس میں شامل ہو گئے بلکہ یورپ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ

---

1 برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۱۸۱

2 آئینہ حق نما کے آخری دو ابواب میں اسلام پر معترضانہ بیان کا رد ایک مسلم عالم احمد بن زین العابدین نے "مصقلۃ الصفا در تجلی حق نما" کے نام سے لکھا۔

3 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۵۷۔۶۱

4 ایضاً، ص ۵۳

کے درمیان فکری اور تنظیمی کشمکش کا اظہار ہندوستان میں بھی ان کے آپس کی رقابت سے ہوتا ہے[1]۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد پروٹسٹنٹ مشنریز نے مناظروں کے ذریعے منادی پر خصوصی توجہ دی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کا مسیحی پادریوں سے مناظروں کا حال تاریخ میں محفوظ ہے۔ ایک بار ایک مشنری دہلی میں اقامت پذیر گورنر سر چارلس مٹکاف (۱۸۴۶ء۔ ۱۷۸۵) کے پاس آیا اور اس سے مناظرے کی خاطر کسی مسلم عالم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مٹکاف نے اس سے دو ہزار روپے کی شرط باندھی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۷۴۶ء۔ ۱۸۲۴ء) کے پاس لے گیا۔ پادری موصوف نے سوال کیا کہ تمہارے پیغمبر حبیب اللہ ہیں؟ شاہ صاحب نے جواب دیا، ہاں۔ پادری نے کہا تمہارے پیغمبر صاحب نے بوقت قتل حسینؓ فریاد نہ کی، حالانکہ حبیب کا محبوب زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا، "ہمارے پیغمبر فریاد کے لیے تشریف لے گئے تھے تو خدا نے فرمایا تمہارے نواسہ پر ظلم ہوا اور وہ شہید ہو گیا، لیکن اس وقت ہم کو اپنے بیٹے عیسی علیہ السلام کا صلیب پر چڑھانا یاد آرہا ہے۔ یہ سن کر ہمارے پیغمبر خاموش ہو گئے کہ واقعی اکلوتے بیٹے سے بڑھ کر میرے نواسے نہیں ہو سکتے، جب بیٹے کی مدد خدا نے نہیں کی تو میرے نواسے کی مدد کیوں کر کرے گا۔ پادری صاحب شرط ہار گئے[2]۔

اسی طرح ایک انگریز اپنے ملازم سے کہا کرتا تھا کہ عیسی علیہ السلام خدا تعالی کے بیٹے ہیں اور یہ بات بہت آشکار ہے مگر تم مسلمانوں کو اس کا اعتقاد نہیں، بلکہ انکار کرتے ہیں۔ وہ شاہ صاحب کے پاس آیا اور عرض کی کہ ایک انگریز اس طرح سے کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا تم اس سے کہو مجھے تو علم نہیں جو تم سے بحث کروں ہاں اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے محاورے میں تین قسم کے بیٹے ہوتے ہیں۔ پوت، سپوت اور کپوت۔ پوت وہ ہے کہ جو کمالات میں باپ کے ہمسر ہو اور سپوت وہ ہے جو کمالات میں باپ سے بڑھ کر ہو۔ اور کپوت وہ ہے جو ابتر ہو کہ باپ اس کا ناراض اس سے رہے۔ اب بتاؤ کہ تمہارے اعتقاد کے مطابق عیسی کس قسم کے بیٹے ہیں۔ اگر پوت ہیں تو بتاؤ کہ خدائے تعالی نے تو یہ زمین و آسمان اور چاند و سورج پیدا کئے ہیں عیسی کے پیدا کئے ہوئے چاند اور سورج کہاں ہیں اور جو سپوت ہیں تو دکھاؤ کہ خدا نے ایک چاند اور ایک سورج پیدا کیا ہے، انہوں نے دو دو یا تین تین پیدا کئے ہونگے تو دکھاؤ کہاں ہیں اگر کپوت ہیں تو ہم ان سے راضی نہیں۔ کیونکہ خود خدا تعالی اس کا جب خوش نہ ہو تو ہم کس طرح ان کو مانیں۔ ملازم نے جب انگریز کو یہ جواب دیا تو وہ سن کر چکرا گیا۔ اور نہایت شرمندہ ہوا کہ ایک جاہل ملازم نے اسے خاموش کر دیا[3]۔

---

1 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۲۲

2 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۳۲۴

3 ایضاً، ص ۳۲۵

جوزف وولف [1] نے بہت سے مسلم علماء سے مباحثے کیے۔ ان میں سے سب سے اہم برطانوی مرکزی حکومت کے دہلی کے ذمہ دار ولیم فریمیسر کے واسطہ سے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۸۴۸ء) سے قرآن مجید اور رسالت محمدیہ کے بارے مناظرہ ہے [2]۔

ایورل پاؤل کے مطابق اس تبشیری دور کا پہلا باضابطہ مناظرہ لکھنو میں نواب اودھ کے دربار میں ہوا۔

The first full scale munazara of the evangelical era took place at the King of Awadh's court in Luckhnow.[3]

اس مناظرہ میں برطانوی ریذیڈنٹ جان لو اور نواب اودھ بنفس نفیس موجود تھے۔ تحریری مباحثہ کے بعد یہ مناظرہ پادری وولف اور سید محمد نصیر آبادی کے درمیان فروری ۱۸۳۳ء کو ہوا۔ رسالت اور کلام الٰہی پر ہونے والے اس مناظرہ میں شیعہ ماخذوں کے مطابق سید محمد غالب ٹھہرے۔ بعد میں اس بحث کو مشنری نقطہ نظر سے کلکتہ مشنری کے آرگن Christian Intelligence میں ۳۹۔۱۸۳۸ء کے دوران شائع کیا گیا[4]۔ اس سے ایک نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس وقت کے مسلم علماء بائبل اور مسیحی الہیات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے اور اناجیل کے تراجم میں اغلاط پر بھی ان کی نظر تھی۔

وکالت سے منسلک آگرہ کے محمد کاظم علی اور سید رحمت علی کی ستمبر ۱۸۴۲ء سے جولائی ۱۸۴۴ء کے درمیان پادری فانڈر سے تحریری بحث مباحثہ جاری رہا۔ اپنے پہلے مراسلہ میں ہی مسلم وکیل نے یہ نکتہ اٹھایا کہ حضرت عیسیٰ صرف یہود کی طرف مبعوث ہوئے تھے نہ کہ باقی دنیا کے لوگ ان کے مخاطب تھے۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو منادی غیر متعلقہ ہے۔ پاؤل کے مطابق فانڈر اپنے حریف کی پہچان میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ بحث کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ختم ہوگئی۔ ولیم میور مسلم مناظر کا تعارف فانڈر کو ان الفاظ میں کرواتا ہے۔"

These writers are ,we believe , Vakeels in the civil court at Agra .Kazim Ali seems to be possessed of some intelligence and sharpness.[5]

---

1 جمہوریہ چیک میں پیدا ہونے والے یہودی الاصل جوزف وولف ایک دلچسپ شخصیت ہے۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں کیتھولک کلیسیا سے بپتسمہ لیا۔ بعد ازاں برطانیہ چلا گیا۔ آکسفورڈ کے کاؤنٹ کی بیٹی سے شادی کی اور پروٹسٹنٹ کلیسیا سے وابستہ ہوگیا۔ اس نے مختلف مشنری تنظیموں سے رابطہ رکھا اور ۱۸۲۱ء میں مشنری سیاحت پر ہندوستان بھی آیا۔ اس کا اہم نظریہ انجیل خصوصاً کتاب دانیال کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ۱۸۴۷ء میں دوبارہ آمد کا عقیدہ تھا۔

2 Birisik , Abdulhamit , Oryantalist Misyonerler vr Kuran, p.114

3 Powell ,Avril A , Muslims and Missionaries an Pre-Mutiny India, , p117

4 Ibid

5 Ibid, p.180

ہندوستان میں مسیحی مناظرین کے سرخیل پادری سی جی فانڈر نے ۱۸۴۴ء میں فانڈر نے جامع مسجد دہلی میں ۲۰۰ سامعین کی موجودگی میں علماء سے مناظرانہ انداز میں بحث کی[1]۔ سید آل حسن (۱۸۰۱ء۔۱۸۷۰ء) کے ساتھ ۲۲ جولائی ۱۸۴۴ء تا ۴ فروری ۱۸۴۵ء کے درمیان ہونے والے گیارہ خطوط پر مبنی فانڈر کے تحریری مباحثہ کو LMS نے مسیحی نقطہ نظر سے ۱۸۴۵ء میں میرزاپور سے شائع کیا۔ جب کہ اسی سال سید آل حسن نے ان خطوط کو اپنی تنقیدات کے ساتھ "کتاب الاستفسار" کے نام سے شائع کیا[2]۔ یہ مناظرہ خود فانڈر کی خواہش ودرخواست پر ہوا تھا۔ اس میں اہم بات پادری فانڈر کا شرائط مناظرہ میں رسول اللہ ﷺ کے بارے تعظیمی الفاظ استعمال کرنے سے انکار تھا۔ مولانا آل حسن نے اپنے خط میں شرائط رکھی تھیں کہ:

۱ ہمارے پیغمبر خدا کا نام یا لقب تعظیم سے اگر لینا نہ ہو تو اس طرح لکھیے۔ "تمہارے نبی یا مسلمانوں کے" اور صیغہ افعال کے یا ضمائر ان کے متعلق آئیں تو بصیغہ جمع لکھیے۔ جیسا اہل زبان بولتے ہیں ورنہ ہم سے بات نہ کی جائے گی۔ اور نہایت رنج ہو گا۔

۲ جب پیغمبر خدا یا اسلام کی کوئی بات آپ کے نزدیک غلط ہو تو یوں لکھا کیجئے کہ یہ بات غیر واقعی ہے یا ثابت نہیں ہوتی یا محال نہ کہ جھوٹ اور بے ہودہ اور لغو ہے۔ اس لیے کہ ہمارے اہل تہذیب اسی طرح گفتگو کرتے ہیں۔

۳ جب کوئی بات پوچھی جائے تو اس کے جواب کے لیے میعاد مقرر کر دی جائے۔ کوئی میعاد بھی ایک ہفتہ سے کم نہ ہو۔

۴ ہمارے پیغمبر خدا کی نسبت تعظیم کے صیغے اردو کے محاورے کے مطابق اگر آپ کہیں گے تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا یا جائے گا کہ آپ نے ان کو مان لیا"۔

لیکن پادری صاحب اس بات پر آمادہ نہیں ہوئے اور پیغمبر اسلامؐ کو لقب یا تعظیم سے مخاطب کرنا یا ان کے لیے جمع کی ضمائر استعمال کرنا اپنے لیے محال گردانا[3]۔

---

1 صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۰۵

2 لکھنؤ، ۱۸۴۵ء، صفحات ۸۰۰؛ صابری، فرنگیوں کا جال ص ۲۱۱ پر مولانا آل حسن کے پادری فانڈر کے مناظرے کا احوال موجود ہے جو سات ماہ ۲۲ جولائی ۱۸۴۴ تا ۴ فروری ۱۸۴۵ء تک جاری رہا۔ فاضل مصنف نے اگرچہ سارے مناظرہ کا تفصیلی بیان لکھا ہے مگر کتابت کی غلطی کی وجہ سے قاری الجھن میں پڑجاتا ہے۔ مثلاً فانڈر کے پہلے خط کی تاریخ ۲۲ جولائی ۱۸۴۴ء کی بجائے ۱۸۴۸ء مرقوم ہے۔

3 صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۱۲

اس سے مسیحی منادین کے عمومی رویہ پر روشنی پڑتی ہے مولانا آل حسن کے ان شرائط کو پیش کرنے سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انہیں اپنے دینی منصب و مرتبے کے منافی رویے پر کوئی تاسف نہیں تھا۔ علمی اعتبار بلند و بالا قامت کی حامل شخصیات بھی عالمگیر اخلاقی اصولوں کی پاسداری نہ کر سکیں۔

ہندوستان کی مسلم مسیحی مناظراتی تاریخ کے دو سب سے اہم نام مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فانڈر ہیں جن کے بغیر نہ صرف یہ تاریخ نامکمل رہتی ہے بلکہ اس کا تجزیہ اور اثرات کا صحیح اندازہ بھی ممکن نہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ / جنوری ۱۸۵۴ء میں پادری تھامس ولیئ فرنچ (۱۸۲۵ء۔۱۸۹۱ء) اور پادری کئی کے ساتھ ثقاہت بائبل کے حوالے سے ایک مناظرہ ہوا۔ ڈاکٹر وزیر خاں بھی مولانا کے ساتھ ہے۔ پادری صاحب دوران گفتگو جب بائبل کی سند پر اعتراضات کا معقول جواب نہ پیش کر سکے تو کہنے لگے،" تمہارے قرآن کا کیا حال ہے؟"ڈاکٹر وزیر خاں نے جواب میں کہا کہ، " قرآن کے لفظوں کا تو کیا اس کے حرکات بھی بتواتر منقول ہیں"۔ دونوں پادری کہنے لگے ہم قرآن کے بارے کلام نہیں کرتے۔

اسی طرح پادری فرنچ صاحب نے کہا کہ ہم نے توریت اور انجیل اور زبور اور قرآن کو بڑے غور سے دیکھا اور تینوں کے شروع میں خدا کی صفتیں ایک ہی طرح پائی جاتی ہیں مگر قرآن میں نہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ قرآن کا جو ذکر آپ کرتے ہیں تو سنئے! انجیل میں خدا کی پاکی کا وہ حال جو قرآن میں نہیں ہے وہ یہ ہے کہ تین خدا ہیں ایک آسمان پر رہا، دوسرا مریم کے رحم میں رہ کر مکان مخصوص سے نکلا اور زندگی بھر کھاتا پیتا رہا اور تیسرا خدا کبوتر کی شکل میں اس دوسرے خدا پر اترا۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے پادری صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ پادری صاحب نے جواب دیا فرنچ، ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر میں کہوں کہ فرنچ صاحب کی عمر جو کھڑے ہیں اس وقت ۲۲ برس کی ہے اور مولوی صاحب کہیں کہ ۴۲ برس کی ہے۔ تو یہ دونوں باتیں کیا سچی ہوں گی یا جھوٹی؟ پادری صاحب نے کہا ہم ایمان کھوئیں گے۔ ایسی بات تو بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر ایسی بات کتاب مقدس میں نکل آئے تو آپ اس کو کیا کہیے گا۔ پادری صاحب بولے کہاں ہے؟ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے کتاب دوم اخبار الایام کے ۲۲ باب کے ۲ درس اور کتاب دوم سلاطین کے ۸ باب کے ۲۶ درس کی عبارت دکھائی اول میں جلوس کے وقت (سلطنت کے ملنے کے وقت (اخزیاہ) کی عمر ۴۲ برس کی اور دوسری میں ۲۲ برس لکھی ہے۔ اس پر پادری صاحب نے انگریزی بائبل میں دیکھا اور کہا یہ غلطی عدد میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا جب بہت سی غلطیاں اس میں ثابت ہو گئیں تو پھر کون سی دلیل ہے کہ اس میں ایک مقصود میں غلطی نہ ہو اور ہم نے کتب مقدس میں سو سے زائد غلطیاں نکال دی ہیں اور آپ سے قرآن میں پانچ جگہ بھی ایسی نہیں نکل سکتیں[1]۔

---

1 کیرانوی، ازالہ الشکوک، ص ۴۴۴۔۴۴۷

مناظرۃ الکبریٰ ہندوستان میں سب سے معروف مناظرۃ الکبری سے ملقب تاریخی مناظرہ پادری فانڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان بروز پیر، منگل ۱۱، ۱۲ رجب ۱۲۷۰ھ بمطابق ۱۰-۱۱ اپریل ۱۸۵۴ کو عبدالمسیح کٹھرہ، اکبر آباد (آگرہ) میں منعقد ہوا۔ مناظرہ سے قبل ۲۳ مارچ تا ۱۸ اپریل ۱۸۵۴ء تک مناظرہ کے انعقاد اور شرائط پر مراسلت ہوئی جس میں ہر فریق نے نو خطوط تحریر کیے۔ اس مناظرہ میں مولانا کے ساتھی ڈاکٹر وزیر علی تھے جب کہ مقابل پادری فانڈر کے ہمراہ پادری فرنچ تھے۔ مناظرے کے موقع پر مسلم شخصیات میں مفتی حافظ محمد ریاض، مولوی فیض احمد صاحب، مولوی حضور احمد صاحب، مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ بنارس، اور قمر الاسلام صاحب خطیب جامع اکبر آباد، منشی خادم علی صاحب مہتمم مطلع الاخبار اور مولوی سراج الحق صاحب نمایاں تھے[1]۔

ایورل پاول کے مطابق مسیحی مناظرین کو کارپردازان حکومت کی تائید حاصل تھی۔ اس وقت کے گورنمنٹ سیکریٹری سر ولیم میور، مسٹر موسلی اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر جارج کرسچین مشیر نظارت مالیہ، مسٹر ریڈلی سرکاری ترجمان مناظرے میں موجود تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرکاری اشیرباد کے باوجود فرنچ اور فانڈر مقامی مشنریز کی معمولی حمایت ہی حاصل کر سکے، جب کہ امریکن اور بپٹسٹ مشنریز اس مناظرہ کے منظر سے غائب رہے۔ ایورل پاول اسے مسلکی رقابت کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔

The other Agra-based American and Baptist missionaries do not appear to have attended, their absence perhaps reflecting the usual sectarian jealousies[2].

اس "رقابت" کا تذکرہ مؤرخ مسیحیت پادری برکت اللہ ان الفاظ میں کرتے ہیں،

" مسلمان علماء سٹراس، فیورخ اور انگریزی ملاحدہ کی کتب مطالعہ کر کے اعتراض پیش کرتے تھے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ معترضین کو یہ کتابیں آگرہ کی رومی کلیسیا کے اسقف اور خادمان دین دیا کرتے تھے تاکہ پروٹسٹنٹ علماء کو نیچا دکھا سکیں۔ ان ملاحدہ یورپ کی کتب کے علاوہ انہوں نے مسلمان علماء کو کلیسیا کی ابتدائی صدیوں کے بدعتیوں مثلاً مارسین، ابیونی، ایریس وغیرہ کی کتابیں بھی دیں اور ان کے مضامین کو ان علماء کے ذہن نشین کرتے رہتے تاکہ بزعم خویش پروٹسٹنٹ خیالات کا پول کھل جائے ہم ان شبیوں اور دین کے خادمان کی ذہنیت پر حیران رہ جاتے ہیں"[3]۔

ابتداء میں پادری فانڈر نے مناظرہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں عیسائی مذہب کا حق ہونا مسلمانوں کے سامنے ثابت کروں۔ یہ مناظرہ نسخ و تحریف اناجیل، الوہیت مسیح، تثلیث، نبوت محمدی، اور

---

1 سید عبداللہ، مباحثہ مذہبی (پہلا حصہ)، (مطبع منصبیہ، اکبر آباد ۱۲۷۰ھ)، ص ۳۶

2 Powell, Muslims and Missionaries an Pre-Mutiny India,, p 244

3 برکت اللہ، صلیب کے علمبردار، ص ۲۲

حقیقت قرآن کے موضوعات پر ہو گا۔ پہلے چار موضوعات پر میں جواب دوں گا اور مولانا رحمت اللہ اعتراض کریں گے اور آخری دو مسائل پر میں اعتراض کروں گا اور مولانا رحمت اللہ جواب دیں گے [1]۔

مولانا نے آغاز میں پادری موصوف کی میزان الحق کی نسخ سے متعلق بعض عبارتیں پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ پادری صاحب اس اصطلاح کا مسلم نقطہ نظر سے صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔ دلیل میں مسلم مفسرین کی آراء پیش کیں۔ تفسیر عزیزی (شاہ عبدالعزیز) سے آیت "ولقد اتینا موسیٰ الکتب ۔۔۔" اور تفسیر حسینی سے "واتینا داؤد زبورا" کی تفسیر پیش کی نیز معالم التنزیل (للبغوی) سے مسلم نقطہ نظر بیان کیا کہ نسخ صرف اوامر و نواہی میں ہی ہوتا ہے۔ پہلے روز زیادہ تر نسخ اور تحریف بائبل پر ہی بات ہوئی جس میں پادری صاحب کے اقرار تحریف کو یوں بیان کیا گیا ہے

"۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے یوحنا کے خط کے پانچویں باب کا درس ۷، ۸ پیش کیا۔ پادری صاحب نے فرمایا کہ یہاں اور دو ایک جگہہ اور تحریف ہوی (ہوئی) ہے۔ یہہ بات سنتے ہی جناب اسمتھ صاحب بہادر صدر دیوانی کے حاکم نے جو پادری فرنچ صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے تھے انگریزی زبان مین پوچہا (پوچھا) کہ یہ کیا بات ہے پادری فرنچ صاحب نے جواب دیا کہ یے (یہ) لوگ ہارن اور اور مفسرون کی کتاب سے چہہ (چھ) سات مقام جن میں تحریف کا اقرار ہوا ہے کے سند لائے ہیں۔ پادری فرنچ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف متوجہہ ہو کر زبان اردو مین یون فرمایا کہ صاحب (یعنی پادری فینڈر صاحب) بہی (بھی) اس بات کو مانتے ہین کہ سات آٹہہ (آٹھ) جگہہ تبدیل و تحریف ہوئی ہے۔ اس پر مولوی قمر الاسلام صاحب جامع مسجد کے امام نے منشی خادم علی مطلع الاخبار کے مہتمم سے فرمایا کہ تم لکہ (لکھ) لو کہ پادری صاحب نے آٹھ جگہہ تحریف و تبدیل کا اقرار کیا ہے۔ پادری صاحب سن کر بولے اچہا (اچھا) لکہہ لو [2]۔

پہلے دن پادری صاحب کے اقرار تحریف نے مسلمانوں میں بہت جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ بقول ایورل پاول؛

The second day added little that was new to the argument As far as the Muslims were concerned Pfander's admission and the mufti's opinion meant that the victory was already won[3].

اگلے روز آغاز مناظرہ میں ہی پادری صاحب نے غلط تلفظ کے ساتھ قرآن پاک کی بعض آیات پڑھنا شروع کیں تو قاضی القضاۃ مولوی محمد اسد اللہ صاحب نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے مناظر سے کہا آپ صرف ترجمہ پر ہی اکتفا کریں کیونکہ لفظ کے بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ جس پر فاضل مناو نے یہ کہتے ہوئے فوراً معذرت کر لی کہ یہ ہماری زبان کا قصور ہے۔ انہوں نے عدم تحریف انجیل پر قرآن پاک کی آیات "وقل آمنت بما انزل اللہ من

---

1 کیرانوی، البحث الشریف، ص ۲۰

2 سید عبداللہ، مباحثہ مذہبی، ص ۴۹

3 Powell, Avril, Muslim – Christian Controversy in India in the mid 19th centurary, Journal of Royal Asiatic Society, No 1 (1976), p 57

کتاب و امرت لا عدل بینکم اللہ ربنا و ربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لا حجۃ بیننا و بینکم ۔۔۔ ، ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی احسن الا الذین ظلموا منہم و قولوا آمنا بالذی انزل الینا و انزل الیکم و الھنا و الھکم واحد و نحن مسلمون ، الیوم احل لکم الطیبات و طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم و لہ " پیش کیں۔ مولانا نے فوراً واضح کیا کہ ان آیات سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے سابق میں بھی خدا کا کلام نازل ہوا اور اس پر ایمان لانا چاہیے۔ لیکن اس سے عہد محمد یہ میں انجیل کے عدم تحریف کہاں سے ثابت ہوتا ہے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ پادری فرنچ نے خود اعتراف کیا کہ:

" ہمارے عالموں نے تیس یا چالیس ہزار جگہ عبارتوں کا اختلاف نکالا ہے۔ پر وہ اختلاف صرف ایک نسخے میں نہیں بلکہ بہت سے نسخوں میں تھا ایسا کہ حساب کی رو سے فی نسخہ چار سو یا پانچ سو ہوتا ہے۔ گو بعض غلطیاں بدنیتوں کے تصرف سے ہو گئی ہیں۔ جیسا ڈاکٹر گریزبیک نے متی کی انجیل میں تین سو سترہ (۳۱۷) سہو آیتوں اور لفظوں میں نکالے ہیں۔ جن میں سے سترہ (۱۷) تو بہت بھاری ہیں اور بتیس (۳۲) بھی بھاری ہیں پر اول کی نسبت کچھ خفیف ہیں۔ اور باقی سب کے سب خفیف اور ہمارے عالموں نے اکثر جگہ ان غلطیوں کو صحیح کیا ہے [1] ۔

بحث میں مولانا کی گرفت پر پادری صاحب بہت الجھ گئے اور مناسب جواب نہ دے سکے۔

مولانا نے پوچھا کہ ایک بات اور بھی پوچھنے کے قابل ہے کہ آپ کے کاتب ان سہووں میں سے جسے ہم تحریف کہتے ہیں اور آپ نے بھی یہی اس وقت اقرار کیا سارے نسخوں میں مانتے ہیں یا نہیں فرمایا ایسا سہو سارے نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ اس پر پادری فرنچ صاحب نے پادری فینڈر کو ٹوکا پھر پادری صاحب کہنے لگے ہم سے غلطی ہو گئی۔ پادری فرنچ صاحب خوب کہتے ہیں۔ قاضی القضاۃ صاحب نے فرمایا اب کیا آپ کا پہلا قول سند ہو گا۔ پادری صاحب نے فرمایا نہیں میں نے غلطی کی اور اس میں کوئی پکی بات نہیں کہہ سکتا [2]۔

ان مقامات کے تسلیم کرنے کے باوجود پادری صاحب اس بات پر مصر تھے کہ اس سے متن میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔ اس پر مولوی فیض احمد صاحب سر رشتہ دار نے پادری صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تعجب ہے کتاب میں تحریف واقع ہو اور متن میں کچھ خرابی نہ پڑے اس پر مباحثہ ختم ہو گیا [3]۔ دراصل پادری صاحب نے مناظرہ جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا جسے اس نے بعد میں اپنی غلطی گردانا تھا۔

The debate came to an abrupt end when Pfander said that unless the Ulama would accept this latter argument, he would discuss with them no longer. In a letter to the Church Missionary Society he admitted that this ultimatum was a mistake on his part as it allowed the Muslims a

1 سید عبداللہ، مذہبی مباحثہ، ص ۶۴ ۔ ۶۵

2 ایضاً، ص ۷۱

3 ایضاً، ص ۷۵

ready pretext to claim that he was afraid to continue with the other points for discussion[1].

اس کے بعد جانبین میں خط کتابت کے ذریعے مباحثہ ہوتا رہا جسے بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا[2]۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب دونوں مناظر حضرات کا شخصی تجزیہ یوں کرتے ہیں:

"مناظرے کی روداد کے مطالعہ سے واضح محسوس ہوتا ہے کہ بالکل دو متضاد شخصیات ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں۔ ایک شخصیت مولانا کیرانوی کی ہے جو اسلام کی نمائندگی، اخلاق، اوصاف، صبر، و تحمل، اور اسلامی تعلیمات غرض ہر پہلو سے کر رہی ہے۔۔۔ دوسری طرف پادری فینڈر صاحب کی شخصیت ہے۔ جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی نمائندگی کر رہی ہے۔ پادری فینڈر کی شخصیت کی تعمیر اور ذہن سازی میں تحریف شدہ کتابوں اور غلط و بے اصل عقائد جو کردار ادا کیا اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ پہلے روز کے آغاز میں پادری صاحب نے جو تقریر کی وہ اس کی مرعوبیت، انفعالی کیفیت اور ذہنی انتشار کی پوری طرح غماز ہے"[3]

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ڈاکٹر وزیر علی کی توسط سے اس مناظرہ میں بعض مغربی نقادوں کی بائبل پر کی گئی تنقید کی مدد سے اپنا مدعا پیش کیا۔ پادری فانڈر صاحب کو اس کی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ اب تک ان کا واسطہ جن مسلم علماء سے پڑا تھا ان کی اس مغربی تنقید تک رسائی نہیں تھی اور وہ خود جدید مغربی تنقیدی اصولوں کی روشنی میں اسلام پر تنقید کرتے۔ یہ مسلم علماء کے لیے نئی بات ہوتی اور وہ دفاعی پوزیشن میں آ جاتے۔ مناظرہ آگرہ میں مسلم علماء کی طرف سے غیر متوقع طور پر پیش کردہ دلائل نے پادری صاحب کو دفاعی پوزیشن میں لا کھڑا کیا اور پادری صاحب کے تحریف بائبل کے جزوی اقرار، جو کہ اصلاً مسلم دعویٰ کو تسلیم کرنا تھا، نے مشنری سرگرمیوں کے جوش و خروش کو بہت کم کر دیا۔ جس کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں اچھا ثابت ہوا اور وہ فاعی پوزیشن سے نکل گئے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی رقم طراز ہیں:

" مباحثہ کا فائدہ یہ ہوا کہ پادریوں کا بالکل وہ زور و شور گھٹ گیا اور کتابیں جو کثرت سے بانٹتے تھے اس کثرت سے موقوف کردیں اور مسلمانوں سے الزام اٹھ گیا اور عیسائیوں کا وہ تکبر اور اعتقاد فاسد مٹ گیا اور مذبذبوں کا تذبذب ہٹ گیا۔ والحمد للہ علی ذلک"[4]

مسیحی تحریروں میں مباحثہ میں پادری صاحب کی برتری ظاہر کی گئی جب کہ مسلم فریق کی طرف سے اسے اپنی

---

1 Powell, Muslim – Christian Controversy in India in the mid 19th centurary , p 57

2 سید عبداللہ، مذہبی مباحثہ (حصہ دوم) (مطبع منعمیہ، اکبر آباد ۱۲۷۰ھ) صفحات: ۱۲۶ یہ فانڈر کے تیرہ اور ڈاکٹر وزیر علی کے چودہ خطوط پر مشتمل ہے۔ جب کہ مسیحی حلقے کی طرف سے "خطوط"، مطبع نور افشاں، آگرہ ۱۸۵۴ء، صفحات: ۲۰۰ کے نام سے یہ خط و کتابت شائع کی گئی۔ (ڈاکٹر عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔۔۔، ص ۲۹۲)

3 ایضاً، ص ۲۹۱

4 ایضاً، ص ۲۸۷۔۲۸۸

بڑی واضح کامیابی گردانا گیا[1]۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ ہزیمت اور پسپائی کے احساس کے زخم نے اسے (پادری صاحب) کو ہندوستان سے رخت سفر باندھنے پر مجبور کر دیا[2]۔

مباحثہ شاہ جہاں پور منشی پیارے لال کبیر پنتھی ساکن چاند پور ضلع و تحصیل شاہجہان پور نے ۷ مئی ۱۲۹۵ھ کو میلہ خدا شناسی مذاہب مختلفہ کا مناظرہ منعقد کروایا۔ اس میں اسلام کی طرف سے مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا سید ابولمنصور نے اسلام کی نمائندگی کی شرائط مناظرہ میں یہ بات طے کروائی کہ؛

۔ ہر فریق اپنا وعظ، اپنے مذہب کی حقانیت و صداقت کھڑے ہو کر بیان کرے۔ اس کے بعد فریق ثانی اس پر اعتراض کرے۔

۔ مدت مناظرہ جو پہلے دو روز تھی اسے تین دن منظور کر لیا گیا۔

۔ مدت وعظ ۱۵ منٹ اور سوال و جواب کے ۱۰ منٹ قرار پائے[3]۔

فریق مناظرہ تین تھے مسلمان، ہندو اور عیسائی۔ لیکن اصل منظرہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تھا۔ پہلے یورپین مسیحی مناظر پادری نولس نے اپنے مذہب کی حقیقت اور انجیل کے صادق ہونے پر طویل تقریر کی۔ جس میں اس نے مسیحیت کے خدائی مذہب ہونے کی دلیل یہ پیش کی کہ سوائے انجیل و کتب مقدسہ کے کسی کتاب کی اشاعت دیکھنے میں نہیں آتی کہ سب تک پہنچے۔ اس کے علاوہ انجیل کا سوڈیڑھ سو زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جواب میں مولانا نانوتوی نے حفاظت قرآن کو معجزہ خداوندی قرار دیتے ہوئے کہا کہ کسی کتاب کی اشاعت ترجموں کی کثرت سے نہیں مانی جاتی۔ بلکہ اس کے پیروکاروں کی تعداد سے اس کی اشاعت و مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمان عالم دنیا میں تمام قوموں کے مقابلہ میں ہر سو پھیلے ہوئے ہیں اس سے قرآن مجید کی اشاعت کا اندازہ لگالینا چاہیے۔ مولانا ابوالمنصور نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ اگر انجیل کے آسمانی ہونے کی دلیل ترجموں کی کثرت ہے تو یوں کہنا چاہیے کہ اٹھارویں صدی سے قبل انجیل کتاب آسمانی نہ تھی۔ اٹھارویں صدی میں یہ عزت و شرف انجیل کو حاصل ہوا۔ کیونکہ اٹھارویں صدی میں ترجموں کی کثرت ہوئی۔ اگر انجیل شروع سے ہی آسمانی ہے تو ہر کتاب کے بارے میں بھی یہی تصور ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں پادری صاحب بولے ہاں ترجموں کی کثرت اٹھارویں صدی میں ہی ہوئی ہے پر اٹھارویں صدی سے پیشتر بھی کئی قسم کے ترجمے تھے[4]۔

---

1 ملاحظہ ہو: صابری، فرنگیوں کا جال؛ اختتام دینی مباحثہ از پادری فانڈر، (سکندرہ چھاپہ خانہ، آگرہ ۱۸۵۵) وغیرہ

2 ڈاکٹر عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ص ۲۹۱

3 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۴۰

4 ایضاً، ص ۲۴۱، ۲۴۲

اگلے روز کے مباحثہ میں مولانا قاسم نے نبوت، اخلاص اور اخلاق پر بہت پر تاثیر گفتگو کی اور اسلام کی حقانیت ثابت کی۔ آپ کے بعد پادری لونس نے کھڑے ہو کر فرمایا" واقعی مسلمانوں میں توحید بہت عمدہ ہے۔ کاش اس کے ساتھ تثلیث کے بھی وہ معتقد ہوتے۔[1] پادری محی الدین پشاوری نے آپ پر چار اعتراضات کیے۔ مولانا نے ان کا شافی جواب دیا اور قرآن میں نسخ کی حقیقت واضح کی[2]۔

۸ مارچ ۱۸۶۷ کو پادری عمادالدین کے ساتھ بعض مسلم افراد کا مناظرہ پادری تاراچند کے مکان پر ہوا۔ اس مجلس میں لالہ چھوک چند، لالہ ہمت رائے، احمد حسن صاحب، دین محمد طالب علم مدرسہ تعلیم المعلمین، حکمی احمد اللہ، لالہ جے دیال، سہارئے مل، محمد یعقوب، مولوی احمد الدین،، مولوی محمد یسین صاحب نے شرکت کی جب کہ محمد عمر طالب علم پادری صاحب کے ساتھ بات کے لیے مقرر ہوئے۔ امداد صابری کے بقول؛

> "توحید و تثلیث پر محمد عمر صاحب اور پادری عمادالدین صاحب میں مختصر بحث ہوئی۔ پادری صاحب پہلے سنتے رہے پھر کچھ بولے تو ایک طالب علم نے جھکا دیا۔ دس ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ آپ مناظرہ سے گریز کرنے لگے۔۔۔ (مولانا عبدالمجید صاحب نے پوچھا کہ) آپ نے ہدایت المسلمین میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں پانچ سو آیتیں منسوخ بتاتے ہیں۔ پادری صاحب نے کہا ہاں، مولانا صاحب بولے یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ نسخ صرف احکام میں ہوتا ہے۔ اعتقاد میں نہیں۔ پادری صاحب نے کہا، درست ہے۔ مولانا صاحب نے فرمایا تو اس صورت میں بقول آپ کے قرآن مجید میں پانچ سو سے زیادہ آیات منسوخ ہونی چاہیے۔ حالانکہ قرآن مجید میں کل احکام پانچ سو ہیں۔ ماسٹر تاراچند نے مداخلت کر کے مباحثہ ختم کروادیا۔ یہ مناظرہ مطبع فاروقی میں چھپا۔ مناظرہ میں شامل ہونے والے حضرات نے اپنے دستخطوں سے شائع کرایا تھا۔ اس کتاب کی تاریخ لالہ چند بھائی نے حسب ذیل مصرعہ میں فرمائی ہے
>
> تثلیث کا رد کیا ہے اچھا ۱۲۸۸ [3]

مولانا سید امیر حسن صاحب محدث سہسوانی (م ۱۸۷۴ء) کا ایک بار پادری اسکاٹ (مقیم بریلی) سے مناظرہ ہوا تو انہوں نے باوجود فطری تعصب کے آپ کے تبحر علمی کا اعتراف کیا۔ پھر اکثر سہسوان آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے تاآنکہ جب صاحب ترجمہ کا ارتحال ہوا تو اسکاٹ صاحب اس وقت لندن میں تھے۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر اخباروں میں آپ کی فضیلت و تشخص پر مضمون لکھا[4]۔

---

1 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۴۴

2 نانوتوی، محمد قاسم، مباحثہ شاہجہان پوری، (دارالاشاعت، کراچی ۱۹۷۷) ص ۵۵

3 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۳۱۔ ۲۳۲

4 عمری، تذکرۃ المناظرین، ص ۱۱۸۔ ۱۱۹

مولانا عبدالباری سہسوانی ۱۲۹۴ء میں آگرہ مدرسہ میں عربی ادب و حساب کے پروفیسر مقرر ہوئے تو یہاں نو مسیحی پادری عمادالدین سے مباحثہ ہوا۔ اس مباحثہ کے لیے بعض مشنری علماء پنجاب سے بھی مدعو تھے۔ اس کے منتظم پرنسپل پادری دین صاحب تھے۔ مولانا نے طویل تقریر دربارہ استحکام اصول اسلام و حقانیت قرآن و صداقت دین بر حق و ابطال و تردید ادیان منسوخہ و تحریفات پر بفصاحت و بلاغت تمام فرمائی۔ اس بیان میں دین اسلام کا غیر مذاہب سے موازنہ زبردست تھا۔ آپ کے بعد پادری صاحبان سے جوابی تقریر کا تقاضا کیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد پادری عمادالدین صاحب نے مناظرہ زبانی کو موجب فتنہ فساد کہہ کر رخصت مانگی اور کہا کہ ہم تحریری بحث پسند کرتے ہیں۔ پادریوں کے اس بے محابا گریز سے عام عیسائیوں کے دل بیٹھ گئے اور ایک مدت کے لیے ان کی تقریروں کا بازار بھی سرد ہو گیا[1]۔

چودھری شیخ مولا بخش کان پور کے مشہور مناظر تھے۔ پادری فیلڈر جو کہ کان پور کے مشنری تھے، ان کے ساتھ ۱۸۸۴ء میں مناظرہ ہوا۔ مناظرہ کا عنوان " ابطال کفارہ، بائبل کے الہامی ہونے کا بطلان، قرآن مجید میں تغیر و تبدل نہ ہونے کا ثبوت، حضرت سردار الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کا اثبات" تھا۔ اس کی تفصیلات چودھری صاحب نے اپنی تصنیف " مراسلات مذہبی" میں دی ہیں[2]۔

مسلم مناظرین میں سے ایک نام مولانا شرف الحق دہلوی کا ہے۔ آپ عبرانی، یونانی، عربی اور فارسی زبان کے ماہر تھے۔ ۸ مارچ ۱۸۸۸ء کو غازی پور میں آپ کا پادری رونسن صاحب اور پادری ای پیٹرک، پرنسپل مشن کالج، غازی پور سے مناظرہ ہوا۔ پادری رونسن صاحب نے سوال کیا کہ؛

> " وہ کون سی ضرورت تھی جو خدائے تعالیٰ نے پہلے توریت، انجیل کو نازل فرمایا اور اس کے بعد قرآن شریف نازل فرمایا۔ کیا وہ کتابیں اس قابل نہ تھیں کہ ان سے مخلوق خدا نجات حاصل کر لیتیں۔ سب سے پہلے یہ بتائیں کہ ان میں کون سا نقص ایسا تھا جو ناقابل نجات قرار پائے اور جو ناقابل نجات ہوئی تو قرآن خدا کا کلام ہونے اور حضرت محمد صاحب کے رسول ہونے کے لیے کیا دلائل اور ثبوت اہل اسلام کے پاس ہیں۔ اگر آپ ہم کو محمد صاحب کو اللہ کا نبی اور رسول ہونے اور قرآن کا کلام ہونا ثابت کریں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے"[3]۔

مولانا نے جواباً اعتراض کو معترض پر لوٹا دیا کہ جو اعتراض رونسن صاحب نے قرآن پر کیا ہے وہی اعتراض زبور اور انجیل پر بھی ہو سکتا ہے کہ خدا نے جو تورات بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی وہ نجات کروانے کے قابل تھی یا ناقابل؟ اگر قابل تھی تو زبور، انجیل نازل ہونے اور خلق خدا کی ہدایت کے لیے آنے کی

---

1 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۱۲۴۔۱۲۵

2 ایضاً، ص ۲۳۲

3 ایضاً، ص ۲۳۳

کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اور یہ کتابیں محض بے کار ٹھہرتی ہیں اور اگر توریت نا قابل نجات قرار دی جاتی ہے تو خدا کی خدائی اور اس کی بزرگی و تقدس و جلیل شان میں بٹہ لگتا ہے۔ جس کو کوئی خدا پرست قبول نہیں کرے گا۔ یہ تو الزامی جواب تھا اصل جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ خدا کے قرآن شریف نازل فرمانے سے پہلے توریت کو اور پھر زبور و انجیل کو حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر نازل فرمایا تھا۔ یہ وہی مجموعہ ہے جواب کتاب مقدس کہلاتا ہے۔ لیکن اب یہ مجموعہ ہرگز ہرگز وہ نہیں ہے اس سے بہت سے صحیفے خارج ہو گئے ہیں اور مسیحی مذہب کے محققین کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کثیر غیر مشہور اور غیر الہامی رسالے اس میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ اور مولانا نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بہت سے تاریخی و علمی حوالوں کے ڈھیر لگا دیئے اور قرآن کی ضرورت اور نبوت و رسالت محمدیہ کا عقلی و نقلی اثبات پیش کیا۔ مولانا کی اس تجر علمی کا مناظرے کے آخر میں پادری صاحب نے ان الفاظ میں اقرار کیا؛

"ہم جناب مولوی صاحب کی اس دریافت پر آفرین نہیں بلکہ صد آفرین کرتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں ایسی تحقیق اور دسترس پہنچائی ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ایسا ماہر اور جامع شخص ہمارے غازی پور تشریف لایا۔ ہم میں اتنا علم اور اتنی لیاقت نہیں کہ جناب مولوی صاحب سے مقابلہ کر سکیں۔ اور آپ کی ہر بات کا جواب دیں سکیں"[1]

اس کے باوجود اپنے قول کے مطابق اسلام قبول نہیں کیا۔

اسی طرح مولانا اشرف الحق کا ۲۳ دسمبر ۱۸۹۱ء کو دہلی کی تاریخی فتح پوری مسجد میں لارڈ بشپ جے اے لیفرائے مشن کالج دہلی سے تحریف بائبل پر معروف مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے کی خاص بات یہ تھی کہ پادری صاحب اور آپ کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ جو بھی مناظرے میں ہار جائے وہ مجمع عام میں اپنی شکست کا اعتراف تحریری کرے گا اور مقابل کا مذہب اختیار کرے گا۔ اس مناظرہ میں آگرہ، علی گڑھ، میرٹھ، دیوبند اور سہارن پور کے معززین و مشاہیر اور علمائے کرام مسیح الملک حکیم اجمل خاں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی مفسر تفسیر حقانی، ڈپٹی سید ہادی حسن، سید سلطان مرزا مجسٹریٹ وغیرہ نے شرکت کی۔ بیس پچیس ہزار کے مجمع میں مولوی صاحب نے عالمانہ اور فاضلانہ بحث کی۔ دوسرے دن اس مناظرہ کا فیصلہ ہوا۔ اس جم غفیر میں پادری صاحب نے اپنا مذہب تو نہ بدلا لیکن تسلیم کیا کہ واقعی انجیل شریف میں تحریف ہوئی ہے۔ تحریر حسب ذیل عبارت تھی۔

" میں اقرار کرتا ہوں کہ لوقا کی انجیل شریف کے ترجمے اور علاوہ اس کے اصلی نسخوں میں جو اس وقت موجود ہیں چند آیتیں غلط ہیں اور بھول سے داخل کی گئی ہیں۔ یہ بات سب سے قدیم نسخوں اور ٹریکٹوں کے ملانے سے معلوم و ظاہر ہوئی اور وہ آیتیں ان میں نہیں ہیں لہٰذا وہی اصلی انجیل کی باتیں سچی مانتا ہوں۔ چند مستشرقین شعراء کے قول اصل انجیل شریف میں ملے ہوئے ہیں۔ دستخط جی اے لیفرائے (انگریزی)"۔

---

1 امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

مسلم مناظرین میں ایک اہم نام مولانا ثناء اللہ امر تسری ہے۔ اللہ تعالی نے آپ کو ذہانت و فطانت، مضبوط قوت حافظہ، دینی حمیت کا وافر حصہ عطا کیا تھا۔ آپ کے معاصر عالم دین اور قادیانیت کے خلاف آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے والے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کہتے ہیں؛

"میرے نزدیک اسلام کی صداقت و حقانیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ثناء اللہ ایسا زیرک، معاملہ فہم، ذہین و فطین انسان اسلام کا علمبر دار ہے اور یہ صداقت اسلام کا جیتا جاگتا چلتا پھرتا معجزہ ہے[1]۔

مولانا ثناء اللہ امر تسری نے عیسائیوں سے متعدد مناظرے کیے۔ آپ کی عمر ابھی ۱۵، ۱۶ برس کی تھی کہ امر تسر کے بازار میں پادری جیمس کی تقریر سننے کا موقع ملا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ مسیح علیہ السلام خدا کے فرزند ہیں اور اس کے تمام اوصاف ان میں پائے جاتے ہیں۔ آپ نے کھڑے ہو کر پادری صاحب سے پوچھا کہ پادری صاحب! یہ جو بار بار آپ حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ رہے ہیں اور ان کو اللہ کی ابنیت میں دے رہے ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں خدا کی شادی کب ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ اس کی بیوی کا نام کیا تھا۔ یہ بیٹا خدا نے خود جنا یا اس کی زوجہ نے جنا[2]؟ اس کے مقابل اسلام کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے سورۃ اخلاص کی آیت قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ تلاوت کیں۔ آپ کی تقریر سے پادری موصوف نے اپنی دکان بڑھالی[3]۔

آپ کے ساتھ مناظرہ لاہور ۱۹۱۰ء میں آپ کے مقابل فریق پادری جوالا سنگھ تھا اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف خود کیا اور ایک پورا خاندان مسلمان ہو گیا تھا[1]۔ اسی طرح ۶ ستمبر ۱۹۱۶ء کو آپ کا مناظرہ ہوشیار پور میں عیسائیوں کے شیخ المنطق جوالا سنگھ سے ہی ہوا۔ ۲۷۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء کو انجمن اہل حدیث کے سالانہ جلسہ میں پادری ایس ایم پال سے مسئلہ توحید پر مناظرہ ہوا۔ عین جلسہ میں ایک عیسائی نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۲ تا ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو حافظ آباد میں بھی آپ نے مسیحی علماء سے مناظرہ کیا۔ لاہور میں معروف مسیحی مناظر پادری عبد الحق سے آپ کا یادگار مناظرہ ہوا۔ اسی طرح مناظرہ الہ آباد[4]۔ ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء میں مسیحی مناظر پادری عبد الحق، مولانا کی گرفت سے اس قدر بوکھلایا کہ خود کہہ دیا" ہم الوہیت مسیح کے قائل نہیں" یہ مناظرہ بڑا معرکہ خیز تھا اور اس کے اثرات بہت دور دور تک ہوئے[5]۔

---

1 الاعظمی، صفی الرحمن، فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امر تسری، (ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء، بنارس (انڈیا) ۱۹۷۹ء) ص ۲۶ بحوالہ ہفت روزہ "المنبر" ، ۱۴ شعبان ۱۳۸۷ھ، ص ۴

2 اسی طرح کا سوال مناظرہ شاہجہان میں وکیل سرکار لکھنؤ نعمان خاں نے پادری لونس سے ان الفاظ میں کیا تھا۔

در فیض محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے	نہ آئے تو آتش دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے
معاذ اللہ فرزند خدا کہتے ہو عیسے کو	تو دادا کون ہے ان کا بتائے جس کا جی چاہے

3 عمری، تذکرۃ المناظرین، ص ۲۳۰

4 الاعظمی، فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امر تسری، ص ۳۰

5 الاعظمی، فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امر تسری، ص ۳۰۔۳۱

بعض مناظروں کی تحریری رپورٹ

مولوی احمد حسن   رسالہ نصرت احمدیہ[1]

یہ رسالہ اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو پادری عمادالدین اور مولوی محمد عمر دہلوی کے درمیان ہوا تھا۔ منشور محمدی جلد ۶ میں شائع ہوا۔

سرسید احمد خاں (زیر نگرانی)   رسالہ مناظرہ مسلمان وعیسائی

قبل ۱۹۰۰ء

مولوی احمد علی واعظ دہلوی   مباحثہ اتفاقیہ[2]

مطبع مفید عام، لاہور طبع اول ۱۸۸۲ء

صفحات: ۳۸

یہ اس مباحثہ کی روئیداد ہے جو مولانا موصوف اور پادری پورن چند کے درمیان ہوا تھا۔

اسد علی مرزا   منظار الکلام[3]

مطبع عزیز، حیدرآباد دکن، ۱۳۰۳ھ

صفحات: ۴۲

یہ پادری اسمتھ اور مرزا اسد علی مابین ہونے والے مناظرہ کے بیان میں ہے۔

شیخ الہ دین   مباحثہ

قاسمی پریس، لودیانہ ۱۹۰۸ء

صفحات: ۳۲

یہ مناظر اسلام شیخ الہ دین صاحب اور پادری احمد شاہ کے مابین دہلی میں ۵ مئی تا ۲ جون ۱۹۰۵ء اٹھائیس یوم تک جاری رہنے والے مناظرہ کی روداد ہے۔ فریقین کے مابین زیر بحث موضوع تھا کہ آیا از روئے اناجیل، مسیح

---

1 "محدث" بنارس، ج ۲۵، ش ۷، (مستقیم سلفی، ردعیسائیت میں علمائے ہند کی خدمات)، ص ۶۲

2 ایضاً، ص ۱۹

3 قاموس الکتب، ص ۸۰۲

صلیبی موت کا شکار ہوئے تھے یا پھر قرآنی تصریح کے بموجب اس لعنتی موت سے محفوظ رہے۔ یہ سوال دونوں مذاہب میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جس کے تصفیے پر فریقین کے مابین بہت سے مسائل طے ہونے کا انحصار ہے۔

"وجادلھم بالتی ھی احسن "کی آیت سے مزین سرورق والا یہ مباحثہ خود مناظر کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ مناظر نے اسے غیر ضروری تفصیلات سے پاک کر کے ایک مسلسل مضمون کی شکل میں پیش کیا ہے۔ پادری احمد شاہ کی تقریر مکمل نقل نہیں کی گئی بلکہ صرف خلاصہ پر اکتفاء کیا گیا ہے مگر فاضل مؤلف کا اپنا جواب مکمل نقل کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انہیں اپنے دلائل کی قوت پر جتنا اعتماد تھا وہ ابتدائے تحریر سے ہی ظاہر ہوتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ مخاطب پادری صاحب کے علاوہ پنجاب کے دیگر عیسائیوں میں سے اگر کسی کا حوصلہ ہے تو ان کے اعتراضوں کا جواب دے[1]۔

اس مباحثہ میں پادری صاحب کے مؤقف پر درج ذیل چھ اعتراضات کیے گئے ہیں۔

ان کا پہلا اعتراض نزول انجیل کے موضوع پر ہے۔ جس پر قبل ازیں مسلم علما کی طرف سے گفتگو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس ضمن میں بعض پادری صاحبان کے نزول انجیل کے انکار سے وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام کا ابن اللہ ہونا تو ایک طرف رہا، ان کی پیغمبرانہ حیثیت ہی مشکوک ہو جاتی ہے؛

"اگر صاحبان مذکورہ (پادری عمادالدین، پادری اسکاٹ، پادری ویری) کا یہ عقیدہ درست ہے کہ حضرت مسیح پر کوئی کلمہ یا کلام ربانی نازل نہیں ہوا تو بدون نزول کلام الہی حضرت مسیح کو کن معنوں سے پیغمبر قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر کے معنی پیغام رساں کے ہیں جائے غور ہے کہ جب بقول آپ کے بزرگ پادریوں کے حضرت مسیح پر کلام الہی کا نزول ہوا ہی نہیں پھر حضرت مسیح کیوں کر پیغمبر ثابت ہو سکتے ہیں"[2]۔

اس کے جواب میں مسیحی مناظر کو یہ مانے بنا چارہ نہ رہا کہ " مین حضرت مسیح پر انجیل کا نزول مانتا ہوں"۔

اعتراف کا نتیجہ مؤلف کی اس طلب کی شکل میں نکلا،

"پادری احمد مسیح صاحب کی زبان مبارک سے منکرین کلام الہی کے حق میں فتویٰ سننے کا منتظر ہوں"[3]۔

دوسرا اعتراض تدوین انجیل، تیسرا مصنفین اناجیل کے ملہم ہونے جب کہ اس کے تتمہ کی ہی شکل میں چوتھا اعتراض ان ملہمین کے بارے متضاد مسیحی عقیدہ پر تھا۔ مثلاً

"پادری فانڈر صاحب نے اپنی میزان الحق مطبوعہ ۱۸۲۸ء کے صفحہ ۱۷۰ سطر ۹ میں لکھا ہے کہ بلا شک وشبہ معلوم و

---

1 الہ دین، شیخ، مباحثہ، (قاسمی پریس، لودیانہ ۱۹۰۸ء)، ص ۲

2 ایضاً، ص ۵

3 ایضاً، ص ٦

یقین ہوتا ہے کہ حواری خدا کے رسول اور پیغمبری کے مرتبہ میں بلکہ اس سے بھی بالاتر ہیں"[1]۔

بعد ازاں پادری عمادی الدین کے اپنے عقیدہ کہ "مرقس اور لوقا کو الہام نہیں ہوا تھا" سے رجوع پر بحث کرتے ہوئے ان کے کمزور موقف پر گرفت کی ہے[2]۔

اعتراض پنجم میں چھ آیات قرآنیہ سے رسالت محمدیہ کا ثبوت دے کر انجیل کے لکھاریوں کی رسولی حیثیت کا سوال کیا گیا[3]۔

چھٹے اعتراض میں بعض انجیلی بیانات کے خلافِ حقیقت ہونے کو واضح کیا گیا ہے اور اس ضمن میں قرآن کا حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ ٹھہرانے اور سیدہ مریم کو اخت ہارون کہنے پر مسیحی معترضین کا مسکت جواب دینے کے لیے انجیل سے بھی استشہاد کیا ہے۔ بعد ازاں قرآن کے مصدق انجیل ہونے پر بحث میں ایک نیا نقطہ نظر سامنے لائے ہیں کہ قرآن مصدق توریت ہے نہ کہ انجیل۔ اس کے ثبوت میں دس قرآنی مقامات نقل کیے ہیں جہاں محض توریت کی تصدیق کا بیان ہے انجیل کا نہیں۔

(سورۃ بقرہ، رکوع ۵؛ ۱۱؛ ۱۲، آل عمران رکوع ۱؛ ۵، سورۃ نساء رکوع ۷، سورۃ مائدہ رکوع ۷، سورۃ فاطر رکوع ۴، سورۃ احقاف، رکوع ۴، سورۃ الصف، رکوع ۱) اور گیارہ ایسے مقامات نقل کیے ہیں جہاں انجیل کا ذکر ہے مگر قرآن کا اس کا مصدق ہونا مذکور نہیں۔ (سورۃ آل عمران رکوع ۱، ۵، ۷؛ سورۃ مائدہ رکوع ۷، ۹، ۱۰، ۱۵؛ سورۃ اعراف رکوع ۱۹؛ سورۃ توبہ رکوع ۴؛ سورۃ فتح رکوع ۴؛ سورۃ حدید رکوع ۴)[4]۔

مؤلف جواب دینے سے قبل مخاطب سے طریق جواب طلب کرتے ہیں جو ان کے اپنے موقف پر یقین محکم اور مدمقابل کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس مباحثہ میں انہوں نے عقلی و نقلی اسلوب اختیار کیا ہے جس کی زبان عامیانہ نہیں۔ ان کی جوابی تقریر سے اس دور کے جذبات کی حدت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ جوش جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو جسے اخلاقیات کے ترازو میں نہ تولا جا سکے۔ اپنی بات کو نپے تلے الفاظ میں پیش کرنا اور جذبات کو دلائل پر حاوی نہ ہونے دینا مصنف کا خاصہ ہے۔ ان کا انداز یہ ہے کہ فریق مخالف کو مدافعانہ طریق اپنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً ص، ۷، ۲۷، ۳۱ وغیرہ

اس مختصر تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو مخاطب کے لٹریچر کے ساتھ ساتھ مناظرے کی اونچ نیچ پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔

---

1 الہ دین، شیخ مباحثہ، ص ۹

2 ایضاً، ص ۱۱

3 ایضاً، ص ۱۴۔ ۲۲

4 ایضاً، ص ۲۸

مولانا ثناء اللہ امر تسری مناظرہ الہ آباد

مطبع ثنائی امر تسر، طبع اول ۱۹۳۴ء

صفحات: ۲۴

یہ رسالہ اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو مولانا امر تسری اور پادری عبد الحق کے مابین " مسئلہ توحید و تثلیث " کے موضوع پر ۴، ۱۵گست ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا۔ عیسائی مناظر مولانا کی گرفتوں سے اس قدر بوکھلا گیا کہ خود ہی کہہ دیا کہ " ہم الوہیت مسیح کے قائل نہیں [1] "

مولوی سید حمید الدین الہ آبادی جواب باصواب [2]

مطبع جلالی الہ آباد، طبع اول ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء

یہ حکایت کے پیرایہ میں مناظرہ ہے۔ اور اس میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل قوم ارازیل سے، دوسری فصل مسلمان اور عیسائیوں سے جب کہ تیسری فصل ہندوؤں کا عیسائیوں سے تقابل پر مشتمل ہے۔

مولوی سید حمید الدین الہ آبادی کیفیت المنطق (قلمی) [3]

یہ رسالہ مناظرہ اہل کتاب میں ہے۔

حیدر علی قریشی سیف المسلمین (قلمی) [4]

۱۲۷۰ھ صفحات: ۱۰۸

سوال و جواب کی شکل میں عیسویت اور اسلام کا مناظرہ ہے۔

مولوی رحمت اللہ پھولجھڑی [5]

(مرتب) مولوی وزیر الدین

طبع ۱۲۹۱ھ

یہ کتاب اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو مولانا رحمت اللہ (کیرانوی) ، ڈاکٹر وزیر علی اور پادری فرنچ اور پادری لئی

---

1 عراقی، عبد الرشید، تذکرۃ ابوالوفا، (ندوۃ المحدثین، گوجرانوالہ، ۱۹۸۴ء) ، ص ۳۰

2 ماہنامہ " محدث " بنارس، ج ۲۵، ش ۷، ص ۲۰

3 ایضاً، ص ۲۱

4 قاموس الکتب، ص ۸۰۶

5 ماہنامہ " محدث " بنارس، ج ۲۵، ش ۷، ص ۲۱

کے درمیان ہوا تھا۔

مولوی سلیم اللہ　　　اظہار الاسلام

مطبع فیض، بریلی طبع اول ۱۸۷۴ء

صفحات: ۹۸

اس میں وہ مناظرہ درج ہے جو مولوی صاحب موصوف اور الطاف مسیح سے رائے بریلی میں ہوا۔ جس پر وہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مولانا شرف الحق دہلوی　　　مناظرہ پونہ موسومہ براہین الہدیہ المعروف مباحثہ پونہ

اکمل المطابع، دہلی بار اول ۱۸۹۳ء

صفحات: ۲۰

پادری جی اسال اور مولانا شرف الحق کے باہمی مناظرہ کی روئیداد ہے۔

مولانا شرف الحق　　　مناظرہ حیدر آباد دکن، مناظرہ کالکاہ، مناظرہ غازی پور

طریق الحیات[1]

امیر المطابع آگرہ، ۱۸۵۳ء

صفحات: ۱۲۴

یہ اسلام وعیسویت پر مناظرہ ہے۔

مولانا سید عبد الباری سہسوانی　　　فتح المبین علی اعداء الدین

مطبع ایجوکیشن پریس، آگرہ طبع ۱۲۹۴ھ

یہ کتاب اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو مولانا سہسوانی اور پادریوں کے درمیان ہوا تھا۔

---

1 قاموس الکتاب، ص ۸۱۱

سید عبداللہ (مرتب)   مباحثہ مذہبی

مطبع منعمیہ، اکبر آباد آگرہ، ۱۲۷۱

صفحات: ۱۲۶

یہ مناظرہ الکبری ۱۸۵۴ء کے بعد ڈاکٹر وزیر علی خاں اور پادری فینڈر صاحب کے درمیان ہونے والا تحریری مناظرہ ہے جس میں طرفین کے درمیان ۱۵ مئی تا ۱۶ اگست ۱۸۵۴ء کو تحریف بائبل کے عمومی موضوع پر ہونے والی خط و کتابت ہے۔ اسلامیہ کالج، پشاور کی لائبریری میں اس کا نسخہ موجود ہے۔

عتیق الرحمن بہاری (مرتب)   روداد مناظرہ مسیحیت و اسلام

مطبع اسرار کریمی، الہ آباد طبع اول ۱۳۵۳ھ

صفحات: ۱۱۱

یہ اس مناظرہ کی مکمل رپورٹ ہے جو مولانا ثناء اللہ امرتسری اور پادری عبدالحق پروفیسر کرسچین کالج، سہارن پور کے درمیان یکم اگست سے چار اگست ۱۹۳۴ء کو پرشوتم داس الہ آباد میں ہوا تھا۔ اس رپورٹ میں فریقین کے سوال و جواب من و عن درج ہیں۔

مولوی محمد قاسم صاحب   مباحثہ شاہجہان پور[1]

مکتبہ دارالتبلیغ، دیوبند ۱۸۹۱ء

صفحات: ۴۲

یہ رسالہ مولانا اور پادری لونس کے مابین اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو میلہ خدا شناسی شاہجہان پور میں ہوئی تھی۔ اسی کی ایک اشاعت مناظرہ عجیبیہ، مطبع گلزار ابراہیم، مراد آباد سے ہوئی۔ جب کہ ایک اشاعت دارالاشاعت، کراچی ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۲۰ بھی ہے۔

---

1 قاموس الکتب، ص ۸۳۷

سید فتح علی بخاری   تصدیق الاسلام مباحثہ نصاری

سید فتح بخاری   تصدق اسلام مباحثہ نصاری

لائٹ پریس، بنارس ۱۲۸۷ھ

صفحات: ۳۰

محمد مبین شاہجہان پوری   تائید آسمانی فی تذکرۃ روحانی[1]

یہ اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو پادری رجب علی اور طالب علم محمد علی کے مابین ہوا، یہ اخبار منشور محمدی میں شائع ہوا تھا۔

مرزا موحد جالندھری   رسالہ ہائیکورٹ آسمانی[2]

مطبع رضوی دہلی

یہ رسالہ ایک مسلمان اور عیسائی کے جھگڑے کی روئیداد ہے۔ جھگڑا اس امر میں تھا کہ استثناء کی یہ بشارت کس کے لیے ہے۔

(خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے بھائیوں ہی میں سے میری مانند ایک نبی تیرے لیے برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔۔۔ میں ان کے بھائیوں کے درمیان سے تیری طرح ایک نبی برپا کردوں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ (استثناء ۱۸: ۱۵۔۱۸)

چودھری مولیٰ بخش کان پوری   مراسلات مذہبی مع ضمیمہ[3]

مطبع نامی پریس، کانپور طبع اول ۱۸۸۸ء

صفحات: ۶۴۸

دو حصوں میں یہ کتاب تحریری مباحثہ پر مشتمل ہے جو چودھری مولی بخش کانپوری اور این اے وائفورڈ ہیڈ ماسٹر کرسچین کالج جرنیل گنج کانپور کے مابین ہوا۔ اصل موضوع بحث "نزول و کتابت قرآن" تھا۔ مصنف لکھتے ہیں:

---

1 "محدث" بنارس، ج ۲۵، ش ۹۔۱۰، ص ۶۰

2 ایضاً، ص ۲۰

3 قاموس الکتب، ص ۸۲۴

" میں نے اس مناظرے کے دو حصے کیے ہیں حصہ اول میں نزول و کتابت قرآن کی بحث ہے۔ یعنی پادری صاحب کا سوال اور میرا جواب اور اس کے ضمیمہ میں اثبات نبوت حضرت محمد ﷺ پر بحث ہے اور یہی ان کے سوال کا جواب ہے۔ دوسرے حصے میں میرا سوال اور ان کا جواب ہے۔ ضمناً پادری صفدر علی کا مضمون اور پادری آئی فیلڈ بریو کی نکتہ چینیوں پر جرح کرکے اس کو بھی ملحق کردیا گیا ہے۔

نعمان خاں وکیل   رسالہ ہفت جلسہ[1]

مطبع صبح صادق، سیتاپور

یہ رسالہ اس مباحثہ کی روئیداد ہے جو پادری کموہن اور منشی صاحب کے درمیان ہوا تھا۔

حافظ ولی اللہ لاہوری   مباحثہ دینی

یہ کتاب اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو حافظ ولی اللہ اور پادری عمادالدین کے مابین شہر امرتسر ۱۸۶۷ء میں ہوا تھا۔

مولانا محمد یوسف شمس فیض آبادی   پادری صاحب کا اظہار ندامت

مطبع برکات الہ آباد، طبع اول ۱۹۳۶

اس مناظرہ کی روئیداد ہے جو انجمن محمدیہ اشاعت الاسلام۔ الہ آباد کے ساتویں جلسہ منعقدہ ۱۶۔۱۷ جون ۱۹۳۶ میں پادری بشیر اور یہ مولانا یوسف شمس کے درمیان ہوا تھا۔

مناظرہ شہر مرزاپور

جواہر اسیر پریس، بنارس

---

1 قاموس الکتب، ص ۸۴۷

باب پنجم

برصغیر کے تفسیری ادب

پر

مسلم مسیحی کشمکش کے اثرات

فصل اول

مسلم تفسیری ادب

پر

ایجابی اثرات و تردیدی رجحانات

فصل اول

مسلم تفسیری ادب پر ایجابی اثرات وتردیدی رجحانات

برصغیر میں مسلم مسیحی کشمکش کے اثرات نے تمام شعبہ ہائے حیات پر اپنے نقوش ثبت کیے توطبعاً یہاں کا تفسیری ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ برصغیر میں اٹھارویں صدی میں مسیحی تبشیری گروہوں کی طرف سے کی جانے والی منظم کاوشوں کے نتیجہ میں عہد نامہ جدید کا مقامی زبانوں میں تراجم کا سلسلہ سامنے آیا۔ سات صدیوں سے حکمران مسلم گروہ کی عدم دلچسپی کی وجہ سے اس وقت تک سرکاری زبان فارسی کے سوا قرآن مجید کے مقامی زبانوں میں تراجم کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ مجہول الاسم مترجمین کی طرف سے کردہ ابتدائی تراجم النادر کالمعدوم کے زمرے میں آتے ہیں۔ جن میں اواخر گیارھویں یا اوائل بارھویں صدی ہجری کی دکنی زبان میں تیسویں پارے کی تفسیر حسینی، ماقبل ۱۱۰۹ھ کا تیسویں پارے کا گجراتی ترجمہ اور ہندی / اردو زبان میں قاضی مراد اللہ سنبھلی کا ۱۱۸۵ھ کا تیسویں پارے کا ترجمہ شامل ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے اخلاف کی طرف سے تراجم قرآنی کا ایک تحریک کی صورت میں سامنے آنا عہد نامہ جدید کے ہندوستانی / اردو زبان میں ترجمہ کے بعد ہی ہے۔ معروف برمن اسکالر این میری شمل (م ۲۰۰۳ء) نے شاہ رفیع الدین (۱۷۵۰ء۔ ۱۸۱۸ء) اور شاہ عبد القادر (۱۷۵۳ء۔ ۱۸۱۴ء) کے تراجم قرآنی کو جنوبی ہند میں ڈینش مشن سے تعلق رکھنے والے ڈنمارک کے بنجمن شلز ے Benjamin Schultze (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۶۰ء) کے کردہ ترجمہ تورات وانجیل کا اثر گردانا ہے[1]۔ پادری صاحب نے ۱۷۲۷ء میں عہد نامہ جدید اور ۱۷۳۲ء میں عہد نامہ قدیم کا تلگو زبان میں ترجمہ کیا جو شائع نہ ہو سکا۔ اس نے دکنی اردو میں بھی عہد نامہ جدید اور داؤد کے گیتوں [زبور] تک عہد نامہ قدیم کا ترجمہ کیا، جو ۱۷۴۹ء اور ۱۷۵۸ء کے درمیان شائع ہوئے[2]۔

جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے، برصغیر کا مسیحی لٹریچر صرف یہاں کے مقامی مسیحی اہل قلم کی کاوشوں پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کا غالب حصہ مغربی مستشرقین کی تحریریں ہیں، جنہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) (۱) وہ مستشرقین جو بذات خود ہندوستان آئے۔ ان میں اکثریت کسی مشنری گروہ کے ساتھ کلیسیائی تنظیمی خدمات بجالانے کے لیے یہاں رہی اور انہوں نے مقامی احوال وظروف کو مد نظر رکھ کر کتابیں لکھیں۔

(۲) وہ مستشرقین جو سوچ اور فکر کے لحاظ سے تو مشنری ہی تھے لیکن یہاں کلیسیائی نظم کی بجائے انہوں

---

1 بحوالہ: Birisik, Abdulhamit, Oryantalist misyonerler ve kuran , p80

2 قریشی، سلیم الدین، اٹھارویں صدی کی اردو مطبوعات، ص ۱۹

نے انگریز حکومت کے کارندوں کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں، جن میں سرفہرست سر ولیم میور، جرمن نژاد الائیس اسپرنگر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

(ب) بعض مستشرقین جو ہندوستان تو نہیں آئے لیکن تبشیری مقاصد کے لیے ان کی تحریروں کا ترجمہ اردو اور مقامی زبانوں میں پیش کیا گیا۔

ہر دو قسم کی ان مغربی تحریروں کا اسلوب، اصول نقد اور معیار فکر دیسی پادریوں کے پیش کردہ لٹریچر سے کہیں بالاتر تھا اور ان کے برصغیر کی مسلم فکر پر تنظیمی اور نظریاتی لحاظ سے بہت گہرے اور کثیر جہتی اثرات مرتب ہوئے اور جدید فکری رجحانات سامنے آئے۔ ایک امر قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہاں کے مسیحی لٹریچر کے لب لہجہ میں واضح تبدیلی در آئی اور سیاسی فاتحین کا رویہ مزید درشت ہو گیا۔ جس میں مقامی دیسی پادریوں کی زبان زیادہ دشنام آمیز ہو گئی حتی کہ دریدہ دہنی کی حدوں کو چھونے لگی۔ اُس دور میں مغرب میں عقل پرستی کے تحت اثرات اپنی جگہ مسلم ہیں، لیکن یہاں صرف زیر بحث موضوع برصغیر میں قرآنی و تفسیری ادب پر مشنریز اور مستشرقین کے ایجابی اثرات و تردیدی رجحانات کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

برصغیر میں مذکورہ مسیحی لٹریچر کے نتائج کے اعتبار سے مختلف گروہوں پر مختلف اثرات مرتب ہوئے۔ اس ضمن میں قرآنیات کے باب میں بھی اہم ترین ایجابی اثرات و تردیدی رجحانات سامنے آئے، جس میں مقامی پادریوں کی تحریروں کی نسبت بدیسی تحریروں کا کردار زیادہ ہے

۔ تعقل پرست متجددین مفسرین پر ایجابی اثرات مرتب ہوئے۔

۔ راسخ العقیدہ مفسرین کا ردعمل پر مبنی تردیدی رویہ سامنے آیا۔

۔ ان دونوں کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیروکاروں کی انگریز کاشتہ گردانی جانے والی احمدی جماعت کی طرف سے بھی قرآنیات سمیت تردید مسیحیت میں قابل ذکر لٹریچر سامنے آیا۔ بانی جماعت مرزا صاحب نے کوئی مستقل تفسیر قرآن تو نہیں لکھی، لیکن نبوت، حضرت عیسیٰؑ کے بارے قرآنی آیات کی مخصوص تشریحات و تأویلات پیش کیں۔ (مرزا صاحب نے اپنے دعاوی کے استدلالات کے علاوہ صرف مسیحؑ کے متعلق آیات پر ہی ارتکاز کرتے ہوئے ان کی مخصوص تشریح و تفسیر کی ہے) اس جماعت نے نظریاتی کشمکش کا جداگانہ محاذ قائم کر لیا۔ اس سے برصغیر میں پہلے سے جاری نظریاتی پیکار دوچند ہو گئی اور راسخ العقیدہ علماء نے عیسائی مشنریوں کے جواب کے ساتھ ساتھ اس گروہ کی انحرافی تاویلات کی تردید میں بھی قلم اٹھایا۔ (یہ موضوع ہمارے دائرہ تحقیق سے باہر ہے)

مشنریز اور مستشرقین کے ایجابی اثرات کا حامل تفسیری ادب

مذکورہ گروہوں میں سے تعقل پرست متجدد گروہ نے مسیحی، خصوصاً بدیسی لٹریچر کا اپنی ذہنی ساخت کے ساتھ مطالعہ کیا اور اور روایت پرست علماء سے مختلف فیہ نتیجہ پر پہنچا۔ ان میں سے بعض معتبر ارباب عقل و خرد نے اسلاف کی روش سے ہٹ کر ان تنقیدات کو پرکھنے کی سعی کی اور مطلق عقل کی روشنی میں سترھویں، اٹھارویں صدی عیسوی میں پروان چڑھے نئے مغربی علم الکلام پر مبنی نقدِ قرآن کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی تو قدیم تفسیری ادب میں کلامی مباحث کو ان تنقیدات کے مقابل ہیچ محسوس کیا۔ جدید سائنسی مباحث کی روشنی میں مابعد الطبعیات اور بعض غیر حسی معاملات کا ثبوت ڈھونڈنا چاہا۔ جس کا ایجابی اثر دور از کار تاویلات، تشکیک زدہ تشریحات یا پھر بعض مسلمات سے ہی انکار کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ اثرات یکساں نہیں بلکہ نتائج کے اعتبار سے فرداً فرداً مختلف فیہ ہیں۔

(الف) "قرآن مجید کلام الہیٰ ہے"۔ یہ آغاز اسلام سے ہی امت محمدیہ میں اجماع کی حد تک قبول کیا جانے والا عقیدہ ہے۔ عہد مذکورہ میں برصغیر میں ایک گروہ نے مشنریز و مستشرقین کی تنقید کے نتیجہ میں اپنا نظریہ قرآن ہی تبدیل کرتے ہوئے فکری نیازِ جبین ان کی چوکھٹ پر جھکا دی اور اپنی محدود عقلی استطاعت کی روشنی میں مغربی نقد سے متاثر ہو کر قرآن کو کلام الہی کی بجائے" کلام رسول "قرار دے دیا۔ یہ دراصل پادری فانڈر صاحب کی طرف سے مسلمانوں کو دیئے گئے مشورہ کا براہ راست نتیجہ ہے۔ پادری صاحب نے کہا تھا:

> " اگر اہل اسلام یوں کہنے پر راضی ہوں کہ قرآن کو حضرت محمد صاحب نے الہام سے خود تصنیف کیا اور جبرائیل نے ان کو نہیں لکھوایا تو ان کی دلیل زیادہ مضبوط ہو[1] "۔

اس مشورے کو من و عن قبول کر لینا اس گروہ کے غیر متصلبانہ ایمان، افلاس فکرِ سلیم، اور سب سے بڑھ کر علمی احساس کہتری کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ حضرات پادری صاحب کے دام تزویر میں بآسانی پھنس گئے۔ مسیحی اہل قلم کو بخوبی ادراک تھا کہ مسلمان اسلامی وحی کو مسیحی تصور الہام سے بہت مختلف اور انسانی خیالات کے آمیزش سے پاک ہونے کی بنا پر بلند تر گردانتے ہیں۔ چنانچہ مسلم نظریہ وحی اور مسیحی تصور الہام کو ایک ہی سطح پر لانے کے لیے اس مشورہ سے نوازا گیا۔ یہ مسلم گروہ پس پردہ اس مقصد کو نہ بھانپ سکا۔ ان میں نمایاں ترین نام جناب نیاز فتح پوری صاحب کا ہے، جنہوں نے سینٹ کلیئر ٹسڈل کی نقد قرآن پر "Sources of Quran" کا ترجمہ "ماخذ القرآن" کے عنوان سے اپنی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالہ " نگار" میں اردو قارئین کے لیے شائع کیا[2]۔ دیگر کی نسبت نیاز صاحب نے بغیر لفظی الجھاؤ کے بانگ دہل، اپنا نظریہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

---

1 فانڈر، میزان الحق، ص ۳۴۶

2 ماہنامہ " نگار" لکھنؤ، جنوری۔ فروری ۱۹۴۵ء، (خصوصی اشاعت) نیاز فتح پوری صاحب نے فروری ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے

"کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ پر اس سے قبل کئی مفصل گفتگو کر چکا ہوں"[1]۔

نیز

"الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انہیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے تو اس پر بہت سے شبہات وارد ہوتے ہیں"[2]۔

نیاز صاحب کے ہم خیال دوسرے لوگ باوجود یہی نظریہ رکھنے کے اتنی جرأت سے علی الاعلان یہ دعویٰ نہیں کر سکے۔ مثلاً پادری عمادالدین کی تردید میں قلم اٹھانے والے مولوی چراغ علی کے متعلق پروفیسر دوست محمد اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ "سیرت النبوی اور مستشرقین۔ علمی اور تنقیدی جائزہ" میں رقم طراز ہیں؛

" مولوی چراغ علی نے نادانستہ قرآن کریم کو کلام الٰہی کی بجائے کلام محمد ﷺ قرار دیا"[3]۔

وحی کے بارے اسی طرح کے مختلف فیہ نظریات ڈاکٹر فضل الرحمن (م ۱۹۸۸ء) نے اپنی کتاب "اسلام" (Islam) میں پیش کیے ہیں۔

(ب) دوسرے گروہ پر ایجابی اثرات اتنے شدید تو نہ ہوئے کہ وہ قرآن مجید کو کلام الٰہی کی بجائے کلام رسول قرار دے، لیکن تنقید کے نتیجہ میں کلام اللہ کی نبوی تفسیر و تشریح سے اخذ کرنے میں پس و پیش کا اظہار کرنے لگا

نگار کا اجراء کیا تھا جو پھر لکھنؤ اور مئی ۱۹۶۲ء میں ان کی وفات کے بعد کراچی سے شائع ہونے لگا۔

1 فتح پوری، نیاز، من و یزداں، (فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۰۷

2 نیاز، من و یزداں، ص ۳۱۶۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ نیاز صاحب نے اپنے رسالہ " نگار" میں اپنائی جانے والی روش پر معذرت نامہ بھی شائع کیا تھا لیکن اس میں کہیں بھی اپنے عقائد سے رجوع کی بات نہیں کرتے۔ اپنے معذرت نامہ میں رقم طراز ہیں؛ "رسالہ 'نگار' میں اس وقت تک اسلامی علوم و تعلیم شعار مذہبی و اعمال اللہ تعالیٰ جل شانہ و حضرات انبیاء کرام علیہم السلام و اصحاب اہل بیت رسالت مآب صلعم و دیگر بزرگان دین و آئمہ دین و علمائے سلف کے متعلق جو مضامین میرے یا دیگر مقالہ نگاروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں ان کو میں اپنے خیال سے اسلام کی خدمت سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منفعل ہوں۔ اس لیے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان تمام امور سے باز آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات نہ شائع ہوں گے جن سے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو۔ مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہنچا اور یقین دلانے کے لیے میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں"۔ [نگار، (جنوری ۱۹۳۲ء)، ص ۱۴۲]

3 دوست محمد، سیرت النبوی اور مستشرقین علمی اور تنقیدی جائزہ، (پی ایچ ڈی مقالہ، یونیورسٹی آف پشاور ۲۰۰۰ء، غیر مطبوع)، ص ۲۳۶

اور بعض مسلمہ اعتقادات و نظریات کو اپنی عقل کی روشنی میں کردہ تاویلات کی بھینٹ چڑھادیا۔ اس میں سرفہرست سرسید کا نام لیا جاتا ہے جن کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ان کے راسخ العقیدگی سے مطلق تعقلیت پرستی کے سفر پر بھرپور مسیحی پروپیگنڈہ کی تاثیر بھی تھی[1]۔ ان کی معجزات، ملائکہ، ابلیس، حشر نشر، میزان، جنت، دوزخ اور نسخ قرآن کے انکار پر مبنی تاویلات، وحی، اعجاز القرآن، جبر و قدر، اور بعض احکام قرآنیہ کی غیر مقبول تفسیر و تشریحات پر مستشرقین اور مشنریز کے اثرات نمایاں ہیں۔ اُن کی "تفسیر القرآن" کے تذکرہ میں ان تفسیری آراء کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ بعد میں آنے والے مفسرین و مصنفین میں سے مولوی محمد علی لاہوری (امیر انجمن احمدیہ اشاعت اسلام)، خواجہ احمد الدین امر تسری، خلیفہ عبدالحکیم پٹیالوی، اور غلام احمد پرویز کو سرسید کے ان افکار سے متاثر گردانا جاسکتا ہے[2]۔

مستشرقین اور مشنریز کے اثرات میں عموماً سب سے اہم "انکار حدیث" اور "تحریک اہل قرآن" کو شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے تحلیلی تجزیہ میں غیر متصلبانہ ایمان، تعقل پرستی، جدیدیت کا خبط، حریت فکر کا شاخسانہ، راسخ العقیدگی کا رد عمل، مغربی تنقید کی نفوذ پذیری، فکری مرعوبیت، ذہنی مغلوبیت، نفسانی خواہشات، احکامات پر عمل اور پابندی سے فرار یا کوئی بھی دیگر عنصر سامنے آئے لیکن یہاں ایک عمومی رائے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جس میں اس کی سرپرستی کے ڈانڈے ہندوستان کی انگریز سرکار اور عیسائی پادریوں سے ملائے جاتے ہیں، جنھوں نے اپنے مقاصد کے تحت انہیں استعمال کیا۔ منکرین حدیث کے سرخیل مولوی عبداللہ چکڑالوی کے متعلق یہ الزام سامنے آیا کہ

> "اب انہوں نے خود حدیث کو غیر معتبر ٹھہرانے کے لیے چند مسلمان منافقین کو خرید لیا۔ ان کے سرخیل عبداللہ چکڑالوی تھے۔ ان کو عیسائیوں نے اس خدمت کے لیے چنا اور انہوں نے اعلانیہ حدیث کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کیا۔ انگریز پادریوں نے اس کو چٹھیاں لکھیں، مالی مدد کے وعدے کیے اور ان سے کہا کہ آپ ایک نہایت اچھا کام کر رہے ہیں"[3]۔

مستشرقین سے اخذ کردہ منکرین حدیث کی فکری راہنمائی کو یوں واضح کیا گیا ہے؛

> "ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی تسلط نے جب حکومتی رنگ اختیار کیا تو مسلمانان برصغیر نے جنگ آزادی کے میدان میں آخری مذبوحی حرکات کا مظاہرہ کیا، لیکن ناکام رہے۔ میدان جنگ کی شکست نے ذہنی مرعوبیت کی راہ دکھلائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مستشرقین نے اپنے خاص مقاصد کی خاطر جو علمی تحاریک شروع کی تھیں، ان کے پس منظر، پیش منظر کا تنقیدی جائزہ لیے بغیر بعض افراد (منکرین حدیث) نے انہیں قبول کر لیا اور پھر ان کے اگلے ہوئے نوالے نئی فکر،

---

1 Birisik, Abdulhamit, Oryantalist misyonerler ve kuran, p123

2 سہ ماہی "فکر و نظر" اسلام آباد، ج ۴۱، ش ۳، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۴ء (محمد ارشد، برصغیر میں تفسیر قرآن کا کلامی اسلوب)، ص ۲۰

3 ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، (حجیت حدیث نمبر)، ج ۷، ش ۲۸۔۲۹، ۱۷ تا ۲۴ فروری ۱۹۵۶ء، ص ۶۵

نئ تحقیق، نئ علمی کاوش اور قومی خدمت کے نام سے پیش کرنے شروع کر دیے۔ انھی میں سے شاخت اور گولڈ زیہر وغیرہ کے یہ فکری شاخسانے تھے جن کو ایسے ذہنی مریضوں نے اپنی فکری پرواز اور علمی اڑان کے لیے سہارا بنالیا۔ حالانکہ یہ ذہنی مرعوبیت کے شاہکار ہونے کے علاوہ کوئی نئ علمی فکری کاوش نہ تھی"[1]۔

انکار حدیث کی اس ہندوستانی تحریک کی تاریخ، علمی و فکری کارنامے، اس کی منفی یا مثبت خدمات خارج از موضوع ہیں۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ اسلام اور قرآن پر غیر مسلموں اور مسیحی مشنریز کے کردہ اعتراضات کے جوابات اور دفاع قرآن کا فریضہ ادا کرنے کی بجائے تحریک اہل قرآن کے لٹریچر کا غالب رویہ، علماء اسلام کے بارے طنز و تمسخر، تضحیک واستہزاء، تذلیل و تضلیل، تحقیر و توہین، اور ان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ پر مبنی رہا[2]۔ اور "خدمت قرآن" کے حوالے سے سامنے آنے والی تحریک کا غیر مسلموں کے مقابل حصہ، راسخ العقیدہ علماء کی "دفاع قرآن" کے محاذ پر کردہ کاوشوں کے سامنے معدودے چند ہے۔ اگر یہ فریق برصغیر کے مسیحی تنقیدی لٹریچر کے جواب میں اپنے اصولوں پر دفاع اسلام و قرآن پر قلم اٹھاتا تو یقیناً ایک متنوع قسم کا لٹریچر سامنے آتا، جو ایک مثبت خدمت کا سبب بنتا اور یہ علماء کی تقویت کا باعث بھی ہوتا۔ لیکن اس کی بجائے وہ انہی علماء کو جھٹلانے اور ان کے خلاف سرگرم عمل ہو گئے جس سے مشنریز کی بالواسطہ تائید ہوئی اور بہت سی سوالیہ آراء اٹھنے لگیں۔ مثلاً

یہ کیسی خدمت تھی جس پر علماء یہود ہوں یا احبار و رہبان عیسائیت، علمبرداران کفر ہوں یا پشتیبانان الحاد، فلاسفہ زندقہ ہوں یا

---

1 ہفت روزہ" اہل حدیث" لاہور۔ (خدمات اہل حدیث نمبر)، ج ۲۸، ش ۳۹، ۱۰۔۱۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء، (ڈاکٹر خالد ظفر اللہ، اہل حدیث کی خدمات حدیث اور منکرین حدیث)، ص ۲۱۳

2 برصغیر میں اداراتی حیثیت سے غلام احمد پرویز صاحب کے قائم کردہ ادارہ" طلوع اسلام" کا نام سر فہرست ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر افتخار احمد بلخی صاحب رقم طراز ہیں:"(مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف) اس 'جہاد اکبر' کے لیے، اس ادارے نے جو اسلحہ فراہم کر رکھا ہے وہ ذاتی پرخاش، آتش حسد، گندگیاں اچھالنے کی فن کاری، تضلیل و تحقیر اور تضحیک و استہزاء، کذب و افتراء، اتہام و دشنام طرازی اور اقتدار وقت کو اکسا کر جبر و تشدد پر آمادہ کرنے کی سعی جیسے" قرآنی حربے" ہیں"۔ [افتخار احمد بلخی، فتنہ انکار حدیث کا منظر و پس منظر، (کفایت اکیڈمی، کراچی ۲۰۰۴ء)، ج ۳، ص ۱۷] ؛ اسی طرح ڈاکٹر محمد دین قاسمی صاحب سربراہ ادارہ پرویز صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:" لیکن بعد میں جب اس" مفکرِ قرآن" اور " مفکرِ کتاب اللہ" کی کذب بافیاں اور دروغ گوئیاں، فریب کاریاں اور دھوکہ بازیاں، خیانت کاریاں اور مغالطہ انگیزیاں، تضاد بیانیاں اور تناقض کلامیاں مجھ پر عیاں اور بے نقاب ہوئیں تو ان کے اخلاص اور نیک نیتی کا تاثر یکسر زائل ہو گیا۔ پھر ان اخلاقی رذائل کے علاوہ جب ان کی دشنام طرازیاں، ان کی بھرپور درشت بیانیوں کے ساتھ میرے سامنے آئیں تو ان کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہو گئی"۔ [حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی، جناب غلام احمد پرویز کی (خود ساختہ) عجمی سازش پر ایک نظر، (کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۹]

دانشوران دہریت، وہ سب راضی اور خوش ہو کر " مفکر قرآن " کو خراج تحسین اور گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں؟[1]

حقیقت یہ ہے کہ حدیث نبوی تفسیر قرآن کریم کا لازمی جزو اور ایک بنیادی ماخذ ہے کیوں کہ یہ قرآنی بیان کے اجمال کی تفصیل، مشکل کی تفسیر، ابہام کا ایضاح، مخفی کا اظہار، عموم کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کے لیے ابلاغ قرآن کی ذمہ داری منصب رسالت کے مساوی ٹھہرائی يَـٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (المائدة ۵ : ٦٧) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے؛

" پھر کس طرح ممکن ہے کہ شارح قرآن کی حیثیت سے آپ ﷺ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے اور آپ ؐ کے پہنچائے ہوئے الفاظ قرآن کو لے کر آپ ﷺ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے "[2]

نیز نبی اکرم ﷺ کو تبلیغ کے ساتھ ساتھ تبیین قرآن کا بھی حکم دیا ہے۔ " لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ " (النحل ۱۶ : ۴۴) کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تفسیر و تشریح و توضیح قرآن بھی شامل ہے۔ فہم قرآن کے لیے جب سنت خود صحابہ کرام کی لازمی ضرورت ٹھہری تو آج اس سے کیسے بے اعتنائی برتی جا سکتی ہے۔ حدیث و سنت کی غیر موجودگی میں تفسیر و توضیح قرآن، امت میں تفریق و انتشار اور نشان منزل کی گمشدگی نیز مغالطات پر مبنی ہر دور میں کئی نئی راہیں کھولنے کا موجب بن سکتی ہے۔

" بدون سنت صحابہ کا کئی ایک مقام پر فہم قرآن میں بے بس رہنا کوئی مخفی نہیں ہے جو کہ اہل زبان اور معلم انسانیت کے شاگرد تھے۔ جب کہ آج قحط الرجال کے دور میں عجمی اور علمی طور پر یتیم چند اردو / عربی، انگریزی / عربی ڈکشنریوں کی مدد سے فہم قرآن کے مدعی بنے بیٹھے ہیں "[3]۔

فہم قرآن کے لیے سنت کی اسی ضرورت کے پیش نظر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ (۱۵۰ھ / ۷۶۵ء) نے فرمایا؛

" لو لا السنة ما فهم احد منا القرآن "[4]

تفسیری روایت میں امت مسلمہ کا تعامل بھی اسی پر رہا ہے۔ چنانچہ تیرہ صدیوں کا تفسیری ادب، خواہ تفسیر بالرائے ہی کیوں نہ ہو، تفسیر بالحدیث کی اس مسلم روایت سے مستغنی ہونے کا اظہار نہیں کر سکا۔ دوسری طرف تقابل ادیان کے حوالے سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے برعکس دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے پاس کسی الہامی کتاب کی خود صاحب کتاب کی کردہ تفسیر و توضیح قطعاً مفقود ہے۔ مسلمانوں کے اس باعث فخر سرمایہ کے مقابلہ میں

---

1 قاسمی، محمد دین، ڈاکٹر پروفیسر حافظ، ولادت عیسیٰ اور منکرین حدیث، (بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۶ء) ص ۲۴۳

2 مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، سنت کی آئینی حیثیت، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء) ص ۲

3 " ہفت روزہ " اہل حدیث " (حوالہ سابقہ)، ص ۲۰۵-۲۰۶

4 شعرانی، الامام، المیزان الکبریٰ، ص ۵۸

اپنی تہی دامنی کو تسلیم کرنے کی بجائے انہوں نے مسلم تفسیر بالحدیث کے اصول کو معرض بحث میں ڈالنا چاہا کہ یہ قرآن فہمی میں رُکاوٹ ہے۔ ایسا عمداً کیا گیا کیوں کہ قرآن و صاحب قرآن کے باہمی تعلق و ربط کو پیچھے دھکیل کر، قرآنی تفسیر کو بائبل کی تفسیر کی مانند تاریخ، شخصی رائے اور کمزور روایات کے تحت لانا مقصود تھا۔ اسی کی دوسری فرع مسلمانوں کو سابقہ کتب سماوی کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی دعوت تھی، لیکن وہ، انہیں کتب محرفہ گردانے کے سبب، اس کے لیے تیار نہ تھے۔ اس مسلم روش کے بارے پادری جے علی بخش ان الفاظ میں شکوہ کناں ہیں؛

"قرآن کی تشریح و تفسیر میں کتب سماوی کو نظر انداز کر کے احادیث سے مدد طلب کی گئی اور اس غلطی کو سرسید احمد خاں اور مولوی عبداللہ چکڑالوی اور دیگر علمائے اسلام نے طشت از بام کر دیا۔ احادیث کی الجھن میں پڑ کر اہل اسلام قرآن کا حقیقی مطلب سمجھنے سے قاصر رہے"[1]۔

اس ہندوستانی مسیحی مفسر کی رائے کو ارباب منکرین حدیث نے حرفاً حرفاً قبول کیا جسے ان کی پیش کردہ فکر میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

انکار حدیث کا مسلم تفسیری ادب پر ایک اثر (احمدی جماعت سے ہٹ کر) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے قرآنی بیانات کی تشریح و تفسیر کرنے والی صحیح بلکہ متواتر احادیث مبارکہ کے انکار کی صورت میں نکلا۔ حضرت عیسیٰ کی بن باپ پیدائش، تکلم فی المہد، معجزات مسیحؑ اور رفع الی السماء کے بارے احادیث کی روشنی میں قائم کیے جانے والے جمہور مسلم عقیدہ کے برعکس تفسیری آراء پیش کی جانے لگیں، جس میں ان کی معجزاتی ہستی کی نفی کی گئی۔ لیکن واضح رہے کہ ان کی تفسیری آراء اس بارے مسیحی روایات سے بھی میل نہیں کھاتی۔ ان کی طرف سے تاریخی شہادتوں، مستند ذریعہ ابلاغ یا عصری انکشافات کی بجائے محض ظن و تخمین، قیاسی شواہد اور لفاظی کے بل بوتے پر اپنے موقف کو منوانے کی کوشش کی گئی۔

انکار حدیث کی سوچ پر مبنی دو نمائندہ تفاسیر "تفسیر بیان للناس" از خواجہ احمد الدین امرتسری اور "مطالب الفرقان" از غلام احمد پرویز سے ان کی فکر عیاں ہو جاتی ہے۔ ان دونوں تفاسیر میں ولادت، معجزات اور رفع مسیحؑ جیسے اہم موضوعات کے متعلق نظریات سے ان کی فکری نہج کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

ولادت مسیحؑ

ولادت مسیحؑ کے بارے جمہور امت مسلمہ کی قرآنی بیان کی کردہ تفسیر کی بجائے خواجہ احمد الدین امرتسری صاحب اس بات کے مدعی ہیں کہ؛

---

1 جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، ص ۲

"مسیحؑ بلاشبہ باپ سے پیدا ہوئے تھے۔۔۔ قرآن مجید میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ولد ہونا تسلیم کیا گیا ہے"[1]۔

غلام احمد پرویز صاحب خواجہ صاحب کی ہم نوائی میں رقم طراز ہیں؛

" عیسائیوں کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ آپ کی پیدائش بن باپ کے ہوئی تھی اور یہی عقیدہ مسلمانوں میں بھی رائج چلا آرہا ہے۔ لیکن عیسائیوں کے ہاں شروع میں یہ عقیدہ نہیں تھا۔ یہ بعد کی اختراع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیکل کو چھوڑنے کے بعد حضرت مریم نے اپنے ہاں کے ایک شخص سے شادی کی تھی جس کا نام یوسف تھا اور بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ چنانچہ اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ کو بالتصریح یوسف نجار کا بیٹا کہا گیا"[2]۔

" قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ حضرت عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اس کے برعکس اس نے اس عقیدہ کی تردید ایسے جامع انداز میں کی ہے جس کی روشنی میں اس کے متعلق کہنے کی ضرورت نہیں رہتی"[3]۔

معجزاتِ مسیح

خواجہ صاحب سورۃ المائدہ کے پندرہویں رکوع میں مذکور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کی تشریح یوں کرتے ہیں؛

"اے عیسیٰؑ مریم کے (جنے ہوئے) بیٹے میری نعمت کو یاد کر۔۔۔ تو (اس طرح سے) مہد (یعنی بچپن) میں اور کہولت کے وقت (یعنی اپنی ادھیڑ عمر میں) لوگوں سے باتیں کرتا تھا۔ (نیک بچے چھوٹی عمر میں ہی نیکی کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کہولت کی عمر پا کر فوت ہوئے شیوخت تک نہیں پہنچے)۔ اور جب کہ میں نے تجھ کو دیگر کتابیں اور حکمتیں (امثال وغیرہ) اور (خاص کر تورات اور انجیل سکھائی (اور تجھ کو بھی وحی کی) اور (تو ایسی مدد پا کر آئندہ کے لیے بھی اپنی تکمیل کرتا تھا) جب کہ تو اپنی طین سے (کیونکہ انسان طین سے ہی پیدا ہوتا آیا ہے) میرے اذن (وقاعدہ) کے مطابق ایسی کیفیت پیدا کرتا تھا جو اڑنے کی حالت کے مانند ہوتی تھی۔ (یعنی پہلے تجھ میں اڑنے کی استعداد جیسی پیدا ہو جاتی تھی۔ تمام بشروں کے آئندہ ترقیات کرنے کا بھی یہی قاعدہ رہا ہے۔) پھر تو اس (تیار شدہ کیفیت) میں (شوق و محبت الہٰی کو) کو نفخ کرتا تھا تو (خود) اڑنے والا بن جاتا تھا۔ (اور اگر اذن الٰہی ہوتا تو تو دوسرے لوگوں کی بھی اسی طرح سے تکمیل کرتا اور انہیں ادنیٰ سے اعلیٰ

---

1 احمد الدین، بیان للناس، (دوست ایسوسی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۹ء)، ج ۱، ص ۴۳۵۔ بیان للناس میں ص ۴۳۵ تا ۴۶۲ پر حضرت عیسیٰؑ کے بارے قرآنی بیان پر بحث کی گئی ہے۔

2 پرویز، غلام احمد، مطالب الفرقان، (ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۸۱ء)، ج ۳، ص ۸۸۔۸۹۔ تفسیر کی نسبت پرویز صاحب اپنی تصنیف " شعلہ مستور" میں تفصیلاً حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بحث کرتے ہیں۔" میں نے حضرت عیسیٰؑ کے کوائف حیات، قرآن کریم، کتب اناجیل، اور عیسائی مؤرخوں کی تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں بڑی شرح وبسط سے مرتب کر کے اپنی کتاب " شعلہ مستور" میں شائع کیے ہیں۔۔۔ جو حضرات زیادہ تفصیل سے رکھتے ہوں وہ " شعلہ مستور" کا مطالعہ فرمالیں"۔ (مطالب الفرقان، ص ۸۸)

3 ایضاً، ص ۹۲

بنانا چاہتا تھا) اور تو میرے اذن کے مطابق مادرزاد اندھوں اور سفید داغ والوں کو(جنہیں لوگ جماعت میں آنے نہیں دیتے تھے۔ انکے خیالی عیبوں سے) پاک ٹھہراتا تھا اور جب کہ تو ان مردوں کو(ان کی غفلتوں سے) میرے اذن کے مطابق نکالتا تھا (لیکن جو لوگ مردہ رہنے کو پسند کرتے تھے تو تو انہیں میرے قاعدے کے مطابق ہی نہیں سنا سکتا تھا۔ کیونکہ رسول ایسے مردوں کو نہیں سنایا کرتے۔ ان کا زندہ کرنا تو علیحدہ رہا) اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا۔ جب کہ تو ان کے پاس بینات لے کے آیا(وہ چاہتے تھے کہ تجھے قتل کر ڈالیں لیکن میں نے تجھے ان سے بچایا ۔ پھر اخیر میں انہوں نے کوشش کی کہ تجھے صلیب پر مار دیں۔ میں نے تجھ کو اپنی حکمتوں سے صلیبی موت سے بھی نجات دی۔ تو پہلے بینات لے کر آیا تھا) سو کافروں نے (ان بینات کے متعلق) کہا کہ نہیں ہے یہ (تعلیم) مگر صریح دھوکا(رسول کریم کفار کو کہتے تھے کہ تم موت کے بعد مبعوث ہوتے ہو تو کافر اس تعلیم کے متعلق کہا کرتے تھے)۔ ان ھذا الا سحر مبین"[1]۔

جب کہ پرویز صاحب معجزات مسیح کے بارے یہی بات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں؛

" اگر معجزات سے مراد خلاف فطرت واقعات کا ظہور میں لانا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے (ظہورِ معجزات سے) اپنے عظیم اصولوں کو توڑا بھی(یعنی اس اصول کو کہ وہ اپنے قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا) تو اس سے حاصل کیا ہوا؟(مثلاً اگر) حضرت عیسیٰ نے سچ مچ مٹی کی چڑیا کو اڑا کر دکھا دیا، اندھوں کو بینائی عطا کر دی، جذامیوں کو ہاتھ پھیر کر اچھا کر دیا، حتی کہ لوگوں کے سامنے مُردوں کو زندہ کر دیا تو اس سے ہوا کیا؟ ان لوگوں میں سے کوئی حضرت عیسیٰ پر ایمان نہ لایا، نہ ہی ان کی مخالفت میں کوئی فرق آیا۔ حتی کہ انہوں نے (یہودیوں کے اعتراف اور اعلان کے مطابق) حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا اگر حضرت عیسیٰ نے ایسا کچھ سچ مچ کر کے دکھایا ہوتا تو کیا اس کا نتیجہ یہی نکلتا؟۔۔۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عیسیٰ ایسے ایسے محیر العقول معجزات دکھائیں اور یہودی ویسے کے ویسے ان کے دشمن اور جان کے لاگو رہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ " معجزات " ویسے نہیں تھے جیسے عام طور پر سمجھا جاتا تھا"[2]۔

"یہ حقیقت کہ کتب اناجیل میں جو " واقعات " بطور معجزات بیان ہوئے ہیں وہ فی الحقیقت واقعہ شدہ امور نہیں تھے بلکہ حضرت عیسیٰ نے جو کچھ تمثیلات کی زبان اور استعارات کے رنگ میں سمجھایا تھا ،انہیں بعد کے سوانح نگاروں (متبعین اناجیل) نے سچ مچ کے واقعات کی شکل میں پیش کر دیا۔ اب خود دنیائے عیسائیت میں مرکز تحقیق و توجہ بن رہی ہے(کذا) حال ہی (۱۹۷۷ء) کوائف حضرت مسیح سے متعلق ایک اہم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے : Jesus An Historians Review of the Gospels اور اس کے مصنف ہیں تاریخ عیسائیت کے بڑے نامور عالم Michael Grant انہوں نے اپنی کتاب میں حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کردہ معجزات کی حقیقت پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے ۔ وہ لکھتا ہے؛" اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ خود حضرت عیسیٰ ان " معجزات " کو محض تمثیلات

---

1 خواجہ احمد الدین، تفسیر بیان للناس، ج ۲، ص ۹۱

2 پرویز، مطالب الفرقان، ج ۳، ص ۱۰۹ ۔ ۱۱۰

سمجھتے تھے"[1]۔

وفات مسیح

وفات مسیح کے متعلق واضح الفاظ میں خواجہ احمد الدین امر تسری لکھتے ہیں؛

" ان (سورۃ آل عمران کے ابتدائی نو) رکوعوں میں تیسری بحث وفات مسیح علیہ السلام کے متعلق ہے۔ پیٹ سے نکل کر بچہ اور جوان ہو کر کہولت کی عمر پانے والا مسیح شیوخت کی عمر پانے سے پہلے یقیناً فوت ہو چکا ہے۔ وہ اس دنیا کا مادی کھانا کھاتا اور آسمان پر نہیں بازاروں میں چلتا تھا وہ ایسا جسد نہیں تھا جو دوسرے لوگوں کی طرح مادی کھانا نہ کھاتا ہو۔ ایسے کھانے کے نتائج اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے وہ اپنی موت تک غریبوں کو زکوۃ دیتا تھا وہ فوت ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور پہنچ چکا۔ اس سے سوال جواب بھی ہو چکے اس نے کہا کہ جب تک میں ان لوگوں میں تھا میں نے اپنی بندگی کا ہی اظہار کیا میرے بعد، اے خدا! تو ہی ان کے حال کو جانتا ہے۔ مجھے بعد کے حالات کا کچھ علم نہیں وغیرہ وغیرہ "[2]۔

رفع مسیح

پرویز صاحب وفات مسیح اور رفع الی السماء کے بارے یوں گویا ہیں؛

"سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح قرآن مجید میں کہیں نہیں کہا گیا کہ حضرت مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اسی طرح اس میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اب قیامت کے نزدیک آسمان سے نازل ہوں گے۔ ہم نے یہ دونوں عقیدے عیسائیوں سے مستعار لیے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ عیسائیوں نے کسی سازش کے تحت ان عقائد کو ہماری کتب روایات میں داخل کر دیا اور اس طرح وہ ہمارے ہاں متواتر چلے آرہے ہیں"[3]۔

" ان تصریحات کی رو سے اللہ تعالی نے حضرت عیسیٰ کے متعلق جو کہا ہے کہ ورافعک الیّ (۳/۵۴) بل رفعہ اللہ الیہ (۴/۵۸) تو اس سے مراد یہ نہیں کہ خدا انہیں اٹھا کر اپنی طرف (آسمان پر لے گیا) اس کے معنی واضح ہیں یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مرے۔ اس کی تردید میں اللہ تعالی نے کہا کہ وما قتلوہ وما صلبوہ (۴/۱۵۷) ان کا دعویٰ ہی سرے سے غلط ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب دے کر لعنتی کی موت مار دیا۔ وہ نہ ان کے ہاتھوں صلیب دئے گئے نہ لعنتی موت مرے۔ خدا نے انہیں اپنے ہاں بلند مدارج عطا کئے"[4]۔

یہاں ان تفسیری آراء کا علمی جائزہ مقصود نہیں بلکہ محض یہ سامنے لانا ہے کہ سلف کی روش ترک کرتے ہوئے

---

1 خواجہ احمد الدین، تفسیر بیان للناس، ص ۱۲۴

2 ایضاً، ص ۴۴۸

3 پرویز، مطالب الفرقان، ص ۱۲۱

4 ایضاً، ص ۱۲۸

اور حدیث نبوی کو چھوڑ کر خود ساختہ اصولوں پر کی گئی تفسیر قرآنی مطالب سے کتنا بُعد رکھتی ہے۔ اور اس ضمن میں مسیحی دعوت کو من وعن قبول کرنے کے کیا نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔

پرویز صاحب کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے بارے مروجہ عقائد دراصل عیسائیوں سے مسلمانوں میں در آئے تھے

"عیسائیوں کے ہاں عقیدہ تھا کہ (۱) حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ (۲) وہ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ اور (۳) قیامت کے قریب دوبارہ نازل ہوں گے۔ ان میں سے کوئی عقیدہ بھی قرآن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے بھی روایات وضع کیں جن میں ان عقائد کو حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا اور پھر ان روایات نے ہماری کتب احادیث میں جا پالی۔ اس طرح یہ عیسائیوں کے عقائد ہی نہ رہے خود مسلمانوں کے عقائد بھی بن گئے"[1]۔

پرویز صاحب نے یہ دعویٰ تو کر دیا کہ یہ عقائد مسلمانوں میں مسیحیت سے لیے گئے ہیں لیکن حقائق اس معاملہ میں ان کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے۔ بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ انہوں نے خود ان نظریات کو نیاز صاحب سے مستعار لیا ہے جن کی نہج فکر میں پادری فانڈر کے الفاظ روح رواں تھے۔

پرویز صاحب کے ولادت، معجزات اور رفع عیسیٰؑ کے بارے مذکورہ نظریات سے نیاز صاحب کی آراء کو متصل کر کے دیکھا جائے تو دونوں اصحاب کے نظریات میں مکمل ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ جیسے ولادت مسیحؑ پر نیاز صاحب ان الفاظ میں اپنا مافی الضمیر واضح کرتے ہیں؛

"کلام مجید کی کسی جگہ اس کا اظہار نہیں کیا گیا کہ آپ کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی تھی۔۔۔"[2]۔

"بہر حال کلام مجید سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ مسیح کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی، اس لیے اب دیکھنا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ انجیل سے بھی مریم اور یوسف کا تعلق ازدواج ظاہر ہو رہا ہے اور اس میں متعدد جگہ یوسف کو مسیح کا باپ ظاہر کیا ہے۔ یہ اعتقاد کہ آپ بن باپ کے پیدا ہوئے کیوں کر پھیل گیا"[3]۔

اسی طرح معجزات مسیح کے بارے رقم طراز ہیں؛

"(سورۃ آل عمران اور سورۃ مائدہ کی) ان آیتوں سے جن معجزات کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں: ۱۔ مٹی کی چڑیا بنا کر حضرت عیسیٰ کا اس کے اندر پھونک مارنا اور اس کا اڑ جانا۔ ۲۔ اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنا۔ ۳۔ غیب کی خبر دینا اس قبیل سے کہ لوگ کیا کھاتے ہیں اور گھروں میں کیا رکھتے ہیں۔ ۵۔ عیسیٰ کی دعا پر آسمان سے دستر خوان کھانے کا نازل ہونا۔۔۔" اناجیل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جہاں جہاں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قصص و حکایات اور امثال و تشبیہات کی صورت میں بیان کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے لٹریچر کی یہی شان تھی۔۔۔ اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگوں کو جو مٹی سے بنے ہو یعنی اپنی پیدائش کے لحاظ

---

1 پرویز، مطالب الفرقان، ص ۸۷

2 نیاز، من ویزداں، ص ۴۵۴

3 ایضاً، ص ۴۶۱

سے بہت حقیر ہو، میں طائر کی سی ہیئت دینے کا عزم کرتا ہوں اور پھر تعلیم الہی دے کر واقعی بلند پرواز اور بلند خیال انسان بناتا ہوں۔ اندھے، کوڑھی اور مردہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی روحیں بیمار اور مردہ ہیں۔ انجیل میں اکثر جگہ بیماروں کو گنہگار مراد لیا گیا ہے۔۔۔ اس لیے اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ میں گناہگاروں سے ان کو چھڑاتا ہوں اور جو روحیں معصیت سے مردہ ہیں ان کو اخلاق کی تعلیم دے کر زندہ کرتا ہوں۔۔۔ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون " یعنی میں تم کو بتاتا ہوں یا سمجھ کرتا ہوں کہ تم کتنا اور کیا کھاتے ہو اور کیا جمع کرتے ہو۔۔۔ اب رہا مائدہ کا آسمان سے نازل ہونا، سو کلام مجید سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مائدہ نازل کیا گیا"[1]۔

جب کہ رفع عیسیٰ کے متعلق یوں گویا ہیں؛

"یوں تو کلام مجید کی مختلف آیتوں سے حضرت عیسیٰ کی وفات اور ان کی طبعی موت ثابت ہوتی ہے لیکن یہاں ہم صرف دو آیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ جن میں نہایت صراحت کے ساتھ اس امر کا اظہار ہے اور جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا " واذ قال اللہ یا عیسی ابن مریم ء انت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ۔۔۔ علی شھید ۔۔۔ آخر کی آیت میں توفیتنی کے معنی سوائے مارنے کے اور کیے ہی نہیں جا سکتے کیونکہ اگر کوئی اور معنی لیے جائیں گے تو مفہوم بالکل غلط ہو جائے گا۔۔۔ یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کلام مجید میں مسیح کی عمر طبعی تک پہنچنے کی پیشین گوئی موجود ہے"[2]۔

مذکورہ بالا منقول عبارات سے صاف عیاں ہے کہ قرآنی بیانات کی ان تشریحات میں خواجہ احمد الدین، پرویز اور نیاز صاحب کی سوچ نہ صرف یکساں بلکہ جمہور مسلم نقطہ نظر سے مختلف فیہ بھی ہے جس میں بظاہر مروجہ مسیحی نظریات سے اختلاف کیا گیا ہے مگر حقیقت میں ٹھوس دلائل کی بجائے محض ناقدین کلیسیا اور ملاحدہ یورپ کی نقالی کی گئی ہے یا پھر ظن و تخمین سے کام چلایا گیا ہے۔ جمہور آراء سے بنیادی اختلاف کے لیے قرآن کریم کے اسلوب بیان میں جس لسانی محاورے اور کلام کے سیاق سباق کو مد نظر رکھنا ضروری تھا اس سے صرف نظر کرتے ہوئے محض لغت کو مد نظر رکھتے ہوئے من پسند معانی کشید کیے گئے ہیں۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی رفع الی السماء میں رفع کے لغوی مجازی معانی لینے پر اظہار خیال فرماتے ہیں؛

" رَفَعَ کے اصلی معانی رفع جسمانی یا رفع مادی ہی کے ہیں۔ الرفع یقال فی الاجسام الموضوعۃ اذا اعلیٰ (راغب) مجازی معنی یعنی رفع مراتب کے بھی جائز ہیں ای رفعہ حیث التشریف (راغب) لیکن حقیقت کو چھوڑ کر مجاز اختیار کرنے کی کوئی وجہ قوی موجود ہونی چاہیے اور وہ یہاں موجود نہیں۔ بعض

1 نیاز، من ویزداں، ص ۴۶۹۔ ۴۷۰

2 ایضاً، ص ۴۶۴۔ ۴۶۵

نادان اور نوخیز فرقوں کا یہ استدلال کہ چونکہ رفع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہے، اس لیے رفع جسمانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا اور اس لیے لامحالہ رفع مجازی یعنی قرب و منزلت ہی مراد ہوگی، قرآن فہمی سے بُعد پر مبنی ہے۔ آخر قرآن مجید ہی میں اس طرح کی آیات موجود ہیں یا نہیں؟ ومن یخرج من بیتیہ مھاجرا الی اللہ، یہاں مہاجرت الی اللہ سے کسی نے مہاجرت الی دار السلام یا مہاجرت الی المدینہ نہیں لی ہے یا پھر قال ابراھیم انی ذاھب الی ربی یہاں کون نہیں سمجھتا کہ ذہاب الی رب سے مراد ذہاب الی الشام مراد ہے وقس علی ھذا۔ امام رازی نے خوب لکھا ہے کہ تعظیم و تشریف کے جس سیاق میں ذکر رفع الی اللہ کا ہے وہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ رفع کوئی امتیازی اور مخصوص چیز ہے متقین اور صالحین کے عام دخول جنت اور وہاں کی لذت جسمانی و حسی سے الگ۔۔[1]

مذکورہ بالا طرز فکر کا ایک اور نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مکمل یا جزوی انکار حدیث کی سوچ نے مسیحیت و یہودیت کے بارے صحیح روایات پر مبنی تفسیر کو بھی رد کر دیا۔ منکرین حدیث میں شامل تمام طبقات نے ان روایات سے ہٹ کر اپنا نظریہ پیش کیا جس میں بعض داخلی طور پر ایک دوسرے سے مختلف فیہ بھی ہیں۔ یوں یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں غلط نہ ہو گا کہ کلام الٰہی کو علی الاعلان کلام رسول کہنے والے ہوں یا احادیث رسول ﷺ کو چھوڑ کر صرف کلام اللہ سے ہی تشریح کرنے کے داعی، دونوں فریق حضرت عیسیٰؑ کے بارے مخصوص نظریات میں ایک ہی سطح پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

اسی طرح قرآنیات کے حوالے سے ایک اہم اثر نسخ قرآن کی نفی کرنا بھی ہے۔ اگرچہ اس کے ڈانڈے معتزلی فکر سے جا ملتے ہیں لیکن برصغیر میں انہی افراد نے نسخ کے مسئلہ کو پوری شدت سے منفی رنگ میں پیش کیا۔

---

1 دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، (تاج کمپنی، لاہور، س ن)، ص ۲۲۹ تحت آیت بل رفعہ اللہ الیہ (النساء: ۱۵۸)

تردیدی رجحانات

برصغیر کے مسیحی لٹریچر کا ایک فوری رد عمل مسلم علماء کے ان کی تردید میں قلم اٹھانے کی صورت میں نکلا، جس میں راسخ العقیدہ علماء کا گروہ متقدم رہا۔ ان علماء نے مسیحیت کی عمومی تردید کے ساتھ ساتھ مسیحی تحریروں کا جواب اپنی کاوشوں کا محور بنائے رکھا۔ جس میں یہاں کے دیسی پادری عموی جبکہ مسلم پس منظر رکھنے والے نومسیحیوں کی تحریریں خصوصاً مد نظر رہیں۔ جس میں سیاسی ماحول اور ان نومسیحیوں کے متعلق جذبات کو نظر انداز کیا جاسکتا نہ ہی ان نومسیحیوں کے غیر محتاط رویہ کو۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا مقامی مسیحی پادریوں اور اہل قلم کی تحریریں اسلوب، اصول تنقید اور معیار فکر میں مستشرقین سے کہیں فروتر تھیں۔ اس کی یہ وجوہات گنوائی جاسکتی ہیں۔

۔ علمی لیاقت

۔ مقامی احوال وظروف کے نتیجہ میں پیدا شدہ جذبات کا دخل

۔ مالی مفاد کی خاطر مخاطب کو خواہ مخواہ سب وشتم کرنا

علمی استعداد کے حوالے سے یہ بات قابل توضیح ہے کہ ان مقامی مسیحی اہل قلم کے دو طبقے ہیں۔

(الف) وہ پادری جن کا خاندانی پس منظر غیر از مسلمین تھا جیسے ماسٹر رام چندر، پادری ہلاسی رام، پادری ٹھاکر داس وغیرہ اگرچہ انہیں علمی شخصیات گردانا جاسکتا ہے لیکن یہ لوگ اسلامی علوم میں کماحقہ درک اور دسترس حاصل نہیں رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں سطحیت اس پر شاہد ہے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر کہ ریاضیات میں ماہر تھے لیکن " تحریف قرآن " میں ان کے غلط استنباط اور اخذ شدہ نتائج مسلم اصول تفسیر سے لاعلمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ سطحیت کی ہی بنا پر مسلم علماء نے انہیں قابل توجہ نہیں سمجھا اور نتیجتاً ان کی تردید مسلم لٹریچر میں کم جگہ پاسکی۔

(ب) وہ پادری صاحبان جن کا پس منظر مسلم تھا اور وہ اسلام چھوڑ کر دائرہ مسیحیت میں داخل ہوئے تھے۔ جیسے پادری عماد الدین، پادری صفدر علی، پادری سلطان محمد پال، پادری احمد شاہ وغیرہ۔ یہ اگرچہ اسلامی علوم میں دسترس رکھتے تھے لیکن اپنی نئی مذہبی شناخت کو مزید پختہ بنانے اور کلیسیا کے مقاصد کے لیے تحت ان کی تحریروں میں تدلیس اور بعض اوقات سوقیانہ پن تک رکاکت پائی جاتی ہے۔ مثلاً پادری عماد الدین کی تحریریں یا پادری احمد شاہ کی امہات المؤمنین اسی عنصر کا مظہر ہے۔

مسلم علماء نے ان تمام تحریروں کا مناسب علمی جواب دیا۔ مسلم مناظراتی ادب میں تردید مسیحیت پر قلم اٹھانے والے علماء کی فہرست طویل ہے لیکن تفسیری ادب کے حوالے سے اس میں مولانا ابوالمنصور دہلوی، مولانا عبد الحق حقانی، مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ مولانا عبد الحق اور مولانا ثناء اللہ کی

تفسیری آراء کا جائزہ اسی باب کی دوسری فصل میں لیا جائے گا جب کہ مولانا ابولنصور دہلوی کی " تبجیل التنزیل " کا جائزہ چوتھے باب میں پیش کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں اس حوالے سے ایک اہم نام مغربی فلسفہ کی رو میں بہہ کر الحاد کے فکری سمندر میں غوطہ زنی کا تجربہ کرنے کے بعد واپس لوٹنے والے مولانا عبد الماجد دریا آبادی کا ہے۔ انہوں نے مغربی فلسفہ کی تردید کے ساتھ ساتھ مسیحی عقائد کا بھرپور تنقیدی جائزہ تفسیر ماجدی میں لیا ہے۔ مثلاً تفسیر ماجدی میں سورۃ بقرۃ کی آیت ۶۲ میں مذکور لفظ نصاریٰ کی تشریح میں وہ مسیحی اور نصاریٰ کی اصطلاح میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے؛

" مسیحی وہ ہیں جو اناجیل اربعہ پر ایمان رکھتے ہیں، مسیح کو خدا کا نبی نہیں، خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ان کے قالب میں حلول کر آیا تھا آخرت میں نجات دینے والا Saviors خدا کو نہیں مسیح" ابن اللہ " کو یقین کرتے ہیں اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابل فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود بھی خدا ہے اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے شرک کے قائلوں کا ذکر ہرگز اس مقام پر مقصود نہیں۔ اسی لیے نام جو بھی مشہور اور چلا ہوا تھا اسے ترک کر کے نصاریٰ لایا گیا۔ نصرانی معرب ہے Nazarene کا حضرت مسیح کے سچے پیرو نبی کو نبی ماننے والے ابتدائی زمانہ میں Nazarenes کہلاتے تھے۔ یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے۔ آگے چل کر یہی لوگ ابیونیہ Ebonite's بھی کہلائے۔ لیکن جب مشرکانہ عقائد کا زور بندھا اور اصل مسیحیت حلولیت اور تثلیث ہی قرار پا گئی تو قدرتاً نصرانیت کا ستارہ بھی گردش میں آیا اور نصرانی و نصرانیت کے الفاظ بجائے عزت و تکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے۔ موجودہ مسیحیت سر تا سر پولوسیت ہے اور تمام تر پولوس طرسوی Paul کی تعلیمات پر مبنی ہے یہ حضرت مسیح کے کچھ ہی روز بعد شروع ہو گئی تھی اور نصرانی اس کے بالکل منکر تھے۔ قرآن مجید میں محل مدح میں ایک موقع پر بھی تثلیثی مسیحیت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ذکر جب کبھی آیا ہے تو ہمیشہ ملامت، بیزاری کے ساتھ "[1]۔

مسلم حلقہ کی طرف سے بار بار جواب دیئے جانے والے بعض قابل بحث امور پر ہی مسیحی حلقہ کے اصرار نے ماحول کو مکدر دیا تھا جس کی وجہ سے تحقیقی اور علمی اسلوب کی نسبت الزامی طریق نے اپنی جگہ ضرورت سے زیادہ بنالی تھی۔ مثلاً مسیحی حلقہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ سے معجزات کے صدور نہ ہونے کے جواب مولانا عبد الماجد دریا آبادی لکھتے ہیں؛

" اپنے اپنے زمانہ کے پیغمبروں اور داعیان حق سے ان کی یہ (معجزات کی) فرمائشیں انوکھی اور ان کا یہ مطالبہ نرالا نہیں جاہلوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اس قسم کی فرمائشیں پیش کی ہیں۔ رسالت محمدی سے حضرات انبیاء میں قریب ترین زمانہ حضرت عیسیٰ کا گذرا ہے۔ آپ عرب میں شام میں تھے، آپ سے بھی تعلیمات اور اصل پیام کو چھوڑ کر تقاضے انہیں آسمانی نشانوں کے ہوتے رہتے تھے۔ " فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لیے اس سے درخواست

---

1 دریا آبادی، تفسیر ماجدی، ص ۲۷

کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشان دکھا (متی ۱۶ : ۱) یہاں تک کہ خود حق تعالیٰ کو لا دکھانے کی فرمائش شروع ہوگئی تھی "فلپس نے اس سے کہا اے خداوند! ہمیں باپ کو دکھا، بس ہمیں کافی ہے" (یوحنا ۱۴ : ۸)[1]

اگرچہ الزامی اسلوب میں دیئے گئے جوابات میں عموماً معقولیت کا فقدان ہوتا ہے۔ مگر اس حوالے سے بھی مسلم علماء متانت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ الزامی اسلوب ایک طرف تو ماحول میں گرما گرمی کا پتہ دیتا ہے اور دوسری طرف مُجیب کی رکاکتِ اعتراض عیاں کرنے کی لیاقت کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

مقامی پادریوں کا زیادہ تر علم الکلام بدیسی پادریوں کا مرہون منت تھا اس لیے تفاسیر میں مغربی تحقیقات نسبتاً زیادہ جگہ پانے لگیں اور بعض معاملات میں ان تفاسیر کے ماخذوں میں مغربی لٹریچر کا معتدبہ حصہ نظر آتا ہے۔ مولانا دریاآبادی بھی اپنی تفسیر میں ان مغربی تحقیقات کو راسخ العقیدہ طبقہ کی تفسیری آراء کے استشہاد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سے قبل سرسید کے ہاں بھی یہی اسلوب پایا جاتا ہے لیکن راسخ العقیدہ تفسیری آراء کے مقابل ان کے تفسیری شذوذ، جو مغربی ناقدین کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ پر مبنی ہیں، بہت زیادہ ہیں۔ مولانا دریاآبادی کے الفاظ میں؛

"بائبل کی تنقید Higher Criticism ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جرمن، فرنچ انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں اور مقالات و مضامین کا تو شمار ہی نہیں۔ پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ انتقادِ متن Textual criticism، انتقاد تاریخی Historical criticism وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں۔ کاش (سر) سید احمد خاں مرحوم (اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے) آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے جس الزام کی صفائی خواہ مخواہ انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھی، اس جرم کا اقبال اب کھلے لفظوں میں وہی لوگ کس کثرت سے کر رہے ہیں"[2]۔

برصغیر کے تفسیری ادب پر ایک عمومی اثر یہ ہوا کہ مسیحی لٹریچر کے جواب میں مسلمان تفہیم قرآن کی طرف زیادہ راغب ہوئے اور ان میں معقولی انداز فکر زیادہ پروان چڑھا۔ اگرچہ شروع شروع میں بعض افراد فکری لغزشوں کا شکار ہوئے لیکن بعد میں مجموعی طور پر نتیجہ تفسیری ادب میں بہتری کی شکل میں نکلا۔ تفسیر ماجدی، تدبر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی، تفہیم القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، معارف القرآن از مفتی مولانا ادریس کاندھلوی اور ضیاء القرآن از پیر کرم شاہ الازہری اس کی مثال ہیں۔

مسیحی علم الکلام کا ایک رد عمل یہ بھی سامنے آیا کہ مسلم علماء کا رخ مسیحی عقائد کے ساتھ ساتھ مختلف مسیحی فرق، کلیسیا، اور اس کے سیاسی و مذہبی غلبہ کی تاریخ اور انجیلی تعلیمات کے اثرات کے بارے تحقیق و تفتیش کی طرف

---

1 دریاآبادی، تفسیر ماجدی، ص ۴۷

2 ایضاً، ص ۳۱

مڑ گیا جو کہ برصغیر کے مسلم تفسیری ادب میں اس سے قبل عنقاء نظر آتا ہے۔ نیز مسلمانوں نے تحریف بائبل پر مرتکز سلف کی عمومی روش سے باہر نکل کر دیگر موضوعات مثلاً تاریخ مسیحیت، کلیسیائی کردار وغیرہ کو بھی زیر بحث لانا شروع کیا۔ جس کا عام مشاہدہ تفہیم القرآن اور تفسیر ماجدی میں کیا جاسکتا ہے۔ مسلم علماء کے اس تردیدی منہج کی کامیابی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب خود معترضین کے حلقوں میں ایسے اعتراضات کو پسندیدہ تصور نہیں کیا جاتا اور لگی بندھی روش ترک کر کے نئے اسلوب میں بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لیے نئے طور طریقے اختیار کیے جانے لگے۔

مسلم علماء کے اس منہج کو ہر لحاظ سے کامیاب تو کہا جاسکتا ہے لیکن اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس کے مطلوبہ نتائج سے صدفی صد متمتع نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ مسیحی علم الکلام کی قوت نہیں بلکہ خود مختلف مسلم حلقوں کا اپنی اپنی مخصوص طرز میں محصور رہنا ہے۔ اگر مسیحی استعمار کی چھتری تلے اسلام کے خلاف چلائی جانے والی مہم نتائج کے اعتبار سے مسلمانوں کو متحد کرنے کا باعث بن جاتی تو یہی بات مائدہ آسمانی سے کم نہ ہوتی۔ یہ بات بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ مسلم علماء نے مسیحی منظم اداروں کا مردانہ وار مقابلہ انفرادی حیثیت میں کیا لیکن باوجود بھرپور وار سہنے کے مسلمان اپنے مخاطب کے تنظیمی ہیئت کے مقابل پھر بھی منظم نہ ہو سکے۔ یہ مذکورہ امر کسی عجوبہ سے کم نہیں جس کی وجوہات کا کھوج لگانا اشد ضروری ہے۔

اپنے مسلم عقیدہ پر بھرپور تیقن کے ساتھ مسیحیت کے بارے ہمہ جہت معلومات حاصل کرنے کا نیا مسلم رویہ مکالمہ بین المذاہب کی جانب اٹھنے والا اہم قدم گنا جاسکتا ہے۔

فصل دوم

منتخب تفاسیر کا جائزہ

تفسیر القرآن الکریم	سر سید احمد خاں
تفسیر فتح المنان	مولانا عبد الحق حقانی
تفسیر ثنائی	مولانا ثناء اللہ امر تسری

فصل دوم

منتخب تفاسیر کا جائزہ

سابقہ اوراق میں لیے گئے جائزہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ برصغیر کے مسیحی لٹریچر کے مسلم تفسیری ادب پر جہاں ایجابی اثرات مرتسم ہوئے وہیں تردید مسیحیت کا رویہ بھی سامنے آیا۔ ان دونوں رویوں کی حامل تفسیری آراء پر مبنی نمائندہ تفاسیر میں سے تین تفاسیر کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ جس سے یہاں کے تفسیری ادب پر ہونے والے ان اثرات کو بخوبی جانچا جاسکتا ہے۔

۱	تفسیر القرآن الکریم از سرسید احمد خاں	ایجابی اثرات کی حامل نمائندہ تفسیر
۲	تفسیر المنان المعروف تفسیر حقانی از مولانا عبدالحق حقانی	غالب منقولی رویہ پر مبنی تردیدی تفسیر
۳	تفسیر ثنائی از مولانا ثناء اللہ امرتسری	معقولی و منقولی رویہ کی حامل تردیدی تفسیر

تفسیر القرآن الکریم سرسید احمد خان (۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء۔۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء)

سید احمد خاں نے ۵ ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ/۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک نجیب الطرفین، مشرقی روایات کے حامل متدیّن اور ذی وجاہت گھرانے میں آنکھ کھولی۔ مذہب کی گود میں ہوش سنبھالنے اور خالص مشرقی انداز میں پرورش پانے والے سید احمد خاں نے انگریز حکومت کی ملازمت، جدید مغربی علوم و تہذیب کی اشاعت و ترویج اور ان کے حصول میں مسلمانان ہند کی بقا کے لیے پُر خلوص و انتھک کاوشوں کے بعد ایک متنازع مصلح کا مقام حاصل کرتے ہوئے، ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ/۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا[1]۔

آپ نے مروجہ تعلیم معروف اساتذہ، جن میں نبیرہ شاہ ولی اللہ سید محمد اسحاق شاہ (م ۱۲۶۲ھ) خصوصاً قابل ذکر ہیں، سے حاصل کی۔ ۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر کچہری میں ملازمت کرلی اور ملازمت کا یہ سفر ۱۸۷۶ء میں جج سمال کورٹ پر منتج ہوا[2]۔

"عقیدہ حجاز سے لو اور علم و تہذیب و تمدن مغرب سے" کے داعی سرسید کے نظریات سے کلی اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاست، اخلاقیات اور تعلیم کے میدان میں نہایت اہم انقلابی اقدامات (علی گڑھ کالج، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، سائنٹیفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، مذہبی، سیاسی و اخلاقی

---

1 حالی، حیات جاوید، ج ۱، ص ۸۷، ۳۳۳

2 ایضاً

تحریروں) کی وجہ سے آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے۔ شخصی اوصاف، قائدانہ صلاحیتوں اور مُصلح کے حوالے سے آپ کے بارے کہا گیا ہے؛

" جو اوصاف وفضائل و محاسن ایک ریفارمر، ایک لیڈر اور ایک مصلح قوم میں ہونے چاہیں وہ قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ سرسید کو عطا کئے تھے۔ اولوالعزمی وبلند حوصلگی، ہمت وجرات، بہادری وشجاع، مستقل مزاجی وخود اعتمادی، دلیری وبے خوفی وخود اعتمادی، دلیری وبے خوفی، سچائی وراست بازی، ہمدردی ومحبت، غیرت وحمیت، عقل وفہم، دانائی و دوراندیشی، تدبیر وتدبر، انتظام وقابلیت، خوش اخلاقی ملنساری،، وقار ومتانت، رعب داب اثر ورسوخ، قدر دانی و حوصلہ افزائی، محنت وجفاکشی، فراخ حوصلگی وعالی ہمتی، رواداری وبے تعصبی واخلاق حسنہ جن کا ایک لیڈر میں پایا جانا ضروری ہے وہ سب کے سب سرسید کے وجود میں پورے طور پر پائے جاتے تھے۔اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ سرسید پیدائشی لیڈر تھے یا خلاق مطلق نے ان کو لیڈری ہی کے لیے پیدا کیا تھا تو شاید بے جا نہ ہوگا۔"[1]

آپ کے مقام ومرتبہ، ملی خدمات، سیاسی ومذہبی نظریات سے قطع نظر موضوع برصغیر میں مسلم مسیحی کشمکش کے آپ کی تفسیر القرآن پر اثرات ہے۔ محمد رضی الاسلام اس تفسیر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

" ملک کی باگ دوڑ انگریزوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کے بعد ان کی سرپرستی میں عیسائی مشنریاں بہت زیادہ سرگرم ہو گئیں اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پیہم کوشش کرنے لگیں۔ اسلام ان کی راہ میں مزاحم بنتا تھا اس لیے انھوں نے اسلامی عقائد، مصادر اور اساسیات پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔اور عیسائی پادری مسلم علماء کو مناظروں کا چیلنج دینے لگے۔۔۔ان نازک حالات میں سرسید کی غیرت وحمیت نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے سرگرم ہوں انہوں نے منصوبہ بنایا کہ ایک طرف دشمنان اسلام کے حملوں کا جواب دیا جائے تو دوسری طرف اسلامی عقائد واساسیات پر مسلم عوام اور خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا ایمان بحال کیا جائے[2]۔(جس کے ارتداد کا بہت زیادہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا)۔ تفسیر قرآن کی تالیف ان کے اسی منصوبہ کا ایک حصہ تھا۔اس کے ذریعے وہ عیسائی پادریوں اور دیگر معترضین کے ان اعتراضات کا جواب دینا چاہتے تھے جو وہ قرآن میں مذکور بعض واقعات اور اس کی تعلیمات پر کرتے تھے "[3]۔

---

1 پانی پتی، محمد اسماعیل، شیخ، سرسید احمد خاں (شخصیات نمبر) (ماہنامہ نقوش، لاہور، س ن) ج ۲، ص ۱۳۸۳

2 تفسیر القرآن میں سرسید کے مخاطب یہی جدید تعلیم یافتہ طبقہ تھا اور آپ نے اس تفسیر کو کبھی عوامی بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دفعہ ایک عالم سرسید کے پاس آئے اور آپ کی یہ تفسیر القرآن دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ سرسید نے ان سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا ﷺ کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا؟ انہوں نے کہا: الحمدللہ۔ پھر کہا آپ حشر نشر اور عذاب وثواب اور بہشت ودوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہوں گے؟ انہوں نے کہا: الحمدللہ، سرسید نے کہا: بس تو میری تفسیر آپ کے لیے نہیں ہے وہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو مذکورہ بالا عقائد پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا ان پر معترض یا ان میں متردد ہیں۔(حالی، حیات جاوید، ج ۲، ص ۴۰۸)

3 صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، ص ۶۴

اس تجزیہ کی تصویب حالی کے اس بیان سے ہوتی ہے؛

" میں ایسے متعدد نوجوانوں سے واقف ہوں جنہوں نے انگریزی تعلیم پانے کے زمانے میں مذہب کو بالکل خیر آباد کہہ دیا تھا اور بعضوں نے عیسائی ہونے کا ارادہ ٹھان لیا تھا، اور ایسے تو بے شمار تھے جن کا ایک قدم لامذہبی کی طرف اٹھتا تھا تو دوسرا قدم مذہب کی طرف سے پیچھے ہٹ جاتا تھا مگر جب سے سرسید مرحوم کی تحریریں شائع ہونی شروع ہوئیں اس وقت سے جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ رخنہ تقریباً بالکل بند ہو گیا ہے۔ بعض مسلمان نوجوانوں نے اخباروں میں بذریعہ تحریر کے اور بعضوں نے پبلک لیکچروں میں اور بعضوں نے اپنے دوستوں سے زبانی بیان کیا کہ: اگر سید صاحب کی تحریریں ہماری نظر سے نہ گذرتیں تو ہم اسلام سے منحرف ہو جاتے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہی مقصد سرسید کا تفسیر القرآن لکھنے سے تھا"[1]۔

تعقلیت کے خوگر سرسید نے معترضین اور متشککین کے لیے اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ، میں قرآنی آیات اور قوانین فطرت کی موافقت پر مبنی بلا ترتیب متفرق آیات کی تفسیر لکھنا شروع کی۔ یکم رمضان ۱۲۹۳ھ کو پہلی بار تہذیب الاخلاق بند ہوا تو آپ نے ۱۸۷۷ء کے آس پاس ترتیب وار تفسیر لکھنے کا آغاز کیا۔ سورۃ بنی اسرائیل تک ڈیوٹی بک ڈپو (علی گرھ کالج کی ڈیوٹی سوسائٹی کے مکتبہ) کی طرف سے اس کی سات جلدوں کی اشاعت یوں ہوئی۔

جلد اول	سورۃ فاتحہ تا سورۃ بقرۃ	طبع ۱۸۸۰ء	صفحات ۳۴۲
جلد دوم	سورۃ آل عمران تا سورۃ مائدۃ	طبع ۱۸۸۲ء	صفحات ۱۶۷
جلد سوم	سورۃ انعام تا سورۃ اعراف	طبع ۱۸۸۵ء	صفحات ۲۲۸
جلد چہارم	سورۃ انفال تا سورۃ یونس	طبع ۱۸۸۸ء	صفحات ۱۵۰
جلد پنجم	سورۃ ہود تا سورۃ نحل	طبع ۱۸۹۲ء	صفحات ۱۳۴
جلد ششم	سورۃ بنی اسرائیل	طبع ۱۸۹۵ء	صفحات ۱۴۷
جلد ہفتم	سورۃ الکہف، مریم اور سورۃ طہ	طبع ۱۹۰۴ء	صفحات ۱۶۹

ابتدائی چھ جلدیں ان کی حین حیات زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ساتویں جلد کا مسودہ ان کی وفات کے بعد کاغذات سے ملا تھا[2]۔ تفسیر کا طریق کار یہ تھا کہ پہلے سورۃ کا متن، نیچے ترجمہ لکھا جاتا اور پھر تفسیر بیان کی جاتی۔ تحریر فی اصول التفسیر، جسے مقدمہ تفسیر کہا جا سکتا ہے، میں پندرہ اصول تفسیر بیان کیے گئے ہیں۔

---

1 شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر، ص ۴۲۵۔۴۲۶

2 صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، ص ۱۸۔۱۹ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور کے مقالہ نگار کو سہو ہوا ہے کہ ساتویں جلد سورۃ انبیاء کا بھی احاطہ کرتی ہے)

تمام تفسیر اس اصول کی روشنی میں کی گئی ہے کہ؛

کلام الہیٰ Word of God اور فعل الہیٰ Work of God ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ فطرت Nature فعل الہیٰ ہے اور قرآن مجید کلام الہیٰ Word of God چنانچہ فطرت اور کلام الہیٰ ایک دوسرے سے قطعی ہم آہنگ ہیں۔

دراصل سرسید کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں الہامی مانی جاتی ہیں ان میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائق موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدن اور حسن معاشرت کی مانع[1]۔

سرسید کا عہد برصغیر کے مسلمانوں کے بہت پر آشوب اور فکری، سیاسی اور تہذیبی انحطاط کا دور تھا جب کہ مغرب علمی و تہذیبی سیادت کی امامت کا داعی تھا۔ اور ان کے ہاں عقل پرستی اور سائنسی انکشافات کی روشنی میں یہ باور کروایا جانے لگا تھا کہ قرآن اس دور کے تقاضے نبھانے سے قاصر ہے۔ چونکہ سائنسی علمی ترقی اور سیاسی تفوق ہر دو لحاظ سے مسیحی اس دور کے سرخیل تھے، اس لیے سائنسی انکشافات کی روشنی میں سابقہ تفسیری آراء پر اعتراضات کو عملاً مسیحی حملہ ہی متصور کیا جانے لگا۔ ان اعتراضات کا دفعیہ ایک حساس امر تھا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عصری سائنسی انکشافات کے بارے مسلمانوں کا اطلاعاتی ذریعہ، ثانوی اور کسی حد تک اس وقت کے سیاسی کارپردازوں کا مرہون منت تھا جنہیں برصغیر میں مغربی عینک سے ہی پیش کیا جاتا۔ نتیجتاً علمی پسماندگی کے شکار مسلمان انہیں خود پرکھ کر قبول یا رد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اس کا ایک اثر یہاں کے تفسیری ادب پر بھی پڑا، جس کی مثال سرسید کی تفسیر قرآن ہے۔ دفاع قرآن کے جذبہ سے سرشار سرسید کا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے دور میں ہونے والی نامکمل سائنسی تحقیق کو حتمی تصور کر لیا۔ چنانچہ سرسید کی تفسیری کاوشیں اپنی تشریحی، تعبیری اور تاویلی لحاظ سے علماء میں ہدف تنقید، جب کہ پُرجوش مسلمانوں میں اضطراری کیفیت کا باعث بن گئیں۔

اس رائے سے حتی الوسع اختلاف کی گنجائش موجود ہے کہ سرسید دراصل مستشرقین، مشنریز و عقلیت زدہ طبقہ کے سامنے اسلام کی نقائص سے پاک تصویر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس میں یہ سوچ کارفرما تھی کہ نقد و تشکیک زدہ امور کی توضیح و تصحیح پر زور دینے کی بجائے ان امور سے دستبرداری میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ بحیثیت مجموعی دین اسلام کے اصولی مسلمات باقی رہتے ہوں۔ مثلاً ممکن ہے کہ سرسید کے خیال میں ہو کہ معجزات کی عدم موجودگی میں بھی اسلام بحیثیت دین اپنی تعلیمات کی حقانیت کے بل بوتے انسانیت کی رہنمائی کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور اس سے دین اسلام میں نقص وارد نہیں آتا۔ چنانچہ معترضین کے جواب میں معجزات کا ہی انکار کر دیا جائے تو قرآن سے ایک اعتراض کم ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بھی اہم پہلو یہ ہے کہ شاید لاشعوری طور پر سرسید کے ذہن میں عیسائیت

---

1 صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، ص ۷

کا یہ پہلو ہو کہ اکثر مسیحی مذہبی دعووں کی تمام تر بنیاد معجزات مسیح پر ہے جب کہ اسلام اپنی صداقت کے لیے معجزات کا محتاج نہیں۔ یوں وہ مسیحی مشنریز پر ان کے الفاظ میں اسلام کی فوقیت پیش کرنا چاہتے ہوں۔

اسی طرح انجیل میں مذکور بعض تصورات قرآن میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً فرشتے، جبرائیل، جہنم، جنت وغیرہ۔ قرآن میں مذکور ان اصطلاحات کے مترادفات بائبلی ادب میں بھی موجود ہیں۔ عیسائی فضلاء نے مادی تعبیر کی بجائے ایسی اصطلاحات کے مجازی، استعاری، اشاراتی یا روحانی معانی مراد لیے ہیں۔ برصغیر میں مسلم مسیحی کشمکش کا تفسیر پر براہ راست اثر سب سے پہلے سر سید کی تفسیر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جنہوں نے ان قرآنی اصطلاحات کے مسیحی طرز تفسیر پر مادی معانی کی بجائے استعاری یا روحانی معانی مراد لئے ہیں۔

سر سید نے جمہور مفسرین کی آراء و تعبیرات سے ہٹ کر ابلیس و جنات کے خارجی وجود اور معجزات و کرامات کا انکار[1] کیا اور بعض مسلّمات مثلاً حشر نشر، حساب کتاب، جنت دوزخ کی حقیقت اور حوض کوثر کی تاویل مجاز، استعارہ و تمثیل کی شکل میں کی[2]۔ نبوت، وحی و نزول وحی، اعجاز القرآن، مسئلہ جبر و قدر، خیر و شر، جہاد و غزوات، کفار سے دوستی، تعدّد ازدواج اور جزیہ وغیرہ پر اس انداز میں بحث و تحقیق کا اسلوب اختیار کیا کہ اس دور کے عقلیت پرست گروہ بالخصوص مغربی مستشرقین کی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے۔ اسے اعتزال جدید سے موسوم کیا گیا[3]۔

اس تفسیر پر مختلف مسلم حلقوں کی طرف سے سخت تنقید و مخالفت کی گئی[4]۔ بلاشبہ ان معترضہ مقامات و مسلّمات کی تشریح و تعبیر میں سر سید نے مفسرین کرام اور محققین اسلام کے اجتماعی شعور و عقل کے مقابل ذاتی فہم و عقل

---

1 سر سید احمد خاں، تفسیر القرآن مع اصول تفسیر، (لاہور ۱۹۹۵ء)، ص ۱۱۳۔۱۱۹، ۱۰۷۵، ۱۰۳۱، ۱۱۴۱، ۱۱۶۰، ۱۱۹۷، ۱۲۰۱

2 ایضاً، مثلاً ص ۲۲۵۔۲۲۶ (حشر نشر)، ۲۲۹۔۲۳۱ (حساب کتاب و میزان)، ۱۰۴۔۱۱۰ (جنت و دوزخ)، ۱۳۷ (حوض کوثر)، ۹۲۔۹۳ (وحی)، ۹۵، ۱۰۵۰ (اعجاز القرآن)، ۸۰، ۸۲ (جبر و قدر و خیر و شر)، ۳۰۹۔۳۱۲ (غزوات و جہاد)، ۳۹۴ (دوستی کفار)، ۴۵۷۔۴۶۵ (تعدد ازدواج)، ۸۸۸۔۸۹۰ (جزیہ) وغیرہ

3 ملاحظہ ہو: محمد ارشد، برصغیر میں تفسیر قرآن کا کلامی اسلوب، ص ۱۸۔۲۰ (بہر حال "تفسیر القرآن" میں سر سید احمد خاں نے مسلک اعتزال کو نئے لباس اور نئے اضافوں کے ساتھ پیش کیا۔ ص ۲۰)

4 اس تفسیر پر اس دور کے ہر مسلم گروہ کی طرف سے تنقید کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے سر سید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجیے، میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کتب درسیہ پڑھی ہیں جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اس کے واسطے سفارش کر دیں" سر سید نے ان کو لکھ بھیجا کہ میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔ (حالی، حیات جاوید، ج ۱، ص ۲۷۴)

کو ترجیح دی اور اجماع کے مقابلے میں تفرد کو اصول بنا گئے[1]۔ اسی بنا پر اس تفسیر کو " تفسیر القول بما لا یرضی بہ القائل " (قول الٰہی کی ایسی تفسیر جس پر خود قائل (خدا) بھی راضی نہ ہو) بھی کہا گیا[2]۔ لیکن بقول حالی؛

" جو لوگ سر سید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ " جو معنی قرآن کے انہوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو" سو شاید سر سید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو، مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے"[3]۔

معروف نقاد ضیاء الدین لاہوری سر سید کے عقائد کو یوں دیکھتے ہیں؛

"جدید تعلیم کی اشاعت، زبان و ادب کی ترقی، صحافت کے ذوق کی تعمیر، تحقیق و تدوین اور تالیف و تراجم کی تحریک میں سر سید کی خدمات کا انکار ممکن نہیں۔ بلکہ ہم ان کا شاندار الفاظ میں اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں دینی بے راہروی کی اگر علمی بنیادیں تلاش کریں تو وہ سر سید کی تفسیر، تہذیب الاخلاق کے مقالات، مذہبی مسائل و معتقدات کے بارے میں ان کے اسلوب اور افکار میں تلاش کرنی چاہیں۔ سر سید نے بعض مذہبی معتقدات کے لیے تاویل ہی کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ انکار و تمسخر کی روش کو اپنایا ہے۔ انہوں نے اسلامی معتقدات کی سر بفلک عمارت کو ڈھایا ہی نہیں، اس کی تباہی پر قہقہے بھی لگائے اور اس کی شان و رفعت کا مذاق بھی اڑایا۔ میں یہاں ان کی تفسیر سے صرف ایک اقتباس پیش کروں گا۔ (مسیحیت میں جنت کی مادی لذات کا انکار کیا گیا ہے۔ غالباً اس پس منظر میں سر سید) جنت کی حقیقت کے بارے لکھتے ہیں؛

" یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے، اس میں سنگ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے۔ ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے، جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے ایک ران پر سر دھرا ہے۔۔۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ، ایسا بے ہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں"۔

اس عبارت کو ایک بار نہیں بار بار پڑھیے اور غور کیجئے، کیا یہ ایک اسلامی اور مبنی بر نص قرآنی عقیدے کی حکیمانہ تفسیر اور محض تاویل ہے یا انکار و تمسخر؟ کیا اسے پڑھنے کے بعد سر سید کا کوئی معتقد اسلامی عقائد پر قائم و استوار رہ سکتا تھا اور رہا؟ حیرت ہوتی ہے کہ سر سید سا عقل پرست اور وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے علم الکلام کے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی، فہم و بصیرت اور حکمت سے دور ایسی باتیں کرتا ہے جنت کا از خود ہی ایک نقشہ کھینچتا ہے، پھر اس پر بے ہودہ پن کی پھبتی کستا ہے اور پھر اپنے خرابات سے اس کا موازنہ کر کے کانٹوں جنت سے ہزار درجہ اچھا بتاتا ہے۔ یاللعجب"[4]۔

---

1 صدیقی، سر سید اور علوم اسلامیہ، ص ۸

2 یہ جملہ سر سید کے دوست نواب محسن الملک نے اپنے خط بنام سر سید میں لکھا ہے۔ (سر سید، تفسیر القرآن، ص ۳)

3 شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر، ص ۴۲۰

4 لاہوری؛ ضیاء الدین، سر سید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص ۱۵۔۱۶

مزید لکھتے ہیں؛

"سرسید کے عقائد صحیح تھے یا غلط؟ دیوبند، بریلی، اہل حدیث وغیرہ کسی مسلک کے عالم دین کی بات نہ مانیے، اگرچہ دین کے معاملے میں بات ان ہی کی ماننی چاہیے۔ ان کے سب سے بڑے مخالف امداد العلی اور علی بخش خاں تھے۔ ان کی بات بھی نہ مانیے، ان کے معتقدین و مخلصین کے افکار پر نظر ڈال لیجیے۔ جنہیں نہ آج تک کسی نے قل اعوذیے کہا ہے نہ ان کے فکر و عمل پر ملائیت کی کبھی پھبتی کسی گئی۔ میرا اشارہ محسن الملک، حالی، اور ڈپٹی نذیر احمد کی طرف ہے، محسن الملک کو سرسید سے بایں ہمہ اخلاص و عقیدت بہت سے مسائل میں اختلاف کرنا پڑا۔ اور انہیں مسلمانوں میں " چھپا پادری" قرار دیا۔ حالی کو بھی سرسید سے تعلق وارادت کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑا کہ سرسید نے تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔ اور نذیر احمد نے تو ان کی متعدد خدمات کے اعتراف کے باوجود یہاں تک لکھ دیا کہ، "جو معانی سید احمد خاں نے منطوق آیات قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کیے میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کا ماننا مشکل۔ یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبرئیل حامل وحی کا، نہ رسول خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون کا، نہ اصحاب کا، ، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہور مسلمین کا" سرسید کی تفسیر کے بارے میں ان کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ سرسید کی تفسیر دیوان حافظ کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے چوتڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنا دیا"[1]۔

سرسید نے مستشرقین اور مسیحی مبشرین کے قرآن و اسلام پر کردہ اعتراضات کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآنی آیات کی جو تفسیر کی اس میں انہوں نے ان کے بعض دعویٰ کو قبول کر لیا یا بعض قرآنی مقامات کی یوں تاویل کی کہ اشکالات باقی نہ رہیں، لیکن اس کوشش میں اشکال کے دور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قرآنی تعلیمات کی اصل روح سے بھی دور جا نکلے۔ نیز بعض مقامات پر بائبل یا مسیحیت پر سخت نقد کرنے کے ساتھ ساتھ بائبل سے استشہاد بھی کیا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کی دفاع اسلام کے جذبہ سے کی جانے والی اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھا جاتا اور جہاں جہاں وہ اسلاف کی راہ سے ہٹ گئے تھے اس کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی جاتی۔ لیکن مسلم علماء نے سلف صالحین کی راہ سے ہٹے ہوئے اس منہج کی نفی کرتے ہوئے ان کے افکار کو شدید ہدف تنقید بنایا۔

حالی لکھتے ہیں؛

" اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائیں ہیں اور بعض مقامات پر ان سے رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔ بایں

---

1 لاہوری، ضیاء الدین، سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص ۲۲۔۲۳

ہم اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں سے ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں"[1]۔

متقدم مفسرین کے ہاں تفسیر قرآن میں بائبل کے حوالے تو نقل کرنے کا رجحان موجود ہے لیکن بہت کم استشہادی جب کہ غالب انتقادی رویے کے ساتھ۔ برصغیر میں سرسید غالباً پہلے مفسر ہیں جنہوں نے تفسیر قرآن میں بائبل کو بحیثیت ماخذ اپنایا۔ وہ قرآنی واقعات کی تشریح و تفصیل میں بائبل سے تائیدی استشہاد کرتے ہیں۔ انہوں نے قرآن و بائبل کے درمیان تطبیق بھی کی اور عدم مطابقت کی وجہ بھی بیان کی۔ قرآن میں مذکور جن واقعات کی طرف بائبل میں سے کوئی اشارہ نہیں ملتا انہیں معترضین بے بنیاد اور من گھڑت قصص قرار دیتے۔ سرسید نے بدلائل ان کا اثبات کیا ہے[2]۔ بعض اوقات، لیکن بہت کم، مسیحی مصنف کا قول اس کے نام کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ اپنی تائید میں معترضین کے اقوال بطور استشہاد نقل کرتے ہیں جیسے؛

"سر ولیم میور صاحب بھی اپنی کتاب مسمی لیف آف محمد (Life of Mehmat) میں تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جس کی عبارت بارہ سو ۱۲۰۰ برس تک ایسی خالص رہی ہو"[3]۔

بعض دفعہ معترضین کے قول پر نقد کرتے ہیں۔ جیسے" وَإِذْ قُلْتُمْ يَـٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّـٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ "[4]کی تفسیر میں اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ خود خدا کوہ سینا پر اترا تھا، بلکہ ان کے نزدیک اس وقت آتش فشان پہاڑ پھٹا تھا[5]۔ اس ضمن لکھتے ہیں:

" کینن اسٹینلی بہت بڑے پادری اور عیسائی مذہب کے پیشوا ہیں۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ درحقیقت خدا ہی (کوہ سینا پر) آگ کی صورت میں اترا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی تحریر میں اس پہاڑ کو آتش پہاڑ کہنے سے بہت بچایا ہے۔۔۔ کینن اسٹینلی کی یہی تاویل کہ وہ نشانیاں اس پہاڑ کی بناوٹ ہی کی ہیں صحیح نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ پس ہم توریت کے الفاظ پر کہ" خداوند در آتش بر اں نزول نمود "یقین نہیں لا سکتے گو کینن اسٹینلی کو یقین ہو"[6]۔

۱۸۳۴ء میں حضر موت یمن سے کچھ کتبے دریافت ہوئے ان کی تحقیقات کے بارے سرسید لکھتے ہیں

"ریورنڈ فاسٹر نے بڑے کتبے کے نیچے جو کتبہ ہے اس میں عک کا نام دیکھ کر اس کتبہ کا زمانہ قرار دینے پر توجہ دی۔۔۔ جب کہ ریورنڈ فاسٹر نے یہ تسلیم کر لیا کہ یہ کتبے قوم عاد کے ہیں جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔۔۔ انہوں

---

1 حالی، حیات جاوید، ج ا، ص ۲۷۳

2 صدیقی، سرسید اور علوم اسلامیہ، ص ۶۷

3 سرسید، تفسیر القرآن، ص ۶۹

4 سورۃ بقرۃ ۲ : ۵۲

5 سرسید، تفسیر القرآن، ص ۱۷۴۔۱۷۶

6 ایضاً، ص ۱۷۳۔۱۷۴

(ریورنڈ فاسٹر) نے جو ان کتبوں کو عاد کی قوم کے کتبے قرار دیئے ہیں یہ محض غلطی ہے۔ دوسرے یہ کہ جو زمانہ ان کتبوں کا ریورنڈ فاسٹر نے قرار دیا ہے وہ بھی غلط ہے"[1]۔

سر سید آغاز تفسیر میں ہی توریت سے استشہاد کرتے ہیں۔ سورۃ فاتحہ کی وجہ تسمیہ میں رقم طراز ہیں؛

" یہودیوں کا دستور تھا کہ توریت کی سورتوں کو یا اس کے شروع کے لفظ سے موسوم کرتے تھے یا جس معاملہ یا مطلب پر وہ سورت دلالت کرتی تھی اسی میں سے کوئی لفظ لے کر اس کا نام رکھ دیتے تھے مثلاً توریت کی پہلی سورت کے شروع میں لفظ "براشیت" ויצשמ آیا ہے۔ اس کا نام انہوں نے "سورۃ براشیت" מןשףוווצשמ رکھا ہے۔ اور دوسری سورت میں حضرت نوح کا قصہ ہے اس کا نام "سورۃ نوح" משףווות رکھا ہے۔ اسی قاعدہ کے مطابق اہل اسلام نے بھی قرآن مجید کی سورتوں کے نام رکھے ہیں۔ اس سورۃ کا نام جو سورۃ فاتحہ رکھا ہے اسی لحاظ سے رکھا گیا ہے کہ قرآن مجید اس سے شروع ہوتا ہے"[2]

برصغیر میں مسلم مسیحی کشمکش میں سب سے زیادہ قابل بحث موضوع" تحریف بائبل "(تحریف لفظی و تحریف معنوی) رہا ہے۔ دیگر علماء کے برعکس سر سید مروجہ بائبل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں ہیں جس کا اظہار وہ تفسیر میں بھی کرتے ہیں؛

" توریت اور صحف انبیاء اور انجیل کے قلمی نسخے جو اب دنیا میں موجود ہیں وہ آپس میں نہایت مختلف ہیں۔ اگرچہ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کی ہے اور نہ علمائے متقدمین و محققین اس بات کے قائل تھے مگر علمائے متاخرین اس بات کے قائل ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف و تبدیل کی ہے۔ اس پر عیسائی مصنفوں نے اس امر محال کے اثبات پر کوشش کی ہے کہ قرآن میں بھی تحریف ثابت کریں"[3]

اس کے ساتھ ساتھ بائبلی تعلیمات پر بھی نقد کرتے ہیں مثلاً؛

" کوئی کتاب دنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بردبار اور متحمل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھلانے والی جس سے آنکھوں میں چکا چوند آجاوے، نہیں ہے۔۔۔ انجیل میں لکھا ہے اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دے[4]۔ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے، مگر (سوال یہ ہے کہ آیا) کسی زمانہ کے لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے؟ اگر دنیا اس پر عمل کرے تو دنیا کا کیا حال ہو؟ اسی

---

1 سر سید، تفسیر القرآن، ص ۶۹۸۔۶۹۹

2 ایضاً، ص ۳

3 ایضاً، ص ۵

4 متی ۵: ۳۹

طرح آباد رہے، اور اسی طرح لوگوں کی جان و مال امن میں رہیں؟نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب کے سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے شر اٹھ جاوے مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ایسا ہو گا؟ یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جو خیال میں شدنی قرار دے کر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے"[1]۔

بلکہ ان تعلیمات کی بنا پر مذہب عیسائیت پر بھی نقد کرتے ہیں؛

"عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سر سبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سر سبز ہوا مگر دیکھو کہ اس نے کیا پھل پیدا کیا۔ ایک بھی نصیحت اس کی کام نہ آئی، اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بد خصلت دکھلائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہو گی۔ اور جس نیکی میں اس کی جڑ لگائی گئی تھی اس نے کچھ پھل نہیں دیا کیونکہ قانون قدرت کے بر خلاف لگائی گئی تھی"[2]

نقد مسیحیت میں سر سید کا لب و لہجہ اور الفاظ کی سختی ان علماء سے قطعاً مختلف اور کم نہیں، جو انہیں انگریز کا طرف دار گردانتے ہوئے کرسٹان (پادری) کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ دراصل عیسائیت کے شدید ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر سر سید مسیحی برطانوی حکومت کے طرف دار تھے، جس کی بنا پر انہیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

مسیحی معترضین کا ایک بڑا اعتراض یہ رہا ہے کہ قرآن کی واقعات بیان کرنے کی ترتیب درست نہیں۔ اس ضمن میں سر سید سورۃ بقرۃ آیت أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ[3] کی تفسیر میں اس اعتراض کا رد بائبل کے اسلوب سے تقابل کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے مذکورہ قصہ کے بیان میں بائبل کے تضاد، اس کا تاریخی اعتبار سے الٹ پلٹ اور ناقص ہونا ظاہر کیا ہے۔ اور یہ بھی ثابت کیا کہ اس واقعہ کے بارے قرآنی بیان ہی درست ہے۔

"عیسائی مؤرخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا۔ ان اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے لیے جو مخالفت کتاب شموئیل پر مبنی ہے ضرور ہے کہ کتاب شموئیل میں جو واقعات اور جو ترتیب ان واقعات کی ہے ان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔۔۔(پھر تفصیل سے واقعات کا جائزہ اور ان کے باہمی تضاد بیان کر کے لکھتے ہیں) اس اختلاف کے سبب خود عیسائی مؤرخوں کی یہ رائے ہے کہ کتاب شموئیل میں قصہ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔۔۔ انہی اختلاف کے سبب بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ (کتاب شموئیل کا) سارے کا سارا سترھواں باب الحاقی و نامعتبر ہے۔۔۔ اگر در حقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو

---

1 سر سید، تفسیر القرآن، ص ۳۱۱

2 ایضاً، ص ۳۱۲

3 سورۃ البقرۃ: ۲۴۶

واقعات کا الٹ پلٹ ہو جانا یا بعض واقعات کا تحریر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آسکتا ہے۔ ہماری غرض اس بحث سے شموئیل کی کتابوں پر جرح وقدح کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہ سے کہ شموئیل کی کتابوں سے بیان میں مختلف ہے اعتراض نہیں ہو سکتا جب تک کہ اور طرح پر اس کی غلطی ثابت نکی جاوے[1]۔

سورۃ الاعراف میں " اتخاذ عجل " کے عنوان سے ۸ صفحات پر مشتمل تفصیلی بحث کی ہے۔اس میں قرآن پر وارد مسیحی اعتراض اور اس کا جواب بھی دیا ہے۔

"عیسائی علماء نے یہ بات چاہی ہے کہ قرآن مجید کی غلطی ثابت کریں مسٹر سلیڈن نے کہا کہ دراصل ہارون اور سامری ایک ہی شخص ہے نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ نے غلطی سے ان کو دو سمجھا ہے۔ سمر یا شمر عبری لفظ ہے اس کے معنی محافظ کے ہیں اور جب کہ موسیٰ پہاڑ پر گئے تھے تو ہارون بنی اسرائیل کے محافظ ہوئے تھے اس لیے وہی شامر تھے۔ مگر مسٹر سلیڈن کا یہ قیاس محض غلط ہے اس لیے کہ اگر یہ لفظ قرآن مجید میں اخذ کیا جاتا تو اس کے ساتھ (عربی گرائمر کی رو سے) یائے نسبت کسی طرح نہیں آسکتی تھی۔اور اگر وہ علم یعنی خاص شخص کا نام متصور ہوتا تو اس پر الف لام لازم نہیں آسکتا تھا۔حالانکہ قرآن مجید میں یائے نسبت اور الف لام دونوں موجود ہیں یعنی " السامری " آیا ہے پس یہ دونوں خیال محض غلط ہیں"[2]۔

سر سید نے اس مقام پر تفصیلی بحث سے یہ ثابت کیا ہے کہ جس قوم یا قبیلہ سے تعلق رکھنے والے شخص نے یہ حرکت کی تھی وہ بعد ازاں یہودیوں میں سامری کے لقب سے موسوم ہوا۔لہٰذا قرآن نے متداول اصطلاح السامری بالکل درست استعمال کی ہے۔اپنے اثبات دعویٰ کے بعد وہ یوں گویا ہوتے ہیں؛

" جو لوگ کہ توریت کے اس کے ان مقامات کو جو قرآن مجید کے بیان کے مخالف ہیں قرآن مجید کی غلطی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ایسی جرات کرنے سے پہلے توریت کے تمام مضامین مندرجہ کی صحت ثابت کرنی چاہیے اور ان کو اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اب تک یہ بھی تحقیق نہیں ہوا ہے کہ موجودہ توریت کس نے لکھی اور کب لکھی گئی۔۔۔پس یہ امر کہ کوئی واقعہ جو توریت کے برخلاف ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتا،اس کو کوئی ذی عقل تسلیم نہیں کر سکتا"[3]

آیت ٱلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ ٱلرَّسُولَ ٱلنَّبِيَّ ٱلْأُمِّيَّ ٱلَّذِي يَجِدُونَهُۥ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي ٱلتَّوْرَىٰةِ وَٱلْإِنجِيلِ (الاعراف ۷ : ۱۵۷) کی تفسیر میں عہد نامہ قدیم وجدید میں مذکور بشارات محمدیہ نقل کی ہیں اور تفصیلی بحث کے لیے سورۃ الصف کی آیت مبارکہ " وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنۢ بَعْدِي ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ " (الصف ۶۱ : ۶)

---

1 سر سید، تفسیر القرآن، ص ۳۴۷۔۳۵۰

2 ایضاً، ۷۵۷

3 ایضاً، ص ۷۵۷۔۷۵۸

کا مقام تجویز کیا تھا لیکن اس کی تفسیر سے قبل ہی رحلت فرما گئے۔ ان کے اسلوب کے مد نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس مقام پر بائبل کے بیانات کے تاریخی اثبات پر بہت وقیع علمی جواہر پارے قاری کے سامنے بکھرے نظر آتے۔ بہر حال اس مقام پر منقول بشارات بھی تفہیم مضمون کے لیے بہت گراں مایہ ہیں[1]۔

اس تفسیر میں سرسید کے اسلوب سے واضح ہوتا ہے کہ آپ غیر ضروری تفصیلات اور لایعنی مباحث سے احتراز کرتے ہیں۔ زیر بحث موضوع کو کسی الجھاؤ کے بغیر واضح الفاظ میں اور اپنا مؤقف بلاکم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ گو سرسید نے قدیم صحف کی روشنی میں تفسیر لکھی لیکن کمزور اسرائیلی یا مسیحی روایات کو قبول نہیں کیا چاہے وہ بائبل میں ہی مذکور کیوں نہ ہوں۔ اور ان روایات پر خود مغربی مسیحی فضلاء کے کردہ نقد سے استشہاد کیا ہے۔

سرسید نے شعوری طور اس تفسیر میں یہ ثابت کرنے کا خصوصی اہتمام کیا کہ مغرب میں نئے نئے سائنسی انکشافات کی روشنی میں کردہ تنقید اور مسلم سیاسی مغلوبیت کے باوجود قرآن اب بھی مسلمانوں کی فکری رہنمائی کا خصوصی اور بنی نوع انسان کی عمومی رہنمائی کی حامل کتاب ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک غلام قوم کی رہنمائی میں عقلیت پسندی کے خوگر اس راہنما کی فکر جرأت مندانہ ہونے کی بجائے معذرت خواہانہ، مرعوبانہ اور تطبیقانہ زیادہ ہے۔

1 سرسید، تفسیر القرآن، ص ۷۶۵۔۷۷۱

تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی — عبد الحق حقانی دہلوی (۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء۔۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء)

"دہلوی" کی نسبت سے معروف مولانا عبد الحق حقانی باختلاف ۱۲۶۵ ھ[1] میں پنجاب کے ضلع انبالہ کے علاقہ گمتھلا میں پیدا ہوئے۔ یہ نامور مفسر، اعلیٰ پائے کے مدرس، امام المناظرین سے ملقب اور دفاع اسلام میں شاندار خدمات سرانجام والی ہستی ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۵ ھ بمطابق ۱۹۱۷ء کو دہلی میں اس دار فانی سے کوچ فرما گئی۔ تقریباً ایک لاکھ افراد نے آپ کے جنازہ میں شرکت کی[2]۔

آپ کا گھریلو نام ' علام جہاں ' رکھا گیا جسے بعد میں آپ نے اپنے استاد عبد اللہ شاہ کے مشورہ سے 'عبد الحق' تبدیل کر لیا[3]۔ آپ کے اساتذہ میں عبد اللہ شاہ، آخوند شاہ عبد العزیز، مولانا احمد علی سہارن پوری، شیخ عبد الحق کانپوری، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، اور سید نذیر حسین محدث دہلوی معروف ہیں۔ شیخ الحدیث سید نذیر حسین محدث دہلوی المعروف میاں صاحب سے حدیث نبوی کی قرآت و سماع یوں کی کہ کتب حدیث تحقیق و تدقیق کی نظر سے لفظاً لفظاً شیخ الحدیث کے سامنے قراءت کیں۔ آپ کی خداداد قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے شیخ المحدثین غایت درجہ آپ پر شفقت فرماتے اور انہوں نے آپ کو اجازت مطلق اور سند موثق عطا فرمائی[4]۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برصغیر کے مسلمانوں کو جہاں سیاسی مغلوبیت سے واسطہ تھا، وہیں دین اسلام اور اصول اسلام پر اعتراضات و تنقید کے ایک سیلاب کا بھی سامنا تھا۔ ان حالات میں مولانا حقانی نے عقل سلیم اور اصول فطرت کی روشنی میں اسلامی عقائد و نظریات کو حق ثابت کرنے کے لیے قلم اٹھایا اور تفسیر فتح المنان لکھی۔ اس کی وجہ تصنیف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں؛

> "چند عرصہ سے اس شجر اسلام پر (ہوائے صرصر) کے جھونکے چل رہے ہیں۔ جس سے دشمن خوش اور اور دردمند کف افسوس مل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اخلاف انصار و مددگار شراب غفلت و نفاق ہو کر بے ہوش اور مست و بخواب خرگوش ہو گئے تو مخالفین نے میدان خالی پا کر اپنا کام کیا۔ اس کی دولت اس کی شوکت اور اس کی سلطنت حکومت اور اس کے علوم فنون کا کام تمام کیا۔ جب تخمیناً سو برس سے بڑے دور دراز سے ایک قوم عیسائی دانشمند، آزادی پسند

---

1 حقانی، عبد الحق، عقائد اسلام مع حیات حقانی،(ادارہ علوم شرعیہ، کراچی، س ن) ص ۷؛ نزہۃ الخواطر میں تاریخ پیدائش ۲۷ رجب ۱۲۶۷ء (۲۸ مئی ۱۸۵۱ء) ہے۔ الحسنی، عبد الحی، نزہۃ الخواطر، (حیدر آباد دکن، ۱۹۷۰ء) ج ۸، ص ۲۳۲

2 حقانی، عقائد اسلام، ص ۱۶

3 ایضاً، ص ۸

4 محمد شریف، سرسید کے آراء و افکار کا مولانا عبد الحق حقانی کی تفسیر کی روشنی میں تنقیدی و تحقیقی جائزہ، (مقالہ برائے ایم فل (غیر مطبوع) ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، سیشن ۲۰۰۰ء) ص ۴۱

ہندوستان آئی تو اپنے ساتھ صدہا جہاز الحاد اور شراب خوری وغیرہ کے بھی بھر کر لائی اول تو یونہی مسلمانوں کی حالت خراب تھی اس پر آزادی اور الحاد کی برانڈی نے وہ آفت ڈھائی کہ

ازاں افیون کہ ساقی درمے افگند   حریفاں را نہ سر ماند نہ دستار

جس سے غفلت اور باہمی نزاع اور بے دینی نے ہر طرف سے محیط ہو کر دینی و دنیوی برکات کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کا دل خوش کرنے کے لیے ایک قوم نے وہ طرز اختیار کیا کہ اہل یورپ کا پورا جامہ پہن لیا۔۔۔ پھر ان کفریات اور پادریوں اور ملحدان یورپ کے معتقدات کا نام تحقیق اور ترقی اسلام رکھ کر صدہا کو روحانی زہر کا پیالہ پلا دیا۔ لہذا حمیت ایمانی اور اہل اسلام کی نفع رسانی نے مجھ جیسے بے لیاقت کو مجبوراً اردو میں ایسی تفسیر لکھنے پر مامور کیا"۔[1]

آٹھ جلدوں پر مشتمل تفسیر فتح المنان المعروف تفسیر حقانی کی پہلی اشاعت دہلی سے ہوئی۔

جلد اول	مطبع حامی الاسلام، محلہ بلی ماراں، دہلی	۱۳۰۵ھ	مقدمہ تفسیر
جلد دوم تا جلد ہفتم	مطبع مجتبائی، دہلی	۱۳۰۵ھ تا ۱۳۱۳ھ	
جلد ہشتم	مطبع مجتبائی، دہلی،	۱۳۱۸ھ	پارہ عم یتساءلون[2]

تفسیر کا اسلوب یہ ہے کہ مولانا ترکیب کے عنوان سے پہلے عربی قواعد اور لغوی مباحث کرتے ہیں پھر تفسیر اور نکات کے تحت قابل توضیح مقامات پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

برصغیر کے مسلم تفسیری ادب پر مسیحی علم الکلام کے اثرات کا ایک نتیجہ ہم تفسیر حقانی کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ جس میں مسیحی لٹریچر میں کردہ تنقید، اس کا جواب اور بعض غلط دعوؤں کی تردید کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مفسر بعض اوقات ناقد مسیحی معترض کا نام لے کر اس کی تردید کرتے ہیں اور اس پر جرح کرتے ہوئے الزامی تنقید بھی کرتے ہیں جس میں مولانا کی بائبل پر دسترس پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔

اکثر مسیحی معترضین اسرائیلی روایات کی بنیاد پر اعتراض کرتے تھے۔ مولانا تفسیر میں اسرائیلیات سے احتراز برتتے ہیں۔ یہ مسیحی علم الکلام کا ہی رد عمل گردانا جا سکتا ہے۔ مولانا نے کمزور اور وضعی روایات کی نفی کا اسلوب اختیار کیا۔ آپ کے بعد کی تفاسیر میں یہ رویہ زیادہ بہتر انداز میں سامنے آیا۔

اسے عیسائیت کا جامع انداز میں تنقیدی جائزہ پیش کرنے والی اردو کی پہلی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ مطبوعہ اردو تفاسیر میں سے سب سے زیادہ بائبل کے حوالہ جات اور تاریخ و تعارف بائبل پر تفصیلی و تحقیقی مباحث اس تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔ مولانا، بائبل کے ساتھ ساتھ ہندو مذہبی ادب سے بھی استشہاد کرتے ہیں۔ مسیحیت پر بسیط مباحث کے ساتھ ساتھ سرسید کی "نیچری آراء" کا بھی رد کیا گیا ہے۔

---

1 حقانی، عبدالحق، تفسیر حقانی، (مکتبہ عزیزیہ، لاہور، س ن) ج ا ص ۳، ۴

2 شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، ص ۴۵

مولانا اپنے دور کے کامیاب مناظر اسلام تھے، چنانچہ تفسیر حقانی میں بھی مناظرانہ رجحان غالب ہے۔اس میں معقولی اسلوب زیادہ ہے، تاہم منطقی اور عقلی دلائل سے بھی فریق مخالف کو جواب دیتے ہیں۔عام مناظرین کی طرح غیر حقیقی اور غلط دعویٰ مخالف کے سر نہیں تھوپتے۔

کہیں کہیں مولانا کا لہجہ تلخ اور الفاظ کی شدت بڑھ جاتی ہے، جسے فریق مخالف کے شعوری طور پر اپنائے گئے رویہ کارد عمل کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں فریق مخالف کی طرح رکاکت، غیر معقولیت، غیر ضروری نکتہ چینی و نکتہ آفرینی سے احتراز برتا گیا ہے۔ مولانا ایک اعتراض کے جواب میں رقم طراز ہیں؛

" ہمارا کلام بے ہودہ گوئی نہیں مگر چونکہ آپ نے سوال کیا اس لیے جواب دینا پڑا"[1]۔

"(پادری صاحبان نے) اپنے ہم مذہبوں کو خوش کرنے کو بڑے بڑے ضخیم رسالے بنا کر مشہور کر دیئے جن کا جواب ناچار مسلمانوں کو دینا پڑا۔ ماسٹر رام چندر صاحب نے تحریف القرآن نام پندرہ سولہ جزء کا رسالہ اسی بنام میں لکھا ہے۔ فقیر نے اس کے جواب میں تعریف القرآن لکھ کر پادری صاحبوں کی ناحق زبان درازی بتلائی ہے"[2]۔

یہ الفاظ فریق مخالف کے کلام میں علمی سطح سے گری ہوئی باتوں اور بے ہودگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مجیب کو باوجود احساسِ احتیاط کے ان رکیک باتوں کا جواب محتاط الفاظ میں دینا پڑتا ہے تاہم وہ جواب میں اُس نچلی سطح تک نہیں جاتے۔ اگر مسلم علماء ایسے سطحی اور بودے اعتراضات کو در خور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے جواب دینے سے احتراز برتتے تو فریق مخالف اس سے غلط استدلال کرتے ہوئے اسلام کی کمزوری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیتا اور اس بات کو اچھالا جاتا کہ ہماری ان باتوں کا جواب نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ پادری صفدر علی نیاز نامہ کے متعلق شاکی تھے (جس کا بعد میں جواب دیا گیا۔) فریق مخالف باوجود اپنے اعتراضات کی غیر علمی حیثیت کے، اس بات کو اپنا فرض منصبی خیال کرتا کہ اپنی گری ہوئی باتوں کا جواب بھی علمائے اسلام سے طلب کرے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق مسلم علماء کو ان سطحی اور رکیک تحریروں پر بھی چارو ناچار قلم اٹھانا پڑتا۔

عصری تقاضے کے مطابق زبان آسان فہم ہے۔ مولانا کسی بھی بحث کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ تاریخی حقائق اور تحقیقی بیانات پر یوں مفصل بحث کرتے ہیں کہ تکرار نہ آنے پائے۔ سلف کی روش کا اتباع کرتے ہوئے کسی جگہ بھی معذرت خواہانہ رویہ نہیں اپنایا۔

تفسیر حقانی کا مقدمہ اپنی جگہ مستقل تحقیقی دستاویز ہے جو کہ تین ابواب اور مختلف فصول پر مشتمل ہے۔

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ج ۱، ص ۶۰ (مقدمہ)

2 ایضاً، ص ۵۱ (مقدمہ)

باب دوم فصل دوم میں جمع وتدوین قرآن کی اصولی بحث میں مسیحی معترضین کے تحریف قرآن پر لکھی گئی تحریروں کے حوالے سے رقم طراز ہیں؛

"اس شبہہ بے اصل کو بعض پادریوں نے اتنا پھیلایا کہ اس میں رسالے لکھ ڈالے۔ چنانچہ عبدالمسیح اور ماسٹر رام چندر اور عمادالدین نے اس میں بڑا ہی زور مارا کہ قرآن مجید میں تحریف ثابت کی جائے[1] "۔

بعد ازاں ٹھوس نقلی و عقلی دلائل سے ان کے مغالطات کا رد کیا ہے۔ مثلاً علوم القرآن میں اصول نسخ کی ذیل میں واردہ بعض روایات کو بنیاد بنا کر تحریف قرآن کا دعویٰ کیا گیا تھا اس کے متعلق مولانا رقم طراز ہیں؛

" ماسٹر رام چندر نے اپنی کتاب تحریف القرآن اور پادری عمادالدین نے کتاب ہدایت المسلمین میں اور دیگر پادر (پادریوں) نے اپنی اپنی تصانیف میں اس الزام کے دفعہ میں (کہ تورات وانجیل میں متقدمین اہل کتاب کی بددیانتی یا غفلت سے بے شمار تحریف لفظی اور معنوی ہوئیں جس کے محققین اہل کتاب بھی مقر ہیں چنانچہ ہارن اور ہنری اوراسکاٹ اپنی تفاسیر میں اور پادری فنڈر اختتام مباحثہ دینی مطبوعہ اکبر آباد میں صدہا بلکہ ہزار ہا درس یوں ریڈنگ یعنی غلطی کاتب کے قائل ہیں اور بہت سی آیات اناجیل اور بعض ابواب کتب بیبل کو الحاقی مانتے ہیں) چند وہ روایات ہماری کتب تفاسیر اتقان وغیرہ سے نقل کی ہیں کہ جن سے بعض آیات قرآنیہ کا منسوخ التلاوۃ ہونا محسوس ہوتا ہے اور اس کو بڑے بسط کے ساتھ لکھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید میں بھی تحریف ہے۔ ان بے اصل باتوں کا جواب بضمن جواب تحریف القرآن رسالہ تعریف القرآن میں فقیر دے چکا ہے[2]"۔

مقدمہ میں مولانا حضرت عیسی علیہ السلام کی ذات کے بارے یہودی، مسیحی اور مسلم نقطہ ہائے نظر کا موازنہ بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق یہودی معاندانہ روش اور مسیحی فرقوں سے بعض جہات میں اس کی تائید، جب کہ مسلم عقیدہ کے مطابق ان کی مکمل تردید بیان کرنے کے بعد اسلام کی حیثیت واضح کرتے ہیں کہ " اسلام کا فریق عجب فرماں بردار فریق ہے کہ جس کو کسی نبی، کتاب الہیٰ سے انکار نہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کا ہو بشرطیکہ اس کی نبوت ثابت ہو جائے اور کتاب کا کلام الہیٰ ہونا دریافت ہو جائے "[3]۔

مولانا ایک ماہر وکیل کا کردار ادا کرتے ہوئے دفاع اسلام کے ساتھ ساتھ مسیحی معترضین کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ اسلام مسیح کے بارے جتنا عمدہ رویہ اپنانے اور ان کے احترام کی تعلیمات دیتا ہے اسی قدر مسیحی اہل قلم اسلام اور بانی اسلام کو طعن کا نشانہ بناتے ہیں۔

بعض مسلم تفسیری آراء کو بنیاد بنا کر فصاحت قرآن پر مسیحی اعتراضات کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ص ۵۲

2 ایضاً، ص ۵۳

3 ایضاً، ص ۶۲، ۶۳

"دراصل لوگوں میں عقائد باطلہ پایا جانا آیات عقائد کے لیے شان نزول ہے اور باہم جھگڑے اور ظلم و ستم کا پایا جانا آیات احکام کے لیے شان نزول ہے۔ اور جب ہمارے بعض مفسر ہی اس نکتہ کو نہ سمجھے اور انہیں بے اصل قصوں کو تفسیر میں داخل کرنے کی ضرورت پڑی تو (ان تفسیری آراء کو) بے چارے پادری وہنود وغیرہم مخالفین (جو کہ علوم اسلامیہ سے اکثر نا آشنا ہیں) کیا سمجھتے؟ پس پادری فانڈر اور پادری عماد الدین وغیرہم نے (ان بے اصل تفسیری آراء کی بنیاد پر) جو قرآن پر اس بارے میں بڑی شدومد سے اعتراضات کیے ہیں اور قرآن کی فصاحت وبلاغت میں نقص ثابت کیا ہے اور ناحق کی قابلیت جتلائی ہے درحقیقت اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان اعتراضات میں بے چارے پادریوں کا محققین اسلام قہقہہ نہ اڑائیں بلکہ ان کو ان کی بے علمی کی وجہ سے معذور سمجھیں"[1]۔

مولانا کے بقول ہر زبان میں بلغاء کے کلام میں حذف ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو تو مفہوم کی عامی کے نزدیک وضاحت تو ہو جائے گی مگر کلام بے لطف رہے گا۔ پادری عماد الدین کے محذوفات قرآن پر معترض ہونے کے بارے کہتے ہیں؛

"عماد الدین کرسٹان نے عجیب غلطی کی ہے کہ اس قسم کے محذوفات کو ذکر کرکے قرآن پر اعتراض کیا ہے کہ یوں چاہیے تھا، یہ غلط ہے۔ اور ہدایت المسلمین کی ایک فصل میں ان محذوفات کو مع ترجمہ ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔ جس سے عوام کو یہ ثابت ہو کہ قرآن میں غلطیاں ہیں۔ ان بے ہودہ اعتراضات پر ہر عربی دان ہنستے ہیں۔ عیسائی عربی دان بھی بنظر حقارت دیکھتے ہیں پھر ان کے ذکر کرنے سے سوائے اس کے کہ پنجاب کے ناواقف (بدیسی) پادری خوش ہوں اور تنخواہ کا اضافہ کر دیں اور کوئی نتیجہ نہیں۔ ان کے جواب میں کوئی کتاب ضخیم لکھنا تضیع اوقات ہے"[2]۔

مولانا بدیسی مسیحی منادین کی زبان دانی میں کم لیاقت کا ذکر کرتے ہیں کہ "اس ملک میں پادری لوگ اردو دانی کا دعوی کیا کرتے ہیں اور سال ہا سال لوگوں سے پڑھتے اور بازاروں میں جا کر بول چال سنتے ہیں مگر پھر بھی وہ اردو بولتے ہیں کہ جس پر اہل زبان ہنس پڑتے ہیں۔ مثلاً ایک پادری صاحب نے کہا دیکھو تمہاری چارپائی پر قفل بیٹھا ہے۔ کہنا چاہیے تھا کہ دھرا ہے۔ ایک نے فرمایا ہماری گائے کا بیٹا پیدا ہوا ہے حالانکہ بیٹا (کا لفظ) انسان کی اولاد میں مستعمل ہوتا ہے"۔ بعد ازاں کہتے ہیں کہ " جو محاورات قرآن نہیں جانتے وہ مطلب فہمی میں بڑی دقت اٹھاتے ہیں۔۔۔ جو لوگ ان محاورات سے واقف نہیں وہ اپنی نادانی سے قرآن کے ان مزیدار فقروں پر اعتراض کرتے ہیں"[3]۔

مقدمہ کے باب سوم کی ابتدائی تین فصلوں میں تورات وانجیل کے مقام اور صداقت قرآن کا ذکر کرتے ہوئے مروجہ عہد نامہ عتیق وجدید کے الہامی ہونے کے دعویٰ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں مذکور تعلیمات و واقعات کی پرکھ کا نتیجہ ان کے غیر الہامی ہونے کی صورت میں نکالتے ہیں[4]۔ چوتھی فصل میں ہنود کی مذہبی کتب، اور پانچویں فصل

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ج ۱، ص ۶۷

2 ایضاً، ص ۹۶ (حاشیہ)

3 ایضاً، ص ۹۸

4 ایضاً، ص ۱۰۴۔۱۲۵

میں پارسی کتب کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مروجہ اناجیل کے متعلق مولانا کا نظریہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے؛

"یہ بات ہمارے اور عیسائیوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ چاروں انجیلیں نہ حضرت عیسیٰ کی تصنیف ہیں نہ ان کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔ پس ہم کو تو بحث کو اسی جگہ تمام کر دینا چاہیے تھا۔ کیونکہ جس انجیل کے اہل اسلام قائل ہیں اور جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ انجیل ہے کہ جو حضرت عیسیٰ پر بذریعہ روح القدس نازل ہوئی ہے۔ جس طرح کہ تورات و زبور و دیگر صحف انبیاء کا حال ہے مگر چونکہ عیسائی اس بات کے قائل ہیں کہ گو یہ مسیح کی اناجیل نہیں مگر یہ بھی الہامی اور رسولوں کی تصنیف ہیں اس لیے بھی ان سے بحث کرنی پڑی۔ ہر چند اس بات کو ہم نے تجسس کر کے دیکھا مگر بہت وجوہ سے غلط پایا اور عیسائیوں کے پاس سوائے خوش اعتقادی کے کوئی دلیل نہ دیکھی۔ ہاں اس قدر ہم بھی مانتے ہیں کہ ان میں کچھ مضامین الہامی بھی ماخوذ ہیں"[1]۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں ضرورت قرآن کے عنوان سے ٹھوس دلائل پر مبنی چار اصول بیان کیے ہیں اور پادری ٹھاکر داس کی تصنیف " عدم ضرورت قرآن" کا اصولی جواب دیا ہے۔ سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں سب سے منفرد تحقیق ایک جدول کی صورت میں سورۃ فاتحہ کی سات آیات کا تورات، زبور، انجیل، دساتیر، رگ وید کی سات دروس سے موازنہ و مقابلہ ہے۔ اس جدول سے اسلام کی تعلیمات کا الہامی اور جامع ہونا واضح ہوتا ہے نیز خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صحیح تعلق کی راہنمائی پر روشنی پڑتی ہے[2]۔

سورۃ بقرہ کی آیت "وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ..... وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرۃ ۲ : ۲۶) کی آیت کی تفسیر میں پولوس کے قول[3] کی روشنی میں کردہ پادری فانڈر کے جنت میں مادی لذات کے بارے قرآنی بیان پر اعتراض کا جواب دیتے ہیں اور انجیل متی سے حضرت مسیح علیہ السلام کا قول اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا ہے؛

"پھر خود حضرت مسیح علیہ السلام کے قول سے (انجیل متی کے ۲۶ باب ۲ تا ۹ درس) جنت میں انگور کا شیرہ پینا ثابت ہے تو جب وہاں پینا ہے تو کیا کھانا نہ ہو گا۔ اور جب شراب ہے تو کیا عورتیں نہ ہوں گیں۔۔۔۔ علاوہ اس کے مکاشفات یوحنا کے ۷ باب اور ۲۱، ۲۲ میں بھی اسی قسم کا بیان ہے۔ اور پولوس کے قول کا مسیح کے مقابلہ میں کیا اعتبار ہے"[4]۔

جا بجا مختلف پادریوں کے اعتراضات کا بتذکرۃ الاسم رد کرنا، مولانا کے مقامی مسیحی لٹریچر کے گہرے مطالعہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا قرآن پاک پر تمام مسیحی اعتراضات سے کما حقہ واقفیت رکھتے

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ج ا، ص ۱۱۷۔ ۱۲۲

2 ایضاً، ص ۴۶۔ ۵۰

3 رومیوں ۱۴: ۱۷

4 حقانی، تفسیر حقانی، ج ا، ص ۱۱۱

تھے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مسیحی مشنریز کی دیکھا دیکھی ہندومت کے دو بڑے گروہوں برہمو سماج اور آریہ سماج کی طرف سے بھی قرآن پر اعتراضات سامنے آنے لگے۔ مولانا نے انہی کی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں تردید کی ہے یہ مولانا کی مختلف مذاہب کے بارے ٹھوس معلومات اور ان کے تبحر علمی پر دال ہے۔(یہ موضوع ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے)

اس تفسیر کا ایک پہلو تذکرہ تاریخ ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل پر ایک مبسوط بحث وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ ...کے تحت موجود ہے[1]۔ تاریخ کعبہ کو تفصیلی طور پر بیان کرتے ہوئے نقشوں سے واضح کیا گیا ہے[2]۔ تاریخ بیت المقدس کے ضمن میں ۲۳ صفحات پر مشتمل سب سے تفصیلی بحث ہے[3]۔

حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق تمام قرآنی بیانات پر مولانا خصوصی طور پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ آل عمران کے پانچویں اور چھٹے رکوع کی تفسیر میں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ مسلم مسیحی مابہ النزاع مسائل میں تحریف بائبل کے بعد سب سے زیادہ قابل بحث موضوع تصلیب و رفع عیسیٰ ہے۔ مولانا صاحب نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا تصلیب کے بارے بیان درست اور مروجہ مسیحی عقیدہ تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ اس بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں؛

> "دوسرا گواہ لوقا اور متی اور مرقس کی انجیل ہے ان میں لکھا ہے کہ مسیح کی سلیب شمعون قرینی پر رکھ پر سلیب دیے کے لیے چلے تھے اور یہ دستور تھا کہ جو شخص صلیب دیا جاتا تھا وہ اپنی صلیب آپ اٹھاتا تھا(تفسیر سکاٹ متی ۲۷ : ۳۲) گرچہ انہیں مورخوں نے اسی تقلید سے یہ بھی کہہ دیا کہ مسیح کو صلیب پر کھینچا مگر ان کی یہ تحریر اصل واقعہ کی طرف صاف صاف اشارہ کر رہی ہے۔ انہی وجوہ سے خود عیسائیوں کے چند فرقے جو اسلام سے پیشتر تھے مسیح کے سولی دیئے جانے کا انکار کرتے تھے جیسا کہ فرقہ ماسلیدی، سرمنتی کارپوکراتی، دوسیٹی، گناستی، ناصری، پوی۔ ان کی تشریح جس کو منظور ہو تاریخ کلیسیا دیکھے۔ اس پر بعض پادریوں کا یہ کہنا کہ مسیح کا مصلوب ہونا اور زندہ ہونا اسی وقت سے عیسائیوں میں مسلم الکل ہو گیا تھا دعویٰ بلا دلیل ہے"[4]۔

سورۃ نساء کی آیت "يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ .... وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا (النساء۴ : ۱۷۱) کی تفسیر میں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے غلو پر مبنی مسیحی عقائد کا مدلل رد کیا ہے۔ اور قرآنی بیان کی صداقت

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ج ا، ص ۱۴۹۔۱۶۲

2 ایضاً، ص ۲۱۱۔۲۱۶

3 ایضاً، ج ۵، ص ۴۹۔ ۷۲

4 ایضاً، ج ۳، ص ۱۱۷

پر منطقی و منقولی دلائل پیش کیے ہیں[1]۔ اسی طرح سورۃ مائدۃ میں " لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم۔۔۔" کی تفسیر میں فلسفیانہ بنیاد پر الوہیت مسیح و تثلیث کا ابطال کیا گیا ہے[2]۔

مولانا قرآنی بیانات کی روشنی میں مروجہ انجیلی بیانات کو محرفہ قرار دے کر انہیں قابل اعتبار نہیں گردانتے۔ مثلاً سورۃ مریم میں تذکرہ حضرت یحیٰ علیہ السلام میں لکھتے ہیں؛

"رضاعت کے زمانے میں یحیٰ کا کلام کرنا انجیل میں ہے قرآن میں نہیں۔ سو یہ کچھ اختلاف ایسا نہیں کہ جس سے ایک کو غلط اور ایک کو صحیح کہنے کی نوبت پہنچی۔ خود چاروں انجیلوں میں اس قسم کی کمی زیادتیاں ہیں۔ ایک میں ہے کہ مجوسی ستارہ کے اشارہ کے بعد مسیح کے پاس آئے دوسری میں نہیں۔ علی ہذا القیاس اور جو اختلاف ہے بھی تو اس میں قرآن مجید کا ہی عقلاً و نقلاً اعتبار ہونا چاہیے نہ کہ ان کی کتب محرفہ کا"[3]۔

سورۃ انبیاء کی تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ادریسؑ، ذی الکفلؑ، حضرت یونسؑ، حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کے بارے بائبلی بیانات بھی نقل کیے ہیں[4]۔ اس سے ماقبل عموماً مسلم مفسرین اردو تفاسیر میں صرف مسلم نقطہ نظر ہی بیان کرتے تھے بائبلی قصص سے نظیر پیش کرنے کا رویہ معدوم تھا۔

سورہ الصف کی آیت من بعدی اسمہ احمد کی تفسیر میں " فارقلیط " پر بحث کے ساتھ ساتھ توریت اور انجیل کی تاریخ تدوین پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مروجہ اناجیل کے علاوہ ایک کتاب دیئے جانے کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور مسیحی عقیدہ کے مطابق انجیل سے قوت الہام یا بشارات وغیرہ مراد نہیں لیتے۔

" اس میں کوئی شبہ بھی اہل اسلام کو نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل کی تھی کما قال و اتیہ الانجیل۔ کہ ہم نے عیسیٰ کو (نہ کسی اور کو) انجیل عطا کی۔ انجیل کے حضرت مسیح علیہ السلام کو دیئے جانے سے ان کو صرف قوت الہام و بشارات دیا جانا مراد لینا ایک بے کار توجیہ اور سست تاویل ہے۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کتنی بڑی کتاب تھی اور کس طرح اور کس وقت لکھی گئی؟ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی موجودگی میں کس کے پاس رہا کرتی تھی۔؟ مگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے الہامات کو جمع کرایا تھا اور یہی وہ کتاب

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ج ۵، ص ۲۵۱۔ ۲۵۴

2 ایضاً ج ۴، ص ۴۷۔ ۴۹

3 ایضاً، ج ۵، ص ۱۳۷۔ ۱۳۸

4 ایضاً، ص ۱۶۷۔ ۱۷۳

مقدس انجیل تھی جس پر اہل اسلام کو ایمان لانا ضروری ہے[1]۔

تحریف بائبل پر قلم اٹھاتے ہوئے پادری فانڈر کا اعتراف تحریف یوں بیان کرتے ہیں؛

" قولہ اگرچہ ہم لوگ قائل ہیں کہ بعض حروف و الفاظ میں تحریف وقوع میں آئی اور بعض آیات کے مقدم و مؤخر اور الحاق کا شبہ ہے تو بھی انجیل کو بے تحریف کہتے ہیں کہ اس لحاظ سے کہ اس کا مضمون اور مطلب نہیں بدل گیا"۔۔۔ پادری صاحب کو اختیار ہے یا یوں اور کتابوں اور آیتوں کے تبدل و تغیر و الحاق پر بھی اور مصنفوں کے نام معلوم نہ ہونے پر وہ اپنی کتاب کو بلا تحریف کہیں مگر لطف یہ ہے کہ پادری فینڈر صاحب بھی صفحہ ۱۳۰ میں کہتے ہیں قولہ کہ یہ بات سچ ہے کہ ویریس ریڈنگ (غلطی کتابت) بہت ہیں اور ہر حال میں تمام یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ صحیح کون ہے"[2]۔

ابتداء تفسیر کی نسبت آخری پاروں میں بعض امور کہ جن پر پادری صاحبان معترض ہیں، تھوڑی سی بحث کر کے گذر جاتے ہیں اور وہاں تفصیلی تردید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً سورۃ الاحزاب نکاح زینبؓ پر مسیحی معترضین کا ذکر کیے بغیر جواب دیا گیا ہے[3]۔ اور سورہ النجم میں قصہ غرانیق کے بارے کوئی بات نہیں کی گئی اور نہ ہی اس بارے الزامات کا رد کیا ہے[4]۔

یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہو گا کہ ۱۳۰۵ ھ میں تفسیر کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد اس پر اعتراضات ہونے لگے۔ محمد صالح اور محمد صادق نامی مؤلفین نے "جواب تفسیر حقانی" کے ذریعے اعتراضات کیے۔ نیز "ریویو تفسیر حقانی" نصرت المطابع، دہلی سے شائع ہوا۔ مخالفین کی نقد کے بعد بار دوم کے مطبوعہ اشاعت میں قابل اعتراض باتیں حذف کر دی گئیں[5]۔

تردید مسیحیت میں مفصل مباحث کی حامل اردو کی یہ اولین تفسیر اس دور کا ایک مسلم علمی ورثہ ہے۔

---

1 حقانی، تفسیر حقانی، ج ۷، ص ۱۰۰

2 ایضاً، ص ۱۳۱

3 ایضاً، ج ٦، ص ۷۷۔ ۷۹

4 ایضاً، ج ٦، ص ۳۰۸

5 شطاری، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، ص ۴۵۷۔ ۴۵۸

تفسیر ثنائی مولانا ثناء اللہ امر تسری (۱۲۸۷ھ / ۱۸۶۸ء ۔ ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء)

مسلم مسیحی کشمکش کا ایک اثر تفسیر ثنائی میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جس کے مصنف اپنے عہد کے معروف عالم دین مولانا ثناء اللہ امر تسری تھے۔

امام المتکلمین، رئیس المناظرین، شیخ الاسلام، مبلغ قرآن و سنت سے ملقب مولانا ثناء اللہ سرینگر (کشمیر) کے علاقہ ڈوڈہ کے ایک منٹو خاندان میں ۱۲۸۷ھ / ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ مفسر، محدث، خطیب، ایڈیٹر، مصنف، متکلم اور لاثانی مناظر کی حیثیت سے تصنیف و تالیف و تبلیغ و تقریر اور تنظیمی و سیاسی میدان میں گراں قدر خدمات سرانجام دیتے ہوئے، زندگی کی اکیاسی بہاریں دیکھنے کے بعد ۳ جمادی الاولی ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے[1]۔

چودہ سال کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہوگئے۔ حصول تعلیم کا آغاز مولانا احمد اللہ امر تسری (م ۱۳۳۶ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہوئے کیا اور پھر استاد پنجاب مولانا عبد المنان وزیر آبادی، (۱۳۳۴ھ)، شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی (۱۳۲۰ھ)، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی (۱۳۳۹ھ) اور مولانا احمد حسن کانپوری جیسے شہرہ آفاق اساتذہ سے حدیث و دیگر فنون میں مہارت حاصل کی[2]۔

اللہ تعالی نے وجاہت و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ مرنجاں مرنج طبیعت کے حامل مولانا کو بہترین اخلاق، عمدہ عادات، ذہانت و فطانت، حاضر جوابی، صبر و حلم، خوش مزاجی، شیریں مقالی، منکسر المزاجی اور دوسرے اعلیٰ خصائص سے نوازا تھا۔ جن کے ساتھ حقیقت میں "تخلقوا باخلاق اللہ" کی سچی تصویر مولانا کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ہندوستان پر تسلط واقتدار کے بعد انگریز حکومت نے تمام مذاہب کے پیروکاروں کو ایک دوسرے پر طنز و استہزاء کی دانستہ چھوٹ دے دی، جس کے پیچھے استعماری مقاصد پنہاں ہونے کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مشق نے نقدِ تعلیمات کی بجائے دوسرے مذاہب کی تکذیب و تحقیر کی تاریخ زیادہ رقم کی اور اس کا سب سے بڑا ہدف اس دور کا سیاسی طور پر مغلوب فریق مسلمان ہی ٹھہرا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں ہی خارجی طور پر غیر مسلموں (خصوصاً مسیحی مشنریز اور آریہ سماج) کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں پر سب سے زیادہ نظریاتی حملے کیے گئے اور اسی عہد میں مختلف اسلامی گروہوں کے باہم دست و گریبان ہونے کا مظاہرہ زیادہ شدت سے سامنے آیا۔ اس وقت ایک بڑا خطرہ مغربی تنقید سے حد درجہ متاثر، تشکیک کا شکار اور متزلزل

---

1 عراقی، عبد الرشید، تذکرۃ ابو الوفاء، (ندوۃ المحدثین، گوجرانوالہ ۱۹۸۴ء)، ص ۱۷، ۵۱

2 فضل الرحمن، حضرت مولانا ثناء اللہ امر تسری، (دار الدعوۃ السلفیہ، لاہور ۱۹۹۴ء)، ص ۴۲۔۴۴

ہونے والے عقل پرست گروہ سے تھا۔ اس کے نتیجہ میں دفاع اسلام کی بعض ایسی کاوشیں سامنے آئیں جن میں اسلام اور قرآن کی اس انداز میں تشریح و توضیح کی گئی جو تمام راسخ العقیدہ مسلم گروہوں کے نزدیک مردود اور تحریف کے زمرے میں آتی تھی۔ اس نازک اور ذہنی انتشار کے دور میں مختلف فکری گروہ اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے قرآن حکیم کی تفسیر و تاویل کرنے لگے۔اس پس منظر میں غیر مسلم آریہ اور عیسائی پادریوں کی طرف سے قرآن مجید پر شدید اور جارحانہ انداز میں اعتراضات سامنے آئے۔ان کی طرف سے قرآن کریم کی صحیح تعبیر کی تکذیب واستہزاء اور غلط تشریحات کے ذریعے اپنی مذہبی کتب کے الہامی ہونے پر دلیلیں پیش کی جاتیں۔ مسلم نظریہ وحی، نظریہ توحید، قرآنی احکام، طریق عبادت، اخلاقی تعلیمات غرض سب کو غیر عقلی اور ناقابل عمل قرار دینے کی سعی ناشدنی کا مظاہرہ کیا گیا۔عہد متذکرہ سے ماقبل کا تفسیری ادب تفہیم قرآن میں تو ضرور مدد گار تھا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو یہ راہ سجھانے میں معاون نہ تھا کہ ان کے دین و عقیدہ پر مذکورہ گروہوں کے اعتراضات و نقد کا جواب کیسے دیا جائے۔ یعنی تمام تر خوبیوں کے باوجود ایک خلا موجود تھا جسے پُر کرنے کی سعادت بقول فضل الرحمن مولانا ثناء اللہ کو حاصل ہوئی[1]۔

مولانا نے ان تمام حالات کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لیا اور خالص علمی اسلوب اور دعوتی و تجزیاتی انداز میں دفاع اسلام اور تائید قرآن کے محاذ پر مصروف عمل علماء کرام کے ساتھ کھڑے ہوئے بلکہ زمام محاذ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ایک کامیاب وکیل کا کردار نبھاتے ہوئے ان معترضین سے چومکھی لڑائی لڑی[2]۔اپنے دور کی اس کامیاب مناظر شخصیت کے متعلق لکھا گیا ہے:

"اگر پوری دنیائے اسلام کے اکابر علماء کسی ایک مجلس علمی میں جمع ہوں اور بیک وقت عیسائیوں، آریوں، سناتن دھرمیوں، ملحدوں، نیچریوں، قادیانیوں، شیعیوں، منکرین حدیث، چکڑالویوں، بریلویوں اور دیوبندیوں سے غرض ہر فرقہ سے ایک ایک گھنٹہ مسلسل نو گھنٹے بحث و مذاکرہ کی نوبت پیش آئے تو عالم اسلام کی طرف سے کون ہستیاں ہوں مجھے نہیں معلوم لیکن پاکستان، ہندوستان، برما اور لنکا، جزیرہ جاوا، سماٹرا کی طرف سے صرف ایک ہستی پیش ہو سکتی تھی اور وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کی تھی"[3]۔

سید سلیمان ندوی دفاع اسلام کے بارے مولانا کی خدمات کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

---

1 فضل الرحمن، مولانا ثناء اللہ امرتسری، ص ۱۲۳

2 ندوی، عبد المتین، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیری خدمات، (چودہ سو برس کی تفسیریں، خدا بخش لائبریری، پٹنہ) ص ۳۰۲، ۳۰۳

3 سوہدروی، عبد المجید خادم، سیرۃ ثنائی، (نعمانی کتب خانہ، لاہور ۱۹۸۹ء، بار اول)، ص ۲۱۔۲۲

"اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا ان کے حملے کو روکنے کے لیے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا، اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انہوں نے عمر بسر کر دی۔ مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد تھے زبان اور قلم سے جس نے بھی حملہ کیا اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا وہ آپ ہی ہوتے"۔

آپ نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا، تفسیر نویسی کے حوالے سے رقم طراز ہیں؛

"چوتھی شاخ میری تصانیف کی تفسیر نویسی ہے۔ یوں تو میری سب تصانیف قرآن ہی کی خدمت ہیں، مگر خاص تفسیر نویسی سے بھی غافل نہیں رہا۔ روزانہ درس قرآن کے علاوہ میں نے " تفسیر ثنائی " غیر مسبوق طرز پر اردو میں لکھی جو آٹھ جلدوں میں ختم ہو کر ملک میں شائع ہوئی"۔

اور تفسیر لکھنے کا سبب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں؛

"اس تفسیر کے لکھنے کا مجھے دو وجہ سے خیال پیدا ہوا۔ ایک تو میں نے دیکھا کہ مسلمان عموماً فہم قرآن شریف سے ناواقف بلکہ شناخت حروف سے بھی ناآشنا ہیں۔ ایسے وقت میں عربی تصانیف سے ان کا فائدہ اٹھانا قریب محال ہے۔ اردو تفاسیر سے بھی کسی قدر طوالت کے عام لوگ مستفید نہیں ہو سکتے، نیز ان کا طرز بیان خاص طریقے پر ہے۔
دوم میں نے مخالفین کے حال پر غور کیا تو باوجود بے علمی اور ہیچمندانی کے مدعی ہمہ دانی پایا۔ خدا کی پاک کتاب پر منہ پھاڑ پھاڑ کر معترض ہو رہے ہیں۔ حالانکہ کل سرمایہ ان کا سوائے تراجم اردو کے کچھ بھی نہیں، جن میں بعض تو تحت لفظی ہیں اور بعض کے محاورات بھی انقلاب زمانہ سے منقلب ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ بھی مطلب بتلانے سے عاری ہیں۔ مع ہذا میں نے قرآن کریم کو جامع علوم عقلیہ و نقلیہ بالخصوص علم مناظرہ میں امام پایا۔ دعوے پر دلیل ایسے ڈھب کی ادا ہوتی ہے کہ ہر ایک درجے کا آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ گو اس کی فاضلانہ تقریر کے سمجھنے کو بہت بڑے علم اور خوض کامل کی ضرورت ہے۔ گو تراجم بامحاورہ بھی ہوں مگر جب تک حسب موقع شرح نہ کی جائے، عام بلکہ متوسط درجے کے خواص بھی فہم و مطالب سے کماحقہ بہرور نہیں ہو سکتے۔ بالخصوص جب کہ ایک مسلسل بیان کی صورت میں لایا جاوے (جیسا کہ عاجز نے کیا) تو عجیب ہی لطف پیدا کرتا ہے۔ آج تک ہمارے مفسرین نے اس طرف توجہ نہیں کی، صرف تفسیر رحمانی کے مؤلف مرحوم و مغفور نے کسی قدر التفات کیا۔ مگر میں نے بعض مقامات کے حل مطالب کے لیے شان نزول کا ذکر بھی ضروری سمجھا۔ سو ہر آیت کے متعلق جہاں تک منقول تھا، اس کو بھی نقل کیا اور بعض مقامات میں رد مخالفین کی طرز پر اور بعض جگہ نادان موافقین کے جواب بھی لکھے"[1]۔

1 امر تسری، ثناء اللہ، تفسیر ثنائی، (مکتبہ قدوسیہ، لاہور ۲۰۰۲ء)، ج ۱، ص ۵

ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل اس تفسیر کی جلدوں کی تقسیم اور سن اشاعت حسب ترتیب ہے۔

جلد اول	طبع اول ۱۳۱۳ھ،	مطبع چشمہ نور، امر تسر	سورۃ فاتحہ تا سورۃ بقرۃ	صفحات ۲۴۰
جلد دوم	طبع اول ۱۳۱۷ھ،	مطبع چشمہ نور، امر تسر	سورۃ آل عمران تا سورۃ نساء	صفحات ۲۲۴
جلد سوم	طبع اول ۱۳۴۲ھ،	مطبع روز بازار، امر تسر	سورۃ مائدۃ تا سورۃ اعراف	صفحات ۱۸۴
جلد چہارم	طبع اول نامعلوم،	طبع ثانی ۱۹۳۱ء	سورۃ الانفال تا سورۃ سورۃ نحل	صفحات ۱۲۸
جلد پنجم	طبع ۱۳۲۵ھ،	مطبع اہل حدیث، امر تسر	سورۃ بنی اسرائیل تا سورۃ الفرقان	صفحات ۲۱۸
جلد ششم	طبع ۱۳۲۹ھ،	مطبع اہل حدیث، امر تسر	سورۃ الشعراء تا سورۃ یسین	صفحات ۲۰۰
جلد ہفتم	طبع ۱۳۴۴ھ،	مطبع روز بازار، امر تسر	سورۃ الصفت تا سورۃ سورۃ النجم	صفحات ۲۰۲
جلد ہشتم	طبع ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۱ء		سورۃ القمر تا سورۃ الناس	صفحات ۱۸۴ [1]

مولانا ثناء اللہ نے تفسیر میں یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ آیات قرآنیہ کے تحت فرمایا اور بعد مسلسل تفسیر کی ۔ اگر دوران تفسیر مزید وضاحت کی ضرورت پیش آئی تو سب سے نیچے حواشی میں اس کا اندراج فرما۔ جن میں بیشتر مخالفین اسلام کے مسکت جوابات ہیں۔ جو طرز تحریر مولانا نے تفسیر ثنائی میں اپنایا ہے اردو میں لکھی جانے والی تفاسیر میں ماقبل نہیں پایا جاتا۔ بقول مولانا؛" میرا طرز بیان پہلے اردو تفسیر میں نہیں آیا۔ جس نے اختیار کیا وہ میرے بعد غالباً دیکھ کر کیا"۔

تفسیر میں قرآنی بیان کی تاریخی توضیح جہاں تک ممکن ہو سکے بائبل سے کرتے ہیں، جہاں بائبل اور قرآنی بیان کا اختلاف ہے، اسے بیان کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ القصص[2] میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک قبطی کے مقابل ہم قوم ایک فرد کی مدد میں ہاتھ بڑھانے کے واقعہ کی بابت رقم طراز ہیں ؛

" موجودہ بائبل میں قرآن مجید سے جہاں اور بعض مقامات میں اختلاف ہے ، یہاں بھی ہے۔ بائبل میں اس قصے کو یوں بیان کیا ہے " جب وہ (موسیٰ) دوسرے دن باہر گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو عبرانی آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔۔۔ عبرانی بنی اسرائیل کو کہتے تھے بائبل کے بیان سے معلوم ہوا کہ دونوں اسرائیلی تھے مگر قرآن مجید میں دوسرے دن کے لڑنے والوں میں سے ایک ان دونوں (موسیٰ اور اسرائیلی) کا مشترک دشمن کہا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسرائیلی نہ تھا بلکہ قبطی تھا۔۔۔ یہ کیوں کر باور ہو سکتا ہے کہ توریت اور قرآن

1 ندوی، عبد المتین، مولانا ثناء اللہ امر تسری کی تفسیری خدمات، ص ۳۱۱

2 فَلَمَّآ أَنْ أَرَادَ أَن يَبْطِشَ بِٱلَّذِى هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يَـٰمُوسَىٰٓ أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِى كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِٱلْأَمْسِ (القصص ۲۸ : ۱۹)

کے اختلاف کی صورت میں توریت کا بیان مقدم سمجھا جائے ۔ پس جو کچھ قرآن مجید میں ہے مقدم سمجھا جائے"[1]۔

سورۃ اعراف کی تفسیر میں توریت میں مذکور حضرت موسیٰ کی زبان سے ایک نبی کے بارے واردہ پیشین گوئی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ پادری فانڈر سمیت اکثر مسیحی اہل قلم نے اس کا مصداق حضرت عیسی علیہ السلام کو ٹھہرایا تھا۔ لیکن مولانا ان کے دعویٰ کو رد کرتے ہوئے متعین الفاظ میں عہد نامہ جدید کی روشنی میں اس کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کی ذات پر کرتے ہیں۔ مولانا بہت خود اعتمادی کے ساتھ یوں گویا ہوئے ہیں ؛"

" پادری صاحب نے غضب کیا کہ اعمال ۳ باب کی آیت گیارہ کو بھی اپنے ثبوت میں کہ یہ پیشن گوئی مسیح کے حق میں ہے ، پیش کر دیا۔ اس لیے سب سے پہلے اسی گواہ سے کہلوانا چاہتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے"[2]۔

پھر مولانا بعض شبہات دور کر کے اپنا دعویٰ بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں اور نتیجہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؛

" منصفو ! بتلاؤ اس سے بڑھ کر کوئی ثبوت ہو سکتا ہے کہ خود باقرار بائبل ثابت ہوا کہ مسیح اور ہے اور وہ نبی جو استثناء ۱۸ کی ۱۵ میں موعود ہے ،اور ہے "[3]۔

اپنے اثبات دعویٰ کے بعد تائید مزید کے لیے عہد نامہ جدید سے " فارقلیط" کی پیشین گوئی پر قلم اٹھاتے ہیں اور صراحت کرتے ہیں کہ اس میں حضرت عیسی علیہ السلام نے آنے والے نبی کو پانچ امور تفویض کرنے کی بات کی ہے جو کہ نبی اکرم ﷺ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے[4]۔ یوں بائبل سے ہی منقولی انداز میں اپنا مقدمہ پیش کیا ہے[5]

سورۃ سباء کی آیت قُلِ ٱدْعُوا۟ ٱلَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۖ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِى ٱلْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شِرْكٍ وَمَا لَهُۥ مِنْهُم مِّن ظَهِيرٍ O وَلَا تَنفَعُ ٱلشَّفَٰعَةُ عِندَهُۥٓ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُۥ"[6] کی تشریح میں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے مسیحی عقیدہ الوہیت کا تضاد ان الفاظ میں کرتے ہیں ؛

---

1 امر تسری ، تفسیر ثنائی ،ج ۱ ، ص ۴۲۷

2 ایضاً ،ص ۴۸۷

3 ایضاً ،ص ۴۹۰

4 ایضاً ،ص ۴۹۲

5 ایضاً ،ص ۴۹۲-۴۹۴

6 سبا ۳۴ : ۲۲-۲۳

" عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت مختلف خیالات رکھتے ہیں ۔ نافع ضار تو سب مانتے ہیں لیکن اس نفع اور ضرر کی وجوہات الگ الگ ہیں ۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ مسیح خود خدا ہے پادری فنڈر لکھتا ہے پہاڑ پر حضرت موسیٰ کو پکارنے والا مسیح ہی تھا ۔ (مفتاح الاسرار ، ص ۳۸) فہرست بائبل کے دیباچہ میں لکھا ہے " خدا نے ہمارے لیے جسم اختیار کیا (کتاب اللہ کا دیباچہ ، ص ۴) اس کے علاوہ کبھی یہ بھی اظہار کرتے ہیں کہ حضرت مسیح ہمارا شفیع اور سفارشی ہے ۔ یہی ان کا کلمہ ہے (واشهد الا شفيع الا المسيح) یعنی ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسیح کے سوا کوئی شفیع نہیں ہے ۔ قرآن مجید نے ان دونوں خیالوں کی تردید کی ہے ۔ پہلے خیال کی تردید تو اس طرح کی مسیح اور ان کے سوا تمام ما سوئی اللہ کی ذاتی ملکیت کی نفی کر دی کہ "لا يملكون مثقال ذرة "دوسرے خیال کی نفی کرنے کو فرمایا کہ کسی کی سفارش جب ہی کام دے گی کہ اللہ کے ہاں سے اجازت بھی ملے ۔ جب سفارش بھی حقیقتاً اللہ ہی کے اختیار میں ہو تو اس مطلب (شفاعت) کے لیے بھی اللہ ہی کو راضی کرنا چاہیے تا کہ وہ مالک اجازت فرمائے اور شفاعت قبول بھی کرے نہ کہ اسی شفیع سے وہ معاملہ کرنے لگ جائے جو اصل بخشنہار سے کرنا چاہیے ۔ پس ثابت ہوا کہ عیسائیوں کا خیال دربارہ حضرت مسیح ہر دو جہتوں سے غلط ہے "[1] ۔

سورۃ نمل میں مولانا نے قرآن کی صفت مھیمن کو واضح کیا ہے اور بائبل میں مندرج غلط بیان کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن کو بائبل کی تصحیح کے مقام پر فائز بتلاتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ قرآن کس نہج سے سابقہ کتب سماوی کا مھیمن ہے[2] ۔

عہد متذکرہ میں مسیحی مشنریز کی کاوشوں سے عام پڑھے لکھے افراد تک عہد نامہ جدید پہنچ چکا تھا اور مسلم نقطہ نظر سے وقت کی آواز تھی کہ ان اذہان کو مسیحی اثرات سے مسموم ہونے سے بچانے کے لیے قرآن کی تفسیر ان کے ہاتھوں میں پہنچائی جائے ۔ مولانا نے وقت کا یہ اہم تقاضا بخوبی نبھایا اور اس بات کا خصوصی اہتمام کیا کہ قرآن کے جو مقامات معترضین اپنے مقاصد کے لیے پیش کرتے ہیں ان کی یوں تفسیر کی جائے کہ اعتراضات یا ابہام باقی نہ رہے ۔ نیز مسیحی پروپیگنڈہ کو بھی ظاہر کیا جائے مثلاً جہاد کے بارے غلط پروپیگنڈہ کے متعلق لکھتے ہیں ؛

" (اہل یورپ کے) ان روشن ضمیر عیسائیوں کو تقدس مآب پادریوں نے یہاں تک بھی سمجھا رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں فرض ہے کہ ساری عمر میں ایک آدھ عیسائی کو ضرور ہی ماریں ۔ مسٹر (رسل) ویب نو مسلم امریکی لکھتے ہیں کہ مجھے ایک عیسائی نے پوچھا کہ کیا سچ ہے مسلمانوں کو جنت میں جگہ نہ ملے گی جب تک وہ ایک آدھ عیسائی کا خون نہ کریں ۔ افسوس ہے کہ اس روشنی کے زمانہ میں بھی مذہبی روشنی کے لحاظ سے یورپ اندھیر نگری ہے ہندوستان میں مشنری لوگ ایسے خیال ظاہر کرنے سے اس لیے بھی رکتے ہیں کہ

---

1 امرتسری ، تفسیر ثنائی ، ج ۳ ، ص ۷۹ ۔ ۸۰

2 ایضاً ، ج ۲ ، ص ۴۰۳

ان کو ڈر ہے کہ بھانڈا پھوٹ جائے گا، اور علمائے اسلام ہماری جہالت کی قلعی کھول دیں گے"[1]۔

مولانا کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی مسیحی معترض کی نشان دہی کیے بغیر اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جس میں بعض اوقات وہ اعتراض دہرا دیتے ہیں جب کہ کبھی صرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا جواب دیتے ہیں۔ صرف اکا دکا مقامات پر ہی معترض کا نام لے کر رد کرتے ہیں۔ برصغیر کی تبشیری تاریخ میں سب سے نمایاں پادری فانڈر کا ہے۔ جس کی جدید علم الکلام کی روشنی میں کردہ تنقید کے اس کے بعد آنے والے اکثر مبشرین خوشہ چین رہے۔ مولانا پادری فانڈر کا نام ذکر کے اعتراض کا رد کرتے ہیں جس میں اس معترض کا بطور فرد نہیں بلکہ نمائندہ کی حیثیت سے اس کا چناؤ کیا۔

سورۃ یٰسین آیت " واضرب لهم مثلاً اصحب القرية ۔ " پر اس مغالطہ آفرینی کو آشکار کرتے ہیں کہ قرآن نے الوہیت مسیح کا اقرار کیا ہے۔ بلکہ مختصراً واضح کیا ہے یہ مغالطہ مسلم مفسرین کی آراء کی بناء پر ہے۔ اگر قرآن کی اصطلاح کے مطابق اس کا مفہوم لیا جائے تو اشکال باقی نہیں رہتا۔

"اس بستی کی نسبت بعض مفسرین کی رائے ہے کہ وہ انطاکیہ تھی جس کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو بھیجا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد بھی چونکہ بواسطہ حضرت ممدوح خدا کے رسول تھے اس لیے خدا نے ان کو اپنا رسول کہا۔ اس سے بعض عیسائیوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ قرآن مجید بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا قائل ہے کیونکہ قرآن میں مسیح کے رسولوں کو خدا اپنے رسول کہتا ہے تو معلوم ہوا کہ خدا اور مسیح ایک ہی ہیں یا مسیح میں بھی الوہیت ہے۔ بغور دیکھا جائے تو عیسائیوں کے اس تمسک اور دلیل کی بنا ان مفسرین کے قول پر ہے جنھوں نے ایسی تفسیر کی۔ لیکن اگر ہم قرآن کی آیت کو قرآن مجید کی ہی اصطلاح میں دیکھیں تو نہ کوئی اعتراض ہے نہ کسی جواب کی حاجت کیونکہ جتنے اور مقامات پر یہ لفظ (انا ارسلنا) آیا ہے اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ خدا نے بلا واسطہ اپنے رسول بھیجے۔ پس یہاں بھی وہی مراد ہے۔ رہا یہ کہ وہ بستی کون سی ہے جس کا یہاں ذکر ہے سو اس طرح کا جواب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اس بستی کا نام نہیں بتلایا نہ اس کے رسول ﷺ نے اس کی تعیین کی ہے نہ تعیین کرنے میں کچھ مزید فائدہ ہے اگر ہوتا تو خدا خود ہی اس کا نام لے دیتا پس ہم بھی اس کی تعیین نہیں کر سکتے جس کو خدا نے مجمل چھوڑا"[2]۔

سورۃ المؤمن کی تفسیر میں مولانا نے ذنوب انبیاء اور خصوصاً ذنوب محمدیہ کا دوٹوک رد کیا ہے۔ اور بائبل کے محاورہ سے ثابت کیا ہے کہ نبی مخاطب کر کے یہاں امت مراد لی گئی ہے نہ کہ ذات نبی۔ عصمت انبیاء کے بارے

---

1 امر تسری، تفسیر ثنائی، ج ا، ص ۱۲۹

2 ایضاً، ج ۳، ص ۱۰۱

مسیحی نظریہ کہ سوائے حضرت عیسیٰؑ کے تمام انبیاء گناہ گار ہیں کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ سب نبی گناہ گار ہیں سوائے حضرت مسیحؑ کے۔ اس دعویٰ پر وہ قرآن میں سے یہ آیت اور اس جیسی اور آیات پیش کیا کرتے ہیں کیونکہ اس کے لفظی ترجمہ سے سمجھا جائے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ گناہگار تھے اس لیے گناہوں کی بخشش مانگنے کا ان کو حکم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید بلکہ دیگر کتب میں بھی یہ محاورہ ملتا ہے کہ نبی کو مخاطب کر کے امت کو حکم ہوتا ہے قرآن کی دوسری آیات میں حکم ہے "یا یھا النبی اتق اللہ ولا تطع الکفرین والمنافقین " اے نبی! اللہ سے ڈر اور کسی کافر یا منافق کی تابعداری نہ کریو اور فرمایا الم تر الی الملا من بنی اسرائیل وغیرہ۔ ان تمام آیات میں صیغہ مفرد مخاطب کا ہے یعنی ترجمہ ان کا یہ ہے کیا تو نے نہیں دیکھا وغیرہ مطلب ان سب آیات کا عام ہے یعنی امت کو حکم ہوتا ہے۔ بائبل میں بھی ہم کو یہ محاورہ ملتا ہے جہاں حکم ہوتا ہے۔

> اے اسرائیل ! سن لے اور اس کے کرنے پر دھیان رکھ تا کہ تیرا بھلا ہو۔ سن لے اے اسرائیل ! خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ (کتاب استثناء ۵ باب ۲ آیات) ان سب حوالجات میں اسرائیل بول کر بنی اسرائیل مراد ہیں۔ کیونکہ اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) تو تورات سے پہلے بہت فوت ہو چکے تھے ۔ اسی طرح آیت قرآنی میں صیغہ مفرد مخاطب کا بول کر تمام امت مراد ہے۔ بس معنی آیت موصوفہ کے یہ ہیں ۔ اے مسلمانو! تم اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرو۔ اس سے ثابت ہوا تو یہ مسلمان گناہگار ہیں اس سے ہم کو بھی انکار نہیں۔ اس مضمون کے ساتھ ساتھ یہ بحث بھی چھیڑی جا سکتی ہے کہ اگر دیگر انبیاء گناہگار ہیں تو انجیل کے حوالجات کے مطابق حضرت مسیح بھی بے گناہ نہ تھے مگر ہماری غرض اس سے وابستہ نہیں، اس لیے ہم اس کے درپے نہیں اللہ اعلم بعبادہ"[1]۔

سورۃ الفتح آیت کے ذیل میں معروف انجیلی اصطلاح" خدا کی بادشاہت" پر نئے پہلو سے روشنی ڈالتے ہوئے اس سے زمانہ محمدیہ مراد لیا ہے اور اس ضمن میں بائبل سے حضرت عیسیٰؑ کے بیانات اپنے موقف کی تائید میں نقل کیے ہیں اور ان کی مختصر توضیح بھی کی ہے۔ توریت کی پیشین گوئی" فاران" پر منطبق کرتے ہوئے اس سے عہد محمدیہ مراد لیا ہے[2]۔

سورۃ الصف کی آیت" یاتی من بعدی اسمہ احمد " کی تفسیر میں انجیل میں حضرت عیسی علیہ السلام کی ایک آنے والے کے متعلق پیشین گوئی درج کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ

---

1 امر تسری، تفسیر ثنائی، ج ۳، ص ۱۷۴

2 ایضاً، ج ۳، ص ۲۷۷

تمہارے لیے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو تسلی دینے والا تم پاس نہ آئے پر اگر میں جاؤں تو میں اسے تم پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے تقصیر وار ٹھہرائے گا گناہ سے اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے راستی سے۔۔۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ وہ سنے گی وہ کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی وہ میری بزرگی کرے گی[1]۔

مولانا نے مسیحی تشریح کے برعکس اس کا مصداق رسول اللہ ﷺ کو ثابت کیا ہے۔

" اس پیشین گوئی میں حضرت مسیحؑ نے آنے والے مقدس کی چند باتیں کہیں ہیں۔ (۱) تسلی دینے والا (۲) صاحب حکومت (۳) مسیح کا مصدق (۴) خدا کی طرف سے ان تینوں اوصاف پر غائر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اوصاف کا موصوف سوائے آنحضرت ﷺ کے حضرت مسیح کے بعد دوسرا کوئی نہ تھا۔

۱) تسلی دینے والا اس سے مراد یہ ہے کہ گناہ گاروں کو خدا کی رحمت کا امیدوار بنائے گا چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم میں صاف ملتا ہے " لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعاً " (اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو خدا سب گناہ بخش دے گا)

۲) صاحب حکومت مراد محض دنیاوی بادشاہ نہیں بلکہ دینی حکومت کا بادشاہ ہونا مراد ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کی نسبت مخالف موافق سب کا اتفاق ہے کہ آپ صاحب حکومت شرعیہ تھے اسی وجہ سے آپ نے مسیح کی واجبی عزت کا اظہار کر کے ان کے منکروں یہودیوں وغیرہم کو کافر قرار دے دیا۔

۳) مسیح کا مصدق ہونا تو ایسا واضح ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ایک طرف حضرت مسیح کے اشد ترین دشمن یہود تھے جو ممدوح کے حق میں سخت ترین مکروہ الفاظ بولتے تھے۔ دوسری طرف مسیح کے قائلین تھے جو ان کو اصل مرتبہ (رسالت) سے بلند کر کے الوہیت تک پہنچاتے تھے ان دو سخت ترین غالی جماعتوں میں حقیقی فیصلہ کرنا خدائی حکم سے پیغمبر اسلام (علیہ السلام) ہی کا کام تھا۔چنانچہ آپ ؐ نے بحکم الہٰی اس سخت ترین مشکل کا صاف لفظوں میں حل فرما دیا کہ مسیح نہ تو ربوبیت میں حصہ دار ہے نہ معمولی آدمی بلکہ "وجيها في الدنيا والاخرة ومن المقربين" دنیا اور آخرت میں بڑی عزت والا اور خدا کے مقربین میں سے ہے اس کے علاوہ صاف لفظوں میں فرمایا " ورسولاً الی بنی اسرائیل " (مسیح خدا کی طرف سے بنی اسرائیل رسول تھا)۔

۴) چوتھی بات تو بالکل صاف ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو کچھ کیا یا فرمایا وہ خدا کے حکم سے کیا۔ چنانچہ اس کے متعلق صاف ارشاد ہے " ان هو الا وحي يوحى " یعنی یہ قرآن جو محمد رسول اللہ ﷺ تم کو سناتے ہیں خدا کی وحی ہے (ان کا اپنا کلام نہیں) نتیجہ صاف ہے کہ ان اوصاف کا موصوف ہے وہ ذات ستودہ صفات ہے جس کا نام بہت تعریف والا محمد ہے علیہ السلام۔

---

1 یوحنا ۱۶: ۷۔۱۳

تفسیر میں مسیحیت کے علاوہ دوسرا مخاطب گروہ سرسید اور ان کے ہم فکر لوگ ہیں۔ مولانا تعقل پرست اور نیچری رویہ کے سامنے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لازم نہیں کہ قانون قدرت جیسے ایک انسان کی فہم میں آیا ہو ویسے ہی درست ہو بلکہ مختلف جہات سے اس کی کامل تعبیر ممکن ہے۔ بسا اوقات تعقل پسندی ایک ہی قانون فطرت کو مد نظر رکھتی ہے جب کہ دوسرے فطری پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہے، جس کی بناء پر وہ یا تو صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ گا یا پھر اس کی تشریح کا غلط طریق کار اختیار کر گئے۔ مولانا کے نزدیک ایسے کسی امر کو ایک پہلو سے ہی درست نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ قانون قدرت کی کلام الہیٰ سے تطبیق اس کی مسلم راسخ العقیدگی سے مخالفت کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ جس کا مظاہرہ وہ جا بجا سرسید کے رد میں کردہ بحث میں کرتے ہیں۔

بعض مقامات پر عیسائیوں کے ساتھ ساتھ ہندو معترضین کا جواب ان کی مذہبی کتب سے استشہاد کرتے ہوئے دیتے ہیں۔ اسلام میں قربانی کے بارے اکثر ہندو معترض ہوتے تھے۔ مولانا قرآنی بیان"وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا[1]"کے تحت لکھتے ہیں؛

> " قرآن مجید کے اس دعویٰ کا (کہ ہر قوم میں قربانی کا حکم ہے) ثبوت آج بھی مذہبی کتب میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کی بائبل تو قربانی کے احکام سے بھری پڑی ہے۔ تورات کی دوسری کتاب خروج میں عموماً یہی احکام ہیں ۔ تعجب تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ہندوں اور آریوں کے مسلمہ پیشوا منوجی فرماتے ہیں یگیہ (قربانی) کے واسطے اور نوکروں کے کھانے کے واسطے اچھے ہرن اور پرند مارنے چاہیے اگلے زمانے میں رشیوں نے یگیہ کے لئے کھانے کے لائق ہرن اور پکشیوں کو مارا ہے۔ شری برہما جی نے آپ سے آپ یگیہ (قربانی) کے واسطے پشو (حیوانوں) کو پیا کیا اس سے یگیہ میں جو قتل ہوتا ہے وہ بدہ نہیں کہلاتا۔ ان حیوان ، پرند ، کچھو وغیرہ یہ سب یگیہ کے واسطے مارے جانے سے اعلیٰ ذات کو دوسرے جنم میں پاتے ہیں ۔(ادھیائے ۵ شلوک ۲۲، ۲۳، ۳۹، ۴۰) گو آج کل کے ہندو یا آریہ ایسے مقامات کی تاویل یا تردید کریں مگر صاف الفاظ کے ہوتے ہوئے ان کی تاویل کون سنتا ہے۔ اس جگہ ہم نے صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن شریف نے جو دعویٰ کیا ہے وہ الحمدللہ اپنا ثبوت رکھتا ہے "[2]۔

اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم مباحث تردید قادیانیت کے بارے میں ہیں۔ جس میں مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی کا عقلی و نقلی رد کرتے ہیں۔ قادیانیت پر مولانا کی گرفت کا اندازہ آپ کے لقب " فاتح قادیان" سے لگایا جا سکتا ہے۔

---

1 الحج ۲۲ : ۳۴

2 امرتسری، تفسیر ثنائی، ص ۳۱۲

مولانا بعض اوقات منطقی جب کہ کسی جگہ معقولی اسلوب اختیار کرتے ہیں لیکن اکثر منقولی انداز میں بائبل اور قرآن کا موازنہ کرتے ہیں۔

نیز مولانا اپنی فہم کو عقل کل نہیں سمجھتے بلکہ قارئین سے اپنے ترجمہ اور تفسیر میں تصحیح یا بہتری کی تمنا رکھتے ہیں۔
سورۃ القصص کی آیت ۴۶ کا آزاد ترجمہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں؛

"اس آیت کا ترجمہ بہت مشکل معلوم ہوا تین دفعہ تو لیکن سے استدلال ہوا پھر اس کا مستثنی منہ سب مفرغ ہے اس لئے میں نے ترجمہ کیا ہے اصل کلام یوں سمجھ کر کیا ہے۔ اس پر اگر کوئی اعتراض ہو تو میں سن کر غور کروں گا۔ ان شاء اللہ"[1]۔

مولانا کا اسلوب رواں، سادہ اور آسان الفاظ میں گنجلک علمی مباحث اور دقیق اصطلاحات کو عام قاری کی لیاقت کو مد نظر رکھ کر واضح کرنا ہے۔ چنانچہ آسان فہم ہونے کی بنا پر قاری کی دلچسپی از اول تا آخر قائم رہتی ہے۔ اور وہ اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ تکرار لفظی نہ ہونے کے برابر ہے اور ایک ماہر جوہری کی مانند الفاظ کے موتیوں کا مناسب جگہ پر چناؤ مولانا کے ادبی ذوق و مہارت کی عکاسی کرتا ہے۔

مولانا کے بیان میں اختصار پسندی، بے جا طوالت، دور از کار تاویلات کے ذریعے نتائج کشید کرنے سے پاک ہے۔ اختصار کے پیش نظر، جیسا کہ خود مقدمہ تفسیر میں اشارہ کرتے ہیں، اصولی رد کا طریق اپناتے ہوئے تجزیہ اور اس کا مختصر نتیجہ بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جامع احاطہ نہیں کرتے۔ اصولاً الوہیت مسیح کا رد کیا کہ اگر وہ شفیع ہے تو غفار کون ہو گا؟

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس تفسیر میں طرفین میں جاری طویل کلامی مباحث کے نتائج کا ملخص لب لباب اصولی، منطقی اور منقولی الفاظ میں یوں سمو دیا کہ گویا ڈیڑھ صدی سے جاری مباحث کو سمیٹ دیا ہو۔

سابقہ اوراق میں مذکورہ تینوں تفاسیر کے جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ باوجود تردید مسیحیت کے، سرسید کی تفسیر پر ایجابی اثرات نمایاں ہیں۔ سرسید کا رجحان مناظرانہ نہیں بلکہ معقولی اسلوب میں بحث و نقد کرنا ہے۔ ان کے مخاطب عامۃ اللناس کی بجائے یورپی افکار سے متاثرہ تعقل پرست گروہ تھا۔ جب کہ راسخ العقیدہ فکر کی نمائندگی کرنے والے مولانا حقانی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کا رجحان تردیدی ہے، جس پر مناظرانہ رنگ غالب ہے۔

ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دائرہ فکر میں رہتے ہوئے دین کی خدمت میں ہمتِ کمر باندھی جس کے پیچھے دفاع دین کا جذبہ کارفرما تھا اور اپنی اپنی جگہ دونوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

---

1 امرتسری، تفسیر ثنائی، ج ۲، ص ۴۳۴

خلاصة البحث

خلاصۃ البحث

" برصغیر میں مسیحی سکالرز کا پیش کردہ قرآنی لٹریچر (۱۸۳۷ء۔۱۹۴۷ء) ایک تاریخی، تحقیقی، تنقیدی جائزہ" کے موضوع پر مقالہ ہذا پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں برصغیر میں تاریخ مسیحیت، مسیحی اہل قلم کا قرآنی لٹریچر اور ان کا انتقادی منہج، اس کے جواب میں مسلم علماء کی کاوشیں اور برصغیر کے تفسیری ادب پر مسلم مسیحی کشمکش کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس بحث کے نتیجہ میں یہ امور سامنے آئے۔

برصغیر میں مسیحیت کے نقوش کافی قدیم ہیں، جن کا حتمی تعین متنازع فیہ مسئلہ ہے۔ چند مختلف فیہ وشاذ آراء کی بنیاد پر بعض مقدس ہستیوں کی ہند آمد کا دعوی کیا جاتا ہے جن میں حضرت عیسی علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام اور برتلمائی وتوما حواری شامل ہیں۔ محل نظر مسیحی دعوی میں باور کروایا جاتا ہے کہ توما حواری کی ۵۲ء کے لگ بھگ ٹیکسلا آمد سے یہاں ایک مسیحی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتداء تک ہندوستانی کلیسیا کی تاریخ 'ناکافی ثبوت'، 'خاموش تاریخ' اور 'تاریک دور' کے اقرار پر منتج ہوتی ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی تک برصغیر میں توما حواری کے پیروکاروں اور شامی کلیسیا سے منسلک مسیحی گروہ کی تاریخ ہی ملتی ہے۔ ۱۴۹۸ء میں پرتگیزیوں کی آمد سے رومی کیتھولک کلیسیا کے قدم یہاں پہنچے اور گوا میں پرتگیزی استعمار قائم ہوا۔ رغبت، دھونس، زبردستی، ریاستی جبر، سیاسی غلبہ اور تلوار کے سائے میں مفتوحہ علاقہ میں تبشیری کاوشیں بڑے جوش و خروش سے سرانجام دی گئیں۔ نو مسیحی افراد کو خصوصی معاشرتی مقام اور سہولتوں سے نوازا جاتا۔ تبشیری جذبہ سے ہی عہد اکبر میں مغلیہ دربار سے سفارتی تعلقات قائم کیے گئے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی ابتداء پہلے اکبر اور پھر جہانگیر کے دور میں مغلیہ دربار میں تجارت کی غرض سے آنے والے انگریزوں سے ہوئی۔ بعد میں جب برطانوی تجارت برطانوی استعمار میں ڈھل گئی تو مسیحیت کی عام اشاعت کے لیے مختلف پروٹسٹنٹ مشن ہندوستان آن وارد ہوئے۔ انگریز حکومت میں مسیحیت کی منظم تبلیغ کے ذریعے عام اشاعت کی گئی۔ پرتگیز اور انگریز استعمار میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر نے یہاں قدم رکھتے ہی مسیحیت کا متشددانہ پرچار شروع کر دیا جب کہ موخر الذکر گروہ کی دلچسپی ابتداء میں صرف تجارت اور سیاست پر ہی مرکوز رہی۔ پرتگیز اپنے مفتوحہ علاقے سے باہر نکل نہ پائے جب کہ انگریزی حکومت نے آہستہ آہستہ پورے ہندوستان میں مسیحی تبشیری مراکز کا جال بچھا دیا۔

مسیحیت کی اشاعت کے لیے تقریر و تحریر کے علاوہ معاشرتی تبدیلی اور مفادات کی ترغیب کا سہارا لیا گیا۔ دیگر علاقوں کی طرح ہندوستان میں مسیحی تبشیری مہم میں عقائد کی بجائے سماجی خدمت کے ذریعے پرچار کا پہلو غالب رہا۔ مسیحی لٹریچر میں اپنے مذہب کی دعوت و تبلیغ کے بارے تحریریں نسبتاً کم، جب کہ ہندومت اور خصوصاً اسلام کی

تنقید و تکذیب پر زیادہ قلم اٹھایا گیا۔ مسیحی اہل قلم نے خصوصاً قرآن اور سیرت النبیؐ کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا اور مقدس مسلم ہستیوں کو زیر بحث لایا گیا، جس میں تنقیص کا رجحان غالب تھا۔ قرآنیات میں ترجمہ و تفسیر قرآن کے علاوہ علوم القرآن مثلاً اعجاز قرآن، جمع و تدوین قرآن، تعلیمات قرآن پر نقد کیا گیا ہے۔ مسیحی اہل قلم میں غیر ملکی منادین اور مقامی نو مسیحی دونوں شامل ہیں۔ مسیحی مترجمین قرآن میں پادری عمادالدین اور پادری احمد شاہ شامل ہیں، جب کہ پادری جے علی بخش اور پادری سلطان محمد پال نے جزوی تفسیر کی۔ علاوہ ازیں قرآنیات پر لکھنے والوں میں بدیسی اہل قلم پادری سی جی فانڈر، پادری ایڈورڈ سیل، پادری کینن سیل، پادری ای ایم ویری، پادری ایل بی جونز وغیرہ جب کہ مقامی مسیحی حضرات میں اکبر مسیح، پادری برکت اللہ، پادری ٹھاکر داس، ماسٹر رام چندر، پادری غلام مسیح، بابو ہلاسی رام وغیرہ شامل ہیں۔ برصغیر کی بجائے کسی اور خطہ میں تبشیری سرگرمیوں میں مصروف عمل بعض دیگر مسیحی افراد کی تحریروں کا اردو ترجمہ بھی یہاں سے شائع کیا گیا، مثلاً پادری ایس ایم زویمر، پادری ایچ ٹی گیرڈنر وغیرہ۔ مقامی اہل قلم کی تحریریں اسلوب تحریر، اصول نقد، معیار فکر اور زبان دانی کے لحاظ سے بدیسی سے فروتر ہیں۔ استشراقی روایت اور عقلیت پسندی کی حامل بدیسی تحریروں میں معقولی رویہ اختیار کیا گیا ہے جب کہ مقامی اہل قلم کی تحریروں میں رکاکت، سوقیانہ پن، سطحی معلومات، اور معاندانہ اسلوب کا عام مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز دین اسلام سے ارتداد کرنے والوں کے سوا دیگر مسیحی اہل قلم کی اکثریت کو عربی زبان میں درک نہیں تھا اور نہ ہی علوم قرآن کی فنی مباحث کا کماحقہ علم۔

اہل کتاب کو " تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم " کی دعوت کے جواب میں قرآن کے بارے معاندانہ رویہ پر مشتمل تنقیص و تکذیب ریب و تشکیک اور تردید کا حامل مناظراتی مسیحی لٹریچر سامنے آیا۔ برصغیر میں مسلم مسیحی مناظراتی ادب میں سب سے زیادہ اہم موضوع " تحریف" رہا۔ دفاع بائبل کے لیے مسیحی تحریروں میں قرآن کو غیر الہامی ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ محرف ثابت کرنے پر زیادہ زور دیا گیا۔ چنانچہ مسیحی انتقادی ادب میں قرآن کو حالات کی پیداوار، زمانہ سازی، اختراعی گردانا گیا۔ اور اس پر بائبلی ادب اور اسفار متروکہ کا سرقہ شدہ چربہ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ قرآن پر داخلی اور خارجی ہر دو طرح سے نقد کیا گیا۔ اسلوب قرآن اور تعلیمات قرآن پر نقد کے ساتھ ساتھ بعض غیر مستند و شاذ روایات کی بنیاد پر جمع تدوین قرآن، اختلاف قرآءت کو موضوع بحث بنایا گیا۔ جب کہ بعض روایات کو اصل تناظر سے ہٹا کر مفہوم کشید کرنے کی کوشش کی گئی۔ معتبر ذرائع، مستند شواہد اور تاریخی حقائق کی حامل ترتیب توقیفی کے برعکس بعض آراء کی مدد سے قرآن کو زمانی ترتیب سے مرتب کرنے کی سعی لاحاصل بھی نظر آتی ہے۔ جیسے پادری جے علی بخش کی تفسیر قرآن۔ نیز بائبل میں ناسخ و منسوخ کو اصولی طور پر تسلیم کرنے

کے باوجود قرآن میں ناسخ و منسوخ کو ضرورتِ دعویٰ نبوت گردانا گیا۔ اس کے برعکس قرآن کو بائبل کا مصدق و مھیمن قرار دینے پر بھی زور دیا گیا۔

برصغیر کے مسیحی لٹریچر میں قرآن کریم پر نقد کا ماخذ و مصدر مستشرقین مغرب کے خیالات و آراء ہی ہیں۔ جن میں سے بعض مستشرقین خود یہاں آئے یا ان کے خیالات کو مقامی لٹریچر میں پیش کیا گیا۔ خود مغرب میں قرآن کے ترجمہ یا اشاعت پر سخت ردعمل سامنے آیا تھا۔ جب کہ یہاں پر ان کے خیالات کو پروان چڑھایا گیا۔ مقامی مسیحی قرآن پر تنقید میں کوئی نئی جہت متعارف کروانے سے قاصر رہے اور زیادہ تر اپنے بدیسی رہبروں کے درآمدی خیالات کے ہی خوشہ چین رہے۔

مسلم علماء نے غالب سیاسی گروہ کے مسیحی لٹریچر سے صرف نظر نہیں کیا بلکہ کسی کمزوری یا تحفظات کا شکار ہوئے بغیر دفاع قرآن میں ایک ایک موضوع پر مدلل، ہمہ جہت اور مفصل اسلوب میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ شائستگی و متانت اور تبحر علمی میں مخالف سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ برصغیر کا مسلم مسیحی مناظراتی ادب مذہبی کے ساتھ ساتھ فریقین کے سیاسی، سماجی اور علمی و فکری رویہ کو بھی آشکار کرتا ہے۔ مسلم علماء نے معترضین کی تدلیس و کذب بیانی، الزام تراشی اور مغالہ آفرینی کو بطریق احسن واضح کیا۔ لیکن یہ زیادہ تر ردعمل پر ہی مبنی رہا جس میں بعض اوقات سخت لب لہجہ کا رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ مسلم علماء کے ہاں صرف تحریف بائبل کا موضوع ہی الزامی طور پر غالب تر رہا۔ مسیحی اہل قلم کی طرح مقدس مسیحی ہستیوں کے خلاف قلم نہیں اٹھایا۔ عہد متذکرہ میں اصل مسیحی مصادر تک براہ راست رسائی نہ ہونے کی بنا پر مسلم مناظرین کا علم ثانوی مصادر سے ماخوذ رہا۔ مطالعہ مسیحیت کے بہت سے گوشے جامع انداز میں زیر بحث نہیں آئے جیسے کونسلوں کے ذریعے عقائد کی تشکیل، کلیسیائی اقتدار اور اس کے تاریخ پر اثرات، کلیسیا کا غیر معقول رجحان، مذہبی تبدیلی کے بارے استبدادی رویہ، مذہبی علوم پر مخصوص گروہ کی اجارہ داری اور عوام الناس کے لیے ان کی عدم رسائی، پاپائیت کے ذریعے مالی و سیاسی استحصال، اور کارپردازان کلیسیا کی اخلاقی حالت جیسے موضوعات کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مسلم مسیحی کشمکش کے برصغیر کے تفسیری ادب پر براہ راست دو طرح کے اثرات مرتب ہوئے۔ اور ایک طرف تو تعقل پرست متجددین کی طرف سے ایجابی اثرات کی حامل تفسیری آراء سامنے آئیں، جب کہ دوسری طرف راسخ العقیدہ علماء کی طرف سے تردیدی تفسیری ادب لکھا گیا۔ فریقین میں سے سرسید احمد خاں کی تفسیر پہلے فریق کی، جب کہ تبجیل التنزیل از سید ابولمنصور دہلوی، تفسیر حقانی از مولانا عبدالحق حقانی اور تفسیر ثنائی از مولانا ثناء اللہ امرتسری کو فریق ثانی کی نمائندہ گردانا جاسکتا ہے۔ مسلم علماء عمومی طور پر انفرادی جب کہ مسیحی گروہ اجتماعی اداروں کی سرپرستی میں مصروف کار رہے۔

اس کشمکش کا برصغیر کے تفسیری ادب پر ایک عمومی اثر یہ ہوا کہ مسیحی لٹریچر کے جواب میں مسلمان تفہیم قرآن کی طرف زیادہ معقولی انداز میں راغب ہوئے۔ نیز جدید مسلم علماء نے مسیحی عقائد کے ساتھ ساتھ انجیلی تعلیمات کے اثرات، مسیحی فرقوں، کلیسیا اور اس کے سیاسی و مذہبی غلبہ کی تاریخ کو بھی زیر بحث لانا شروع کیا جو اس سے قبل کے تفسیری ادب میں مفقود تھا۔

موضوع ہذا پر تحقیقی کاوش کے آخر میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ تقسیم ہند سے قبل کی کشمکش اور اس میں تند و تیزی کے باوجود یہ بات اہم ہے کہ تقسیم کے بعد فریقین میں رواداری کی اہمیت کو یکساں طور محسوس کیا گیا۔ غالباً اقلیتی فریق کو سیاسی سرپرستی سے محرومی نے اس کی ضرورت کا احساس دلایا۔ چند ایک واقعات کے سوا، جن کے پس پردہ غیر ملکی عناصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تقسیم ہند کے بعد مسلم مسیحی تعلقات بہتر رہے اور اس حوالے سے ماحول مجموعی طور پر پر سکون رہا۔

عالمگیریت کا عصر حاضر بین المذاہب مکالمہ کا دور ہے اور اس کا رجحان مناظراتی و تنازعاتی کی بجائے مکالماتی ہے یعنی (Dilouge, not Clash) وطن عزیز میں ہندوؤں کے بعد، مسلمانوں کے دوسرے بڑے مذہبی پڑوسی مسیحی ہیں۔ موضوع ہذا پر تحقیق کے نتیجہ میں فریقین کے ارباب خرد و دانش کے سامنے یہ سفارش کی جاری ہے کہ وسیع الظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علمی بنیادوں پر جدید اصول تحقیق و تنقید کی روشنی میں ایک دوسرے کے عقائد و افکار اور لٹریچر کا جائزہ لیں تا کہ ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے اور موجود تنفر و تعصب اور بُعد، باہمی الفت و یگانگت میں ڈھل جائے۔ نیز گلوبل دنیا کے سب سے بڑے دو گروہ باہم مل جل کر ہی موجودہ دنیا میں فلاح و نجات کے منصوبوں کو پروان چڑھا سکیں گے۔

واخر دعوانا الحمد للہ رب العالمین

کتابیات

کتابیات

- القرآن الکریم
- کلام مقدس، سوسائٹی آف سینٹ پال روما، ۱۹۵۸ء
- کلام مقدس، کیتھولک بائبل کمیشن پاکستان، ۲۰۰۷ء، اشاعت نہم
- کتاب مقدس، بائبل سوسائٹی، انار کلی بازار، لاہور ۱۹۹۰ء

الف

- ابن ابی شیبہ، عبداللہ بن محمد العبسی، المصنف، دار تاج، بیروت ۱۴۰۹ھ
- ابن حجر، عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری لشرح صحیح البخاری، دارالنشر الکتب الاسلامیہ، لاہور ۱۹۸۱ء
- ابن خلدون، تاریخ خلدون، القاہرہ ۱۳۲۹ھ
- ابن داؤد، ابو بکر عبداللہ بن سلیمان السجستانی، کتاب المصاحف، (تحقیق: د. محب الدین عبدالسبحان واعظ) دارالبشائر الاسلامیہ، بیروت، ۲۰۰۲ء، طبع ثانیہ
- ابو داؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، السنن، دارالسلام، الریاض
- ابوالسادات، عبدالرشید، برہان اعظم بجواب دین قیم، مطبع صدیقی، لاہور ۱۸۹۷ء
- ابوالمنصور، سید محمد، رقیمۃ الوداد، نصرت المطابع، دہلی ۱۸۷۴ء
- احمد خاں، ڈاکٹر، قرآن کریم کے اردو تراجم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء، بار اول
- احمد خاں، سر سید، تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام، غازی پور ۱۸۶۲ء
- احمد خاں، سر سید، تفسیر القرآن الکریم مع اصول تفسیر، لاہور، ۱۹۹۵ء
- احمد خاں، سر سید، الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ، مسلم پرنٹنگ پریس، لاہور ۱۹۱۴ء
- احمد خاں، سر سید، رسالہ اسباب بغاوت ہند، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی
- احمد الدین، بیان للناس، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور ۱۹۹۹ء
- احمد شاہ، پادری، مفتاح القرآن، ای جے لعزرس اینڈ کمپنی، بنارس ۱۹۰۶ء
- اسلم برکت، ریورنڈ، آئینہ چرچ آف پاکستان، لاہور ڈیوا سیس، لاہور ۲۰۰۲ء، اشاعت اول
- الاعظمی، صفی الرحمن، فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امر تسری، ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء، بنارس (انڈیا) ۱۹۷۹ء
- اکرام، محمد، شیخ، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۰ء، بار چہارم
- اکبر مسیح، تاویل القرآن، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور، ۱۹۵۲ء، بار دوم

- اکبر مسیح، سلک مروارید، لاہور ۱۹۲۸ء
- الہ دین، شیخ، بست سوال، قاسمی پریس، لودیانہ ۱۳۲۴ھ
- الہ دین، شیخ، مباحثہ، قاسمی پریس، لودیانہ ۱۹۰۸ء
- امداد صابری، آثار رحمت، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی س ن
- امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی ۱۹۷۹ء
- امرتسری، ثناء اللہ، مولانا، اسلام اور مسیحیت، نعمانی کتب خانہ، لاہور س ن
- امرتسری، ثناء اللہ، مولانا، تقابل ثلاثہ، نعمانی کتب خانہ، لاہور س ن
- انصاری، محمد حلیم، انجیل برنباس (اردو ترجمہ)، لاہور ۱۹۱۶ء
- انوار الحق، ریورنڈ، الناسخ والمنسوخ، میتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ ۱۹۲۶ء

ب

- بارکلے، ولیم، یسوع کے حواری، (مترجم: فادر رفیق مائیکل)، کیتھیکیٹکل سنٹر، ۱۰۴ موہن ٹیرس، بار اسٹریٹ، صدر کراچی ۱۹۸۴ء
- باری، کمپنی کی حکومت (تاریخ)، نیا ادارہ، لاہور ۱۹۶۹ء، طبع چہارم
- البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۹ء
- برکت اللہ، پادری، توضیح البیان فی اصول القرآن، پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۳۹ء
- برکت اللہ، پادری، صلیب کے ہراول، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۴۹ء
- برکت اللہ، پادری، قرون وسطی کی ایشیائی اور ہندوستانی کلیسائیں، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۶۲ء
- برکت اللہ، پادری، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۷۰ء، بار اول
- برکت اللہ، پادری، مقدس توما رسول ہند، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۱۹۴۸ء، بار اول
- بلجی، افتخار احمد، فتنہ انکار حدیث کا منظر و پس منظر، کفایت اکیڈمی، کراچی ۲۰۰۴ء
- بوکائیے، موریس، بائبل، قرآن اور سائنس، (مترجم: ثناء الحق صدیقی)، ادارۃ القرآن، کراچی، س ن
- البیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین بن علی، سنن کبریٰ، دار الفکر، بیروت

پ

- پال، سلطان محمد، پادری، تصحیف التحریف، پال، سلطان محمد، پادری، لاہور ۱۹۲۵ء
- پال، سلطان محمد، پادری، سلطان التفاسیر، ایم کے خاں مہاں سنگھ باغ، لاہور س ن
- پال، سلطان محمد، پادری، عربستان میں مسیحیت، پنجاب ریلجس بک سوسائٹی، لاہور، بار اول ۱۹۴۵ء
- پال، سلطان محمد، پادری، وید قرآن اور بائبل کی دعائیں، اے کے خاں، مہاں سنگھ باغ لاہور، ۱۹۲۶ء

- پال، سلطان محمد، پادری، ہمارا قرآن،ناشر ایم کے خان مہاں سنگھ،لاہور۱۹۲۸ء
- پرویز، غلام احمد، شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ،لاہور، ۱۹۹۴ء، طبع پنجم
- پرویز، غلام احمد، مطالب الفرقان،ادارہ طلوع اسلام،لاہور،۱۹۸۱ء

ٹ

- ٹھاکر داس، جی ایل، پادری، انجیل یا قرآن، کرسچین لٹریچر سوسائٹی،لدھیانہ ۱۹۱۰ء

ج

- الجاحظ، ابو عثمان عمرو بن بحر، المختار فی الرد علی النصاری، تحقیق: ڈاکٹر محمد عبداللہ الشرقاوی، دارالجیل، بیروت ۱۹۹۱ء
- جونز، ایل مسجد، (مترجم: جے سجان) ،پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی،لاہور
- جیلانی، عبدالقادر، اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر، بیت الحکمت ،لاہور ۲۰۰۵ء
- جے علی بخش، پادری، تفسیر قرآن، مرکنٹائل پریس،لاہور ۱۹۳۵ء

چ

- چراغ علی، مولوی، تعلیقات، مطبع منشی اصغر علی لکھنؤ، ۱۸۷۲ء، بار اول
- چراغ علی، مولوی، یورپ اور قرآن، نول کشور سٹیم پریس،لاہور، ۱۹۱۰ء
- چودہ سو برس کی تفسیریں، خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۱۹۸۹ء

ح

- حالی، الطاف حسین، مولانا، حیات جاوید، بک ٹاک ،لاہور ۲۰۰۷ء
- الحسنی، عبدالحی، نزہۃ الخواطر، حیدر آباد دکن، ۱۹۷۰ء
- حمید اللہ، ڈاکٹر، القرآن فی کل لسان، ادارہ عالمگیر تحریک قرآن، حیدر آباد دکن، ۱۳۶۶ھ، طبع ثالث
- حقانی، عبدالحق، تعریف قرآن رد تحریف قرآن، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۲۹۰ھ / ۱۹۳۴ء
- حقانی، عبدالحق، تفسیر حقانی، مکتبہ عزیزیہ،لاہو، س ن
- حقانی، عبدالحق، عقائد اسلام مع حیات حقانی، ادارہ علوم شرعیہ، کراچی، س ن

خ

- خاکوانی، محمد باقر خاں، ڈاکٹر، پاکستان میں قرآن مجید کے تراجم وتفاسیر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۲۰۰۶ء
- خالد، انور محمود، ڈاکٹر، اردو نثر میں سیرت رسول، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۹ء، طبع اول
- خان بہادر، رحیم بخش، ابن مریم، لاہور، س ن
- خواجہ، موازنہ انجیل و قرآن، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۱۹۲۵ء

د

- دریا آبادی، عبدالماجد، تفسیر ماجدی، تاج کمپنی، لاہور، س ن
- دوست محمد، سیرت النبوی اور مستشرقین علمی اور تنقیدی جائزہ، (مقالہ پی ایچ ڈی، غیر مطبوع)، یونیورسٹی آف پشاور۲۰۰۰ء
- دیدات، احمد، خطبات شیخ احمد دیدات، (مترجم و مرتب: ایف نیاز، اکرم طیب)، لاہور۲۰۰۶ء

ر

- رام چندر، ماسٹر، اعجاز قرآن، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۱۸۹۵ء
- رام چندر، ماسٹر، تحریف قرآن، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۸۹۳ء
- رخشندہ گل، اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات (پی ایچ ڈی مقالہ، غیر مطبوع)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- رکن الدین، محمد، اصول بطلان مذہب عیسوی مع ثبوت نبوت، مطبع خزینۃ الدرر، لکھنؤ۱۸۷۵ء
- رینسن، سی ڈبلیو، پادری کلیسائے ہند اور مسیحی خادم الدین (مترجم: پادری برکت اللہ)، پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی، لاہور، س ن

ز

- زویمر، ایس ایم، تین مذاہب، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۱۹۲۹ء

س

- ساجد میر، پروفیسر، عیسائیت۔ تجزیہ و مطالعہ، دارالسلام، لاہور س ن
- سائتھ، پیٹرسن، ڈاکٹر، بائیبل کا الہام، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۱۹۰۵ء

- سمتھ، ونسٹ اے، قدیم تاریخ ہند (مترجم: محمد جمیل الرحمن)، دارالطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۲۲ء
- سورہ فاتحہ، کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لودیانہ ۱۹۰۰ء
- سوہدروی، عبدالمجید خادم، سیر ۃ ثنائی، نعمانی کتب خانہ، لاہور ۱۹۸۹ء، باراول
- سیالکوٹی، ابراہیم میر، مولانا، اعجاز القرآن بجواب تنویر الاذہان، اندر پریس، سیالکوٹ ۱۹۰۸ء
- سید عبداللہ، مباحثہ مذہبی (پہلا حصہ)، مطبع منعمیہ، اکبر آباد ۱۲۷۰ھ
- سیل، ایڈورڈ، عقائد اسلامیہ، امریکن مشن پریس، لکھنؤ ۱۸۸۳ء
- سیل، ایڈورڈ، کشف القرآن (مترجم: منشی محمد اسمٰعیل)، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۰۲ء
- سیل، کینن، ڈاکٹر، جنگ بدر و جنگ احد، (مترجم: پروفیسر محمد اسمٰعیل)، مشن پریس الہ آباد، ۱۹۱۹ء
- سیل، کینن، ڈاکٹر، القرآن، کرسچین لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا، پنجاب لودھیانہ، ۱۹۱۹ء
- السیوطی، جلال الدین، الاتقان فی معرفۃ علوم القرآن، مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۹۵۱ء

ش

- شاہجہان پوری، پیام، مسیح کی ہندی انجیل، ادارہ تاریخ و تحقیق، لاہور ۱۹۹۴ء
- شطاری، سید حمید، ڈاکٹر، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک، ایچ ای ایچ، دی نظامس اردو ٹرسٹ، حیدرآباد ۱۹۸۲ء

ص

- صادق علی، ڈاکٹر، البرہان علی اعجاز القرآن، مطبع چودہویں صدی، راول پنڈی ۱۳۱۴ھ
- صالحہ شرف الدین، ڈاکٹر، قرآن حکیم کے اردو تراجم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س ن
- صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۱ء
- صدیقی، یسین مظہر، ڈاکٹر، سرسید اور علوم اسلامیہ، ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۱ء

ظ

- ظفر، محمود احمد، حکیم، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے معاصرین، ادارہ تخلیقات، لاہور ۲۰۰۷ء

ع

- عبدالحق، مولوی، خطبات عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۴ء، بار دوم
- عمادالدین، لاہز، تحقیق الایمان، مطبع آفتاب پنجاب، لاہور ۱۸۶۶ء
- عمادالدین، لاہز، ترجمۃ القرآن بہ اردو زبان، امرتسر ۱۸۸۶ء
- عمادالدین، لاہز، تعلیم محمدی، وکیل ہندوستان پریس، امرتسر ۱۸۸۰ء
- عمادالدین، پادری، تنقید القرآن، مشن پریس امرتسر، ۱۸۹۵ء
- عمری، محمد عارف، اعظمی، تذکرہ مفسرین ہند، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، ہند، طبع دوم ۲۰۰۶ء
- عمری، محمد مقتدی اثری، تذکرۃ المناظرین، دارالنوادر، لاہور ۲۰۰۷ء

غ

- غلام مسیح، پادری، ہماری بائبل اور مسلم علما، لاہور ۱۹۲۶ء

ف

- فانڈر، سی جی، میزان الحق، پنجاب رلیجس بک سوسائٹی، لاہور ۱۹۶۲ء
- فتح پوری، نیاز، من ویزداں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء
- فتح حسین، شیخ، منبع الحسنات فی تحقیق النجات، مطبع قیومی، کان پور ۱۳۲۲ھ
- فرشتہ، ابوالقاسم، تاریخ فرشتہ، نول کشور ۱۸۶۴ء
- فضل الرحمن، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مکتبہ سلفیہ، لاہور ۱۹۸۷ء
- فیضی، ابوالفیض، تفسیر سواطع الالہام، نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۸۸۹ء

ق

- قادیانی، غلام احمد، مرزا، جنگ مقدس، قادیان
- قادیانی، غلام احمد، مرزا، مسیح ہندوستان میں، مطبع انوار احمدیہ مشن پریس، قادیان ۱۹۰۸ء
- قاسمی، محمد سعود عالم، ڈاکٹر، مطالعہ تفاسیر قرآن، فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۰۴ء
- قاسمی، محمد دین، ڈاکٹر پروفیسر حافظ، ولادت عیسیٰ اور منکرین حدیث، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۶ء

- قاسمی، محمد دین، ڈاکٹر پروفیسر حافظ، جناب غلام احمد پرویز کی (خود ساختہ) عجمی سازش پر ایک نظر، کتاب سرائے، لاہور ۲۰۰۹ء
- قاموس الکتب اردو (جلد اول)، (مرتبہ: مفتی انتظام اللہ شہابی)، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی ۱۹۶۱ء

- کانپوری، محمد علی، دفع التلبیسات، نامی پریس، کانپور ۱۳۰۲ھ
- کھگہ، محمد فیروزالدین شاہ، اختلاف قراءات اور نظریہ تحریف قرآن، شیخ زید اسلامک سنٹر، لاہور ۲۰۰۶ء
- کیرانوی، رحمت اللہ، محمد، ازالۃ الاوہام، سید المطابع، شاہجہان آباد۔ دہلی ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء
- کیرانوی، رحمت اللہ، محمد، ازالۃ الشکوک، انگپا نایک اسٹریٹ نمبر ۱۵۶، مدراس ۱۲۸۸ھ
- کیرانوی، رحمت اللہ، مولانا، اعجاز عیسوی الملقب بمصلۃ تحریف، ادارہ اسلامیات، کراچی ۱۴۰۴ھ

- گلکرسٹ، اردو کا کلاسیکی ادب، قواعد زبان اردو (ناشر۔ سید امتیاز علی تاج) مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۲ء
- گولڈسیک۔ ڈبلیو، اسلام میں قرآن سنجاب۔ ریلیجس بک۔ سوسائٹی، لاہور ۱۹۵۴ء، بار دوم
- گولڈسیک، ڈبلیو، ینابیع القرآن، کرسچین لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا، لدھیانہ ۱۹۰۹ء
- گیلانی، مناظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ، لاہور س ن

- لینگ، جیفرے، سر تسلیم خم ہے (سٹرگلنگ ٹو سرنڈر) (مترجم: ڈاکٹر تصدق حسین راجا) الصدیق پبلشرز، اسلام آباد ۱۹۹۸ء

- مبارک پوری، اطہر، قاضی، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، مکتبہ عارفین، کراچی
- محسن فانی، دبستان مذاہب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور
- محمد اعلیٰ، سید، تنزیہہ الفرقان، مطبع شمس پریس، آگرہ ۱۸۷۷ء، طبع اول
- محمد شریف، سرسید کے آراء و افکار کا مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر کی روشنی میں تنقیدی و تحقیقی جائزہ، (مقالہ ایم فل، غیر مطبوع)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۰۲ء
- محمد عبداللہ، انجیل و قرآن کا مقابلہ، اسلام اور عیسائیت کا مجادلہ، نظامی پریس، بدایوں ۱۹۳۰ء

- محمد عبداللہ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اوران کی علمی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ،(مقالہ پی ایچ ڈی، غیر مطبوع)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۲۰۰۰ء
- محمود اختر، حافظ، پروفیسر، تدوین قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات کا محققانہ جائزہ،(پی ایچ ڈی مقالہ، غیر مطبوعہ)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۹۰ء
- المروزی، محمد بن نصر، مختصر قیام اللیل و قیام رمضان و کتاب الوتر، المکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل ۱۹۶۹ء
- المسعودی، ابوالحسن علی بن حسین بن علی، مروج الذهب و معادن الجواهر، مصر ۱۳۷۷ء/۱۹۵۸ء
- المسلانی، مصطفیٰ نصر، الاستشراق السیاسی، دار اقرا، طرابلس ۱۹۸۶ء، الطبع اولیٰ
- مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض ۱۹۹۸ء
- منار الحق، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور س ن
- منصور پوری، محمد سلیمان سلمان، قاضی، برہان، کیلسن پرنٹنگ پریس، لاہور س ن
- مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، سنت کی آئینی حیثیت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء
- موہانی، آل حسن، سید، کتاب الاستفسار، مطبعہ رضویہ، دہلی، ۱۸۴۳ء
- مونگیری، محمد علی، مولانا، مرآۃ الیقین لاغلاط ہدایۃ المسلمین، مطبع رحمانیہ، مونگیر ۱۳۳۹ھ، اشاعت دوم
- میتلی، جی ٹی، ہماری کتب مقدسہ، مسیحی اشاعت خانہ، لاہور ۱۹۹۸ء، بار دہم

ن

- نانوتوی، محمد قاسم، مباحثہ شاہجہان پوری، دارالاشاعت، کراچی ۱۹۷۷ء
- ندوی، مسعود علی، مولانا، ہندوستان عربوں کی نظر میں، دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۶۰ء
- نسیم عثمانی، ڈاکٹر، اردو میں تفسیری ادب، کراچی، س ن

و

- والٹ، ایس این، توما مقدس رسول، عباسی لیتھو آرٹ پریس، کراچی، ۱۹۷۷ء
- ولی اللہ، حافظ، صیانت الانسان عن وسوسۃ الشیطان فی رد تحقیق الایمان، مطبع مصطفائی، لاہور ۱۲۸۹ھ
- ولی اللہ، شاہ، الفوز الکبیر، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س ن
- ویری، ای ایم پادری، آئینہ قرآن، امریکن مشن پریس، لودیانہ ۱۸۸۱ء
- ویری، ای ایم پادری، دین اسلام، امریکن ٹریکٹ سوسائٹی، لودھیانہ ۱۹۰۵ء
- ویری، ای ایم، پادری، ہدایت الممترین، کرسچین لٹریچر سوسائٹی، لدھیانہ ۱۹۰۱ء

ھ

- بلاسی رام، بابو، تحریف قرآن یا بائبل، حسن بلڈنگز، بیڈن روڈ، لاہور ۱۹۲۹ء، بار اول
- الہیثمی، نورالدین، مجمع الزوائد، موسستہ المعارف بیروت ۱۹۸۶ء

ی

- یاد، یوسف مسیح، توما ہندوپاک میں، پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈز، پشاور ۱۹۹۶ء

رسائل و جرائد

- ہفت روزہ " اہل حدیث " امرتسر
- ماہنامہ " تعمیر افکار " کراچی
- ماہنامہ، " ذکر و فکر " دہلی
- ماہنامہ " محدث " بنارس
- ماہنامہ " نگار " لکھنؤ
- سہ ماہی " تحقیقات اسلامی " علی گڑھ
- سہ ماہی " عالم اسلام اور عیسائیت " اسلام آباد
- شش ماہی " علوم القرآن " علی گڑھ
- " القلم " ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

خصوصی اشاعتیں

- ہفت روزہ " اعتصام " لاہور، ج ۷، ش ۲۸_۲۹، ۱۷تا۲۴ فروری ۱۹۵۶ء، (حجیت حدیث نمبر)
- ہفت روزہ " اہل حدیث " لاہور، ج ۲۸، ش ۳۹، ۱۰_۱۱۶ اکتوبر ۱۹۹۷ء، (خدمات اہل حدیث نمبر)
- ماہنامہ " سیارہ ڈائجسٹ " لاہور (قرآن نمبر)
- ماہنامہ، " نقوش " لاہور (شخصیات نمبر)
- سہ ماہی " اسلام اور مغرب " انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، (قرآن اور مستشرقین نمبر)
- سہ ماہی " فکر و نظر " اسلام آباد (برصغیر میں مطالعہ قرآن نمبر)

ENGLISH BOOKS

- Allegro. J.M. Dead Sea Scrolls, Penguin Books Ltd., UK1957
- Arlyle , Thomas , Humphrey Milford , Oxford University Press , London
- Armstrong Karen, Bible – the Biography, London 2007
- Barrett, David B, World Christian Encyclopedia, Oxford University, Press, UK 1982
- Birisik Abdulhamit , Oryantalist Misyonerler ve Kuran,Istanbul 2004
- Chaim Bermant & Michel Weitzman, Ebla, London 1979
- Clark Robret, The Missions, Church Missionary Society, London1904
- Crucifixion By An Eye Witness, Indo American Book Company, Chicago 1911
- Cyclopedia of India, Book Traders, Lahore, 1992
- Encyclopedia Britannica, London1970
- Gunny Ahmad, Perceptions of Islam in European Writings, The Islamic Foundation, Leicester UK, 2004
- H.Daniel Rops, Church in Eighteenth Century, London1964
- Jeffery Arthur, Materials for the history of the text of the Quran, E. J. Brill, Leiden 1937
- Jafarry Arther, Quran as Scripture, New York, 1952
- Keay F.E. History of Syrian Church in India, S.P.C.K, Madrass, 1938
- Kenneth Scott, Christianity in Revolutionary Age, London 1961
- Kersten Holger, Jesus Lived in India, Element Book Ltd. Shaftsbury, England 1983
- Kooiman, Conversion and Social Equality in India, Manohar Publications, Delhi 1989
- Kritzeck, James, Peter the venerable and Islam, Princeton University Press New York
- Latourette K.S., Christianity in a revolutionary age, Vol. III, London1961
- Matar, Nabil, Islam in Britain, Cambridge University Press, UK 1998
- Niell, Stephen, The Story of the Christian Church in India and Pakistan, ,(Michigan 1970
- Paine Thomas, The Age of Reason, Paris and London, 1794
- Potts, British Baptist Missions in India, Cambridge University Press Cambridge1967
- Powell Avril A. Muslims and Missionaries an Pre-Mutiny India, Curzon Press Ltd, UK 1993
- Prasad, Ram Chandra, Early English Travelers in India, Motilal Banarsidass, Delhi 1965
- Priolkar A.K, The Goa Inquisition, Bombay University Press, Bombay 1961
- Rule, William Harries, History of Inquisition, Wesleyan Conference, London1868
- Sabshena, R.N, Into the Mainstream, Aplinew Publications, 2003
- Sale, George, The Koran commonly called Alkoran of Mohammed , George Routledge & sons, London

- Sherring, M.A., Rev., History of Protestant Missions in India, London 1875
- Smith George, The Conversion of India, London 1893
- Stephen Neill ,Builders of the Indians Church, Edinburgh house Press, London 1934
- Thiering, Barbara, Jesus The Man, Corgi Book, London 1993
- Thomas P, Christians and Christianity in India and Pakistan, London 1954
- Wherry, E. M., Islam and Christianity in India and the Far East, Flemi. Revell Company, London 1907
- Wherry, E.M, The Muslim Controversy, Madras 1905
- Wilson, Edmund, The Dead Sea Scrolls 1947 – 1969, William Collins Sons & Co. Glasgow1977
- American Ethnologist, Vol.14 No.1 1987
- Journal of Royal Asiatic Society, No 1 1976
- Word and World, Vol. xvi, No.2, Spring 1996
- www.Jheaoouba.com / tomb.html
- www.boaringchristianity.org
- www.jesus-kashmir-tomb.com
- www.wakipedia.com/ goainquisition.html